2

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نورِ سرمدی

فخرِ انسانیت

محمد فتح اللہ گولن

نور سرمدی

فخر انسانیت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(جلد دوم)

(İNSANLIĞIN İFTİHAR TABLOSU

SONSUZ NUR-2)

مؤلف

محمد فتح اللہ گولن

مترجم

محمد اسلام

نام کتاب : نور سرمدی، فخر انسانیت حضرت محمد ﷺ (جلد دوم)

مصنف : محمد فتح اللہ گولن

ترجمہ : محمد اسلام

نظر ثانی : شازیہ یعقوب

ناشر : ہارمَنی پبلی کیشنز

ہاؤس نمبر 9، مین ڈبل روڈ۔ ایف ٹین ٹو اسلام آباد

فون: 92-051-2212250

فیکس: 92-051-2212186

تعداد 16,000

اشاعت 2011ء

9, Main Double Road, F-10/2,
Islamabad - Pakistan
Tel: +92-51-2212250, Fax: +92-51-2112186
www.harmonypublications.pk
harmony.publications@gmail.com

فہرست مضامین

حصہ چہارم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا عسکری پہلو

پانچواں حصہ

عصمتِ انبیائے کرام علیہم السلام اور عصمتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

ملحق

اسلامی شریعت میں سنت کی حیثیت اور مقام

حصہ چہارم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

حیاتِ طیبہ کا عسکری پہلو

پہلی فصل:

عسکری نبی

الف: مقاصد جہاد

اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص عرصے تک رسول اللہ ﷺ کے سامنے مادی جہاد کے دروازے بند رکھے۔ چونکہ ہر کام کے لیے مخصوص وقت ہوتا ہے، اس لیے یہ بات فطرت سے بالکل ہم آہنگ تھی۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا اور کافی عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرماتے ہوئے مسلمانوں کو تلوار اٹھانے، طاقت کا استعمال کرنے اور جنگ چھیڑنے کی اجازت دی کہ اب تمہیں اپنی جانوں اور حقوق کا دفاع کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس وسیع و عریض موضوع میں داخل ہونے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کا باعث بننے والے بعض امور کی وضاحت کر دوں۔

افواج میں نظم و نسق پیدا کرنے، ان کی تیاری اور ان کی راہنمائی میں رسول اللہ ﷺ کی فراست کے موضوع کو شروع کرنے سے پہلے جہاد کی مشروعیت کے عہد پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح جہاد کے عمومی مفہوم کا ادراک ضروری ہے، اسی طرح مادی جہاد یعنی قتال کے حکم کے آغاز کی تاریخ کے بارے میں جاننا بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ایک طرف دشمنانِ اسلام جہاد کے مفہوم کو مسخ کرنے میں مصروف ہیں تو دوسری طرف نادان دوست تاریخ میں خلط مباحث کا ارتکاب کر کے ذہنوں میں تشویش پیدا کر رہے ہیں، لہٰذا میں ان دونوں پہلوؤں سے متعلق بعض امور کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ عمر بھر اسلام کے اصولوں سے سرمو پیچھے نہ ہٹے۔ آپ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اسلام کی تنفیذ اور اسے عملی جامہ پہنانے سے عبارت تھی۔ یہ بات جس طرح زندگی کے دیگر شعبوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، اسی طرح جنگ و جہاد کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

۱- دفاع

اسلام نے افراد اور اقوام کو اپنے وجود کے لیے خطرہ بننے والی دشمن طاقتوں کے خلاف اپنا دفاع کرنے کی نہ صرف اجازت دی ہے، بلکہ بعض اوقات اس کی ترغیب بھی دی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی

ذات، مال، زندگی، دین یا عزت وآبرو کونقصان پہنچانا چاہتا ہے تو آپ اس کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں آپ دونوں کے درمیان شدید جھگڑا بھی کھڑا ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ملک سرحد عبور کر کے آپ کے خطہ ارض پر قبضہ کر لے تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟ یا اگر وہ آپ کے ملک کے بعض افراد کو آپ کے خلاف سرگرم کرنے کی کوشش کرے تو آپ دل میں کیا سوچیں گے؟ یا اگر آپ کے ہم مذہب ساتھی کسی جگہ ظلم وستم اور دھوکے کا نشانہ بن رہے ہوں تو آپ کا کیا طرز عمل ہوگا؟ یقیناً آپ محض یہ کہنے پر اکتفا نہیں کریں گے کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتا۔

اسی نقطے کے پیش نظر رسول اللہﷺ نے چودہ صدیاں پیشتر ایک نظام کے تحت طاقت کے استعمال کا طریق کار وضع فرما کر ضرورت کے وقت حکمت وارشاد کے ساتھ طاقت اور تہدید کے استعمال کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اگر مسلمان عزت واحترام کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ طاقت حاصل کر کے اسے راہِ خدا میں استعمال کریں، دنیا سے اپنی بات منوائیں اور غلط آوازوں کو دبا کر بین الاقوامی سطح پر توازن کے قیام کا باعث بنیں۔

۲- ظلم کا سدباب

اس دنیا میں انسانیت کی ایک بڑی تعداد ظلم وستم اور زیادتی کا شکار ہے۔ اگر ہم ایسے لوگوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں یا ہمیں اس سلسلے میں سیاسی سطح پر کسی قدر کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے مشکل حل کردی ہے۔ کسی حد تک اس گمان میں معقولیت بھی پائی جاتی ہے، کیونکہ ہم اپنے قومی اور دینی بھائیوں کے لیے اپنے دلوں کے دریچے کھول کر اپنی قربانیوں کے ذریعے ان کی بعض مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کی مشکلات حل کرنے میں ہمیں کتنے فیصد کامیابی حاصل ہوتی ہے؟ ہمارے قریب ہی پندرہ سے بیس لاکھ لوگ ظلم وستم کا نشانہ بنے اور ان پر شعائر اسلام کی ادائیگی اور اسلامی نام رکھنے پر پابندی عائد کی گئی۔ اگرچہ ہم پانچ لاکھ افراد کے لیے اپنے دلوں کے دریچے کھول سکے، لیکن دس سے پندرہ لاکھ افراد ابھی تک ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ (۱) اگر ہم ایک چھوٹے سے ملک کی طرف سے درپیش چھوٹی سی مشکل کو حل کرنے سے عاجز ہیں تو دنیا کی طرف سے حال ومستقبل قریب میں درپیش متعدد مشکلات سے کیسے نبرد آزما ہوسکیں گے؟

لہٰذا ایک ایسی اسلامی مملکت کا وجود ناگزیر ہے، جس کے محاسبے سے سب ڈریں، جس کے ماتھے پر بل پڑنے اور تھوڑے سے غصے کے اظہار سے لوگ راہِ راست پر آکر اپنی حدود کو پہچان لیں۔ حق کے

اثبات، باطل کے ابطال اور فوری طور پر ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کو پہنچنے کے لیے دوسروں پر ہیبت طاری کرنے والی ایسی طاقت کا ہر وقت موجود رہنا ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب حسبِ موقع کبھی کبھی اس عظیم طاقت کا اظہار کیا جاتا رہے۔ ماضی میں اس طاقت کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ جب ہم بین الاقوامی توازن قائم کرنے میں اپنی ذمہ داری ادا کرتے تھے اس وقت ہندوستان پر قبضے کے خواہش مند انگلستان کو خوف زدہ ہو کر کے الٹے پاؤں واپس پلٹنے پر مجبور کرنے کے لیے ہمارا صرف اتنا اعلان کر دینا کافی ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا بحری بیڑا بحر ہند کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس دور میں بین الاقوامی توازن کے پلڑے میں ہماری بات کا بڑا وزن تھا۔ ہمارے اسی غیر معمولی وزن اور فیصلہ کن حیثیت کا نتیجہ تھا کہ فرانس سے لے کر ہندوستان تک کے وسیع علاقے میں حق کے اثبات اور باطل کے ابطال کے لیے ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ لوگ ہماری ہی طرف دوڑ کر آتے تھے۔

اسلام میں جنگ مظلوموں اور کمزوروں کی مدد کے لیے جائز قرار دی گئی ہے۔ اگر مسلمان مسلمان کی مدد کو نہیں آئیں گے تو پھر اور کون لوگ آئیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حق کی سربلندی کی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈالی ہے۔ اس لیے اس مقام کے حصول کو اپنا مقصد حیات سمجھتے ہوئے اس کی خاطر جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے۔ بصورت دیگر ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۳- دعوت کی آزادی

اگر حق، حقیقت، استقامت اور باعث فضیلت امور کی نشر و اشاعت کی آزادی میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں تو اسلام اس آزادی کی حفاظت اور اسے یقینی بنانے کی خاطر ہمیں جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے، البتہ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ جنگ حق اور حقیقت کی نشر و اشاعت کی خاطر جائز قرار پائی ہے، بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اگر حق اور حقیقت کی اشاعت کی آزادی سلب کر لی جائے تو اس وقت اعلانِ جنگ کیا جائے گا۔ اگر آپ کے پاس اسلام کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانے کے لیے افراد موجود ہیں تو وہ افراد ہر انسان تک اسلام کا پیغام پہنچا سکتے ہیں، لیکن اگر دوسرے لوگ اس مقصد میں رکاوٹ بنتے ہیں تو آپ پر ان رکاوٹوں اور دشواریوں کو ختم کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ لوگ دوسرے انسانوں کے برضا و رغبت جنت کے راستے پر چلنے میں حائل ہو رہے ہیں۔ آپ کے کندھوں پر حریت فکر کی حفاظت، رکاوٹوں کے ازالے اور اس حریت کے خلاف کسی بھی قسم کی سرگرمی کو ختم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جس قدر آپ کو اس آزادی کے یقینی بنانے میں کامیابی حاصل ہو گی، اسی قدر آپ کو اپنے دین کی اشاعت میں کامرانی نصیب ہو گی۔

۴- انسانی اقدار

حریت کی حفاظت کی اس جنگ کے دوران ضروری ہے کہ انسانی عزت وشرف کو پامال کیا جائے اور نہ ہی بچوں، عورتوں، عبادت گاہوں، راہبوں، اپنی زندگی کو عبادت وطاعت کے لیے وقف کرنے والوں اور پرامن لوگوں سے تعرض کیا جائے۔ سب جانتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حال ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچی، بلکہ اس سے بہت فروتر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ جن لوگوں نے آباد شہروں پر ایٹم بم پھینکے تھے، ان کے لیے ''بہت فروتر'' کا لفظ کافی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں کافی نہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ انہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی نامی شہروں پر ایٹم بم گرا کر ان میں سے ہر ایک کے اسی ہزار سے زائد شہریوں کو ہلاک کر دیا اور ہزاروں افراد کو زخمی، اپاہج اور مسخ کر دیا۔ یہ سب کچھ ان لوگوں نے کیا جو عصرِ حاضر کے تمدن کے علمبردار ہیں۔

دوسری طرف مسلمانوں کو دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ اور ہر خلیفہ جنگ کے لیے جانے والے سپہ سالار کو تاکید سے ہدایت کرتے کہ وہ کسی بوڑھے، بچے یا عورت کو قتل نہ کریں، عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے والے راہبوں سے تعرض نہ کریں۔ کسی عبادت گاہ کو منہدم نہ کریں، کسی درخت کو نہ کاٹیں اور اموال کو ضائع نہ کریں۔(2)

مجھے نہیں معلوم کہ وحشیانہ انداز میں پرامن شہریوں پر بم برسانے والوں کے لیے ان ہدایات کی رعایت کرنا اور ان پر عمل پیرا ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ بین الاقوامی توازن میں اہلِ ایمان کی عدم موجودگی کے سبب اس میں پیدا ہونے والے خلا کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اگر ہمارا شمار بھی بڑی طاقتوں میں ہوتا تو وہ تمام مظالم اور مصائب نہ ہوتے جو راہِ خدا میں جہاد کے لیے نکلنے کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل تھا۔

چونکہ میں اس وسیع وعمیق موضوع کا تجزیہ اپنی گزشتہ کتاب میں کر چکا ہوں، اس لیے میں یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قارئین کو اس کتاب کی طرف مراجعت کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔(3)

رسول اللہ ﷺ نے پورے مکی دور میں کسی بھی قسم کی مادی مزاحمت یا جدوجہد نہیں فرمائی، بلکہ ہمیشہ اطمینان وسکون اور صبر واستقامت کے ساتھ اپنے گردوپیش کے لوگوں کو وعظ ونصیحت فرماتے رہے۔ میں یہاں صرف نبی کریم ﷺ کے تیرہ سال تک قرآن کریم کے الماسی دساتیر کے ذریعے دلوں کو اپنا گرویدہ کرنے کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ آپ ﷺ نے اپنی ساری جدوجہد کوئلے کو ہیرا

اور مٹی کو سونا بنا دینے والے مسحور کن کلام و خطاب کے ذریعے دعوت و تبلیغ پر مرکوز کیے رکھی۔ آپ ﷺ نے اذیت کا جواب اذیت سے دیا اور نہ ہی گالی کے جواب میں گالی دی، بلکہ مصائب و آلام کے سمندر میں نہ ختم ہونے والے صبر کے ساتھ کود پڑے۔ اہل ایمان کو آپ ﷺ کے سامنے تکالیف دے دے کر قتل کیا جاتا، لیکن آپ ﷺ اپنی تکالیف کے ساتھ ساتھ ان کی تکالیف کو بھی صبر کے ساتھ برداشت فرماتے، مثلاً جب مشرکین حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے خاندان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا رہے ہوتے اور آپ ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو انہیں دلاسا دیتے ہوئے فرماتے: ''اے آل یاسر! صبر کرو، بیشک تم سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے''۔ (4)

ایک طرف آپ ﷺ کے صبر و تحمل کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف کفار کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس مسلمانوں کو مکہ سے دور بھیجنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے اور انہیں ہجرت کر کے اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب کو چھوڑنے اور اپنے ان گھروں کو خیرآباد کہنے کے احکامات صادر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، جن میں انہوں نے پرورش پائی اور اپنی عمر کا ایک طویل حصہ امن و سکون کے ساتھ گزارا تھا۔

ابتدائی مسلمانوں نے اس انداز سے ہجرت کا آغاز کیا تھا۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، لیکن ان کی ہجرت کی داستاں بڑی دکھ بھری تھی، کیونکہ وہ تنِ تنہا ہجرت کر رہے تھے، ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ (5)

ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت فرمائی تو ان کے ہمراہ ان کی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نہ تھیں، جنہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ بننے کے بعد اپنی بیٹی ہونے کے باوجود ''ماں'' کہہ کر پکارتے تھے، اس وقت وہ کہاں تھیں؟ اس کی کسی کو خبر نہیں، تاہم اس دور میں ہجرت کا یہی طریقہ تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ہر کوئی اپنے گھر اور وطن کو خیرآباد کہہ کر ہجرت کرنے پر مجبور تھا۔ ایک دن عتبہ بن ربیعہ، عباس بن عبدالمطلب اور ابوجہل بن ہشام بالائی مکہ کی طرف جاتے ہوئے بنو جحش کے گھروں کے پاس سے گزرے تو عتبہ بن ربیعہ نے دیکھا کہ ان کے دروازے ویرانی کے باعث کھڑکھڑا رہے ہیں اور ان میں کوئی رہنے والا نہیں ہے، یہ منظر دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ بھری اور درج ذیل شعر پڑھا:

وکل دار وان طالت سلامتها   یوماً ستدرکها النکباء والحوب

"کوئی بھی گھر اگر چہ کتنا ہی پائیدار کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن وحشت و مصائب کا شکار ضرور ہوتا ہے"۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ نے کہا: "بنو جحش کا گھر اس کے باسیوں سے خالی ہو گیا۔" اس پر ابو جہل نے کہا: "لیکن ان پر کوئی بھی رونے والا نہیں۔"(6)

رسول اللہ ﷺ اس صورت حال کے ہرگز ذمہ دار نہ تھے، بلکہ اس کے ذمہ دار وہ ظالم اور غدار لوگ تھے، جنہوں نے ان گھروں اور رہائش گاہوں میں جنم لینے اور پروان چڑھنے والے مسلمانوں کو نکال باہر کیا تھا حتی کہ اس ظلم سے ان کے جانور بھی محفوظ نہ رہے اور کافروں کی آنکھیں بھی یہ منظر دیکھ کر بھیگ جاتی تھیں۔

مسلمان صحراء کی چلچلاتی دھوپ میں بغیر کسی توشے اور معاون کے تقریباً پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے پر مجبور تھے۔ اس دور میں یہ مسافت پورے ایک ماہ میں طے ہوتی تھی، لیکن مسلمانوں کے لیے اسے طے کرنا ناگزیر تھا۔ سفر و قیام میں اور سوتے وقت ان کے پاس جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس تھکا دینے والے سفر میں وہ کیا کھائیں پیئیں گے۔ یہ مہاجرین جو بعد میں مدینہ منورہ میں عزت و احترام سے رہے، انصار کی پناہ لینے پر مجبور تھے۔ یہ ان کے لئے ایک دوسری آزمائش تھی، تاہم انصار کے پاکیزہ معاشرے نے ان کے لیے اپنے دلوں کے دریچے کھول دیئے اور ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ ان سے فرماتے: "صبر کرو اور اس پر ڈٹے رہو، کیونکہ جنت تمہارا ٹھکانہ ہے۔" رسول اللہ ﷺ خدائی احکامات کے مطابق چلتے تھے، جس میں آپ ﷺ کی خواہشات و جذبات کا کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔

مسلمانوں پر ڈھایا جانے والا یہ ظلم و ستم جس میں ان کا اپنے گھر بار اور اہل و عیال کو چھوڑنا اور طرح طرح کی تکلیفیں سہنا جن کا سلسلہ بعض اوقات موت تک جاری رہتا، بھی شامل تھا، ظالم مشرکین کی نظروں میں ناکافی تھا اور اس سے ان کے جذبۂ عداوت کی پوری تسکین نہ ہوئی، چنانچہ ایک دن انہوں نے مسلمانوں کے مال و متاع اور جائیداد پر قبضہ کرکے اسے آپس میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ آٹھ سال کے بعد فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہوئے اور اسامہ بن زید نے آپ ﷺ سے پوچھا: "کل آپ کا قیام کہاں ہوگا؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے؟"(7)

یعنی کفار نے رسول اللہ ﷺ کا کوئی ایسا گھر نہیں چھوڑا تھا، جس میں آپ ﷺ قیام اور آرام فرما

سکتے۔ عقیل ابوطالب کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔وہ کافی عرصہ بعد اسلام لائے اور اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کی دشمنی پر کمربستہ تھے۔ان میں وفاشعاری کے جذبے کی کمی تھی، اسی لیے انہوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کا وارث قرار دیتے ہوئے آپ کی جائیداد پر ہاتھ صاف کیے۔دیگر ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی جائیدادوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔

منافق ابن اُبَی نے مکہ میں پیش آنے والے اس واقعے سے فائدہ اٹھایا اور مدینے آکر پکار پکار کر کہنے لگا: ''او مسلمانو! تم یہاں بیٹھے ہو، جبکہ مکہ میں تمہارا مال ومتاع لوٹا جارہا ہے۔اہل مکہ تمہارے اموال بازاروں میں باہم تقسیم کررہے ہیں۔ایک دن آئے گا جب تمہارے پاس یہاں کوئی چیز ہوگی اور نہ وہاں۔''

یہ ستم بر ستم تھا،(8) لیکن بات یہیں پر ختم نہ ہوئی، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکین کا قافلہ مسلمانوں کا مال ومتاع شام کی طرف لے جاتے ہوئے جان بوجھ کر مدینے کے قریب سے گزرتا ہے اور بزبانِ حال مسلمانوں سے کہتا ہے: ''دیکھو اور غصے سے مرجاؤ۔'' پھر انہوں نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ مسلمانوں کے اونٹ اور بکریاں بھی ہانک کرلے گئے۔کفار کی لوٹ مار کی یہ صورتحال تھی۔حقیقت یہ ہے کہ آج پھر وہی کچھ ہورہا ہے۔شاعر محمد عاکف(9) بجا کہتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں: ''تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے۔'' اگر ہم تاریخ سے عبرت حاصل کرتے تو کیا پھر بھی وہ اپنے آپ کو دھراتی؟''

آج پھر اہل ایمان طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار ہیں اور ان کی مدد کرنے والوں کو بھی طرح طرح کی تنگیوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔انہیں نہ صرف اپنے وطن اور گھربار سے محروم کردیا جاتا ہے، بلکہ ان سے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔

مجھے یہ سوال دوبارہ پوچھنے دیجئے: ''اگر آپ ان کی جگہ ہوتے تو آپ کا کیا ردعمل ہوتا؟'' یہ مت بھولیے کہ ہزاروں صحابہ کے دل اس قسم کے جذبات سے لبریز اور ان کے احساسات مجروح تھے۔ہر روز انہیں ایک نئے طعنے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔اگر اسی طرح زیادہ عرصہ گزرجاتا اور انہیں عداوت کی آگ بجھانے کی اجازت نہ دی جاتی تو وہ ہمت ہار بیٹھتے، لیکن رحمت خداوندی کو جوش آیا اور وہ جلد ہی ان کی مدد کو آپہنچی ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ()الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ﴾ (الحج: ۳۹-۴۰) ''جن

مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں ہمارا پروردگار خدا ہے۔"

صحابہ کرام کو طرح طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا تھا حتیٰ کہ انہیں جینے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا، چنانچہ اب جن لوگوں کا پیچھا کیا گیا تھا اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر جان سے مار ڈالا گیا تھا، انہیں اپنا دفاع اور دشمن کا محاسبہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس اجازت کا مدار اس بات پر تھا کہ انہیں صرف ایک اللہ کو اپنا رب ماننے کی پاداش میں ناحق طور پر اپنے گھروں سے نکال دیا گیا تھا۔ انہیں مختلف قسم کی محرومیوں کا شکار ہونا پڑا، اپنے اہل و عیال سے جدائی برداشت کرنی پڑی اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ بعض صحابہ ایسے بھی تھے، جنہوں نے سات سات آٹھ آٹھ سال پابند سلاسل رہ کر گزارے۔ آخر کار ظلم و ستم کے شکار ایسے مظلوموں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر جنگ کی اجازت دے دی گئی اور اسی عرصے میں رسول اللہ ﷺ کو حکم جہاد ملا۔

اسلام شمشیر زنی اور خون ریزی کا دین نہیں، جیسا کہ بعض منافقین اور جاہل قسم کے لوگوں کا دعویٰ ہے۔ یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تلوار استعمال کی ہے۔ انبیائے کرام نے پہلے ہی آپ ﷺ کے اس وصف کے بارے میں بتا دیا تھا، چنانچہ سیدنا مسیح علیہ السلام آپ ﷺ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وہ تاج، معراج، جھنڈے اور تلوار والے ہوں گے۔"(10) چنانچہ وہ حسبِ ضرورت جنگ کے مستحق لوگوں کے خلاف جنگ بھی کریں گے، سیدنا مسیح علیہ السلام مزید فرماتے ہیں: "ان کے پاس لوہے کی چھڑی ہوگی، جس کے ساتھ وہ اور ان کی امت جنگ کرے گی۔"(11)

یعنی امت مسلمہ کے پرچم ساری دنیا پر لہرائیں گے اور بہت سے لوگ ان کے سائے تلے آ کر حق کی خاطر جدوجہد کریں گے۔ ان کے پرچم اس مبارک جذبے کے حامل تھے، جس کے اثرات تمہارے جھنڈے اور پرچم میں محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اُس دور میں اس مقدس پیغام کے علمبردار تھے، جس نے مشعل کی طرح اطرافِ عالم کو منور کیا۔

ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ نے دشمنوں کے خلاف جدوجہد اور جہاد کرنے کا حکم دیا، گویا آپ ﷺ اپنے دور کے مخالفین سے فرما رہے ہوں: "تم حریت فکر کو روک سکتے ہو اور نہ ہی انسانی معراج تک پہنچانے والے راستوں کو بند کر سکتے ہو۔" آج بھی "انقلابِ فرانس" کو خراجِ تحسین پیش

کرتے ہوئے اسے آزادی کا پیش خیمہ قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ اس کے ہاتھ قتل و بربریت کے ہزاروں واقعات سے رنگین ہیں۔ اس دوران ہزاروں انسانوں کو "Guillotine" نامی مشین کے ذریعے ذبح کر دیا گیا حتی کہ خود انقلاب برپا کرنے والے انقلاب کی نذر ہو گئے، چنانچہ جب Robespierre نے Danton کو "Guillotine" کی طرف بھیجا تو اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی۔ اس کے جواب میں Danton نے کہا: "میری کوئی خواہش نہیں، کیونکہ عنقریب میرے سر کے ساتھ تمہارا سر بھی "Guillotine" کی ٹوکری میں ہوگا۔"

یہ اُس انقلاب کی حقیقی تصویر ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے آزادی کا دروازہ کھولا۔ اس کی اس بربریت و وحشی پن سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔ پہلے بادشاہ اس کا شکار ہوا، پھر اس کے حمایتی اور پھر دوسرے لوگ۔

رسول اللہ ﷺ نے چودہ صدیاں پیشتر تاریکی کے پردوں کو چاک اور ظلم و استبداد کا خاتمہ فرما کر انسانیت کو آزادی کا تحفہ پیش کیا۔ آپ ﷺ کا پیغام تھا کہ مظلوم کی مدد کرو، مظلوموں کی آہیں اور سسکیاں سنتے ہوئے تمہارے لیے چین و سکون سے بیٹھنا ممکن نہیں ہونا چاہیے اور اگر حق کے اثبات اور ظلم کے ازالے کے لیے طاقت کا استعمال ناگزیر ہو تو اس کے استعمال سے گریز مت کرو۔" آج ہمارے لیے یہ ممکن نظر نہیں آتا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مناسب وقت پر انتہائی احتیاط اور منظم انداز سے طاقت کا استعمال فرمایا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پورے نبوی دور میں مسلمانوں میں سے شہید ہونے والوں کی تعداد ایک سو سے کچھ زائد تھی، جبکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران چالیس ملین سے زائد افراد فریقین کے درمیان وحشیانہ جنگ کی بھینٹ چڑھے اور روس میں ایک غلط نظام کو مستحکم کرنے کے لیے دس کروڑ انسانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ ان کے خون میں کشتیاں چلائی اور ان کی کھوپڑیوں سے بڑی بڑی عمارتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اس عدیم النظیر بربریت کا مظاہرہ صرف ایک نئے نظام "سوشلزم" کو مستحکم کرنے کے لیے کیا گیا۔

ایسے نظام پر خدا کی لعنت ہو اور وہ اسفل السافلین تک دھنس جائے اور عملاً یہ نظام اسفل السافلین تک دھنس بھی گیا، کیونکہ وہ انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ ہر وہ نظام جو فطرت کے خلاف ہو، جس کی بنیاد غلط ہو اور جو حق کے آئینہ دار اصولوں اور افکار کو آزادی نہ دے وہ انجام کار ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ حق کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے دس سال تک اپنے دشمنوں سے برسر پیکار رہے، لیکن آپ ﷺ کی ان تمام جنگی مہمات میں صرف ایک سو سے کچھ زائد مسلمان شہید ہوئے۔ یہ مسلمانوں کی تعداد ہے، کفار کے مقتولین کا مجھے علم نہیں، لیکن دوسری طرف صرف دوسری جنگ عظیم کی بھینٹ چڑھنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے زائد ہے، نیز اس میں وہ زخمی، اپاہج اور معذورین شامل نہیں، جو زخموں کی تاب نہ لاکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی کو انسان کی انسانیت اور اس کی فکر و احساس کے احترام کا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس مقام تک ہیومن ازم (Humanism) کی رسائی ہوئی ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کا سہرا صرف رسولِ عربی حضرت محمد ﷺ کے سر ہے۔ مؤمن نبوی تعلیمات کے مطابق جنگ کرتا ہے اور اپنے سامنے صلح کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ وہ انسانی اقدار کو پامال کرتا ہے اور نہ ہی ان کی تحقیر کرتا ہے۔ وہ کسی انسان کو ناحق قتل بھی نہیں کرتا نیز دوسری ریاستوں پر قبضہ کرتا ہے اور نہ ہی دوسری اقوام کے وسائل کا استحصال کرتا ہے۔

۵- اسلام میں صلح بحیثیت اصل الاصول

مغرب نے مختلف ممالک پر قبضہ کر کے ان کے ظاہری و باطنی وسائل کا استحصال کیا، ان کے باشندوں کو غلام بنایا اور وہاں اپنی نو آبادیاں قائم کیں۔ اس نے اسی مقصد کے لیے جنگیں لڑیں اور اسی کے لیے خون ریزی کی۔ جنگ بلقان، پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور صومالیہ و خلیجی ممالک پر قبضے کے پیچھے یہی محرک کارفرما تھا، جبکہ دوسری طرف اسلام میں جنگ فکری و اعتقادی آزادی اور انسانی معراج تک پہنچانے والے راستوں کو کھولنے جیسے عظیم اہداف کے حصول کے لیے لڑی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود حسب ضرورت صلح کے پہلو کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا، کیونکہ اصل اہمیت صلح کو حاصل ہے۔ جنگ صرف استثنائی صورت ہے، ارشادِ ربانی ہے ﴿وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (الأنفال:٦١) ''اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسا رکھو کچھ شک نہیں کہ وہ سب کچھ سنتا (اور) جانتا ہے۔'' ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ ادْخُلُواْ فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ (البقرة:٢٠٨) ''مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔''

اس قسم کی آیات مسلمانوں کو صلح کی دعوت دیتی ہیں اور اگر مسلمان حالت جنگ میں ہوں تو انہیں

میانہ روی اور ثابت قدمی کی طرف بلاتی ہیں، جبکہ دوسرے نظامہائے حیات میں جنگ وحشی پن اور بربریت کا مظہر ہوتی ہے، بلکہ ان کے ہاں تو صلح کا زمانہ بھی جنگ کے زمانے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ ان شیطانی نظاموں کا نام کوئی سا بھی ہو ان کا مقصد انسانیت کو گمراہ کرنا اور بدامنی وفتنوں کی آگ بھڑکانا ہے۔ چونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، اس لیے وہ ان نظاموں کو ان کے حمایتیوں کی نظروں میں مزین کر کے پیش کرتا ہے اور مسلمانوں کو ان کی ہستی سے دور کر کے انہیں اپنی تاریخ اور اس کے فلسفے میں غور وفکر کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

صلح حالت جنگ میں بھی مؤمن کے پیش نظر رہنی چاہیے۔ بعض اوقات مسلمانوں کی آپس میں جنگ ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں بھی صلح ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (الحجرات: ۹) ''اور اگر مؤمنوں میں سے فریقین آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔ پس جب وہ رجوع لائے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں، جس کے نتیجے میں ملک وملت کی وحدت خطرے سے دوچار ہو جائے اور ملک میں بدامنی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہونے لگے تو ایسی صورت حال میں لڑنے والے اگرچہ اہل ایمان کیوں نہ ہوں ان کا محاسبہ کرنے اور ملک وملت کی شیرازہ بندی اور مسلمانوں کی وحدت کی حفاظت کی خاطر بھرپور جدوجہد کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم ہم سے اسی بات کا مطالبہ کر رہا ہے، لیکن ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ماضی قریب میں ہماری کارکردگی قابل اطمینان نہیں رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مایوسی کمال کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے اور مایوس انسان اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ مایوسی ایک ایسا تالاب ہے، جس میں گرنے والا غرق ہو جاتا ہے، لیکن تفرقہ بازی کے اس قدر مظاہر دیکھ کر نیک شگون قائم کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ بلاشبہ اہل ایمان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور اقوام عالم کے درمیان توازن کے قیام اور عمومی نظم ونسق کی بقا کے ضامن ہیں، اس لیے حق اور انصاف کے قیام کی خاطر ہمیں ہر معاملے میں مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر ہمارے اپنے یا کسی اور ملک میں حالات اس قدر بگڑ جائیں جو ہماری مداخلت کے متقاضی ہوں اور

ہم میں مداخلت کی صلاحیت بھی ہو تو امن وامان کے قیام کے لیے مداخلت کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔اگر مداخلت کا فیصلہ ہو جائے اور اس کے نتیجے میں جنگ کرنی پڑ جائے تو پھر اللہ پر بھروسا اور اعتماد کرتے ہوئے ہمیں راہِ حق پر چل پڑنا چاہیے۔غزوہ احد کے المناک اختتام پر ارشادِ خداوندی ہے: ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (آلِ عمران:۱۵۹) ''اور جب (کسی کام کا) عزمِ مصمم کرلو تو خدا پر بھروسا رکھو۔''

اگر حالات آپ کو مادی جہاد کی طرف لے جائیں یعنی اگر آپ کے لیے دین کی نشرو اشاعت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں یا مظلوموں پر ہونے والے ظلم وستم کو روکنے اور ان کی آہوں اور شکایات کا مداوا کرنے والا کوئی نہ ہو یا کوئی بزورِ بازو آپ کو دین کی نشرو اشاعت سے روکے یا آپ کے وطن کی حرمت کو پامال کرے یا آپ کی جان کو خطرے میں ڈالے تو ایسی تمام صورتوں میں آپ کے لیے میدانِ جنگ میں اترنا اور جنگ وحرب کے لیے کمر بستہ ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔

ب: اعلیٰ پیمانے پر تیاری

جب حالات میدان جنگ میں اترنے کے متقاضی ہوں تو اس کے لیے اعلیٰ پیمانے پر تیاری کرنا ضروری ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے روحانی قوت کے حصول کا اہتمام کرنا چاہیے۔ عسکری ماہرین جنگ میں روحانی قوت کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، اسی لیے وہ اسے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ بلاشبہ ایمان روحانی قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے اور ایمان سے محروم شخص سے میدانِ جنگ میں کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۱- روحانی قوت

درج ذیل آیات کو ملاحظہ فرمائیے، جو مؤمن میں روحانی قوت پیدا کر کے اسے جہاد کے لیے تیار کرتی ہیں: ﴿فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْراً عَظِيماً﴾ (النساء: ٧٤) ”تو جو لوگ آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے یا غلبہ پائے، ہم عنقریب اس کو بڑا ثواب دیں گے۔“ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُواْ أَلْفاً مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ﴾ (الأنفال: ٦٥) ”اے نبی! مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر سو (ایسے) ہوں گے تو ہزار پر غالب رہیں گے، اس لیے کہ کافر ایسے لوگ ہیں کہ کچھ بھی سمجھ نہیں رکھتے۔“ ﴿كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (البقرة: ٢٤٩) ”بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔“ ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ (آلِ عمران: ١٣٩) ”اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مؤمن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔“ ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (الأعراف: ١٢٨) ”اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔“

ان آیات سے جو اصول نکلتا ہے وہ یہ ہے: ”الحق یعلو ولا یعلی علیہ“ ”حق غالب آتا ہے، لیکن مغلوب نہیں ہوتا۔“ (12) راہِ جہاد میں نکلے ہوئے مؤمن کا دل اس احساس سے لبریز ہوتا ہے، کیونکہ وہ ایمان کے ایک ایسے محفوظ قلعے میں ہوتا ہے، جس کی فصیلوں کو پھلانگا نہیں جا

سکتا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے بہادروں کو تیار کرتے وقت ان کے دلوں کو اسی قسم کے ایمانی جذبات سے گرما دیتے تھے۔

یہ بہادر موت کے اس طرح شیدائی تھے، جس طرح ان کے دشمن زندگی کے شیدائی تھے۔ وہ موت کو تلاش کرتے پھرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ موت کی طلسمی کنجی سے ہی جنت کے دروازے کھلتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے: ''میں کب خونِ شہادت میں لت پت اپنے پروردگار کے حضور پیش ہوں گا؟'' وہ ایک دوسرے سے اس قسم کے سوالات پوچھتے اور میدانِ جنگ میں شہادت کو تلاش کرتے۔ ان بہادروں میں سے ہر ایک کا دل اس قسم کے جذبات سے لبریز ہوتا تھا۔ کیا موت کو حقیر جاننے والے ایسے بہادروں کے مقابلے میں کسی کے لیے ٹھہرنا ممکن تھا؟ دشمن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے، اس لیے ان کے پاس راہِ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا تھا۔

۲- حفاظتی قوت کا حصول

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کو اس قدر مضبوط دیکھنا چاہتے تھے کہ بین الاقوامی توازن میں اس کا لحاظ رکھا جائے اور اس کی گرفت سے ڈرا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ اس قدر طاقتور نہیں ہوں گے تو دوسرے لوگ آپ کی کوئی پروا نہیں کریں گے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے معاملات میں مداخلت اور آپ سے تمسخر کرنے لگیں، نیز آپ کی رائے کی پروا کیے بغیر فیصلے کرنے لگیں، بلکہ اس سے بڑھ کر آپ کی رائے کے برخلاف فیصلے کرکے آپ کو ان پر عملدرآمد کرنے کے لیے مجبور کرنے لگیں۔ اس ساری صورتحال کا سبب یہ ہے کہ بڑی طاقتوں کے مقابلے میں بین الاقوامی توازن میں آپ کے پاس مناسب قوت اور وزن نہیں ہے، حالانکہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَن يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلاً﴾ (النساء: ۱۴۱) ''اور خدا کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر کا مومن سے برتر ہونا ممکن نہیں ہے، یعنی لازم ہے کہ کوئی مسیحی، یہودی، بت پرست، سرمایہ دار، لامذہب یا اشتراکی معاشرہ مسلم معاشرے پر حکمرانی نہ کرے۔ درحقیقت وہ حقیقی مسلمانوں پر حکمرانی کر بھی نہیں سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا موقع نہیں دیتے، گویا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں نے ان کے سامنے اس کے راستے بند کردیئے ہیں۔'' مومن دوسروں کے ماتحت رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس کے شایاں نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے سہارے جیئے۔ وہ ظالم کے ہاتھوں میں کھلونا بننا کبھی گوارا نہیں کرتا۔

اہلِ ایمان انفرادی، معاشرتی اور قومی سطح پر اعلیٰ خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ہمیشہ بلندیوں پر رہنا ضروری ہے۔ یہ ہدف ان کے لیے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے، گویا آپ ﷺ فرما رہے ہیں: ''تمہاری بلندی کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اگر تم روئے زمین پر قوت کے مالک نہ رہے تو تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا'' چنانچہ ابوداؤد اور احمد بن حنبل نے حدیث نقل کی ہے: ''قریب ہے کہ قومیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو ایسے بلائیں جیسے کھانے والے ایک دوسرے کو پیالے کی طرف بلاتے ہیں۔''(13) یعنی وہ تمہارے خلاف اور خدا کی طرف سے تمہیں عطا کردہ نعمتوں پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گے جیسے کھانے والے ایک دوسرے کو پیالے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ دورِ حاضر کے تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمہارے خلاف کرکوک، داغستان، شام، لیبیا اور مصر میں پٹرول اور دیگر معدنی ذخائر پر ایک دوسرے کو دعوت دیں گے۔

ہماری نعمتیں اغیار کی للچائی ہوئی نظروں کا شکار ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی ملک کسی جگہ کوئی اسکول کھولتا ہے تو اس سے دوسروں کو بھی اپنے اپنے اسکول کھولنے کا حوصلہ ملتا ہے اور وہ کہتے ہیں: ''ہمیں بھی وہاں اپنے مفادات کی خاطر اسکول کھولنے چاہئیں۔ کیا پتا مستقبل میں حالات کیا رخ اختیار کریں۔'' بعض اوقات ایک چھوٹے سے شہر میں تین تین غیر ملکی اسکول غیر ملکی زبانوں کی تعلیم و تدریس کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ترکی میں تین سو سے زائد ایسے غیر ملکی اسکول ہیں، جو غیر ملکی اداروں کے لیے جاسوسی اور ثقافتی استعمار کی ترویج کی خدمات سرانجام دیتے ہیں، ورنہ ترکی میں ان کا کیا کام؟ اور یہاں ان کے کیا اہداف و مقاصد ہیں؟ کیا ہم اپنا نظام خود نہیں چلا سکتے؟ ان جراثیم کے ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کرنے، ہمارے خلاف ثقافتی یلغار کرنے اور ہمارے اداراتی نظام کی جڑوں میں بیٹھ جانے کا حقیقی سبب کیا تھا؟ اس کا سبب ہماری محبت ہرگز نہ تھی، بلکہ ان کا مقصد ہمارے روحانی وجود میں اپنے پنجے گاڑھنا تھا۔ اکثر اوقات انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ وہ جنگ بلقان میں ہمارے خلاف متحد ہو کر ہم پر یکبارگی حملہ آور ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں انہوں نے ہم پر مصائب کے پہاڑ ڈھائے اور دوسری جنگ عظیم کی چکی میں ہمیں پیسنے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری حفاظت فرمائی اور آج تک ہمیں قائم رکھا۔ یہ مصائب ہم پر اسی لیے ٹوٹے کہ ہم نے بحیثیت امت رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عملدرآمد کرنے میں کوتاہی کی اور جس مقام تک رسول اللہ ﷺ ہمیں پہنچانا چاہتے تھے اس مقام تک نہیں پہنچے، حالانکہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾ (الأنفال: ٦٠) ''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو۔''

ابتدائی مسلمانوں نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی۔ مولانا شبلی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب مسلمان دشمنوں کے خلاف مختلف محاذوں پر برسر پیکار تھے اس وقت جنگ میں شریک گھوڑوں اور اونٹوں کی بڑی تعداد کے علاوہ گھوڑوں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی، جسے جنگ میں استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ مثلاً مدینے سے باہر چراہ گاہ میں چالیس ہزار ایسے عمدہ گھوڑے تیار رہتے تھے، جنہیں کسی بھی لڑائی میں استعمال نہیں کیا گیا تھا، اسی طرح چالیس ہزار گھوڑے شام کے قریب بھی ہنگامی حالات کے لئے موجود رہتے تھے۔ یہ گھوڑے جنگ میں استعمال نہیں ہوتے تھے، بلکہ ناگہانی صورت حال کے لیے احتیاطی تدبیر کے طور پر پالے جاتے تھے۔[14] اس سے پتا چلتا ہے کہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وسائل کی حد تک کس قدر بندوبست رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی احتیاط اور بندوبست کا وجوب آیت کریمہ میں وارد لفظ ''الرباط'' سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ''الرباط'' کا خاص معنی ہے جنگ کے لیے حیوانات، انسانوں اور آلات کی صورت میں تمام ضروری عناصر کو مخصوص اور وقف کرنا، گویا قرآن ہمیں اس ہدف تک پہنچنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اپنے دین، زبان، شرف، عزت، ناموس، وطن اور تمام مقدسات کی ان دشمنوں سے حفاظت کرو، جو ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس ہدف کے حصول کے لیے مطلوبہ قوت تیار رکھو۔ اس بارے میں کبھی کوتاہی کرو اور نہ ہی دشمن کو کبھی موقع دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاؤ۔''

۳۔ ضرورت کے وقت تلوار کا استعمال

قرآن کریم عالمی توازن میں حق اور حکمت کی تائید کے لیے قوت کے استعمال کی تاکید کرتا ہے۔ محمد ﷺ کے پیغام رسالت میں جنگ مشروع ہے۔ انجیل میں آپ ﷺ کے مذکورہ اوصاف میں یہ بھی ہے کہ آپ ''صاحب القضیب'' یعنی ''صاحب شمشیر'' ہوں گے۔[15] آپ ﷺ حق کو پھیلائیں گے، لیکن اگر حق کی اشاعت میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں تو آپ ﷺ طاقت اور تلوار کو بھی استعمال کریں گے۔ لہٰذا آپ ﷺ ''صاحب شمشیر نبی'' ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قرآن کریم میں جنگی حکمت عملی کی تعلیم بھی دی ہے، چنانچہ ایک آیت مبارکہ میں قرآن کریم آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ (الصف: ٤) ''جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسے طور پر) پرے جما کر لڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں وہ بیشک محبوبِ پروردگار ہیں۔''

یعنی تمہاری صفیں آپس میں اس قدر مضبوطی سے ملی ہوئی ہوں کہ دشمن کو ان میں گھسنے کا موقع نہ ملے۔ اس دور میں صفوں کا ملا ہوا ہونا صف بندی کی بہترین صورت ہوتی تھی، کیونکہ اس سے دشمن کے دل میں رعب اور دبدبہ پیدا ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی جنگوں میں یہ حکمت عملی اختیار فرمائی، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ کو فتح حاصل ہوئی۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں راہ خدا میں جنگ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ جوں ہی بعض حضرات نے اس میں سستی اور پس وپیش کا مظاہرہ کیا فوراً شدید نوعیت کا عتاب نازل ہوا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ مَا لَکُمْ إِذَا قِیْلَ لَکُمُ انفِرُواْ فِیْ سَبِیْلِ اللّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَی الأَرْضِ أَرَضِیْتُم بِالْحَیَاةِ الدُّنْیَا مِنَ الآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا فِیْ الآخِرَةِ إِلاَّ قَلِیْلٌ٥ إِلاَّ تَنفِرُواْ یُعَذِّبْکُمْ عَذَاباً أَلِیْماً وَیَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَیْرَکُمْ وَلاَ تَضُرُّوهُ شَیْئاً وَاللّهُ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ٥ إِلاَّ تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ کَفَرُواْ ثَانِیَ اثْنَیْنِ إِذْ هُمَا فِیْ الْغَارِ إِذْ یَقُولُ لِصَاحِبِهِ لاَ تَحْزَنْ إِنَّ اللّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللّهُ سَکِیْنَتَهُ عَلَیْهِ وَأَیَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ کَلِمَةَ الَّذِیْنَ کَفَرُواْ السُّفْلَی وَکَلِمَةُ اللّهِ هِیَ الْعُلْیَا وَاللّهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾ (٩التوبة:٣٨-٤٠)

''مومنو! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم (کاہلی کے سبب سے) زمین پر گرے جاتے ہو (یعنی گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے) کیا تم آخرت (کی نعمتوں) کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو۔ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔ اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تمہیں بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا (جو خدا کے پورے فرمانبردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو خدا ان کا مددگار ہے (وہ وقت تم کو یاد ہو گا) جب ان کو کافروں نے گھر سے نکال دیا (اس وقت) دو (ہی شخص تھے جن) میں (ایک ابوبکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ ﷺ) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے تو خدا نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے اور کافروں کی بات کو پست کر دیا اور بات تو خدا ہی کی بلند ہے اور خدا زبردست (اور) حکمت والا ہے۔''

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام شر پسند قوتوں کے خلاف اپنے رسول کی ایسے وقت میں مدد فرمائی جب تم اس کی مدد کے لیے نہیں اٹھے، اسی طرح وہ تمہارے صدق واخلاص کی بقدر تمہاری بھی نصرت فرمائے گا۔

رسول اللہ ﷺ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس طرف اپنی امت کی ہمیشہ راہنمائی فرماتے رہے، اس لیے اس جماعت پر غلبہ پانا ممکن تھا اور نہ ہی پاؤں تلے روندنا۔ عملاً مسلمان کبھی بھی مغلوب نہیں ہوئے، کیونکہ بین الاقوامی توازن برقرار رکھنے کے لیے ان کے کندھوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ہر وقت تیار رہیں اور وقت آنے پر فوراً محاذ جنگ پر پہنچ جائیں۔ اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرنا گناہ کبیرہ تصور ہوتا تھا۔ ذیل میں عہد نبوی سے اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے: ﴿وَعَلَى الثَّلاَثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُواْ حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّواْ أَن لاَّ مَلْجَأَ مِنَ اللّهِ إِلاَّ إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُواْ إِنَّ اللّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ (التوبة:۱۱۸) ''اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہوگئیں اور انہوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔ بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

ج: جذبۂ اطاعت

کسی بھی نظام میں اطاعت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایسے اجڈ معاشرے میں جذبہ اطاعت کو پروان چڑھانا زیادہ اہم ہے، جس میں کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی بات کو اہمیت دیتے ہوئے اس پر کان دھرنے یا توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتدریج اس قدر فرمانبرداری سکھادی کہ جب آپ ﷺ نے اٹھارہ سالہ نوجوان کو ایک ایسے لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا، جس میں ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم جیسے بڑے بڑے صحابہ کرام شامل تھے تو سوائے دو ایک افراد کے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔(16) کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُواْ وَاذْكُرُواْ اللّهَ كَثِيراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلَحُونَ۝ وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُواْ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (الأنفال: ٤٥-٤٦.) ''مومنو! جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور خدا کو بہت یاد کرو تاکہ مراد حاصل کرو اور خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا اور صبر سے کام لو کہ خدا صبر کرنے والوں کا مددگار ہے۔'' اور ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (النساء: ٥٩) ''مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی۔''

صحابہ کرام کے ہاں جذبہ اطاعت کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کے باوجود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس مشاورت و وزارت کی غرض سے ٹھہرانے کی اجازت لینے کے لئے نوجوان سپہ سالار حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے درخواست کی۔(17)

چونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اسامہ کو سپہ سالار مقرر فرمایا تھا اور ان کی اطاعت واجب تھی، اس لیے خلیفہ بھی اجازت مانگ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جانتے تھے کہ عدم اطاعت کی صورت میں بدامنی اور فتنوں کے دروازے کھلیں گے، اسی لیے آپ ﷺ نے آخر دم تک اطاعت کو بہت زیادہ اہمیت دی اور اس سلسلے میں آپ ﷺ کو بے مثال کامیابی بھی حاصل ہوئی یہاں تک کہ جب حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی نے مسلمانوں کے ایک لشکر کے سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں کو آگ میں

داخل ہونے کا حکم دیا تو ان میں سے بعض عملاً اس میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے تھے، حالانکہ یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا، اسی لیے ان میں سے بعض دیگر حضرات نے کہا: ''ہم نے آگ سے بچنے کے لیے نبی کریم ﷺ کی پیروی اختیار کی، پھر کیا ہم اسی میں داخل ہو جائیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے اس واقعے پر ارشاد فرمایا: ''اگر وہ اس میں داخل ہو جاتے تو پھر ہمیشہ اسی میں رہتے۔ اطاعت صرف نیکی میں ہے۔''(18)

جذبہ اطاعت کے اثرات اس قدر گہرے تھے کہ صحابہ کرام کے سروں پر تلواریں چل رہی ہوتی تھیں، لیکن جب تک سپہ سالار کی طرف سے حکم نہ ملتا اس وقت تک ان میں سے کوئی پیچھے ہٹنے کا سوچتا بھی نہ تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور ہر سپاہی اپنی من مانی کرتا تو مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی، ان کا شیرازہ بکھر جاتا اور ہر معاملہ الٹ ہو جاتا، اسی لیے ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (الأنفال:٤٦) ''اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا اور صبر سے کام لو کہ خدا صبر کرنے والوں کا مددگار ہے۔''

د: عسکری پیغمبر اور جنگی حکمت عملیاں

رسول اللہ ﷺ کسی بھی ماہر جنگ کی طرح ہمیشہ اپنی حکمت عملیاں بدلتے رہتے تھے۔ عموماً ایک حکمت عملی کو دوبارہ نہ اپناتے تھے، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کے دشمنوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ”پلٹنے جھپٹنے، جھپٹ کر پلٹنے“ یعنی حملہ کر کے پیچھے ہٹ جانے اور پھر دشمن کے لیے بالکل غیر متوقع مقام سے حملہ آور ہونے کی حکمت عملی جو آج کل بہت معروف ہے، لیکن اس دور میں اس کا رواج نہ تھا، نے قریش کو پریشان کر رکھا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر میں اپنے دشمنوں کے خلاف یہی حکمت عملی اپنائی، لیکن مشرکین اسے سمجھ نہ سکے، جس کے نتیجے میں جنگجوؤں، گھوڑوں اور اونٹوں کی کثرت کے باوجود ان کے آغاز میں ہی پاؤں اکھڑ گئے، جبکہ دوسری طرف مسلمانوں کے پاس دو تین گھوڑوں، نیزوں اور تیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔(19) کیونکہ وہ مقام بدر جنگ کی نیت سے نہیں آئے تھے، بلکہ کسی اور ارادے سے آئے تھے،(20) لیکن جب دشمنوں کو بالکل غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تو ان میں خوف وہراس پھیل گیا اور تقدیر خداوندی میں طے شدہ اسباب خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی سزا کے طور پر انہیں دھتکارنے و پھٹکارنے لگے۔

ایک اور حکمت عملی ملاحظہ فرمائیے:

محاذِ جنگ پر اجتماعی طور پر نماز ادا کی جاتی تھی، جس سے جہاں مسلمانوں میں دشمنوں کی کم اہمیتی کا احساس اجاگر ہوتا تھا، وہیں ان میں اعتماد اور سکون کا احساس بھی پیدا ہوتا، تاہم کافروں کے لئے اس موقع سے فائدہ اٹھانا بھی ممکن تھا، لیکن اس وقت کافروں کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب قرآن کریم نے محاذِ جنگ پر نماز کی ادائیگی کے بارے میں درج ذیل ہدایات نازل فرمائیں: ﴿وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ (النساء:۱۰۲) ”اور (اے پیغمبر) جب تم ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ مسلح ہو کر کھڑی

رہے۔ جب وہ سجدہ کر چکیں تو پرے ہو جائیں پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی (ان کی جگہ) آئے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کرے۔ کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ کہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔ اگر تم بارش کے سبب تکلیف میں ہو یا بیمار ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو، مگر ہوشیار ضرور رہنا۔ خدا نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

یعنی جب آپ نماز پڑھانے لگیں تو ایک جماعت آپ کے پیچھے نماز کے لیے کھڑی ہو اور دوسری جماعت کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہے اور جب پہلی جماعت ایک رکعت پڑھ لے تو دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہیں تبدیل کر لیں، یعنی پہلی جماعت پہرہ دینے لگے اور دوسری جماعت آ کر رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ لے۔

دور سے مسلمانوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے والے دشمن اس صورت حال پر حیرت زدہ تھے۔ وہ مسلمانوں کو تلواروں، زرہوں اور تیروں سمیت نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے اور جب حملہ کرنے کا ارادہ کرتے تو مسلمانوں کی ایک دوسری جماعت کو اپنے سامنے پاتے اور انہیں نماز کی صف سے پہرے داری کی صف کی طرف اور پہرے داری کی صف سے نماز کی صف کی طرف حرکت کرتے ہوئے دیکھتے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حکم خداوندی سے نماز کے دوران میں بھی جنگی حکمت عملی اپناتے تھے۔(21)

۱- رازداری

ہٹلر نے اپنی عسکری حکمت عملی بیان کرتے ہوئے کہا تھا: ''معاملات میں رازدری کا خیال رکھنے کی حکمت عملی سب سے پہلے میں نے دریافت کی تھی۔'' لیکن یہ بات درست نہیں، کیونکہ رازداری کا اصول سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے وضع فرمایا تھا اور پھر آپ ﷺ سے اسے انسانیت نے سیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جارحانہ اور مدافعانہ دونوں صورتوں میں آپ ﷺ کی حکمت عملی اور اہداف کو کوئی بھی نہیں جان سکتا تھا، کیونکہ آپ ﷺ اپنی مہم کا معتدبہ حصہ سر کرنے کے بعد اپنی سمت کی تصریح فرماتے تھے، چنانچہ جب آپ ﷺ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو آپ ﷺ کے ہدف کا مسلمانوں یا مشرکین میں سے کسی کو بھی واضح طور پر علم نہ تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس وقت ہوا جب آپ ﷺ اور مکہ کے درمیان بہت تھوڑی مسافت رہ گئی اور جب آپ ﷺ نے دس ہزار جگہوں پر دس ہزار مشعلیں روشن کروائیں تو

قریش کے دلوں پر خوف طاری ہو گیا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور مسلمان اس قدر قریب پہنچ چکے تھے کہ اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ (22)

۲- خبر رسانی کا جال

آپ ﷺ نے خبر رسانی کا عدیم النظیر جال بچھایا، جس کے نتیجے میں مرکز تک پل پل کی خبر پہنچتی، جہاں اس کا فوراً تجزیہ کیا جاتا تھا، دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی خبروں کے دشمنوں تک پہنچنے پر تاریخی شواہد موجود نہیں۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ سے غلطی سے اس کا ارتکاب ہوا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی روانگی کی اطلاع دینے کے لیے اہل مکہ کی طرف پیغام بھیجا تھا، لیکن ان کی پیغام رساں خاتون کو رستے میں ہی گرفتار کر لیا گیا۔ بدری صحابی ہونے کے باوجود ان سے یہ غلطی سرزد ہوئی، لیکن چونکہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور پیغام بھی مکہ والوں تک نہ پہنچ سکا، اس لیے ان کا مواخذہ نہیں کیا گیا اور لغزشوں سے پاک شخصیت نے انہیں معاف فرما دیا۔ (23)

رسول اللہ ﷺ نے حسبِ ضرورت خبر رسانی کا جال بچھایا، لیکن کسی کو اپنی خبروں پر مطلع ہونے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں رازداری کا اس قدر اہتمام ہوتا تھا کہ کسی راز کے بارے میں کسی کو کانوں کان کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔ (24) حقیقت یہ ہے کہ یہ حکمت عملی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو سکھائی اور پھر انسانیت نے چودہ صدیاں پیشتر اسے آپ ﷺ سے سیکھا۔ آپ ﷺ اس مقام تک جہاں ایک تیز رفتار اونٹ مسلسل اڑتالیس گھنٹے دوڑ کر پہنچتا تھا، اپنا پیغام اس سے بھی مختصر مدت میں پہنچا سکتے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ مدینے میں تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کا لشکر شام کی سرحد کے قریب تھا۔ یہ مسافت دس دن کے مسلسل سفر سے طے ہوتی تھی، لیکن نبی کریم ﷺ کے پیامبر اسے صرف آٹھ دن میں طے کر لیتے تھے۔ یہ رسول ﷺ کے نظام پیغام رسانی کی فعالیت کی کھلی دلیل ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو عملی جامہ پہنایا کرتے تھے، جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ آپ ﷺ کا پہلا پیامبر اپنے تیز رفتار گھوڑے پر پورے ایک دن کی مسافت طے کرتا اور اس کے بعد وہ پیغام وہاں پر موجود دوسرے پیامبر کے حوالے کر کے خود آرام کرتا۔ دوسرا پیامبر اپنے گھوڑے پر ایک دن کی مسافت طے کرتا اور پھر پیغام تیسرے پیامبر کے حوالے کر دیتا۔ یہ سلسلہ جاری رہتا یہاں تک وہ پیغام تازہ دم پیامبروں اور گھوڑوں کے ذریعے مختصر ترین مدت میں مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتا۔ مکہ اور فیزان کے درمیان اس کے سوا خبر رسانی کا کوئی اور طریقہ ممکن نہ تھا۔

ایسی عظیم فراست کی حامل شخصیت رنگارنگ الواح پر اپنے کمال کا ایسا مظاہرہ کرتی کہ انہیں دیکھ کر اس دور میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کے دل شاد ہو جاتے اور وہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کسی بھی ماہر جنگ کی طرح حسبِ ضرورت صلح کے لیے تیار رہتے تھے۔ اوپر ہم اس موضوع پر اختصار کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الأنفال: ٦١) ''اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسا رکھو۔''

یعنی اسباب اختیار کیجیے، لیکن اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے میں کوتاہی بھی نہ کیجیے، کیونکہ اسباب اختیار کیے بغیر توکل اختیار کرنا سستی، غفلت اور بے حسی کی علامت ہے، جبکہ اسباب اختیار کرنے کے بعد توکل کرنا جہاں تسلیم وانقیاد اور تعلق مع اللہ کی دلیل ہے، وہیں اللہ تعالیٰ کی فطری شریعت اور قوانین فطرت سے ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کی رعایت وادراک کرنے کی علامت بھی ہے۔

۳۔ تبلیغ کے مراحل

تبلیغ کے ایک مرحلے میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو درج ذیل ہدایات ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (النحل: ١٢٥) ''(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ جو اس کے رستے سے بھٹک گیا تمہارا پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں ان سے بھی خوب واقف ہیں۔'' یعنی اللہ تعالیٰ گمراہ اور ہدایت یافتہ لوگوں کو جانتے ہیں۔ آپ اپنی دعوت کی ذمہ داری کو ادا کیجیے اور اس کے سوا کسی اور کام سے غرض نہ رکھیے۔ اس آیت مبارکہ نے آپ ﷺ کے اور آپ کے صحابہ کرام کے دلوں کو ایمانی جذبات سے سرشار کر دیا۔ اس کے بعد دعوت کا ایک اور مرحلہ آیا، جس میں رسول اللہ ﷺ کو اعلانیہ دعوت دینے، حسبِ ضرورت سخت لہجہ اختیار کرنے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب خداوندی سے ڈرانے کا حکم ہوا، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (الشعراء: ٢١٤) ''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو۔'' ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الحجر: ٩٤) ''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو۔'' ''پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو۔''

۵: آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے چند گوشے

جب رسول اللہ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو کفار کی طرف سے دباؤ بڑھ گیا اور حضرت سمیہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما وغیرہ جیسی شخصیات کی شہادتیں رونما ہوئیں۔ان میں سے بعض کو ایذائیں پہنچا کر اور بھوکا رکھ کر شہید کیا گیا تو بعض کے سینے میں نیزے اور تیر اتار کر شہید کیا گیا۔اس کے بعد ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت ہوئی اور پھر وہاں سے واپسی پر مدینہ کی طرف ہجرت ہوئی۔اس سے بھی پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کی وفات کی صورت میں ''عام الحزن'' (سالِ غم) پیش آیا، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ مادی اور ظاہری حیثیت سے بے یارومددگار رہ گئے۔درحقیقت اللہ تعالیٰ ایک ایک کر کے آپ ﷺ کے تمام ظاہری اسباب اور سہارے چھین رہے تھے، تاکہ آپ ﷺ پورے طور پر مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہو جائیں، کیونکہ یہ فطرت کا قانون ہے کہ مقربین کو اس وقت تک مسبب الاسباب کا مکمل دھیان نصیب نہیں ہوتا جب تک تمام اسباب ختم نہ ہو جائیں، لہذا صرف اللہ کی طرف توجہ کے حصول اور فطری میلان اور اضطراری جبر کے ذریعے نورِ توحید کے اسرار جاننے کے لیے تمام اسباب کا خاتمہ ناگزیر تھا، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ کے وجدان میں حضرت یونس علیہ السلام کی طرح احدیت کا راز افشا ہوا، آپ ﷺ سلامتی کے ساحل پر پہنچے، آپ کے لیے کدو کی بیل اُگی اور آپ نے عظیم نورِ خداوندی کا مشاہدہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ سے لے کر آپ کے دو اہم سہارے چھین لیے تھے۔دراصل اللہ تعالیٰ آنے والی نسلوں کو ایک اہم بات بتانے کے لیے آپ ﷺ کے تمام ظاہری اور مادی اسباب کو ختم کر کے آپ کو صرف مسبب الاسباب کی طرف متوجہ کر رہے تھے، گویا اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے فرما رہے تھے: ''آپ کا انتخاب صرف خدا کا نام لینے کے لیے کیا گیا ہے۔کیا آپ دیکھتے نہیں کہ میں نے آپ کے والد کو آپ کی ولادت سے بھی پہلے لے لیا، پھر ولادت کے بعد آپ کی والدہ اور پھر آپ کے دادا کو اپنے پاس بلا لیا۔میں نے آپ کے ہر حامی وناصر کو یکے بعد دیگرے اس لیے چھینا، تاکہ آپ کے حاشیہ خیال میں بھی میرے سوا کوئی نہ آئے۔ہردم میری جستجو میں اور صرف میری طرف متوجہ رہیے اور اس کائنات کے ذرے ذرے میں میری آواز سننے کی کوشش کیجیے۔''

اگر چہ جس راستے پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو چلنے پر مجبور کیا وہ مشکل اور پُر مشقت تھا، لیکن یہ بوجھ رسول مصطفیٰ حضرت محمد ﷺ کے لیے ناقابل برداشت نہ تھا، کیونکہ آپ ﷺ نصرتِ خداوندی سے انتہائی مضبوط اور ناقابل شکست انسان تھے۔ عجز اور فقر آپ ﷺ کے بازو تھے۔

نبی کریم ﷺ کو پیش آنے والے المناک واقعات میں سے جن میں آپ ﷺ کو انکار اور مسترد کیے جانے کا سامنا کرنا پڑا، واقعہ طائف بھی ہے۔ آپ ﷺ اس امید سے طائف گئے تھے کہ شاید وہاں کسی رحم دل انسان سے ملاقات ہو جائے، لیکن آپ ﷺ وہاں سے سرتا پیر لہولہان ہو کر لوٹے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپ ﷺ کی یثرب کے چھ افراد سے ملاقات ہوئی۔ اس سے اگلے سال عقبہ میں بارہ افراد سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ حضرت ابوالہیثم بن تیہان اور ان کے رفقا تھے۔(25) انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی اور مدینے واپس لوٹ گئے۔ آئندہ سال آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے لیے بہتر افراد آئے، جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون نسیبہ مازنیہ تھیں، جن کا ذکر ام عمارہ کے نام سے اسلامی تاریخ میں سنہری حروف میں ملتا ہے۔ دوسری خاتون اسماء بنت عمرو تھیں۔(26)

یہ دونوں عظیم خواتین سفر و حضر میں ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہیں، بلکہ ام عمارہ نے تو ارتداد کی جنگوں میں بھی شرکت کی، چنانچہ انہوں نے جنگ یمامہ میں حصہ لیا اور ہاتھ میں تلوار لے کر غزوہ احد کی طرح اس جنگ میں بھی دادِ شجاعت دی۔ ان کے بیٹے حضرت حبیب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا قاصد بنا کر مسیلمہ کذاب کے پاس بھیجا تھا، جنہیں اس نے شہید کر دیا۔(27) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو مدینے تشریف آوری کی دعوت دی گئی، جہاں آپ ﷺ اپنے لشکر کے سپہ سالار بن گئے۔

آپ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی، بلکہ اگر آپ کسی کو چھری پکڑاتے تو اس کے پھل والا حصہ اپنی طرف اور دستے والا حصہ دوسرے شخص کی طرف کرتے تاکہ کہیں وہ خوف زدہ نہ ہو جائے۔(28) آپ ﷺ اپنے کردار اور معاملات میں اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے عمر بھر کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن اس کے باوجود بعض چمگادڑ صفت لوگوں کو قرآنی تعلیمات اور دعوت کی روشنی کے پھیلنے سے پریشانی لاحق تھی، اس لیے انہوں نے اس روشنی کو پھیلنے سے روکنے کی کوششیں کیں، لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ ”صاحبِ شمشیر“ ان کے سامنے تلوار سونت کر کھڑا ہو جائے اور ان سے کہے: ”او تاریکی کی چمگادڑو! آج کے بعد تم روشنی کو پھیلنے سے

نہیں روک سکتیں۔صرف تم ہی اندھیرے میں رہو گی، اس لئے دن کے اجالے اور روشنی کے شہسواروں کے رستے سے ہٹ جاؤ۔''

اگر چہ آپ ﷺ راہنما اور سپہ سالار تھے، لیکن اس کے باوجود اپنے پیروکاروں سے گھل مل کر رہتے تھے۔آپ ﷺ نے صحابہ کرام میں مواخات قائم فرما کر معاشرتی مسائل کو فوری طور پر حل فرمایا۔آپ نے اہل کتاب کو اپنی صفوں میں شامل کرنے کے لیے ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا اور امن کا دستور تشکیل دیا، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ سب کے ہاں امن پسند اور بااعتماد شخصیت قرار پائے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے لشکر پر توجہ دی۔ابتدا میں آپ ﷺ نے چھوٹے چھوٹے عسکری دستے تشکیل دیئے اور انہیں اطلاعِ احوال کے لیے آس پاس کے علاقوں میں بھیجنا شروع کیا۔جن عسکری دستوں کی تعداد دس افراد سے کم ہوتی تھی، ان کا مقصد معلومات حاصل کر کے رسول اللہ ﷺ تک پہنچانا ہوتا تھا۔

ان کے علاوہ بڑے عسکری دستے بھی تھے، جو تربیت یافتہ اور مسلح ہوتے اور ہر وقت تیار رہتے تھے۔دورِ حاضر میں ہم انہیں ''مزاحمتی دستوں'' (Strike forces) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔یہ دستے جہاں معلومات اور خبریں حاصل کرتے وہیں ضرورت پڑنے پر عملاً جنگ میں حصہ بھی لیتے تھے۔آپ ﷺ نے بنفس نفیس ایسے چار دستوں کی قیادت فرمائی۔ایسے دستوں کے شرکاء کی تعداد بعض اوقات دو سو سے بھی تجاوز ہوتی تھی۔ان کا مقصد دشمن کے دلوں پر رعب اور دبدبہ قائم کرنا ہوتا تھا۔

و: عسکری دستوں کے اہداف و مقاصد

مسلمان ہر قسم کے مقابلے اور جدوجہد کے لیے تیار تھے، بلکہ زیادہ درست الفاظ میں طاقت کے نشے میں چور مشرکین کی وجہ سے مقابلے اور جدوجہد پر مجبور تھے۔ نزولِ وحی کے آغاز کو تیرہ سال بیت چکے تھے اور اب چودھواں سال جاری تھا۔ روشنی سے پریشانی میں مبتلا لوگ اسے مٹانے پر تلے ہوئے تھے اور ہر جگہ قرآنی دعوت کے درپے رہتے۔ وہ کسی بھی مسلمان کو پکڑ لیتے تو اسے فوراً جان سے مار ڈالتے۔ آج جب ہم بلغاریہ، روس اور بھارت کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہیں تو کم از کم ہمیں ایسے لوگ تو ملتے ہیں، جو انہیں برا اور قابلِ مذمت سمجھتے ہیں، لیکن اس دور میں جب مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جاتے تو کوئی انہیں برا اور قابلِ مذمت سمجھتا اور نہ ہی ان کے خلاف آواز اٹھاتا۔ قریش کا ہر طرزِ عمل دوسروں کے لیے قابلِ قبول تھا خواہ وہ ظلم اور بربریت کی بدترین مثال ہی کیوں نہ ہوتا۔ چونکہ قریش سردارانِ مکہ تھے، اس لیے انہیں اپنی من مانی کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ نبی کریم ﷺ نے مطلق العنانیت کے اس بت کو گرانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی اور اس کے لیے عسکری دستے تشکیل دے کر انہیں مختلف اطراف میں روانہ کیا۔ ان عسکری مہمات سے چند مخصوص اہداف کا حصول مقصود تھا، جن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:

۱- اسلامی وجود کا احساس اجاگر کرنا

ایک اہم مقصد اسلامی وجود کا احساس اجاگر کرنا اور یہ بتانا تھا کہ اگرچہ مشرکین نے مسلمانوں کو مکہ سے نکال دیا ہے، لیکن وہ اسلام کی روشنی کو نہیں بجھا سکے: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (الصف:۸) ''یہ چاہتے ہیں کہ خدا (کے چراغ) کی روشنی کو منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں، حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا، خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔'' لہٰذا رسول اللہ ﷺ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس تاریک اور وحشتناک صحراء کے اندھیرے نورِ خداوندی کو ہرگز بجھا نہ سکیں گے۔

۲- حق کی بالادستی کا اظہار

رسول اللہ ﷺ یہ بھی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حکمرانی پر صرف مشرکینِ مکہ اور قریش کی اجارہ داری نہیں ہے، بلکہ اہلِ حق بھی اس میں حصہ دار ہیں، بلکہ عنقریب ایک دن کفر کی طاقت اپنے تمام تر اسلحے

کے باوجود حق کے سامنے سرتسلیم خم کر دے گی۔ اس وقت روئے زمین پر صرف حق کی حکمرانی اور قانون کی بالادستی ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ کو یقین تھا کہ قریش حق پر نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر عارضی طور حق پر غلبہ پا سکتے ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے لیے حق کی طاقت کا مظاہرہ کرنا ناگزیر تھا۔ ان عسکری دستوں کی تشکیل آس پاس کے علاقوں میں اسی طاقت کا اظہار تھا، دوسرے لفظوں میں یہ اس بات کا اعلان تھا کہ انسانی حقوق کو غصب کر کے ان کا استحصال کرنے والے ابوسفیان، ابوجہل، عتبہ، شیبہ، ابن ابی معیط اور ولید وغیرہ جیسے لوگوں کو انسانیت پر حکمرانی کا کوئی حق حاصل نہیں۔

۳- دعوت وارشاد کے لیے ماحول کی سازگاری

ان عسکری دستوں کی ایک اہم ذمہ داری دعوت کے راستے سے رکاوٹیں ہٹانا بھی تھی۔ مختلف مقامات پر عسکری دستوں کی نقل وحرکت سے رسول اللہ ﷺ کو نظم ونسق چلانے، داعی، مبلغ اور مرشد حضرات کو مختلف مقامات پر بھیجنے اور انہیں بلاخوف وخطر شہروں اور دیہاتوں میں پھر کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے پرسکون ماحول میسر کرنے میں مدد ملی۔ رسول اللہ ﷺ ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے مدینے کے گردونواح میں عسکری دستے مسلسل بھیجتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد غزوہ بدر میں دشمن کے ساتھ ٹکراؤ تک بہت سے ''مزاحمتی دستے'' روانہ فرمائے اور چند ہی ماہ میں یہ دستے مدینہ منورہ سے ایک ماہ کی مسافت پر واقع مقامات پر بھی دیکھے جانے لگے۔ بعض اوقات یہ دستے مکہ کے قرب وجوار میں کسی سائے یا فرشتوں کی مانند دکھائی دیتے اور پھر غائب ہو جاتے، لیکن اپنے پیچھے دشمن پر خوف طاری کر جاتے۔ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ دشمن خوفزدہ حالت میں غزوہ بدر میں شریک ہونے پر مجبور ہو گیا۔

۴- قیام امن

اس دور میں صحرائے عرب میں لوٹ مار عام تھی۔ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' والا اصول کارفرما تھا۔ کمزور اور مظلوم جینے کے حق سے محروم تھے۔ طاقتور کمزوروں کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل حکمت عملی وضع فرمائی: ''عسکری دستے دشت وصحرا میں گشت کریں، لیکن کسی بھی شخص کے مال ومتاع اور عزت وآبرو کو گزند نہ

پہنچائیں۔ مسلح دستے گھروں اور مکانوں کے سامنے سے گزریں، لیکن کسی کو نقصان پہنچانے کی بجائے ان کے لیے امن وسکون کی علامت بن جائیں۔'' اس کے بعد سب نے دیکھا کہ صحرائے عرب میں لوٹ مار کے سوا دیگر مظاہر بھی موجود ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے سوا اور کون یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا تھا؟ لہٰذا ہر کسی کو بخوبی معلوم ہو گیا کہ صحرائے عرب پر تنہا مشرکین قریش کی حکمرانی نہیں ہے، بلکہ محمد ﷺ بھی اس میں شراکت دار ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے اجالا پھیلے گا ویسے ویسے آپ ﷺ کی یہ شراکت بڑھتی جائے گی یہاں تک ہر گھر اور دل میں اس کے اثرات پہنچ کر رہیں گے۔

ز: عسکری دستے

۱- پہلا سریہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

اوپر ذکر کردہ اہداف کے حصول کے لیے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف آوری کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک سو افراد پر مشتمل پہلا سریہ تشکیل دیا اور اس کی قیادت اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو سونپی۔ اس دور میں رسول اللہ ﷺ کا خفیہ خبر رسانی کا نظام اس قدر وسیع تھا کہ صحرائے عرب میں کوئی چڑیا بھی اڑتی تو آپ ﷺ کو اس کی خبر ہو جاتی۔

انہی دنوں ایک قافلہ مہاجرین کا بہت سا مال و متاع لے کر مدینے کے قریب سے بزبانِ حال مسلمانوں کو چیلنج کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی۔ اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا، لیکن دشمن اس قدر خوفزدہ ہوا کہ فوراً بھاگ کھڑا ہوا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔[29] دشمن اگرچہ فرار ہو گیا، لیکن اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ ہوا کہ مدینے اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ اہل مکہ کے علاوہ بھی ایک طاقت موجود ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے والوں پر پڑنے والے نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیا جائے۔

اس قسم کی کارروائیوں کے دوران اہل مکہ ہمیشہ راہ فرار اختیار کرتے اور جب لوگ مسلمانوں کو ان کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھتے تو ان پر حیرت واستعجاب اور خوف کی ملی جلی کیفیت طاری ہو جاتی۔ رسول عربی حضرت محمد ﷺ کسی بھی ماہر جنگ سپہ سالار کی طرح اپنے دشمنوں کو بھاگنے پر مجبور کر کے دیکھنے والوں کو متاثر و مسحور کر لیتے، چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوتا گیا، قبائل عرب فوج در فوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے، راستے پرامن ہو گئے اور اسلام کی قوت و شوکت کا اظہار ہونے لگا۔ جب اسلام حق کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے آیا تو اس نے اس حق کی حفاظت کے لیے ضروری طاقت کا مظاہرہ بھی کیا، جس کے نتیجے میں لوگوں کی سوچ کے دھارے بدلے اور وہ ایک نئے انداز سے سوچنے لگے۔

۲- دوسرا سریہ

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ ﷺ نے ایک اور عسکری دستہ تشکیل دیا اور اس کی قیادت حضرت

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ اس عسکری دستے سے بھی کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا، کیونکہ اس کا مقصد ایک مخصوص سطح پر طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا، تاکہ قریش جس کا واحد مذہب طاقت تھا، کو پتا چل جائے کہ اگرچہ بعض اوقات طاقت کے فوائد ظاہر ہوتے ہیں، لیکن طاقت ہر جگہ کام نہیں آتی، نیز اس عسکری دستے کے اہداف میں قریش کی طاقت کا ایسی حق پرستانہ طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی شامل تھا، جو ظلم و جبر، دھوکا دہی اور باطل کی طرف کبھی بھی مائل نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ عدل اور رحمدلی کی پشت پناہی کرتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو کسی بدو کی بکریوں کے دودھ کے استعمال کی ضرورت پیش آتی تو وہ پہلے اس سے اجازت لیتے اور پھر معاوضہ ادا کر کے دودھ استعمال کرتے۔ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل عرب کے بدوؤں کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا، چنانچہ وہ ایسا طرزِ عمل دیکھ کر حیرت سے پوچھتے: ''کیا یہ وہ ملائکہ آسمان سے تو نہیں اتر آئے، جن کے بارے میں حضرت ابرہیم علیہ السلام نے بتایا تھا؟''

۳۔ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کا سریہ

رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حارث بن عبدالمطلب کے بیٹے حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک اور عسکری دستہ تشکیل دیا۔ حضرت عبیدہ بن حارث غزوہ بدر کے اولین شہداء میں سے تھے۔ جب انہیں غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اٹھا کر لایا گیا تو ان کے کٹے ہوئے بازو سے خون بہ رہا تھا، لیکن ابھی ان کی موت واقع نہ ہوئی تھی، تاہم وہ پریشان تھے اور رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا میں شہید نہیں ہوں؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیوں نہیں، تم یقیناً شہید ہو۔''[30] یہ عسکری دستہ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ''بطن رابغ'' نامی مقام تک پہنچا اور دشمن کو خوفزدہ کر کے واپس لوٹ آیا۔[31] یہ قریش اور اس کے قافلوں کے رہبروں کے لیے انتہائی غیر متوقع صورت حال تھی، جس کے اثرات ان پر کافی عرصے تک باقی رہے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ کی بنفس نفیس قیادت

مزاحمتی دستوں کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے دو سو مسلم افراد پر مشتمل ایک عسکری دستہ تشکیل دے کر بنفس نفیس اس کی قیادت فرمائی اور شام کی طرف جانے والے قریش کے قافلے کو خوف وہراس میں مبتلا کرنے کے لیے نکلے۔ آپ ﷺ نے تمام امور کی بڑی گہرائی سے منصوبہ سازی فرمائی اور تمام راستوں پر اس قدر کڑی نگرانی کا بندوبست فرمایا کہ اگر رسول

ﷺ خود قریش کے قافلے کو نہ گزرنے دیتے تو وہ وہاں سے نہ گزر پاتا۔ یہ قریش کے لیے ایک دھمکی تھی، جس سے وہ بہت زیادہ مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کسی کو کوئی گزند پہنچائے بغیر واپس تشریف لے آئے۔[32] پھر رسول اللہ ﷺ نے اسی مقصد کے لئے ایک چھوٹا سا عسکری دستہ تشکیل دیا، جو ''بواط''[33] نامی مقام تک گیا اور دشمنوں کو ہراساں کر کے واپس لوٹ آیا۔[34] آپ ﷺ ''عشیرة'' نامی مقام پر بھی دشمنوں کو اسی قسم کی صورت حال سے دوچار فرما کر مدینہ واپس تشریف لے آئے، تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ صحرائے عرب میں امن وامان کے قیام کا نظام اب آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہے۔[35]

۵- حضرت عبداللہ بن جحش کا عسکری دستہ

آپ ﷺ نے آخری عسکری دستہ اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیار فرمایا۔[36] آپ ﷺ اس قسم کی مہمات کے لیے اپنے قرابت داروں کا انتخاب فرماتے اور خونی رشتے کے ذریعے اسلامی رشتے کو مضبوط بناتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک مسلمانوں نے دشمنوں سے جنگ نہیں کی تھی اور اپنے رشتہ داروں سے جنگ وقتال کرنا صحرائے عرب کے قانون کی سنگین خلاف ورزی تھی۔ اس تناظر میں غزوہ بدر کبریٰ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان عسکری دستوں کی قیادت رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حمزہ، عبیدہ بن حارث، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہم جیسے اپنے قرابت داروں کو سونپی۔ آپ ﷺ نے صحرائے عرب اور بدوی معاشرے کے قانون سے متعارض یہ مشکل اور بھاری ذمہ داری اپنے رشتہ داروں کو قصداً سونپی اور بنفس نفیس تین یا چار عسکری دستوں کی قیادت بھی فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، جنہوں نے بعد میں غزوہ احد میں اپنی بہادری اور دلیری کے جوہر دکھائے۔ ان کی آنکھوں کی بصارت کمزور تھی اور انہیں دھندلکے سے سائے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، جس کے باعث وہ اپنی کم نظری کی اکثر شکایت کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ کسی غزوے سے پیچھے نہ رہے۔ غزوہ بدر میں انہوں نے دادِ شجاعت دی اور جب غزوہ احد میں انہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں شکست کے آثار دیکھے تو ان سے رہا نہ گیا اور پوری شدت سے لڑنا شروع کر دیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جحش نے غزوہ احد کے دن مجھ سے کہا: ''آیئے! اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔'' چنانچہ دونوں ایک

طرف چلے گئے اور حضرت سعد نے درج ذیل دعا مانگی: ''اے اللہ! کل جب دشمن سے میرا سامنا ہو تو میرے مقابلے میں خوب بہادر اور غضبناک قسم کا آدمی لائیے، جسے میں تیری راہ میں قتل کرکے اس کا سامان لے لوں۔'' حضرت عبداللہ بن جحش نے اس پر آمین کہی اور پھر درج ذیل دعا مانگی: ''اے اللہ! کل میرا مقابلہ خوب بہادر اور غضبناک قسم کے آدمی سے کرائیے، جس سے میں تیری راہ میں لڑوں اور وہ مجھ سے لڑے، پھر وہ مجھے قتل کرکے میرے ناک، کان کاٹ ڈالے اور جب میں آپ سے ملوں اور آپ مجھ سے پوچھیں: ''اے عبداللہ! تمہارے ناک، کان کیوں کاٹے گئے؟'' تو میں عرض کروں: ''آپ کے اور آپ کے رسول ﷺ کی راہ میں کاٹے گئے۔'' اس پر آپ فرمائیں: ''تم نے سچ کہا۔'' حضرت سعد فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ کی دعا میری دعا سے بہتر تھی۔ میں نے اس دن کے اختتام پر ان کے ناک کان ایک دھاگے میں پروئے ہوئے دیکھے۔ (37)

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے بارہ افراد پر مشتمل عسکری دستے کا امیر بنا کر مدینہ منورہ سے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر مکہ کے قریب واقع مقام نخل کی طرف روانہ فرمایا۔ اس عسکری دستے کے ذمے مطلوبہ مقام تک جا کر اہل مکہ کے حالات کی خبر لے کر واپس لوٹ آنا تھا۔ چونکہ اس قسم کی مہمات کو سرانجام دینا زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر ممکن نہ تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی فراست سے اس عسکری دستے کی قیادت کے لئے موت سے بے خوف اور زندگی کو حقیر سمجھنے والے انسان حضرت عبداللہ بن جحش کا انتخاب فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک خط میں اس عسکری دستے کی ذمہ داری سے متعلق احکامات لکھ کر ان کے حوالے کیے اور ہدایت کی کہ اس خط کو صرف مطلوبہ مقام پر پہنچ کر پڑھا جائے، نیز آپ ﷺ نے اس کی بھی تاکید فرمائی کہ کسی کو اس دستے میں شرکت پر مجبور نہ کیا جائے، بلکہ تمام شرکا خوش دلی سے شرکت کرنے والے ہوں، چنانچہ اس دستے کے شرکا میں سے ایک نے شرکت سے معذرت کر لی، لیکن باقی حضرات نے ہدایات پر عملدرآمد کرتے ہوئے سفر جاری رکھا یہاں تک کہ مقام نخل تک پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا خط مبارک کھول کر پڑھا اور اس میں درج ہدایات پر عملدرآمد کیا، لیکن وہاں ایک غیر متوقع حادثہ پیش آ گیا، جس کے نتیجے میں ایک مشرک ہلاک ہو گیا اور مسلمانوں نے فرار ہونے والوں کے سامان پر قبضہ کرکے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ واقعہ اتفاقی طور پیش آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ کا حکم نہیں دیا تھا، تاہم اہل مکہ نے اس واقعے سے فائدہ اٹھایا اور مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے کہا: ''محمد اور اس کے ساتھیوں نے ''حرمت والے مہینے'' کی

حرمت کو پامال کیا، اس میں خون بہایا، مال لوٹا اور انسانوں کو قیدی بنایا۔" جب انہوں نے بہت ہی واویلا کیا تو درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرة: ٢١٧) [38] "(اے محمد) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہل مسجد کو اس سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) خدا کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔"

ح: عسکری مہمات کے نتائج

۱- سیادت کا قیام

جیسے ہی رسول اللہ ﷺ کو مدینے میں استحکام نصیب ہوا آپ ﷺ نے سریع الحرکت عسکری مہمات تشکیل دینا شروع کردیں، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ کے دشمن دیوار سے لگ گئے، ان میں خوف وہراس پھیل گیا، ان کا معاشی نظام خطرے میں پڑ گیا، وہ مالی بحران کا شکار ہو گئے اور حالات انہیں غزوہ بدر کبریٰ کی طرف دھکیل کر لے آئے۔ آپ ﷺ نے اس دوران خفیہ خبر رسانی کا اتنا وسیع جال بچھایا کہ قریش کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھریلو حالات سے بھی باخبر ہیں۔ ہر محفل میں یہ بات موضوع بحث بنی رہتی کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خفیہ خبر رسانی کی خدمات کون سرانجام دے رہا ہے؟ آپ ﷺ اپنے دشمنوں کے تمام حالات سے باخبر رہتے اور یہ بات ان کے لیے گہری تشویش کا باعث تھی۔

جب ہم عسکری خدمات سرانجام دے رہے تھے اس وقت ہمیں بتایا جاتا تھا کہ جنگ ''خفیہ پیغام رسانی'' کا نام ہے۔ اگر آپ کے پاس خفیہ پیغام رسانی کا اچھا ادارہ اور مواصلات کا عمدہ نظام ہے تو گویا آپ نے آدھی جنگ جیت لی، بشرطیکہ آپ کی خبریں دشمن تک نہ پہنچیں، دشمن کی خبریں مسلسل آپ تک پہنچتی رہیں اور آپ انہیں اپنی مرکزی قیادت کے علم میں وقتاً فوقتاً لاتے رہیں۔ اگرچہ دورِ حاضر میں ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کرلی ہے، لیکن اس کے باوجود دشمن کو علم ہوئے بغیر اس کی خبروں تک رسائی بہت مشکل ہوتی ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس غیر ترقی یافتہ دور میں خفیہ پیغام رسانی کا عمدہ جال بچھایا، جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ تک باعتبار ذرائع سے انتہائی سرعت کے ساتھ پل پل کی خبر پہنچتی تھی۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس انتہائی بلند مرتبہ اور امانت دار سید الملائکہ کی وساطت سے انتہائی باعتبار طریقے سے وحی پہنچتی تھی اسی طرح آپ ﷺ کے خفیہ پیغام رسانی کے نظام کے ذریعے آپ تک انتہائی قابل اعتبار اور درست معلومات پہنچتیں۔ پیغام رسانی کا یہ سلسلہ ہمیشہ برقرار رہتا۔ دشمن کی پل پل کی خبر آپ ﷺ تک پہنچتی، لیکن آپ ﷺ کی کوئی خبر دشمن تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

قیصر (Cesar)، ہنبل (Hannibal)، نپولین (Nepolin) اور ہٹلر (Hitler) جیسے بعض راہنماؤں کو اہل مغرب انتہائی بافراست اور عبقری راہنما تسلیم کرتے ہیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے خفیہ پیغام رسانی کے نظام جیسا نظام وضع کرسکا اور نہ ہی

آپ ﷺ کی طرح اپنے دشمنوں کی نگرانی کرسکا۔ رسول اللہ ﷺ کی خبر آپ ﷺ کے دشمن تک پہنچنے پر ایک بھی تاریخی شاہد موجود نہیں، ورنہ مٹھی بھر اہل ایمان کفار وفجار پر کیسے غالب آسکتے تھے؟ اللہ تعالیٰ کی مدد وتوفیق اسی قدر انسان کے شاملِ حال ہوتی ہے، جس قدر وہ اسباب وتدابیر اختیار کرتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے نمونہ اور اسوۂ حسنہ تھے، اس لیے آپ ﷺ اسباب اختیار فرماتے تھے۔

ہم دنیا کی جنگوں میں دیکھتے ہیں کہ کسی ملک کی بندرگاہوں اور تجارت کو خطرے میں ڈالنے اور اس پر معاشی پابندیاں عائد کرنے سے اس کے شہریوں کی زندگی اجیرن اور مستقبل مخدوش ہو جاتا ہے اور اس حکمت عملی کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے خون کے پیاسے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے جا رہے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ پہلے ان کی نقل وحرکت کو مفلوج کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ سریع الحرکت عسکری دستے بھیج کر اپنے دشمنوں کی نقل وحرکت کو مفلوج کرنا چاہتے تھے۔ اہل مکہ کے لیے حالات پرامن نہ رہے اور صحرائے عرب کے دیہاتی اور بدو محسوس کرنے لگے کہ اب اہل مکہ ہماری حفاظت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، بلکہ ہماری قسمت دوسرے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، اس لیے ہمیں انہی کے قریب ہونا چاہیے۔ وہ اس انداز سے سوچنے لگے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر فوج در فوج قبولِ اسلام کا اعلان کرنے لگے۔

اگرچہ اہل مکہ کے قافلوں کو کبھی نقصان نہ پہنچا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ خطرے میں رہتے، البتہ مقام نخل پر پیش آنے والا واقعہ اس سے مستثنیٰ ہے، جس میں ایک بیچارہ شخص کسی مسلمان کا تیر لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

۲- امن کا فروغ

رسول اللہ ﷺ عسکری دستوں کو بھیج کر اپنے تمام اہداف حاصل کرنے لگے۔ صحرائے عرب میں ایک نئی قوت ظاہر ہو کر اپنا وجود تسلیم کروا چکی تھی اور اب ظالم قریش کے سامنے محمد ﷺ اور ان کے صحابہ موجود تھے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ اپنی طاقت کا اظہار فرما کر چوروں اور لٹیروں کو بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن آپ ﷺ نے کبھی بھی ظلم کا ارتکاب نہ کیا، جبکہ آپ ﷺ کی مدمقابل قوت ظلم وزیادتی کرنے میں اپنی مثال آپ تھی۔ وہ لوگ شب خون مارتے اور کمزوروں کی آہوں اور سسکیوں کی پروا کیے بغیر قتل وغارت گری کرتے۔

یہ ایک دوسری قسم کی قوت تھی، جس کا نزول آسمان سے ہوا تھا۔ یہ طاقت ہونے کے باوجود حق

وانصاف کی حدود کی پاسداری اور حقوق کا احترام کرتی تھی۔حق بات اور حقوق کی اس قدر رعایت و احترام تاریخ میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آرہی تھی اور یہ سب کچھ حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں سرانجام پارہا تھا۔دوسرے لوگ اپنے مفادات کی خاطر آئے روز نئے نئے قوانین بناتے اورانہیں حقوق کے ضامن کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرتے،جبکہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین اورحقوق کی عظمت کے قائل تھے اوران کا احترام فرماتے۔آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی حرام یا ممنوع چیز کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔یہ منظر صحرائے عرب کے ہر باشندے نے دیکھا۔مسلمانوں کے مسلح دستے جھونپڑیوں کے سامنے سے گزرتے،لیکن وہ کسی عورت یالڑکی کو چھیڑتے،کسی کا مال چھینتے اور نہ ہی کسی پرظلم کرتے۔رسول اللہ ﷺ لوگوں کو یہی منظر دکھانا چاہتے تھے،جس کی بدولت آہستہ آہستہ لوگوں کا اعتماد مکہ سے مدینے کی طرف منتقل ہونے لگا،کیونکہ ''امین'' وہاں موجود تھا۔اہل مکہ نے ''امین'' کی قدر نہ پہچانی۔وہ ''امین'' جسے ہم "محمد رسول اللہ ﷺ الصادق الوعد الأمین" کے لقب سے پکارتے ہیں۔اب وہ مدینے میں جلوہ افروز تھا اورامن وامان کے قیام کا نظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔دیہاتی،اعرابی اور عرب قبائل بھی یہی سوچ رہے تھے اوران کا رخ مدینے کی طرف ہوتا جارہا تھا،جبکہ قریش اپنا وہ بھروسا اوراعتماد کھوچکے تھے،جو پہلے کبھی انہیں حاصل تھا۔وہ نہ صرف دوسروں کوامن واعتماد فراہم کرنے سے عاجز تھے،بلکہ ہروقت خطرے میں گھرے ہوئے اپنے قافلوں کی حفاظت میں بھی ناکام تھے،جس کے نتیجے میں مشرکین کی صفیں مسلسل انتشار کا شکار تھیں اوروہ جب بھی یہ صورتحال دیکھتے توغم وغصے سے ان کا بُرا حال ہوجاتا۔

۳- معاملات پر تیزی سے گرفت

دشمن کے گرد گھیرا تنگ کر کے اسے بھڑکانا اوروقت سے پہلے حرکت میں آنے پر مجبور کرنا بڑی اہم جنگی حکمت عملی ہے۔میں آپ کو ایک تازہ واقعہ بتاتا ہوں۔لوگ اکثر اوقات مجھ سے پوچھتے ہیں:''ترکستان،ازبکستان،جارجیا،داغستان اورقرم میں متعدد تحریکیں کام کررہی ہیں۔کیا یہ وہی بابرکت دور ہے،جس کے قیامت سے کچھ عرصہ پہلے آنے کی انبیائے کرام اوراولیائے عظام نے پیش گوئی کی تھی؟ کیا اس بابرکت دور کا آغاز ہوچکا ہے؟اورکیا غلام اقوام اپنی آزادی اور جائز حقوق کو حاصل کرسکتی ہیں؟'' یہ درست ہے کہ اس دور کا آغاز ہوچکا ہے،لیکن ہمارے دشمن ان واقعات کو مخصوص رنگ دے کر عالمی منظرنامے پراپنے مفاد کے لیے پیش کرتے ہیں۔بلاشبہ ہمارے دشمن ہمارے دینی

اور قومی بھائیوں کے ملکوں میں ایسی تحریکوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ ہماری حیثیت وہاں ایسی ہی ہے، جیسے چوزے کی انڈے میں یا انڈے کی مرغی کے نیچے ہوتی ہے۔ ہمارے دشمن ہمارے درمیان موجود مٹھی بھر شر پسند اور اوباش قسم کے لوگوں کے جذبات بھڑکا کر انہیں شاہراہوں پر مظاہرے کرنے پر اکساتے ہیں اور پھر ہمیں کچلنے کے لیے مسلح افواج کے ساتھ ہم پر چڑھ دوڑتے ہیں، جبکہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے بعض لوگ جارجیا سے بلغاریہ گئے اور وہاں شومن اور صوفیا نامی شہروں میں منظر عام پر آ کر علی الاعلان دعوت دینے لگے: ''ہم نے روس میں بغاوت کر کے اپنے بعض حقوق زبردستی حاصل کر لیے ہیں۔ لہٰذا تم بھی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے بغاوت کرو۔'' یہ انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ یہ ہمیں تباہ و برباد کرنے کے لیے ہمیں مخصوص سمت کی طرف دھکیلنے کی کوشش ہے، لیکن انہیں نہیں پتا کہ انجام کار کامیابی اہل تقوی کا مقدر ہے۔: ''حق ہمیشہ غالب آتا ہے، کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔'' ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ دشمنوں کی سازشوں کو انہی کے گلے میں ڈال دے۔[39] ﴿وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾ (فاطر:٤٣) ''اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے ہی پر پڑتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اپنی نقل و حرکت کے ذریعے کفار کے جذبات کو برانگیختہ کرنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے قافلے اور معاشی نظام خطرے میں ہیں اور صحرائے عرب آہستہ آہستہ محمد (ﷺ) کی قلمرو میں داخل ہوتا جا رہا ہے، اس لیے ہمیں اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لینے چاہئیں۔ یہ باتیں ابوجہل کہتا تھا اور جب بدر کے موقع پر بعض کفار نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس وقت بھی اسی نے ان سے کہا تھا: ''بخدا! ہم بدر تک پہنچے بغیر واپس نہ جائیں گے۔ (''بدر'' عرب کا ایک تہواری مقام تھا، جہاں ہر سال میلہ لگتا تھا) ہم وہاں تین دن ٹھہریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، کھانا کھائیں گے، شراب پئیں گے، باندیوں سے گانے سنیں گے اور سارا عرب ہماری نقل و حرکت اور اکٹھ کے چرچے سنے گا، جس کے نتیجے میں ان پر ہمارا رعب و دبدبہ ہمیشہ قائم رہے گا، لہٰذا اب چل پڑو۔''[40]

رسول اللہ ﷺ کا یہی ہدف تھا، جس کی قرآن کریم نے آپ ﷺ کو تعلیم دی تھی: ﴿وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ (الأنفال:٤٤) ''اور اس وقت جب تم ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو

کافروں کو تمہاری نظروں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا اور تم کو ان کی نگاہوں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا تاکہ خدا کو جو کام کرنا منظور تھا اسے کر ڈالے اور سب کاموں کا رجوع خدا ہی کی طرف ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظروں میں مشرکین کی تعداد اور مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی دکھائی، تاکہ اللہ تعالیٰ پہلے سے طے شدہ معاملے کا فیصلہ فرمائیں اور انہیں ایک ایسے معرکے کی طرف لے جائیں، جس کا انہوں نے پہلے سوچا بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ایک فیصلہ فرما چکے تھے، جس پر عملدرآمد ناگزیر تھا، یعنی انجام طے تھا، جس سے فرار ممکن نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ دشمنانِ اسلام کو اسی انجام کی طرف لے جا رہے تھے، جس کے نتیجے میں وہ غیر متوقع طور پر اپنے آپ کو بدر کبریٰ کے مقام پر مسلمانوں کے مدمقابل پانے والے تھے، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملی سے ناواقف تھے۔ آپ ﷺ کو انہوں نے اپنے شہر سے نکال دیا تھا، لیکن اب وہ آپ ﷺ کے سامنے کھڑے خوف سے کانپ رہے تھے۔ آپ ﷺ پہلے سال سے ہی حق کی سربلندی، اپنے حقوق کی کفار سے واپسی اور کفار کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے عسکری دستوں کو تشکیل دے رہے تھے۔ کفار کو آپ ﷺ کی جنگی اور عسکری صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہ تھا، لیکن چند ہی لمحوں بعد انہیں صحیح صورتحال معلوم ہونے والی تھی، اگرچہ اس وقت اس علم نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچانا تھا۔ ان کا سامنا ایک ایسے سپہ سالار اور اس کی جنگی حکمت عملی سے تھا، جس کے بارے میں ان کے اندازے غلط تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس مقابلے میں خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ گئے۔

۴- غزوہ بدر کے لیے حالات کی سازگاری

آج معرکہ بدر کبریٰ برپا ہونے والا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کسی عام انسان یا سپہ سالار کی طرح مقام بدر تک نہیں پہنچے، کیونکہ آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں، یہاں آتے ہوئے آپ ﷺ جانتے تھے کہ وہ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے اور ان سے لڑنے جا رہے ہیں۔ مقام بدر کی طرف آنے سے پہلے آپ ﷺ نے متعدد عسکری دستے تشکیل دیئے جنہوں نے اپنی نقل وحرکت اور جنگی مشقوں کے ذریعے دشمن کو خوفزدہ کرنے، ہر جگہ ان کے حوصلوں کو پست کرنے اور انہیں اپنی قوت وطاقت کے بارے میں اس قدر شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے میں اہم کردار ادا کیا کہ لوگ کہنے لگے: ''اب مکہ اور اس کے گردونواح پرامن نہیں رہے۔'' اسی طرح اہل عرب کی عمومی رائے بھی آپ ﷺ کے حق میں بن گئی۔ امن کی صورتحال عملی طور پر ''امین'' کے ہاتھ میں چلی گئی اور سب اسے

تسلیم کرنے لگے۔ لوگ زمانۂ جاہلیت میں بھی آپ ﷺ کو ''محمد الامین'' کے لقب سے پکارتے اور آپ کو امانت داری کا ''منفرد نمائندہ'' سمجھتے۔ آپ ﷺ زمین و آسمان دونوں جگہ ''امین'' تھے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے تحدیث بالنعمت کے طور پر فرمایا تھا: ''کیا تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتے حالانکہ میں آسمان والوں کی نظر میں بھی ''امین'' ہوں۔''(41)

بادیہ نشینوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی تھی کہ امین کون ہے؟ اور امن کہاں قائم ہے؟ ''امین'' مدینے میں جلوہ افروز تھا اور اسی کی طرف قیادت منتقل ہو رہی تھی، یعنی مدینے میں جلوہ افروز اس قریشی سردار کی طرف جو نہ صرف قریش و بنوہاشم کا سردار تھا، بلکہ پوری انسانیت و کائنات کا تاج دار تھا۔ ساری کائنات اس کی خاطر وجود میں آئی اور اس کے بارے میں کہا گیا: ''اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔''(42) اگرچہ علم حدیث کی رُو سے یہ حدیث صحیح نہیں ہے، لیکن اس کے مفہوم کے نفس الامر کے مطابق ہونے میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ اگر آپ ﷺ کی ذات گرامی نہ ہوتی تو کائنات اپنی معنویت کھو بیٹھتی اور اشیاء کی حقیقتیں مخفی رہتیں، دنیا کی حقیقت معلوم ہوسکتی اور نہ ہی آخرت کی، دل کی معنویت ظاہر ہوتی اور نہ ہی انسان کی۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو دنیا ایک ماتم کدہ بن جاتی۔ ہر مرنے والا ہمیں غمگین کر جاتا اور ہر المناک حادثہ ہمارے دلوں کو تکلیف میں مبتلا کر دیتا۔ تاریکیوں سے نکل کر بُقعۂ نور میں آنا ہم نے آپ ﷺ سے ہی سیکھا ہے۔ اگر اس دنیا کو اس کے ذاتی پہلوؤں سے دیکھا جائے تو یہ جہنم کا حصہ دکھائی دیتی ہے، لیکن آپ ﷺ کی برکت سے یہ ہمارے لیے جنت بن گئی ہے۔ آپ ﷺ کے پُرنور ارشادات سے ہمیں معلوم ہوا کہ ایمان کی بدولت یہ دنیا جنت بن جاتی ہے اور ہر مؤمن کے دل میں جنت کا تخم موجود ہے، جو اس کی دنیوی زندگی کو جنت کی زندگی کی طرح خوشگوار بنا دیتا ہے۔ آپ ﷺ سے یہ باتیں سیکھ کر ہمیں اطمینان و سکون نصیب ہوا اور ہمیں پتا چلا کہ دل کا سکون اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (الرعد:۲۸) ''اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔''

خوشی مادی خوشحالی اور مالی فراوانی سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی گھروں اور عمارتوں کے حصول سے ملتی ہے، بلکہ یہ ایمان، دلی سعادت اور انسانی اقدار کی پاسداری سے نصیب ہوتی ہے، یعنی جب دل کی کشتی اطمینان کے ساحل پر پہنچ جاتی ہے اور خواہشات کم اور مطالبات ختم ہو جاتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر کسی انسان کو پوری دنیا بھی مل جائے تب بھی اس کی تمنائیں ختم ہوں گی اور نہ ہی اس کی خواہشات کی تسکین ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان باتوں کی تعلیم دی ہے، چنانچہ مشہور شاعر محمد

عاکف کہتے ہیں:

''معاشرہ اور فرد سب اس کے مرہونِ منت ہیں۔
بلکہ ساری انسانیت اس کے زیرِ بارِ احسان ہے۔
اے پروردگار! قیامت کے دن اسی گواہی پر ہمیں اٹھانا۔''

آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے دل جنت کے شوق سے اس قدر لبریز تھے، گویا وہ جنت کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ انہوں نے پوری تیاری کر رکھی تھے اور مقام بدر پر پوری رضامندی اور سکون کی کیفیت میں پہنچے تھے۔ دل آپ ﷺ کی طرف متوجہ اور آپ پر وارفتہ تھے۔ انسانیت نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی صورت میں اپنی متاعِ گم گشتہ پالی تھی۔ ''امین'' کے دور کا آغاز ہو چکا تھا اور وہ دن آنے والا تھا جب آپ ﷺ نے عدی بن حاتم سے فرمانا تھا: ''اے عدی! کیا تم نے حیرہ شہر دیکھا ہے؟'' اس کے جواب میں عدی نے کہنا تھا: ''دیکھا تو نہیں، لیکن مجھے اس کے بارے میں معلومات ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمانا تھا: ''اگر تمہاری زندگی نے وفا کی تو تم دیکھو گے کہ ایک پردہ نشین خاتون حیرہ سے چل کر کعبے کا طواف کرے گی اور اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔''(43)

جس دور کی طرف آپ ﷺ نے اپنی گفتگو میں اوپر اشارہ فرمایا ہے، اس کا آغاز عملاً اسی وقت سے ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ کے عسکری دستوں نے اس کی راہ ہموار کر کے معرکہ بدر کے لیے فضا سازگار بنائی۔

اگرچہ یہ عسکری دستے شعلۂ برق کی مانند مختلف مقامات پر ظاہر ہو کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے، لیکن ان کی وجہ سے کسی کو کوئی ایذا پہنچتی اور نہ ہی کسی کا امن وسکون برباد ہوتا، بلکہ وہ جہاں بھی جاتے اطمینان وسکون کی فصل بوتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوٹ مار کرنے والے لوگ نہ تھے، بلکہ محمد ﷺ کے امانت دار سپاہی تھے۔ وہ امن وامان کے قیام کے علمبردار اور لوٹ مار مچانے والوں، شقاوت اور بدمعاشوں کے دشمن تھے۔ وہ اپنے پیچھے صرف اطمینان وسکون کے آثار چھوڑ کر جاتے، جس کی وجہ سے ہر کوئی پوچھتا: ''اس رحمت کا نزول کہاں سے ہوا ہے؟'' یہ رحمت رحمت للعالمین محمد ﷺ کے ابرِ کرم سے برس رہی تھی۔ یہ عسکری دستے اس کی برق وچمک تھے اور اس سے پھوٹنے والی روشنی سے آپ ﷺ کا نامِ گرامی لکھا جا رہا تھا۔

دوسری فصل:

نبی اکرم ﷺ اور غزوات

الف: غزوۂ بدر اور اس کے اسباب

اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کردہ حالات کے تحت اسلامی لشکر مقام بدر پر پہنچ چکا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ اور پرخلوص دعوت کے راستے میں رکاوٹ بننے والوں کے سروں پر فیصلہ کن ضرب لگائی جائے اور دشمنانِ اسلام سے کہا جائے: "آج کے بعد تم روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے کسی کو روک سکو گے اور نہ ہی خدائی دعوت کو قبول کرنے والوں پر دباؤ ڈال سکو گے۔" اللہ تعالیٰ کی دعوت کو کسی خاص علاقے میں محدود کرنا درست نہیں، بلکہ اسے ہر انسان کے سینے تک پہنچنا چاہیے، تاکہ ساری انسانیت کے دلوں کو سکون نصیب ہو۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے راستے سے تمام رکاوٹیں ہٹا دینی چاہئیں، تاکہ خدا کی بات محبوس نہ رہے، بلکہ ساری انسانیت تک پہنچ کر اس کے لیے اصولِ زندگی بن جائے۔ آزادئ فکر کے راستوں کو کھولنے اور ان میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کے لیے ان مشرکین مکہ پر فیصلہ کن ضرب لگانا ناگزیر تھا، جنھوں نے آپ ﷺ کے لیے مکہ میں باعزت زندگی گزارنے کے حق کو تسلیم نہیں کیا۔

مسلمان اپنے مال و متاع سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین مکہ سے ہجرت کرتے وقت اپنے ساتھ بہت کم چیزیں لا سکے تھے اور باقی سارا مال و متاع مکہ میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ اہل مکہ یہ مال و متاع اونٹوں پر لاد کر شام اور یمن میں فروخت کرنے کے لیے مسلمانوں کے سامنے سے گزرتے تھے۔ مدینے کے قریب سے گزرنے والے قافلے میں مسلمانوں کا مال و متاع تھا، جسے واپس لینا ضروری تھا۔

نیز بعض ایسے لوگوں کی سرزنش بھی ضروری تھی، جنھوں نے مسلمانوں کو ان کے وطن اور گھر بار سے بے دخل کیا، انھیں ڈرایا دھمکایا اور ایذائیں پہنچا پہنچا کر ان پر دائرہ زندگی تنگ کر دیا تھا۔ بعض کفار برچھیوں سے مسلمانوں کے سینوں کو چیر کر انھیں جان سے مار ڈالتے۔ چونکہ ایسے لوگوں کو سزا دے کر لگام دینا اور ان کے دلوں میں رعب ڈالنا ضروری تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کے لیے ان پر آخری ضرب لگاتے ہوئے یہ کہنا ناگزیر تھا: "طاقت تمھارے پاس نہیں، بلکہ حق والوں کے پاس

ہے۔ اللہ تعالیٰ حق کی راہ میں چلنے والوں کو قوت عطا فرماتے ہیں۔ آج نہیں تو کل قوت اہل حق کے ہاتھ میں آکر رہے گی۔ ایک دن آئے گا جب حق کا بول بالا ہوگا، دلوں پر اس کی حکمرانی قائم ہوگی اور انسان اور اس کے ذریعے سے حاصل ہونے والی عظیم حقیقت کے احترام کا اظہار ہوگا۔" رسول اللہ ﷺ انہی مقاصد کے حصول کی خاطر جنگ فرما رہے تھے۔

بعض قبائل اور قوموں کے افراد تذبذب کا شکار تھے، جس کی وجہ سے وہ مشرکین کے ساتھ تھے اور نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ۔ بعض لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہونا چاہتے تھے، لیکن قریش کے ظلم وستم کے خوف سے متردد و متذبذب تھے۔ آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھانا چاہتے تھے، لیکن اس کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ قوت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں آگئی ہے اور طاقت کا پلڑا مدینے کی طرف جھک گیا ہے تو ان کے لئے اطمینان وسکون کے ساتھ یہ قدم اٹھانا ممکن ہو گیا، گویا رسول اللہ ﷺ ان سے فرما رہے تھے: "اندیشہ کرو اور نہ ہی غمزدہ ہو۔ اگر تم مؤمن ہوئے تو اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کشادگی اور راستے پیدا فرمائیں گے اور دروازے کھول دیں گے، تاکہ تم سعادت اور اطمینان وسکون پا سکو۔" لیکن وہ اس بارے میں متردد تھے اور غزوہ بدر کبریٰ کے اختتام پر انہیں اس کا یقین ہوا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ طاقت کا توازن بدل گیا ہے اور کفارِ مکہ کے لیے انہیں ایذا پہنچانا ممکن نہیں رہا تو وہ مدینے میں جلوہ افروز عظیم ہستی محمد ﷺ اور پیغام حق "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی طرف لپکے۔

۱- غزوۂ بدر میں طاقت کا تناسب

سیرت ومغازی کی کتابوں میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ۳۰۵ پیروکاروں کے ہمراہ غزوہ بدر کے لیے نکلے۔ بعض کتابوں میں ۳۱۳ شرکا کا ذکر ہے۔[44] بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہمراہ جالوت کے خلاف لڑنے والے لشکر کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ انسانی قدر اور تاریخ انہی دو ادوار میں تبدیل ہوئی ہے، جن میں نورانی لشکروں کا ظلماتی لشکروں سے ٹکراؤ ہوا۔ یہ دونوں لشکر حضرات اسحاق واسماعیل علیہما السلام کی اولاد کے ممتاز ترین افراد اور خدا کو ایک ماننے والی ملت حنیفیہ کے ۳۱۳ نمائندوں پر مشتمل تھے، چنانچہ محی الدین ابن عربی "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں کہ ایک لشکر کی قیادت خلافت کے نمائندے حضرت داؤد علیہ السلام فرما رہے تھے اور دوسرے لشکر کی قیادت شفاعت عظمیٰ اور مقام فردیت کے یکتائے زمانہ نمائندے حضرت محمد ﷺ کے پاس تھی۔

غزوہ بدر میں مسلمانوں کے پاس دو گھوڑے اور تیس سے چالیس اونٹ تھے۔ مسلمانوں کی اس بے سروسامانی کے مقابلے میں مشرکین کے پاس دو سو گھوڑے تھے، گویا مسلمانوں کے ایک گھوڑے اور شہسوار کے مقابلے میں مشرکین کے پاس سو گھوڑے اور شہسوار تھے۔ اسی طرح ۳۱۰ مسلمان مجاہدین کے مقابلے میں تقریباً ایک ہزار مشرک جنگجو تھے، گویا ہر مسلمان کا تین سے چار مشرکین سے مقابلہ تھا۔ قریش کا لشکر اس زمانے کی ضروریات کے مطابق کیل کانٹے سے لیس تھا، جبکہ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا لشکر دو سو کلو میٹر کی مسافت طے کرنے کے لیے چند ایک اونٹوں پر باری باری سواری کرنے پر مجبور تھا۔ یہ انتہائی مفید معلومات ہیں۔ گرمی کا مہینہ تھا، صحرائے عرب کی چلچلاتی دھوپ میں مسلمانوں نے رمضان کا مہینہ ہونے کی وجہ سے دو سو کلو میٹر کا فاصلہ روزے کی حالت میں طے کرنا تھا۔ کیا آپ کو اس صحراء اور مقام بدر کا علم ہے؟ جن لوگوں کو حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ اس بارے میں کسی حد تک جانتے ہوں گے۔ اب تو راستے میں پٹرول پمپ موجود ہیں۔ اگر آپ اس علاقے اور راستے کا پٹرول پمپوں اور دورِ حاضر چھوٹے چھوٹے نخلستانوں کے بغیر تصور کریں تو آپ کے سامنے تا حدِ نگاہ ریگستان ہی ریگستان ہوگا اور آپ کو اس میں چلنے والی خوفناک آندھیوں کی سرسراہٹ سنائی دے گی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مسلمان قریش کے قافلے کو ہراساں کرنے کے لیے نکلے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ اس بارے میں فرماتے ہیں۔ ﴿وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللّٰهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۞ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ﴾ (الأنفال: ۷-۸) ''اور (اس وقت کو یاد کرو) جب خدا تم سے وعدہ کرتا تھا کہ (ابوسفیان اور ابوجہل کے) دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا (مسخر) ہو جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے (شان و) شوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے اور خدا چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے اور کافروں کی جڑ کاٹ (کر پھینک) دے، تاکہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کر دے، گو مشرک ناخوش ہی ہوں۔''

۲- مقابلہ

چونکہ مشیت خداوندی یونہی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی خواہش کے برخلاف انہیں قافلے کی بجائے مشرکین کے لشکر کے مقابلے میں لے آئے۔ مسلمان قافلے کا تعاقب کر کے اپنا مال و متاع واپس لینا چاہتے تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ ایک ایسے نئے دور کا آغاز فرمانا چاہتے تھے، جس سے ظلم و ستم

اورلوٹ مار کے دور کا خاتمہ ہونا تھا۔ مسلمانوں کے لیے مشرکین پر ایک ایسی کاری ضرب لگانا ضروری تھا، جس سے ان کے قدم اکھڑ جائیں اور وہ ان پر دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں۔ حق کے غلبے کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ ''حق کا غالب آنا اور مغلوب نہ ہونا ضروری ہے۔''(1) اور یہی مشیت ایزدی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتے نہیں ہوتا: ﴿وما تشاؤون الاأن يشاء الله﴾ (التکویر: ۲۹) ''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے، مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔''

خدا کی مشیت کے سامنے کسی بھی انسان کی خواہش اہمیت نہیں رکھتی۔ خدا کی مشیت بدر کی طرف جانے کی تھی اور رسول اللہ ﷺ کو اس کا ادراک تھا۔ آسمان بھی رمضان مبارک کے اس مبارک دن کو دیکھنے کا منتظر تھا جو آہستہ آہستہ لیلۃ القدر سے قریب تر ہو رہا تھا۔ جب مسلمان وہاں پہنچے تو ان پر سکون کی بارش ہوئی، جو ان کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ اس کی وجہ سے گردوغبار بیٹھ گیا، زمین پر مٹی جم گئی اور کنویں پانی سے بھر گئے، گویا بارش کے قطروں کے ساتھ فرشتوں کا نزول ہو رہا تھا، بلکہ واقعتاً فرشتوں کا نزول ہوا تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مشابہت کے لیے ان جیسی شکل وصورت اختیار کر رکھی تھی۔ اس دن مسلمانوں کا شعار أَحَـد أَحَـد تھا۔[45] سارے مسلمان عنقریب پورے زور سے ''الله أحد'' کا نعرہ بلند کرنے والے تھے۔ انہوں نے کفن کی طرح کی سفید عبائیں پہنی ہوئی تھیں۔ چونکہ مدینے سے نکلتے وقت انہیں علم نہ تھا کہ کب اور کہاں دشمن سے ٹکراؤ ہو جائے، اس لیے وہ موت کو گلے لگانے اور حوروں کے استقبال کے لیے تیار اور عرفہ کے دن حاجیوں کی طرح کے سفید لباس میں ملبوس تھے۔ ان کا یہ منظر بلاشبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

بعض لوگ اس مبارک سفر میں شرکت نہ کرسکنے کے سبب غم میں گھلے جارہے تھے۔ انہی میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جو رسول اکرم ﷺ سے جدائی کا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ وہ اس معرکے میں شرکت نہ کرسکے، جس کی وجہ سے وہ سال بھر غم والم میں مبتلا رہے۔ اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں آپ لوگوں کے لیے اس درد کے حصول اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے بے تعلقی کی دعا کروں: ''اے اللہ! ان کے دل ودماغ کو بھی اس درد سے آشنا فرما دیجئے اور ان کی آنکھوں سے نیند اڑا دیجئے۔'' بلاشبہ اس مصیبت زدہ اور خستہ حال امت کے غم میں گھلنا، اس کے حالات کے بارے میں سوچنا اور اس کے دکھوں پر دکھی ہونا بہت ہی اونچی دعا اور آہ وزاری ہے، جس کا ثواب بعض اوقات مکہ مکرمہ میں ایک ہزار رکعات پڑھنے اور کعبہ کے گرد طواف کرنے سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی آپ نے اپنے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری کرتے ہوئے

''یارب!'' نہ کہا ہو، لیکن آپ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی ہو اور امت مسلمہ کے حالات کے بارے میں سوچتے ہوئے بستر پر کروٹیں لیتے لیتے صبح کردی ہو: ''آہ! میرے ترکستانی بھائی۔ آہ! میرے افغانستانی بھائی۔ کون جانتا ہے کہ وہاں میری کسی بہن کے حجاب کی طرف کتنے ہاتھ بڑھے؟ کون جانتا ہے کہ وہاں میری کتنی مائیں اور بہنیں زیادتی کا شکار ہوئیں؟'' ''آہ!'' ''جمعہ بالا''، ''کملوجہ''، ''صوفیا''، ''اسکج'' اور ''قوالہ''[46] کے میرے بھائی۔ وہ ''قوالہ'' جسے عظیم سلاطین اسلام نے جامع مسجدوں سے آراستہ کیا تھا، لیکن آج ان کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا۔ آہ! فلسطین اور کشمیر اور دوسرے علاقوں کے میرے بھائی۔''

ایسے غم میں گھلنا اتنی عظیم دعا ہے کہ اس پر آسمان کے فرشتے خدا کے حضور ''آمین'' کہتے ہیں۔ اس لمحے مؤمن ان دکھوں کی وجہ سے بہت ہی بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور اگر اس مقام کے ساتھ دعائیں بھی شامل حال ہو جائیں تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے، جب مؤمن اپنے سر میں درد محسوس کرتا ہے اور اپنی کوکھ پر ہاتھ رکھ کر درد سے دہرا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اس وقت اپنے ان بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے، جن کی وجہ سے وہ تشویش میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے ان دوستوں کے ہمراہ ہوتا ہے، جو اسی کی طرح سوچ رہے ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی کا یہی مقصد ہے۔ اگر ہم سے یہ بھی نہ ہو سکے تو ہمارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے۔ اگر ہمارے بھائیوں اور ہماری امت پر ظلم و ستم ہو رہا ہو اور ہم اس ذلت کو ختم کرنے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں تو ہمارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے۔

صحابہ کرام یہی سوچ کر ذوق وشوق سے غزوہ بدر کے لیے نکلے تھے۔ جنت ان کے سامنے ان کی منتظر تھی، جہاں انہیں حیاتِ جاوداں ملنی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نصیب ہونی تھی۔ اَحَد اَحَد کے نعرے لگاتے مسلمانوں سے اس دن فرشتے بھی خوش تھے اور آسمان سے قطار در قطار اتر رہے تھے، گویا وہ غزوہ بدر کے پیش آنے سے پہلے ہی اس کی فتح کی مبارک دینا اور اس پر جشن منانا چاہتے ہوں۔ بعض صحابہ کرام کو وہ نظر بھی آرہے تھے۔ ان کے سروں پر سفید عمامے اور ان کے جسموں پر صحابہ کرام کی عباؤں جیسی سفید عبائیں تھیں۔ صحابہ کرام اَحَد اَحَد کے نعروں کے ساتھ فرشتوں کا استقبال کر رہے تھے، جبکہ دوسری طرف سے مشرکین مکہ اور ان کے سردار اپنے سیاہ دلوں جیسے سیاہ کپڑے پہنے آرہے تھے۔

بعض صحابہ کرام انتہائی مسرت وشادمانی کی کیفیت میں میدان بدر آئے تھے۔ ایک ایسے ہی صحابی ایک درخت کے نیچے بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ خوشخبری سناتے

ہوئے سنا: ''اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں محمد کی جان ہے! جو شخص بھی آج کفار کے ساتھ ثابت قدمی اور ثواب کی نیت سے لڑتے ہوئے بغیر پیٹھ پھیرے قتل ہوگا اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔'' یہ سن کر وہ صحابی بولے: ''واہ واہ! کیا میرے اور جنت کے درمیان صرف ان کفار کے ہاتھوں قتل ہونے کی دیر ہے؟'' پھر انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود کھجوریں پھینک دیں اور تلوار لے کر کفار سے لڑنے لگے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔[47]

اس دن شوق و رغبت کے یہ جذبات تمام صحابہ کرام میں مشترک تھے۔ وہ میدانِ بدر میں شوق و اشتیاق کی اسی کیفیت میں سرشار ہو کر آئے تھے۔ یہ ایک ایسی روحانی اور پُر اثر کیفیت تھی، جسے مغلوب کرنا کسی طاقت کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ اس جذبے سے سرشار تھے۔ وہ دنیا کی زندگانی کو حقیر سمجھتے اور آخرت میں بھی صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے امیدوار تھے۔ بھلا ایسی فوج سے کیسے لڑا جا سکتا ہے، جو جنگ میں ایسے شریک ہوتی ہو، جیسے شادی میں شریک ہوتے ہیں۔ ایسی فوج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے سامنے ٹھہرا جا سکتا ہے۔

۳۔ عسکری نظم و نسق

غزوہ بدر کی ایک خوبی یہ تھی کہ صحرائے عرب کے بدوؤں نے پہلی مرتبہ ایک ایسی منظّم فوج دیکھی تھی، جس کے ہاں لوٹ مار اور غارت گری کا کوئی تصور نہ تھا، کیونکہ اس فوج کی قیادت انسانیت کو نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے روشناس کرانے والی شخصیت کے ہاتھ میں تھی: ﴿وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ()أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ()وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ﴾(الرحمٰن: ۷-۹) ''اور اسی نے ترازو قائم کی کہ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرو اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔'' اس آیت مبارکہ میں میزان کے لفظ کا تین بار ذکر ہوا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور صورت قرین قیاس ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ جنہوں نے نظم و نسق اور توازن کی اہمیت کو اجاگر کیا، حضرت محمد ﷺ کو ایک منظّم فوج کے منتظم، باریک بیں اور اعتدال پسند سپہ سالار کی حیثیت سے میدان بدر کی طرف بھیجتے؟

غزوہ بدر سے پہلے سراغ رساں عسکری دستوں نے اہم کردار کیا۔ زمانہ جاہلیت کے عرب اس سے پہلے ایسی حکمت عملی سے واقف نہ تھے۔ عسکری دستے ایسے تجربہ کار اور آزمودہ افراد پر مشتمل ہوتے، جن کا ثانی ملنا مشکل ہوتا۔ یہ دستے سراغ رسانی کی تقریباً بیس مہمات سرانجام دے چکے

تھے، جس دوران انہوں نے اس علاقے کے چپے چپے کو چھان مارا تھا۔ یہ مہمات محض ضابطے کی کاروائیاں نہ تھیں، بلکہ ایسے عسکری دستوں پر مشتمل تھیں، جنہیں حوادثِ زمانہ نے پختہ کار اور تجربات کی بھٹی نے کندن بنا دیا تھا۔ وہ بارہا دشمن سے دوبدو ٹکر لے چکے تھے اور ان کے ساتھ گھمسان کی جنگ میں شریک ہو چکے تھے، بلکہ بعض اوقات ان کے مرکز پر حملہ آور ہو کر ان میں خوف و ہراس پیدا کر چکے تھے۔ جو لوگ ایسے تجربات اور مشقوں سے نہیں گزرے تھے، ان کے لیے ان کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ وہ دشمن کے ٹھکانوں، ان کے قافلوں کی گزرگاہوں اور دشمن کی خبریں پہنچانے والے لوگوں کی جگہوں سے بخوبی واقف تھے۔ نہ صرف صحرائے عرب بلکہ شاید انسانیت کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس قسم کے سریع الحرکت دستے تشکیل دیئے گئے تھے۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ کا کمال تھا۔ اگر آپ پوچھیں: ''کیسے؟'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عسکری اور سراغ رسانی کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود لشکر تشکیل دے کر راستوں کو پُرامن بنایا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے پیدل اور اونٹوں پر سوار ہو کر بغیر کسی مقابلے اور رکاوٹ کے دو سو کلومیٹر کی مسافت طے کرنا ممکن ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے عسکری دستے اس علاقے میں سراغ رسانی کی تقریباً بیس مہمات سرانجام دے چکے تھے، لہذا ان کے لیے یہ بتانا ممکن تھا کہ کون سا راستہ کس طرف جا رہا ہے۔ اس طرح وہ امن وسلامتی کے ساتھ میدانِ بدر تک پہنچ گئے، جو کہ عسکری پہلو سے بہت اہم بات ہے۔

۴- بدر کے کنوؤں کی طرف توجہ

بدر کے کنوؤں کے پاس مسلمانوں کے لشکر نے پڑاؤ ڈال کر آرام کرنا تھا۔ دشمن بھی اس جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں تھا اور اپنے دو سو شہسواروں کے ساتھ اس کی طرف تیزی سے پیش قدمی کر رہا تھا، تاہم مسلمانوں نے اپنی فراست اور تیز رفتاری کی بدولت اس جگہ پر پہلے قبضہ کر لیا۔ اس علاقے میں صرف بدر کے مقام پر ہی پانی موجود تھا، جو اب مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ سراغرساں دستے قافلوں کا تعاقب کرتے اور اپنی کاروائی مکمل کرنے کے بعد قافلے والوں کے ساتھ خرید و فروخت بھی کرتے، کیونکہ ان کا مکہ میں چھوڑا ہوا مال و متاع قافلے میں ہی ہوتا، جسے غاصبوں سے واپس لینا ان کے لیے ضروری تھا۔ مسلمان اس بارے میں منصوبہ سازی کر رہے تھے، لیکن مشیت ایزدی کا فیصلہ یہ تھا کہ کفر پر ایک ایسی زوردار ضرب لگائی جائے، جس سے اس کا توازن بگڑ جائے اور وہ آئندہ کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔

رسول اللہ ﷺ نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ایک حصے کو دائیں، دوسرے کو بائیں اور تیسرے کو درمیان میں رکھا۔اس دور میں یہ حکمت عملی معروف نہ تھی۔درمیان والا حصہ مہاجرین اوران سرداران انصار پر مشتمل تھا، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر موت کی بیعت کی تھی۔اگر میدان جنگ میں صرف وہی رہ جاتے تب بھی وہ اپنے وعدے سے نہ پھرتے۔لشکر کا درمیانی حصہ ایسے افراد پر مشتمل تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے لشکر کے درمیانی حصے کے مہاجرین کی قیادت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور انصار کی قیادت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کئی مواقع پر اپنی ہوشمندی کا ثبوت فراہم کر چکے تھے۔(48)

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خصوصی فضیلت کے باعث تمام صحابہ کرام سے زیادہ عظیم المرتبت تھے۔اگرچہ یہ بات مسلم اور اتفاقی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے تین خلفائے راشدین عمومی فضائل کے اعتبار سے آپ سے افضل ہیں، لیکن اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی نسبت سے آپ رضی اللہ عنہ کے خصوصی مقام، آپ ﷺ کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کی قرابت داری، آل بیت کے اسرار سے واقفیت، آپ رضی اللہ عنہ کی پشت سے رسول اللہ ﷺ کی نسل مبارک کے سلسلے کے جاری ہونے(49) اور تمام اولیائے کرام کا سرتاج اوران کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے میں آپ رضی اللہ عنہ کا کوئی ثانی نہیں۔آپ رضی اللہ عنہ سات سال کی عمر میں اسلام لائے۔آپ کو کفر وشرک کی گرد نے بھی نہیں چھوا۔جب رسول اللہ ﷺ نے بنو عبدالمطلب کے بڑوں کو بتایا کہ میں تمہاری طرف خصوصی طور پر اور ساری انسانیت کی طرف عمومی طور پر مبعوث ہوا ہوں اور اس کے بعد ان سے پوچھا: ''تم میں سے کون کون میرا بھائی اور ساتھی بننے پر بیعت کرتا ہے؟'' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اس موقع پر موجود لوگوں میں سب سے کم سن تھے، کے سوا کوئی بھی نہ اٹھا۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں بیٹھنے کے لیے فرمایا۔آپ ﷺ نے اپنی بات کو تین بار دہرایا اور ہر بار صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اٹھے۔تیسری بار آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا۔(50)

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سترہ برس کے تھے اس وقت رسول اللہ ﷺ نے انہیں ہجرت کی رات اپنے بستر پر گزارنے کا حکم دیا۔دوسرے لفظوں میں موت کو گلے لگانے کی تجویز دی، جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قبول کرلیا۔(51) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے مواقع پر کبھی پس وپیش نہ فرمائی۔یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے شجاعت ومردانگی کے پیکر اس نوجوان کو غزوہ بدر کے موقع پر

مہاجرین کی قیادت سونپی۔ یارسول اللہ ﷺ میری جان آپ پر فدا! لوگوں کے انتخاب میں آپ کس قدر صائب الرائے تھے!

دوسری طرف حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی فضیلت وثابت قدمی میں اپنی مثال آپ تھے۔ان کے اخلاص کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ان کے صاحب ایمان ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب ایک معرکے میں وہ شدید زخمی ہوگئے تو انہوں نے بستر مرگ پر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دعا کی: ”اے اللہ! اگر قریش کے ساتھ کوئی جنگ ہونا ابھی باقی ہے تو مجھے اس کے لیے زندہ رکھیے، کیونکہ تیرے رسول کو ایذا پہنچانے، اسے جھٹلانے اور اسے اپنے وطن سے نکالنے والی قوم سے جنگ کرنے سے زیادہ مجھے کسی قوم سے جنگ کرنا عزیز نہیں، لیکن اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگوں کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو آج مجھے پہنچنے والے زخم کو میری شہادت کا ذریعہ بنا دیجئے، نیز جب تک بنوقریظہ کے بارے میں میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں اس وقت تک مجھے موت نہ دیجئے۔“[52] حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اسی زخم کی وجہ سے وفات ہوئی اور جب رسول اللہ ﷺ انہیں ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے ان کے جنازے کے ہمراہ چلے تو ان کے جنازے کے بارے میں فرمایا: ”اس کے آنے کی خوشی میں رحمان کا عرش بھی جھوم رہا ہے۔“[53] آپ ﷺ کا یہ انتخاب کتنا درست اور اچھا تھا۔

لشکر کے مرکزی اور درمیانی حصے میں ایسی شخصیات موجود تھیں۔جب سپہ سالار ہی ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہو تو کیا سپاہی پیٹھ پھیر سکتے ہیں؟ اور اگر سپہ سالار اپنے سر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو تو کیا سپاہی اپنے سروں کی قربانی پیش کرنے سے پیچھے ہٹ سکتے ہیں؟ پھر سپاہی بھی ایسے جو وہاں آئے ہی شہادت کی جستجو میں ہوں۔رسول اللہ ﷺ لشکر کے مرکز میں ایسے سپاہیوں کے درمیان موجود تھے، جنہوں نے زرہ کی مانند آپ ﷺ کو گھیرا ہوا تھا۔ان سب کی لاشوں پر سے گزرے بغیر کسی کے لیے آپ ﷺ تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ لشکر کے ایسے مرکزی حصے میں موجود تھے۔آپ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو پرچم عطا فرمایا۔[54] یہ انتخاب بھی کس قدر شاندار تھا! (جب معرکہ احد میں حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کا دائیاں بازو کٹ گیا تو انہوں نے بائیں ہاتھ سے پرچم پکڑ لیا، پھر جب بائیاں بازو بھی کٹ گیا تو انہوں نے درج ذیل آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُل﴾ (آل عمران: ١٤٤) ”اور محمد تو صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔“ اور شہید ہونے تک پرچم کی حفاظت فرمائی۔[55]

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ درمیان میں کھڑے تھے اور سفید پرچم ان کے ہاتھوں میں لہرا رہا تھا۔ میمنہ اور میسرۃ نے منظّم انداز میں اپنی اپنی جگہیں سنبھال لی تھیں۔ لشکر کا اگلا حصہ مستعد ہوکر احکامات کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے "ردیف" تھا، جس کی قیادت حضرت قیس بن ابی سعد رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے۔ یہ لشکر اس قدر مضبوط ارادے اور قوتِ برداشت کا مالک تھا کہ اگر ان کے ناخن ایک ایک کر کے اکھیڑ دیئے جاتے تب بھی ان میں سے کوئی اُف نہ کرتا۔

مسلمانوں کا لشکر ایسے نظم ونسق کا نمونہ پیش کر رہا تھا، جس کی نظیر جنگوں کی تاریخ میں اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس نظم ونسق نے قریش کی کمر توڑ دی۔ رسول اللہ ﷺ کا پیش کردہ نیا نظام پرانے، فرسودہ اور بے فائدہ نظاموں کے لیے موت ثابت ہوا۔ دوسری طرف کفار فرسودہ نظام پر کاربند تھے اور ان کی صفوں میں بدنظمی واضح طور پر نظر آ رہی تھی، پھر رسول اللہ ﷺ کی اپنے لشکر کے اگلے حصے میں موجودگی مسلمانوں کے حوصلوں کی بلندی اور ان کی فعال قوت میں اضافے کا باعث تھی۔ مسلمان تو پہلے ہی آپ ﷺ سے عہد کر چکے تھے کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ مبعوث کیا ہم آپ کی ہر اس چیز سے حفاظت کریں گے، جس سے ہم اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

بادشاہ کا اپنی رعیت کے دلوں میں اطمینان اور اعتماد پیدا کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ ذمہ داری بحسن وخوبی ادا فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے فرمایا تھا: "میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہے۔"(56)

آپ ﷺ کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ آپ ﷺ بنفس نفیس وہاں موجود تھے اور ان کے درمیان گھوم پھر رہے تھے۔ مسلمان وہاں اونٹوں پر باری باری بیٹھ کر آئے تھے (کاش! وہ اونٹ مٹی کی بجائے میرے چہرے پر قدم رکھتے۔) آپ ﷺ کے اونٹ پر آپ ﷺ کے ہمراہ دو صحابہ سوار ہوکر میدان بدر تک آئے۔ وہ (آپ ﷺ کے پیدل چلنے پر) غمزدہ تھے اور آپ ﷺ سے درخواست کرتے: "آپ سوار ہوجایئے۔ ہم آپ کی باری پر آپ کی طرف سے پیدل چلیں گے۔" لیکن رسول اللہ ﷺ ان سے فرماتے: "تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اور نہ میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی ہوں۔"(57) یہ امیر الامراء کے الفاظ ہیں۔ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے۔ ان کے ساتھ اٹھتے، بیٹھتے اور ان سے علیحدہ نہ ہوتے۔ آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا تناول فرماتے، جو دوسرے لوگ کھاتے۔ آپ ﷺ ہر معاملے میں ان کے ساتھ شریک رہتے اور کبھی بھی ان سے ممتاز ہونے کی کوشش نہ فرماتے۔

''انقلابِ فرانس'' کے بعد سے ''مساوات'' کا لفظ لوگوں کی زبانوں پر عام ہو گیا ہے۔ کیا کسی نے انقلابِ فرانس کے بعد سے آج تک مساوات دیکھی ہے؟ حقیقی مساوات عہدِ رسالت اور خلافت راشدہ کے دور کے انسانوں کے سوا کسی نے نہیں دیکھی۔ یہ مساوات حضرت محمد ﷺ کے صدقے انسانیت کو ملی تھی۔

مشکل ترین ایام میں آسمان آپ ﷺ کے لیے اپنے دروازے کھول دیتا اور فرشتے آپ ﷺ کی حفاظت فرماتے اور آپ کو ڈھانپ لیتے۔ شاعر نظامی (58) نے خوب کہا ہے:

لقد أصحبت أنصاف الأهلة   حدوات تحت حوافر جواده

''ہلال دو ٹکڑے ہو کر آپ ﷺ کے گھوڑے کے سموں کی نعل بن گیا۔''

جنت نے معراج کے موقع پر آپ ﷺ سے درخواست کی تھی: ''ٹھہر جائیے، نہ جائیے۔'' لیکن آپ ﷺ لوگوں میں لوٹ آئے۔ ولی کبیر حضرت عبدالقدوس رحمہ اللہ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''نبی اکرم محمد ﷺ جس مقام تک پہنچے وہاں کسی اور کی رسائی ممکن نہیں۔ بخدا اگر میں ان مقامات تک پہنچ جاتا تو کبھی بھی دنیا میں واپس نہ آتا۔'' ایک اور ولی شیخ عبدالقدوس رحمہ اللہ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''یہ وہ مسافت ہے جو نبی اور ولی میں فرق قائم کرتی ہے۔ اس مسافت کو طے کرنا کبھی بھی ممکن نہیں۔'' اس مسافت کو طے کرنا اسی لئے ممکن نہیں کہ محمد ﷺ رسولِ خدا ہیں۔

اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں اس قدر بلند مقام حاصل تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ اپنے آپ کو ایک عام انسان سمجھتے اور لوگوں کے درمیان رہنا پسند فرماتے۔ انسانیت کو مساوات آپ ﷺ کے واسطے سے ملی اور اگر انسانیت دوبارہ اس مقام تک پہنچی تو آپ ﷺ کی برکت سے ہی پہنچے گی۔ یہ انتظار علم قانون کی فطرت سے پھوٹنے والی حقیقت ہے۔

عرب کے بادیہ نشین اس لشکر کو اسی زاویے سے دیکھتے تھے۔ صحرائے عرب میں ایسے لشکر کی موجودگی اس کے لیے بڑے شرف کا باعث تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے لشکر کو بنفس نفیس ترتیب دیا اور اسے مختلف مقامات پر تعینات فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے اس جگہ کے درمیان میں ایک بڑا سا گڑھا کھدوایا اور اسے اس قدر پانی سے بھر دیا، جس قدر پانی کی ضرورت مسلمانوں کے لشکر کو جنگ کے آخر تک پیش آ سکتی تھی اور پھر باقی تمام کنوؤں کو بند کروا دیا۔ (59) آپ ﷺ نے یہ تمام اقدامات اس لیے کروائے تا کہ جب دشمن اس مقام پر کنوؤں کی

موجودگی کی بنا پر بغیر تیاری کے پہنچے گا تو کنوؤں کی حالت دیکھ کر اپنی کمر ٹوٹتے ہوئے محسوس کرے گا، چنانچہ بعد میں عملاً ایسا ہی ہوا۔

جس طرح لشکر کا نظم و نسق اعلیٰ تھا، اسی طرح اس کی نقل و حرکت اور جنگ کا طریق کار بھی عمدہ تھا۔ سپاہی بخوبی جانتے تھے کہ کہاں تیر استعمال کرنے ہیں، کہاں نیزے استعمال کرنے ہیں، کس جگہ تلواروں سے کام لینا ہے، کب لشکر کے میمنہ اور میسرہ نے جنگ میں شامل ہونا ہے اور کب پیچھے موجود طاقت نے مداخلت کرنی ہے۔ یہ تمام امور ایک انتہائی عمدہ نظام الاوقات کے تحت طے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے قیام کے لیے خیمہ نصب کرنے کے لیے انتہائی دقت نظری سے رسول اللہ ﷺ جیسے عظیم قائد کی شایانِ شان جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ اس جگہ سے آپ ﷺ پورے میدانِ جنگ پر اچھے طریقے سے نظر رکھ سکتے تھے۔ آپ ﷺ اس جگہ سے میمنہ، میسرہ اور ان کے پیچھے موجود فوج کی نگرانی فرما سکتے تھے۔ نیز آپ کے لیے لشکر کے ساتھ رابطے میں رہنا اور انتہائی سرعت کے ساتھ اس تک احکامات اور ہدایات پہنچانا ممکن تھا۔

اب تمام انتظامات مکمل تھے اور تھوڑی دیر بعد جنگ شروع ہونے والی تھی، جس میں مسلمان اپنے سے تین گناہ بڑے دشمن پر فتح پا کر صرف چودہ افراد کی شہادت کا معمولی نقصان اٹھا کر اسے عبرت ناک شکست سے دوچار کرنے والے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا رسول اللہ ﷺ نے اس غزوے میں مسلمانوں کا خصوصی شعار ''اَحَد اَحَد'' کا نعرہ مقرر فرمایا تھا۔ ''اَحَد'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام ہے، جو کسی انسان کا نام رکھنا جائز نہیں۔ ''اَحَد'' اس ہستی کو کہتے ہیں جو اپنی ذات میں یکتا ہو ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ (الاخلاص: ۱) ''کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ (ہے) ایک ہے۔'' یہاں احد سے الوہیت اور ربوبیت دونوں میں توحید کی طرف اشارہ ہے۔ واحد کا تثنیہ اثنان ہے، لیکن احد کے لیے تثنیہ کا کوئی صیغہ نہیں، چنانچہ احد ایک ایسا منفرد عدد ہے، جس کے لیے دو یا تین کا عدد استعمال نہیں ہوتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ہستی بھی ایک ایسی اکیلی ''اَحَد'' ہے، جس کا کوئی ثانی نہیں۔

اس دن کا شعار ''اَحَد اَحَد'' تھا۔ جب بھی مسلمان یہ نعرہ بلند کرتے تو یوں لگتا جیسے پردۂ غیب سے اس کے جواب میں آواز آتی ہے: ''میرے بندو! میں موجود ہوں۔'' اس شعار کو اختیار کرنے کی جہاں ایک حکمت یہ تھی، وہیں اس کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اہل مکہ اس وقت تک جنگ کے لیے خصوصی علامات کے استعمال سے ناآشنا تھے۔ لہٰذا مسلمان یہ مخصوص نعرہ بلند کر کے جہاں باہمی رابطے کا کام

لیتے، وہیں اسے مشرکین کے دلوں پر رعب ڈالنے کے لیے بھی استعمال کرتے۔ وہ کفن نما سفید لباس میں ملبوس لوگوں کو زوردار نعرے بلند کرتے ہوئے دیکھتے۔ اہل ایمان خدا کے راستے میں موت اور شہادت کی تلاش میں رہتے۔ ان کی زندگی کا صرف یہی مقصد تھا۔

۵- پہلا مقابلہ

عمومی نظم و نسق اور حکمت عملی کے ساتھ ساتھ ہر نئی صورتِ حال کے لیے مستقل احکامات صادر ہوتے اور بالکل درست ثابت ہوتے۔

ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے تین افراد کو مبارزت کے لیے نکلنے کا حکم دیا۔ ان تینوں کا تعلق انصار کے اہم اور شہادت کے متمنی افراد سے تھا۔ اگر ان کے مقابلے میں عنترہ یا ہرقل بھی آتا تو انہیں اس کے ساتھ مقابلہ یا جنگ کرنے میں ذرا تردد نہ ہوتا، لیکن قریش نے تکبر اور غرور میں آ کر کہا: ''اے محمد! ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کے ہمسر لوگوں کو بھیجئے۔'' یہ غرور ان کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو اسی کی توقع تھی۔ اگرچہ کتب سیرت میں اس کا ذکر نہیں، لیکن شاید رسول اللہ ﷺ نے ایسا جنگی حکمت عملی کے تحت ہی کیا تھا، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کے ذہن میں مبارزت کرنے والوں کے نام پہلے سے موجود تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''حمزہ، عبیدہ اور علی اٹھو۔'' ان میں سے ہر ایک پورے لشکر پر بھاری تھا۔ ان میں سے دو آپ ﷺ کے چچازاد بھائی جبکہ تیسرے چچا تھے، گویا آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو موت کے دروازے پر دستک دینے کے لیے بھیجا۔ دوسری طرف سے بھی تین مبارز عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ نکلے۔ دشمن کو ایک بہت بڑا دھچکا لگنے والا تھا۔ ان تینوں کا شمار طاقتور ترین قبائلی سرداروں میں ہوتا تھا۔ جب دو بھائی اور ان میں سے ایک کا بیٹا میدانِ بدر میں تلوار سے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تو دشمن کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے، جو اُن کی ہزیمت کی پہلی علامت تھی۔ مسلمانوں میں سے حضرت عبیدہ شدید زخمی ہو گئے اور انہیں میدان سے اٹھا کر ان کے چچازاد بھائی اور ان کے جنت کے راہنما رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، جہاں انہوں نے آپ ﷺ کے قرب میں وفات پائی۔(60)

عتبہ، شیبہ اور ولید کی موت کے بعد دشمن کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہت سے لوگ جنگ میں انہی کے پُرزور اصرار پر شریک ہوئے تھے، لہٰذا ان تین سرداروں کی موت دشمن کی صفوں میں خوف اور انتشار پھیلنے کا باعث بنی۔

٦- متضاد اہداف

چونکہ دشمن کی صفوں میں انتشار اور بدامنی پھیل چکی تھی، اس لیے ان میں سے ہر ایک کا رخ مختلف سمت میں تھا، جس کے نتیجے میں وہ پہلے مسلمانوں کے تیروں اور نیزوں اور پھر تلواروں کا نشانہ بنے رسول اللہ ﷺ نے ان پر ایسی کاری ضرب لگائی، جس سے ان کے حواس اڑ گئے اور انہیں سمجھ نہ لگی کہ وہ کیا کریں، مزید یہ کہ وہ معرکہ بدر میں کسی اصول، فکر یا خاص اقدار کے تحت نہیں آئے تھے، بلکہ عداوت اور حسد کے جذبات انہیں یہاں لائے تھے، جبکہ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اعلائے کلمۃ اللہ جیسی بلند فکر اور اعلیٰ ہدف کی خاطر میدانِ بدر میں اترے تھے۔ اصولوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، ابن ابی معیط اور امیہ بن خلف نہیں جانتے تھے کہ وہ کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وہ تو صرف دشمنی اور غصے سے مغلوب ہو کر میدانِ بدر میں لوگوں کو قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے اس طرزِ عمل سے وہ خانہ کعبہ کا مرتبہ بلند کریں گے اور لوگوں کی نظروں میں اپنی قدر و منزلت بڑھائیں گے، تاہم انہیں ماضی میں اس سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل ہوئی اور نہ ہی مستقبل میں اس کی کوئی توقع تھی، کیونکہ ان کے وہاں آنے کے پیچھے صرف اور صرف دشمنی اور غیظ و غضب کا محرک کارفرما تھا۔

دوسری طرف مسلمان وہاں اللہ کے دین کی سربلندی اور اسے اطرافِ عالم میں پھیلانے جیسے بلند مقصد کے حصول کے لیے گئے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس قسم کے جذبات موجزن تھے اور وہ اس ہدف کی خاطر موت کو بھی معمولی سمجھتے تھے۔ اہل ایمان راہِ خدا میں شہادت کی تمنا کرتے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے گھروں سے نکلتے تھے۔ جسے اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور وصال نصیب ہو جائے گا وہ کبھی نقصان نہیں اٹھائے گا، بلکہ اسے بہت زیادہ نفع حاصل ہوگا۔ ہر مسلمان اسی جذبے سے لڑتا اور اس کی خاطر زندگی کو حقیر سمجھتا، جبکہ دشمنانِ اسلام زندگی کو اہم ترین متاع اور اپنی تمام امیدوں کا منتہا تصور کرتے تھے۔

ان کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ ان کی دنیوی زندگی دراز سے دراز تر ہو جائے۔ اگر انہیں معرکہ بدر میں فتح حاصل ہوتی تو ابوجہل شراب پینے، رقاصاؤں کا رقص دیکھنے اور طرب و نشاط کی محفل سجانے کی قسم پوری کرتا۔(61) جبکہ مسلمانوں نے وہاں نمازیں ادا کیں، اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں، اس کے سامنے آہ و زاری کی اور قربِ خداوندی کے حصول کے ذرائع کی جستجو کی۔

دونوں جماعتوں کے درمیان یہ واضح فرق تھا۔ان میں سے ایک جماعت اطمینان وسکون کی دولت سے مالا مال ہوکر بلندیوں پر محوِ پرواز تھی تو دوسری جماعت تنگی واضطراب میں مبتلا ہوکر دنیا کی پستیوں میں جا گری تھی۔

۷۔ امت مسلمہ کے فرعون کا خاتمہ

عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں غزوہ بدر میں صف میں کھڑا تھا کہ میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور اپنے آپ کو انصار کے دو کم سن لڑکوں کے درمیان پایا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں ان کی بہ نسبت زیادہ مضبوط لوگوں کے درمیان ہوتا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے میری طرف اشارہ کرکے پوچھا: ''چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو جانتے ہیں؟'' میں نے کہا: ''ہاں، جانتا ہوں، لیکن تمہیں اس سے کیا غرض؟'' اس پر اس نے کہا: ''مجھے پتا چلا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو بُرا بھلا کہتا ہے۔اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو میں اس سے اس وقت جدا نہ ہوں گا، جب تک ہم میں سے کوئی ایک مر نہ جائے۔'' ابھی مجھے اس کی اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ دوسرے لڑکے نے بھی میری طرف اشارہ کرکے یہی بات کہی۔تھوڑی دیر بعد مجھے ابوجہل لوگوں کے درمیان گھومتا پھرتا دکھائی دیا۔ میں نے ان سے کہا: ''وہ دیکھو! یہی تمہارا مطلوبہ شخص ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ اپنی تلواریں لے کر تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور اس پر پے در پے وار کرکے اسے قتل کردیا۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو صورتحال سے آگاہ کیا۔آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے؟'' ان میں سے ہر ایک نے کہا: ''میں نے اسے قتل کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اپنی تلواریں صاف کردی ہیں؟'' انہوں نے عرض کی۔ ''نہیں'' نبی کریم ﷺ نے دونوں کی تلواریں دیکھ کر فرمایا: ''تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔''(62) اس طرح اس امت کا فرعون اپنے انجام کو پہنچا۔وہ دونوں لڑکے معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق وہ دونوں عفراء رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔

وہ جاہلیت کو چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوچکے تھے۔معرکہ احد میں ان کا شہادت کا شوق پورا ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔درحقیقت وہ اسی اعلیٰ ہدف کے حصول کے لیے میدانِ بدر میں آئے تھے۔غرض رسول اللہ ﷺ نے صرف انہی لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ فرمایا، جنہوں نے آپ ﷺ کی

دعوت کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنایا، آپ ﷺ کو ایذا پہنچائی اور حق، حقیقت اور علم وعرفان کی مخالفت کی، اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے ایمان اور اسلام کی مخالفت کی، تاہم رسول اللہ ﷺ نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام اقدامات خوب سوچ سمجھ کر اٹھائے۔ آپ ﷺ کی حکمت عملی اس قدر متوازن اور پُر حکمت ہوتی کہ اس میں کسی غلطی یا لغزش کا امکان باقی نہ رہتا اور یوں محسوس ہوتا، جیسے آپ میدانِ بدر میں پچاس بار دشمن کا سامنا کر کے پچاس بار اپنی حکمت عملی آزما چکے ہیں، بلکہ یوں محسوس ہوتا جیسے آپ وہاں تفریح کے لیے گئے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وتوفیق سے فتح یاب ہو گئے ہوں۔

ہر فتح ایک دوسری فتح کا پیش خیمہ بننے والی تھی، یعنی آپ ﷺ ایک ایسے مفید دائرے میں داخل ہو چکے تھے، جس میں ایک بھلائی دوسری بھلائی تک پہنچاتی تھی۔ اس کے برعکس برائی کے چکر (Vicious Circle) میں ہمیشہ ایک برائی دوسری برائی، ایک پیچیدگی دوسری پیچیدگی اور ایک غلطی دوسری غلطی کا باعث بنتی ہے... چونکہ اسلحہ تیار اور تیاری مکمل تھی، اس لیے اچھے نتائج کا برآمد ہونا یقینی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''بھلائی صرف بھلائی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔''[63] معرکہ بدر خیر محض تھا۔ وہ قلب وفکر کے لیے خیر ہی خیر تھا، کیونکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جان پر کھیل کر اس میں شرکت کرنے والوں کے لیے بھلائی کے ہزاروں دروازے کھول کر ان سے کہا: ''ان میں سے جس راستے پر چاہو، چلو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔''

۸۔ شکست کی تکمیل

رسول اللہ ﷺ کے کاروائی سے مشرکین کی کمر ٹوٹ گئی اور ایک عرصہ تک ان پر اس کا خوف طاری رہا۔ اگر ابوجہل وغیرہ کے بعض حمایتی کفار کو نہ بھڑکاتے اور منفی پروپیگنڈا نہ کرتے تو ان میں سے کوئی بھی جنگ اُحد کے لیے نہ نکلتا۔ جنگ اُحد کے لیے قریش کے نکلنے کا محرک انتقام اور عداوت کے جذبات کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا: ''کچھ بھی ہو، مسلمانوں کے ساتھ ایک بار ضرور جنگ ہونی چاہیے۔'' ہند بنت عتبہ کا جذبۂ عداوت اور اصرار اس کی واضح مثال ہے۔ وہ ابوسفیان سے کہا کرتی تھی: ''میرے باپ، چچا اور بھائی ولید کو قتل کر دیا گیا اور تم گھر میں عورتوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہو۔ ایک عورت کے ساتھ رہنے پر میں اپنی ماں کے گھر جانے کو ترجیح دوں گی۔'' عورتیں روزانہ روتیں، اپنے کپڑے پھاڑتیں، اپنے چہروں کو نوچتیں اور مردوں کو بھڑکاتیں۔ ایک سال کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں مشرکین جنگ اُحد کے لیے نکل پڑے۔ اس موضوع پر ہم آئندہ کسی موقع پر دوبارہ گفتگو کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر میں کفار کے سروں پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ وہ دوبارہ مسلمانوں سے ٹکر لینے کا سوچ بھی نہ سکتے تھے، لیکن ان کے دلوں میں غصے اور دشمنی کے جذبات کسی طرح ٹھنڈے نہیں ہو پا رہے تھے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر کے بعد ان کے مجروح دلوں کی دلجوئی اور پامال شرف کے تدارک کے لیے ان کے ساتھ حسن سلوک بھی فرمایا تھا، مثلاً رسول اللہ ﷺ یہ بھی کر سکتے تھے کہ آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ان تمام قیدیوں کے سر قلم کرنے کا حکم ارشاد فرما دیتے، جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا تھا اور انہیں شدید ایذائیں پہنچائی تھیں، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان پر احسان فرما کر انہیں معاف فرمانے کو ترجیح دی اور ارشاد فرمایا: ''ہمیں ان سے درگزر کرنی چاہیے۔'' آپ ﷺ نے ان میں سے بعض سے فدیہ وصول فرمایا اور بعض کو اہل مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا کہا۔

۹- قیدیوں سے درگزر کرنے کے اہداف ومقاصد

اول: یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان پر احسان تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے ان قیدیوں کے فدیے کے مطالبے کو مشرکین نے بخوشی قبول کر لیا۔ قیدیوں کے فدیے میں مشرکین نے جو مال مسلمانوں کو ادا کیا وہ درحقیقت مسلمانوں کے مکہ میں رہ جانے والے ان اموال کا کچھ حصہ تھا، جنہیں کفار نے غصب کر لیا تھا۔

دوم: اس وقت تک مدینہ میں خواندگی کی شرح بہت پست تھی، حالانکہ مستقبل میں علم ودین کی نشر واشاعت میں ان کے کردار کے پیش نظر وہ لکھنا پڑھنا سیکھنے کے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ضرورت مند تھے، نیز اس ذریعے سے اہل مکہ اور اہل مدینہ کے درمیان موجود ثقافتی فرق اہل مدینہ کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

سوم: جن لوگوں نے مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے مدینے میں ٹھہرنا تھا، انہیں اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملنا تھا اور جب وہ مکہ لوٹتے تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گھر میں خدا اور اس کے رسول کا داعی ثابت ہوتا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اخلاق اور عفو ودرگزر کے ذریعے ان کے دل جیت لئے تھے۔

مثلاً دیکھئے ابوجہل کے بھائی ابن ہشام قبولِ اسلام تک دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے، کیونکہ ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے عفو ودرگزر اور مروت کے برتاؤ نے

انہیں آپ ﷺ کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر شرمندہ کر دیا۔ یہی بات تقریباً دوسرے تمام افراد کے حق میں بھی سچ ثابت ہوتی ہے۔

چہارم: ان قیدیوں کے گھر والے اور رشتہ داران کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، لیکن جب انہوں نے انہیں ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ اور صحیح سالم دیکھا تو ان میں احسان شناسی کا احساس پیدا ہوا، کیونکہ آج تک انہوں نے مسلمانوں کو جو ایذائیں پہنچائی تھیں، وہ ان سے بخوبی واقف تھے، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے قریش کے بڑوں سے اس قدر نرمی اور مروت کا برتاؤ کیا کہ ایسا نرم برتاؤ اہل مکہ اپنی اولاد سے بھی نہ کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے قیدیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ نے قریش اور ان کے حلیفوں کے دل جیت لیے، حتیٰ کہ اگر ابوجہل جنگ بدر میں قتل نہ ہو چکا ہوتا تو اس کے گھرانے میں اس کے سوا کوئی بھی حالت کفر پر نہ رہتا، کیونکہ اس گھر کے ہر فرد کا دل نرم پڑ گیا تھا، حتیٰ کہ ابوسفیان جو بنوامیہ میں سے اسلام کے شدید ترین مخالف تھے، کے رویے میں بھی نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غزوہ اُحد کے موقع پر میدانِ بدر میں ایک اور جنگ کا چیلنج دینے کے باوجود وہ دوسرے غزوہ بدر کے لیے نہ نکلے۔ اگر یہ مروت اور نرمی نہ ہوتی تو نہ جانے کتنے ناخوشگوار واقعات پیش آ سکتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر سے بھلائی کا پہلو نکالا۔ اس دور میں جس کے پاس طاقت ہوتی وہ دوسروں کو وحشیانہ ظلم وستم کا نشانہ بناتا، چنانچہ جب ہند کو موقع ملا اس نے آدم خور عورت کی طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبا ڈالا، تاہم وہ اسے نگل نہ سکی۔[64] اگر اسے غزوہ بدر میں اس کا موقع ملتا تو وہ بلاتردد ایسا ہی کرتی، لیکن جب مسلمانوں کو غزوہ بدر میں فتح نصیب ہوئی تو انہوں نے انسانی اقدار کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کیں۔ دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر انسانوں کو انتقام کا نشانہ بناتے، لیکن مسلمان ان کی دلجوئی کرتے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی فراست کا نتیجہ تھا۔ اسی لئے ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے غیر معمولی عسکری پہلو کو آپ ﷺ کی فراست کا ایک رخ سمجھتے ہیں۔

۱۰- فتح کے اسباب

غور کرنے سے غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کی فتح کے درج ذیل اسباب سامنے آتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے اعلیٰ پیمانے پر جنگی تیاری فرمائی اور میدانِ بدر میں سپہ سالار کے احکامات وہدایات پر عملدرآمد کے پابند لشکر کے ہمراہ اترے۔ اس لشکر کے حوصلے بلند اور ایمان مضبوط وراسخ

تھا۔اس ایمان کی برکت سے انہیں اسی دنیا میں جنت کے منظر دکھائی دیتے حتیٰ کہ بدر کے ٹیلوں پر چلتے ہوئے انہیں یقین نہ آتا کہ وہ بدر کے ٹیلوں پر چل رہے ہیں یا جنت کے ٹیلوں پر ٹہل رہے ہیں۔ایسے ایمان افروز جذبات سے سرشار ہوکر وہ میدانِ بدر میں اترے تھے، نیز وہ سپہ سالار کے احکامات کی اطاعت کے جذبے سے سرشار تھے۔جب تک کسی کام کے بارے میں انہیں احکامات نہ ملتے، اس وقت تک اسے سرانجام نہ دیتے، خواہ اس میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔پورا لشکر رسول اللہ ﷺ کے احکامات کا منتظر رہتا۔کسی بھی معرکے میں مرکزی قیادت کی طرف سے ہدایات کا جاری ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا اہتمام فرمایا اور ہدایات کے اجراء کو صرف مرکزی قیادت کے تحت لاکر اسے مضبوط بنیادوں پر استوار فرمایا۔آپ ﷺ نے خبر رسانی کا عمدہ نظام وضع فرمایا۔آپ ﷺ اپنے خیمے سے سارے علاقے پر نظر رکھ سکتے تھے۔بعض اوقات آپ ﷺ حالات جاننے کے لیے نیچے اتر کر لشکر کے درمیان میں آجاتے اور اگر کسی جگہ کمزوری یا خلل محسوس فرماتے تو وہاں جاکر اس کا ازالہ فرماتے۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''غزوہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ دشمن سے سب سے قریب تھے اور ہماری حالت یہ تھی کہ ہم آپ ﷺ کی اوٹ میں پناہ لیتے تھے۔''[65] اگرچہ رسول اللہ ﷺ دشمن سے قریب تر تھے، لیکن اگر دشمن کا کوئی فرد آپ ﷺ کے قریب آنے کی جرأت کرتا تو گوشت پوست کی مضبوط دیوار سے ٹکرا کر گر پڑتا۔

رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر میں گھوم پھر کر مسلمانوں کی ہمت بڑھاتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان سے فرماتے۔''اللہ تمہارے ساتھ ہے اور عنقریب تمہیں فتح سے ہمکنار کرکے تمہاری مدد فرمائے گا۔'' تمام صحابہ کرام بلند حوصلگی اور کامل جذبہ اطاعت سے سرشار ہوکر لڑتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ جنت کی طرف جارہے ہوں۔

مسلمانوں کا لشکر اس دور کے لحاظ سے انتہائی منظّم تھا۔اس کی ترتیب بہت ہی عمدہ تھی۔وہ میمنہ، میسرہ، مرکز اور ریزرو فورس پر مشتمل تھا۔یہ تمام امور اس وقت کے عسکری علوم کا نچوڑ تھے۔رسول اللہ ﷺ نے ان تمام امور کو مناسب مقام پر مناسب انداز میں استعمال فرمایا۔مثلاً اطاعت کو ہی لے لیجئے۔سپاہ گری نام ہی اطاعت کا ہے۔اس کی اہمیت کے پیش نظر زیر تربیت سپاہی کو سب سے پہلے اطاعت سکھائی جاتی ہے۔سپاہی کو جب پیش قدمی کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ پیش قدمی کرتا ہے اور جب ٹھہرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے میدانِ بدر میں اترنے سے پہلے اپنے لشکر کو اطاعت کرنا سکھا دیا تھا۔آپ ﷺ نے مرکزی قیادت کا خیمہ مقام بدر کے ایک ایسے ٹیلے پر نصب

فرمایا، جہاں سے آپ ﷺ پورے علاقے پر نظر رکھتے اور احکامات جاری فرماتے، جن پر سارے صحابہ کرام فوراً عملدرآمد کرتے۔ آپ ﷺ نے اپنے لشکر کے دلوں میں غیر متزلزل ایمان کی روح پھونک دی تھی۔ یہ جنگ دنیا سے محبت کرنے والوں اور اسے حقیر جاننے والوں کے درمیان تھی۔ ایک فریق گلستان سے پھول توڑنے کا شوقین تھا اور دوسرا اپنے خون سے اس کی آبیاری کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک گروہ کہتا تھا: ''میں نے اس زندگی کا بوجھ بہت اٹھالیا ہے۔ کب جنت کے دروازے کھلیں گے اور میں ان میں داخل ہو کر اس کی سرزمین پر ٹہلوں گا!'' جبکہ دوسرے گروہ کے دل کی آواز یہ تھی: ''کاش! میں صحیح سالم واپس لوٹ جاؤں، تاکہ رقاصاؤں کے رقص کے دوران شراب کے جام لٹا کر دنیا کی لذتوں سے محظوظ ہوں۔'' یہ معرکہ دو ایسی جماعتوں کے درمیان تھا، جن میں سے ایک زندگی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی اور دوسری اسے پوجتی تھی۔ ایک جماعت منظّم اور دوسری بے ترتیب افراد کا مجموعہ تھی۔ اس معرکے کا انجام شروع سے ہی واضح تھا، کیونکہ یہ نظم و نسق اور بدانتظامی کے درمیان جنگ تھی۔ مسلمانوں کی صفوں میں کہیں بھی رخنہ پڑنے لگتا تو رسول اللہ ﷺ فوراً وہاں پہنچ جاتے اور اس حصے کو مضبوط بنادیتے۔ مسلمان جونہی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ان کے حوصلے بلند ہو جاتے اور وہ رخنہ فوراً بند ہو جاتا۔

کسی بھی دعوت کے علمبرداروں کا یہ خصوصی وصف ہوتا ہے کہ وہ ہر لمحہ بدلتی صورت حال کے مطابق نئی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی حکمت عملی نہایت باریک بینی سے تیار فرماتے اور کسی بھی پہلو کو نظرانداز نہ فرماتے۔ آپ ﷺ کی حکمت عملی، طریق کار اور اسلوب کا آپ کے انتہائی قریبی کمانڈروں کے سوا کسی کو علم نہ ہوتا تھا۔ دشمن غیر منظّم طور پر لڑ رہا ہوتا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے لشکر کو بخوبی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے، کس طرف تیر پھینکنے ہیں اور کہاں نیزوں سے لڑنا ہے۔ بلاشبہ جنگی حکمت عملی انتہائی اہم چیز ہے۔

۱۱- محاذ سے پسپائی اختیار کرنا مؤمن کا شیوہ نہیں۔

ایک اہم بات یہ تھی کہ کوئی بھی سپاہی اپنی مرضی سے کوئی کام نہ کرتا، بلکہ جب تک رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کوئی دوسرا حکم نہ آتا، اس وقت تک اپنی جگہ پر ڈٹا رہتا، اگرچہ اسے موت کو گلے لگانا پڑتا یا واضح طور پر شکست ہوتی دکھائی دے رہی ہوتی۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے: ﴿يَـا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُواْ زَحْفاً فَلاَ تُوَلُّوهُمُ الأَدْبَارَ﴾ (الأنفال: ١٥) ''اے اہل ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔''

یعنی لشکر کا ایک سپاہی بھی باقی رہ جائے تب بھی فرار ہونا جائز نہیں۔ مجھے جب بھی ویانا (Vienna) کی شکست کا خیال آتا ہے تو مجھے اپنا دل غم سے پھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور میں دل میں سوچتا ہوں: ''کاش! قرہ مصطفیٰ پاشا کی فوج آخر دم تک وہاں لڑتی رہتی اور پیچھے نہ ہٹتی۔ شاید شکست فتح میں بدل جاتی اور وہ ''سرخ سیب''(66) ہماری گود میں آ گرتا، جسے ہم اپنی پوری تاریخ میں فتح نہ کر سکے۔'' لیکن جب فوج کی نگاہوں میں زندگی حسین اور موت خوفناک چیز بن جائے، جب ایمان اور جنت کا شوق ان کے نزدیک ثانوی حیثیت اختیار کر جائے اور اس سے بڑھ کر جب مؤمن کی نظر میں دنیا اہم اور بڑی چیز بن جائے تو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا رعب چھین لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں کافران پر غلبہ پا لیتے ہیں، انہیں دھوکا دیتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔(67)

مؤمن ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا ہے، لیکن میدانِ جنگ سے بھاگنا اُس کے لیے ممکن ہے اور نہ ہی اس کے رتبے کے شایاں ہے۔ اسلامی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ان سب نے شجاعت و جوانمردی غزوہ بدر کے شیروں سے سیکھی ہے۔ غزوہ بدر اس حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ مستقبل کے لیے ایک روشن مثال بن گیا۔

جنگ یرموک میں بیس ہزار بہادر دو لاکھ ایک ہزار رومی سپاہیوں سے ٹکرا گئے۔ یہ معرکہ غزوہ بدر سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس میں اسی جذبے اور حوصلے کی بدولت فتح حاصل ہوئی، جس حوصلے اور جذبے سے غزوہ بدر کی فضا معمور تھی۔ ان ہزاروں بہادروں میں سے صرف ایک بہادر قباث بن اشیم کو دیکھیے کہ جنگ کے دوران ظہر کے وقت ان کی ایک ٹانگ تلوار کے وار سے کٹ گئی، لیکن انہیں پتا بھی نہ چلا۔ جب عصر کے وقت مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو انہوں نے اپنے گھوڑے سے اترنا چاہا اور جب اترنے کے لیے ٹانگ کھینچی تو زمین پر آ گرے اور جب اٹھنے کی کوشش کی تو انہیں اصل صورتحال کا علم ہوا۔ ان کی ٹانگ ان سے پہلے جنت میں پہنچ گئی۔ اس واقعے کے کئی برس بعد ان کے پوتے نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا: ''خلیفہ معظم! میں اس شخص کا پوتا ہوں، جس کی ٹانگ ظہر کے وقت کٹی، لیکن اسے عصر کے وقت اس کا علم ہوا۔''

راہِ خدا میں لڑتے ہوئے ان کے پیش نظر دنیا ہوتی اور نہ ہی آخرت کی نعمتیں، بلکہ صوفی شاعر یونس امرہ کی طرح ان کے دل صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے اور وہ کہتے: ''ہمیں صرف آپ کی جستجو ہے!''

جنگ کے دوران بھاگنا سنگین جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک معیار مقرر کیا ہے، جس پر پورا اترنے کی صورت میں ہی پیچھے ہٹنا جائز ہوسکتا ہے۔ کسی بھی شخص کو ذاتی طور پر اپنی مرضی سے پیچھے ہٹنے کی اجازت نہیں۔ وہ معیار درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ (الأنفال:١٦) ''اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا کہ لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جاملنا چاہے، اُن سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔''

جب غزوہ موتہ کے بہادر مدینہ لوٹ کر آئے تو ان میں رسول اللہ ﷺ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو جنگ سے بھاگنے والا سمجھ رہے تھے، اس لیے شرمندگی کے باعث آپ ﷺ کا سامنا کرنے سے بچنا چاہتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اوپر ذکر کردہ آیت مبارکہ تلاوت فرما کر ان کی دلجوئی فرمائی اور ہمت بڑھائی۔ جب بعض صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''ہم فرار ہونے والے لوگ ہیں۔'' تو آپ ﷺ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا: ''نہیں، بلکہ تم پلٹ کر حملہ کرنے والے ہو۔''(68)

اگر جنگ میں پیچھے ہٹنا اور پسپائی اختیار کرنا ضروری ہو تو ایسا سپہ سالار کے حکم سے ہونا چاہیے، چنانچہ غزوہ موتہ میں ایسا ہی ہوا تھا۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ قائد کو اپنے لشکر میں موجود رہنا چاہیے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اسلامی مملکت کا سربراہ کسی لشکر کی قیادت کرتا، ایسا لشکر اکثر اوقات فتح سے ہمکنار ہوتا، لیکن جب سے سلاطین محلات میں بیٹھ گئے، جیسا کہ سلطنت عثمانیہ کے بعض ادوار میں ہوا تو انتشار اور پسپائی شروع ہوگئی۔ سلطان سلیمان قانونی نے اپنی حکمرانی کے چھیالیس برس گھوڑے کی پشت پر ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف منتقل ہوتے ہوئے گزارے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بعد ان کے دور حکومت میں مملکت کی حفاظت کا راز اسی میں تھا۔

اوپر ہم نے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غزوہ بدر اور دیگر غزوات میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے اور تمام اسباب وعوامل کو اختیار کرنے کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح ونصرت حاصل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام عملی تدابیر اختیار کرنے کے بعد اپنے پروردگار کے حضور ہاتھ اٹھا کر خشوع

وخضوع سے دعا فرمائی اور جب یہ دعائیں تدابیر کے ساتھ ملیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی، نیز گزشتہ صفحات میں ہم نے کتب سیرت ومغازی کی روشنی میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے غزوہ بدر کا نقشہ کھینچا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہترین ماہر جنگ تھے، کیونکہ آپ ﷺ نے اپنے مٹھی بھر بہادر اور دلیر صحابہ کے ذریعے کسی غلطی یا لغزش کا ارتکاب کیے بغیر اپنے پروردگار کے طے کردہ اہداف کو حاصل کر لیا۔ آپ ﷺ کی کامیابیوں کی پیشانی پر ہم ہمیشہ آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی لکھی ہوئی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ فتح یاب کیوں ہوئے تھے؟ اس لیے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول تھے۔ آپ ﷺ بہترین ماہر جنگ کیوں تھے؟ اس لیے کہ آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی تھی۔ چونکہ آپ ﷺ نے ایک بہت بھاری ذمہ داری سے عہدہ براہونا تھا، اس لیے آپ ﷺ براہ راست اپنے پروردگار سے احکامات وہدایات لیتے تھے۔ آپ ﷺ کی عظیم فراست آپ کے لیے سب سے بڑی نعمت خداوندی تھی، جس کے ذریعے آپ ﷺ انتہائی باریک بینی سے تمام خدائی احکامات کی گہرائی تک پہنچتے۔ صرف یہی عظیم اور حیرت انگیز حکمت وفراست اللہ تعالیٰ کے احکام ومشیت کو پورے طور پر سمجھتی تھی۔ فخر انسانیت صرف ایک ہی ہستی ہے، جس نے کتابِ فطرت کے حقائق کو خدائی احکامات کی کتاب ''قرآنِ مجید'' کے حقائق سے ہم آہنگ پایا۔

قرآنِ کریم کی ہر بات اللہ کی قدرت، ارادے، منصوبہ بندی اور مشیت سے وجود میں آنے والی ''کتابِ فطرت'' کے عین مطابق ہے۔ ان دو کتابوں کے درمیان ہم آہنگی ثابت کرنے، بلکہ زیادہ درست لفظوں میں ان کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی کو سمجھنے اور پھر اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

ب: جنگ احد: ایک کٹھن مرحلہ

اب ہم توفیق خداوندی سے غزوہ احد کی طرف آتے ہیں اور اس غزوے اور اس میں ظاہر ہونے والی حکمت و فراست کے تناظر میں اس عمدہ قائد، عظیم انسان اور بے مثال نبی کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

غزوہ احد میں مؤمن اور منافق، وفادار اور بے وفا، بہادر اور بزدل اور نبی کریم کے ساتھ حقیقی تعلق رکھنے والوں اور آپ ﷺ کے بارے میں دلوں میں کھوٹ رکھنے والوں کے درمیان فرق ظاہر ہوگیا، تاہم غزوہ احد کے تذکرے میں کسی قدر غم کی تلخی ہمیشہ شامل رہے گی۔

ایک دن جبل احد کے دامن سے گزرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے اس پر ایک طویل نظر دوڑائی اور پھر ارشاد فرمایا: ''جبل احد ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''(69) گویا آپ ﷺ کا یہ ارشاد چودہ صدیاں قبل جبل احد کا ان لوگوں سے دفاع ہے، جو اس کے بارے میں دل میں رنجیدگی کے جذبات رکھتے ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ جبل احد کی طرف نحوست یا بے وفائی کے منسوب کیے جانے کو پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اس معرکے میں مسلمانوں کے وقار کے مجروح ہونے پر غمزدہ دلوں کی دلجوئی کے لیے یہ بات ارشاد فرمائی۔ آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ ہم اس واقعے کے دیگر اسباب تلاش کریں۔ یہ درست ہے کہ عہد رسالت میں جس طرح مسلمانوں کا وقار اس معرکے میں مجروح ہوا کسی اور معرکے میں نہیں ہوا، لیکن اس کا سبب جبل احد نہ تھا، بلکہ جبل احد نے تو پریشانی اور اضطراب کی گھڑی میں مسلمانوں کی حفاظت کی، کیونکہ جبل احد کی پناہ لینے کی وجہ سے اسباب کے درجے میں مسلمان مکمل شکست سے دوچار ہونے سے محفوظ رہے۔

اس معرکے میں مسلمانوں کو پہنچنے والے وقتی صدمے کا حقیقی سبب بعض منافقین کا آغاز سے ہی مسلمانوں کے لشکر سے جدا ہوجانا تھا، جس کے مسلمانوں کے حوصلوں پر بُرے اثرات مرتب ہوئے، نیز بعض صحابہ کرام کا آپ ﷺ کے احکامات کی کماحقہ اطاعت نہ کرنا اور ان کے دلوں میں مالِ غنیمت جمع کرنے کی خواہش کا پیدا ہونا، گو یہ خواہش جائز تھی، بھی اس کا سبب بنا۔ بہرکیف! اس میں کوئی شک نہیں کہ غزوہ احد میں مسلمانوں کو زبردست دھچکا لگا، لیکن اس کا تعلق جبل احد کے ساتھ جوڑنا درست نہیں، اسی لیے آپ ﷺ نے ذہنوں سے اس وہم کے ازالے کے لیے جبل احد سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا۔

ذیل میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ غزوہ احد میں کیا صورت حال پیش آئی؟ میدانِ احد تک مسلمان کیسے پہنچے؟ اس معرکے کے پیش آنے کے کیا اسباب تھے؟ اور کیا اس معرکے سے گریز ممکن تھا؟ ہم اپنی گفتگو کا آغاز غزوہ احد کے تجزیے سے کریں گے، جس سے بظاہر ایک ہاری ہوئی جنگ میں بھی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ایک بے مثال ماہر جنگ سپہ سالار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے گی۔

غزوہ بدر کی شکست نے مشرکین مکہ کو عموماً اور اس معرکے میں قتل ہونے والوں کے اعزہ و اقارب کو خصوصاً غیظ و غضب میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ لوگ اہل مکہ کو انتقام اور بدلہ لینے پر مسلسل اکساتے رہے۔

یہ کوششیں صرف مکہ تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ کعب بن اشرف کی وساطت سے ان کا دائرۂ اثر مدینے تک پھیل چکا تھا۔ یہ یہودی اپنی غزلوں میں مسلمان خواتین کا تذکرہ اور ان پر بہتان تراشی کر کے مسلمانوں میں فتنے کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں زبان درازی کرنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔ اگرچہ مسلمان اس صورت حال سے سخت بے زار تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انہیں ہمیشہ صبر و تحمل اور دوراندیشی کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کا حکم ملتا۔

مشرکین نے جنگی دستے تشکیل دینا شروع کر دیئے، جو لوٹ مار مچاتے اور مدینے کے باشندوں کے حوصلوں کو پست کرنے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات انہیں اس سلسلے میں کامیابی بھی حاصل ہو جاتی۔ غزوہ بدر کے بعد یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا اور اہل مکہ مدینہ والوں پر زندگی کا دائرہ ایسے ہی تنگ کرنے لگے، جیسے جراثیم انسانی جسم کو تنگ کرتے ہیں، لہٰذا تمدن کا گہوارہ بننے کی اہلیت کے حامل ''مدینے'' کو تمام نقصان دہ جراثیم سے محفوظ رکھنا ناگزیر ہو گیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں مختلف اقدامات کیے۔ اسی عرصے میں اسلام کے شدید ترین دشمن کعب بن اشرف کو قتل کیا گیا۔ چونکہ وہ سازشوں کا جال بننے والوں کا سرخیل تھا، اس لیے اس کا خاتمہ ضروری تھا۔ یہ ذمہ داری محمد بن مسلمہ نے سرانجام دی۔ [70]

بنوقینقاع کے یہودیوں نے بھی مشکلات پیدا کرنا شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے ایک مسلمان خاتون کو چھیڑا، جس کے نتیجے میں ہنگامہ کھڑا ہوا اور دونوں جانب سے کچھ افراد قتل ہو گئے، نیز انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ اپنے مضبوط قلعوں کے زعم میں رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''اے محمد! تم اس گھمنڈ

میں نہ رہو کہ جنگ سے ناواقف ایک قوم سے مقابلے میں تمہیں کامیابی ہوئی ہے۔ بخدا!! اگر تمہاری ہمارے ساتھ جنگ ہوئی تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف فوج کشی کی، کیونکہ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ ان پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ کسی بھی وقت مسلمانوں کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں، تاہم یہودیوں کو اپنے کیے پر ندامت ہوئی اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے، لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ کو ان پر بھروسا نہ تھا، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں مدینے سے جلاوطن کر دیا۔[71] ان کے نکل جانے سے مدینہ منورہ کے امن وامان کی صورت حال پہلے سے کافی بہتر ہو گئی۔

اس عرصے میں مکہ میں انتقام کا لاوہ پک رہا تھا۔ ابوسفیان نے قسم اٹھائی تھی کہ جب تک وہ مسلمانوں سے انتقام نہ لے لے گا، اس وقت تک خوشبو استعمال نہ کرے گا، چنانچہ وہ بنونضیر کے یہودیوں کے علاقے میں آیا اور مسلمانوں کے دو ایک گھروں کو نذرِ آتش کر کے مکہ کی طرف فرار ہو گیا۔[72]

رسول اللہ ﷺ کو اپنے وضع کردہ خفیہ خبر رسانی کے نظام کے ذریعے پل پل کی خبر پہنچ رہی تھی۔ آپ ﷺ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش کیل کانٹے سے لیس ہو کر مردوں اور عورتوں اور اپنے بعض حلیف قبائل کے ہمراہ مدینے کی طرف آ رہے ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہم اہم مشیروں کو جمع فرما کر ان سے اس بارے میں مشورہ کیا۔

رسول اللہ ﷺ کی رائے مدینے میں رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کی تھی، تاکہ جس طرح قریش کو غزوہ بدر میں ایک غیر متوقع جنگی حکمت عملی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اسی طرح اس دفعہ بھی وہ ایک غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہوں۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ قریش معرکہ بدر کی دوبدو جنگ کے تجربے کی روشنی میں ایک دوبدو جنگ کی تیاری کر کے آئے تھے، اس لیے اگر مسلمان مدینے میں رہ کر دفاعی جنگ لڑتے تو قریش زیادہ عرصے تک مدینے کا محاصرہ نہ کر سکتے اور آخر کار مایوس ہو کر مکہ واپس لوٹنے پر مجبور ہو جاتے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی رائے عورتوں اور بچوں کو قلعوں میں بھیج کر خود مدینے میں رہنے کی تھی، تاکہ اگر دشمن مدینے میں داخل ہو تو اس کے ساتھ گلیوں میں جنگ لڑی جائے اور چھتوں کے اوپر سے اس پر تیر برسائے جائیں۔[73]

اس حکمت عملی سے رسول اللہ ﷺ کے پیشِ نظر درج ذیل اہداف تھے:

الف: جنگ مسلمانوں کا مقصد نہیں، بلکہ وہ امن وسلامتی کے علمبردار ہیں۔

ب: لیکن اگرکوئی حق کی اشاعت میں رکاوٹ بنے تو اسے دور کرنے کے لیے وہ کسی بھی قسم کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

ج: جب مسلمانوں پرکوئی حملہ آورہوتا ہے تو وہ دین،عزت وآبرواوروقار کی حفاظت کے لیے لڑتے ہیں۔یہ ان کا جائز حق ہے۔جب انہیں لڑنا پڑے تووہ صرف اسی حق کے لیے لڑتے اورمرتے ہیں۔

مسلمانوں کے گردونواح میں حالات پرنظر رکھنے والے لوگوں کومسلمانوں کے بارے مذکورہ بالا تاثرات دینے اوران کے بارے میں صحیح صورت حال بتانے کی ضرورت تھی۔

۱۔ غزوہ اُحد سے پہلے مشاورت کا اہتمام

رسول اللہﷺ دفاعی جنگ لڑنا چاہتے تھے۔اسی دوران آپﷺ نے ایک خواب دیکھا اور اپنے صحابہ کو بتایا:''بخدا!میں نے بھلائی دیکھی ہے۔میں نے ایک گائے اوراپنی تلوار کی دھار پر کند ہونے کا نشان دیکھا ہے،نیز میں نے دیکھا ہے کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے،جس کی تعبیر میں نے''مدینہ'' سے لی ہے۔'' آپﷺ نے اپنے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:''گائے سے میرے بعض شہید ہونے والے صحابہ مراد ہیں۔اپنی تلوار کی دھار پر کند ہونے کا جونشان میں نے دیکھا ہے،اس سے میرے اہل بیت میں سے شہید ہونے والا ایک فرد مراد ہے۔'' زرہ سے آپﷺ نے مدینہ منورہ مراد لیا اور مدینہ میں ٹھہرے رہنے کو پسند فرمایا۔اس سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیﷺ کو دفاعی جنگ لڑنے کا اشارہ دیا تھا اور کند ہونے کا نشان شیر خدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی طرف اشارہ تھا۔(74)

بعض صحابہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے۔وہ شہادت کے طلبگار تھے اوراللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لی تھیں۔ایسے ہی ایک صحابی حضرت انس بن نضر کہتے تھے:''رسول اللہﷺ نے پہلی مرتبہ جس غزوے میں شرکت فرمائی،میں اس میں شرکت نہ کرسکا۔اگراللہ تعالیٰ نے رسول اللہﷺ کے ساتھ کسی اورغزوے میں مجھے شرکت کا موقع دیا تو اللہ تعالیٰ میری کارکردگی دیکھ لیں گے۔'' وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کی دعا کرتے اورجلد ازجلد شہادت کے خون میں لت پت ہوکر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔حضرت انس جیسے حضرات نے اپنی اس خواہش کو ایک سال تک بڑی مشکل سے دبائے رکھا اوراللہ تعالیٰ سے شہادت کی آرزو کے پورے ہونے کی دعائیں کرتے رہے۔اللہ تعالیٰ ایسی دعاؤں کو رد نہیں فرماتے،چنانچہ ان کی یہ دعائیں قبول ہوئیں۔(75)

حضرت عبداللہ بن جحش، عمرو بن جموح اور سعد بن ربیع رضی اللہ عنہم بھی ان صحابہ میں سے تھے، جوشہادت کے منتظر اوراس کے لیے کوشاں رہتے اور ہر رات اس کے خواب دیکھتے، نیز اس موقع پر ہمیں حضرت سمیراء رضی اللہ عنہا اوران کے بیٹوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے ہی حضرات نے اس روز مشاورت کے دوران فیصلے کے پلڑے کو اپنی طرف جھکا لیا۔

رسول اللہ ﷺ معاشرے کی بنیادوں کو مشاورت کے اصول پر استوار و محکم کرنا چاہتے تھے اوراسی اصول کے ذریعے تمام مسائل کو حل فرماتے۔ آپ ﷺ ایسا طرز عمل اس لیے اختیار فرماتے تاکہ معاشرے کا ہر فرد زیر غور معاملے کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھے اور چونکہ اس نے اس سے متعلق مباحث میں شرکت کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اس لیے اس کی پوری حمایت کرے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو وحی آسمانی کی تائید حاصل تھی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ صحابہ کرام سے مشاورت فرماتے تاکہ بعد میں کوئی مسلمان یہ نہ کہہ سکے کہ اگر ایسا کرتے تو ایسا ہوتا۔ آپ ﷺ صحابہ کرام سے مشاورت فرما کر ان کے رائے لیتے اور آخر میں اپنی ذاتی رائے پیش فرماتے۔

اس روز غزوہ بدر میں شرکت نہ کرسکنے والے پرجوش نوجوانوں نے کہا: ''ہم اسی دن کے آرزومند تھے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دن دیکھنے کی دعا کرتے تھے، چنانچہ آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھا دیا ہے اور منزل کو قریب لے آئے ہیں۔'' ایک انصاری صحابی نے عرض کی: ''یارسول اللہ! اگر ہم ان سے اپنے گھر کے قریب نہیں لڑیں گے تو پھر کہاں لڑیں گے۔'' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی! ہم ان سے ضرور لڑیں گے۔'' حضرت نعیم بن مالک نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! ہمیں جنت سے محروم نہ فرمائیے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں اس میں ضرور داخل ہوکر رہوں گا۔''(76)

رسول اللہ ﷺ دوسرے معرکے میں پہلے معرکے والی حکمت عملی نہیں اپنانا چاہتے تھے، بلکہ دشمن کو ہر دفعہ ایک نئی اور غیر متوقع صورت حال سے دوچار کرنا چاہتے تھے، لیکن نوجوان صحابہ دوسری رائے پر اصرار کر رہے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوئے اور جنگی لباس پہن کر تلوار لٹکالی۔ جب صاحب رائے صحابہ کرام نے یہ صورت حال دیکھی تو انہیں احساس ہوگیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ان کی مرضی کے خلاف پر مجبور کیا ہے، چنانچہ جب آپ ﷺ باہر تشریف لائے تو انہوں نے عرض کی: ''یارسول اللہ! اگر آپ چاہیں تو بیٹھ جائیں۔'' لیکن اب فیصلہ ہو چکا تھا، جس سے پیچھے ہٹنا درج ذیل وجوہ کی بنا پر درست نہ تھا۔

اول: اس سے دوسروں کی رائے پر زد پڑتی اور نتیجتاً دور یا تسلسل (Vicous Circle) لازم آتا، نیز چند افراد کی خواہش یا رائے کی وجہ سے طے شدہ فیصلے سے پیچھے ہٹنا بہت بڑی غلطی تصور ہوتا ہے، جس کی کسی معمولی قائد سے بھی توقع نہیں رکھی جا سکتی، چہ جائیکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی توقع رکھی جاتی۔ آپ ﷺ سے اس قسم کی غلطی کا صادر ہونا ناممکن تھا۔

دوم: دفاعی جنگ کی صورت میں اگر کوئی غیر متوقع صورتحال پیش آتی یا کوئی غیر معمولی نقصان ہوتا تو اس حکمت عملی کے مخالفین کو اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا۔ ایسی صورت حال کے پیش آنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سوم: دفاعی جنگ میں حاصل ہونے والی کامیابی، شہرت اور مالِ غنیمت کا دوبدو جنگ میں حاصل ہونے والی کامیابی، شہرت اور مالِ غنیمت سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حکمت عملی سے ناخوش لوگ اس بات سے بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

بہر کیف! مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر وجوہات کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی نبی کے لیے اسلحہ پہن لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اسے اتارنا مناسب نہیں۔''[77] کیونکہ اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت مبارکہ ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (آل عمران:١٥٩) ''اور (جب کسی کام کا) عزم مصمم کر لو تو خدا پر بھروسا رکھو۔'' میں آپ ﷺ کو غیر متزلزل اور ثابت قدم رہنے کا حکم دیا ہے۔ معمولی سا تذبذب بھی آپ ﷺ کے پیروکاروں کے دلوں میں پریشانی اور تردد پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ ہر نیا فیصلہ اکثریت کی رائے میں مزید اختلاف کا باعث بنتا، جس کے نتیجے میں کمزوری اور انتشار میں اضافہ ہوتا۔

اگرچہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کے حق میں تھے، لیکن جب مشاورت کے دوران دوبدو جنگ کی حمایت کرنے والوں کا پلڑا بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ نے مشاورت میں طے پانے والے معاملے پر عملدرآمد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور اس فیصلے سے کسی بھی صورت میں پیچھے ہٹنا مناسب نہ تھا، بلکہ اگر شوریٰ کے طریق کار کو مستحکم کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو ستر کی بجائے ستر ہزار افراد کی قربانی دینی پڑتی تو بھی آپ ﷺ ذرا تردد نہ فرماتے۔ معرکہ بدر فتح مبین تھی اور معرکہ اُحد کم از کم اس کے مشابہ ضرور تھا۔

۲- میدانِ احد کی طرف پیش قدمی

رسول اللہ ﷺ نے فوراً میدانِ احد کی طرف روانہ ہونے کا حکم ارشاد فرمایا تا کہ مسلمانوں کا لشکر

اُحد کے مقام پر پہنچ کر دشمن کو مدینہ پر حملہ آور ہونے سے روک دے۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا۔ اب اگر دشمن مدینہ میں داخل ہوتا تو پیچھے سے اس کا محاصرہ کر کے اس کی نقل و حرکت کو مفلوج کر دیا جاتا۔ اگرچہ یہ فیصلہ فوری طور پر کیا گیا تھا، لیکن متبادل حکمت عملی پہلے سے موجود تھی۔

مسلمانوں نے جبل اُحد کے دامن میں پہنچ کر صف بندی کر لی۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی۔ اگرچہ عبداللہ ابی بن سلول ابتدا میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے لیے نکلا تھا، لیکن بعد میں اپنے تین سو آدمیوں کے ہمراہ اس بنیاد پر واپس لوٹ آیا کہ مسلمانوں نے اس کی رائے کو اہمیت نہیں دی۔ (78) زرہ پوش مسلمانوں کی تعداد ایک سو تھی۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ (79) جبکہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ گھڑسواروں اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پیادہ فوج کی قیادت کر رہے تھے۔

دشمن کو پیچھے سے آ کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لیے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیر اندازوں کو ایک اہم اور حساس مقام پر تعینات کر کے ان سے فرمایا: ''تیروں کے ذریعے گھڑسواروں کو ہم سے دور رکھنا۔ وہ ہمارے پیچھے سے نہ آ پائیں۔ ہمیں فتح ہو یا شکست تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہنا۔ تمہاری طرف سے دشمن ہم پر ہرگز حملہ نہ کر پائے۔''(80)

رسول اللہ ﷺ نے تمام ضروری اقدامات اٹھائے۔ اس دفعہ آپ ﷺ نے اپنی فوج کی صف بندی کرنے کی بجائے اسے جبل احد کے دامن تک کمان کی صورت میں پھیلا دیا تاکہ مسلمان دشمن کا گھیراؤ کر کے پہلے اس پر تیر برسائیں اور پھر دشمن کے قلب پر عبداللہ ابن جحش، مصعب بن عمیر، ابودجانہ اور سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم جیسے شیر دل شہادت کے متوالوں کے ذریعے حملہ کیا جائے۔

غزوہ بدر میں مسلمانوں کا شعار ''اَحد! اَحد!'' تھا، لیکن غزوہ اُحد میں ان کا شعار ''أمت! أمــت!'' ''مرجا! مرجا!'' تھا۔ اس دفعہ جہاں جنگ کی حکمت عملی اور شعار مختلف تھا، وہیں مسلمان اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں اپنی جانوں کا دفاع کرتے ہوئے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

طے شدہ حکمت عملی کے مطابق مسلمان تیار کھڑے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک میں ایک تلوار لہراتے ہوئے فرمایا: ''کون اس کا حق ادا کرنے کی شرط پر اسے لے گا۔'' یہ سن کر مسلمانوں میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر ایک اس تلوار کو لینے کا متمنی تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ جو اپنے

صحابہ کو خود ان سے بھی بہتر طور پر جانتے تھے، کی آنکھیں اس تلوار کے مستحق کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اچانک حضرت ابودجانہ نے پوچھا: ''یارسول اللہ ﷺ! اس کا حق کیا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے کند ہونے تک اس کے ذریعے دشمن سے لڑتے رہو۔'' اس پر ابودجانہ نے عرض کی: ''یارسول اللہ! میں اس کا حق ادا کرنے کی شرط پر اسے لیتا ہوں۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے وہ تلوار انہیں دے دی۔

حضرت ابودجانہ بڑے بہادر انسان تھے اور جنگ کے وقت اترا کر چلتے تھے۔ ان کے پاس سرخ رنگ کی ایک پٹی تھی، جو جنگ کے وقت ان کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ جب وہ پٹی باندھ لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب وہ لڑائی کرنے والے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے تلوار لے کر اپنی وہ پٹی نکالی اور باندھ لی۔ اب بھلا ان کے سامنے کون ٹھہر سکتا تھا، چنانچہ واقعی ان کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا۔ اگرچہ مذکورہ بالا گفتگو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوئی تھی۔ (81) لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں معرکہ اُحد کے اختتام پر سارے حق پرست لشکر کی یہی کیفیت تھی۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے ایسے دشمن کا سامنا ہونے کی دعا مانگتے جو انہیں قتل کر دے۔ سبحان اللہ! ان بہادر اِن قوم کے دلوں میں آخرت کے شوق کی کیسی آگ لگی ہوئی تھی! حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی آواز سے تو شیروں کے دل بھی خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔

موت کے ان متوالوں کو دشمن کے اگلے حصے پر حملہ کرنے کے لیے بھیجنے کی حکمت عملی قریش کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ ابوسفیان غزوہ بدر جیسی صورت حال کا منتظر تھا، لیکن اچانک اسے غزوہ بدر سے مختلف صورت حال سے دوچار ہونا پڑا اور مسلمانوں کے ''اَمِــت اَمِــت'' کے نعروں سے مشرکین بخار میں مبتلا شخص کی طرح کانپنے لگے۔ چونکہ مشرکین کے لیے یہ بالکل غیر متوقع صورت حال تھی، اس لیے وہ جلد ہی پسپا ہو گئے۔ یہ غزوہ اُحد کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے لشکر کو مدینے اور جبل احد کے درمیان پھیلا دیا تھا، اس وقت جبل احد مسلمانوں کی پشت کی جانب تھا۔ آپ ﷺ نے ایک مناسب مقام پر تیر اندازوں کو تعینات کر کے ان کے امیر سے فرمایا تھا: ''تیروں کے ذریعے گھڑ سواروں کو ہم سے دور رکھنا۔ وہ ہمارے پیچھے سے نہ آ پائیں۔ ہمیں فتح ہو یا شکست تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہنا۔ تمہاری طرف سے دشمن ہم پر ہرگز حملہ نہ کر پائے۔'' ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: ''اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمیں اٹھا کر لے جا رہے ہیں، تب بھی جب تک میں تمہاری طرف پیغام نہ بھیجوں، اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹنا اور اگر تم ہمیں دشمن پر فتح مند ہوتے دیکھو تب بھی جب تک میں نہ کہوں اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔'' (82) اس

کے بعد آپ ﷺ نے اپنے لشکر کے بہادروں کو دشمن کے لشکر پر حملہ کرنے کے لیے کہا، جس کی تاب نہ لاتے ہوئے، دشمن کی فوج فوراً پسپائی اختیار کر گئی۔ دشمن کو اتنی بری ہزیمت ہوئی کہ جلد عورتوں کے خیموں تک جا پہنچا۔ ابو دجانہ لڑتے ہوئے دشمن کے لشکر کے قلب میں پہنچ گئے، جہاں ابوسفیان کی بیوی ہند موجود تھی اور اس کے خیال میں یہ محفوظ ترین جگہ تھی۔ ابو دجانہ نے ایک شخص کو لوگوں کو جوش دلاتے ہوئے دیکھا۔ جب انہوں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے واویلا کیا، جس سے انہیں پتا چلا کہ یہ تو عورت ہے۔ ابو دجانہ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی تلوار کو ایک عورت کے قتل سے محفوظ رکھا۔''(83)

صحابہ کرام نے اپنی ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ نبھایا اور اپنے فرض کو پوری طرح ادا کیا، جس پر ان سب کو خوشنودیِ خداوندی کا پروانہ ملا۔ سورۃ آلِ عمران نے صحابہ کرام کی جدوجہد اور بہادری کو وضاحت سے بیان کیا ہے اور انبیائے سابقین اور ان کے گرد موجود بہادر سپاہیوں کی شجاعت کی مثالوں کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کے گرد موجود بہادرانِ قوم کی بہادری اور دلیری کی درج ذیل الفاظ میں منظر کشی کی ہے: ﴿وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ()وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ()فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (آل عمران:١٤٦-١٤٨) ''اور بہت سے نبی ہوئے ہیں، جن کے ساتھ ہو کر اکثر اہل اللہ (خدا کے دشمنوں سے) لڑے ہیں تو جو مصیبتیں ان پر راہِ خدا میں واقع ہوئی ہیں، ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ بزدلی کی، نہ (کافروں سے) دبے اور خدا استقلال رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور (اس حالت میں) اُن کے منہ سے کوئی بات نکلتی تو یہی کہ اے پروردگار! ہمارے گناہ اور زیادتیاں جو ہم اپنے کاموں میں کرتے ہیں، معاف فرما اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافروں پر فتح عنایت کر، تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ (دے گا) اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔'' اگرچہ یہ آیات مبارکہ ربانیین سے متعلق ہیں، لیکن اگر ہم اس پہلو سے دیکھیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو یہ جنگ احد کے شرکا کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، کیونکہ ان کا نزول جنگ احد کی مناسبت سے ہوا ہے۔

۳- غزوہ اُحد کے مختلف مراحل

جنگ اُحد کے درج ذیل تین مراحل ہیں:

الف: پہلا مرحلہ

پہلے مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کے فوری طور پر اٹھائے گئے اقدامات کی کامیابی جھلکتی ہے۔ اگرچہ اس مرحلے میں بھی بعض صحابہ شہید ہوئے، لیکن حضرت حمزہ، ابو دجانہ اور عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہم جیسے بہادروں نے مشرکین کے سروں کی پکی ہوئی فصل کو کاٹ کر انہیں عبرتناک شکست سے دوچار کیا اور خود فتح سے ہمکنار ہوئے حتیٰ کہ مشرکین کی عورتوں نے چیخ چیخ کر انہیں بھاگنے سے روکنے کی کوشش کی اور انہیں اس پر شرم دلائی، لیکن ان کی یہ چیخ وپکار اہل مکہ کی فوج کو فرار ہونے سے نہ روک سکی۔

معتبر تاریخی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معرکے میں منافقین کے لوٹ جانے کے بعد مسلمانوں کی تعداد سات سورہ گئی تھی، جبکہ دشمن کی فوج تقریباً تین ہزار افراد پر مشتمل تھی، یعنی دشمن کی تعداد مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھی اور ہر مسلمان کے مقابلے میں چار سے زائد مشرکین تھے۔ قریش اپنے ساتھ عورتیں اور بچے بھی لائے تھے، جو دف بجا کر اپنی فوج کو جوش دلا رہے تھے۔

مشرکین کی فوج کیل کانٹے سے لیس تھی، لیکن اس کے باوجود غزوہ بدر کی طرح اس موقع پر بھی انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں شکست کا سامنا ہوا، تاہم اس دوران مسلمانوں سے نبی کریم ﷺ کے فرامین کی رعایت نہ کرنے کی بہت بڑی لغزش ہوئی۔ ہم اس طرز عمل کے لیے "الـزلة" (لغزش) کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کیونکہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے اس قدر مقرب بندے تھے، گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ مؤمن کامل تھے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے آخرت کو اس قدر پیش نظر رکھتے تھے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ وہ اللہ کی بندگی ایسے کرتے جیسے اسے دیکھ رہے ہوں اور ہر چیز کو ہماری بہ نسبت ایک مختلف زاویے سے دیکھتے۔ قرب خداوندی کے اس مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے ان سے دل ودماغ کے خیالات پر بھی مؤاخذہ ہوتا۔ یہ صدمہ مقربین خدا کے لیے آزمائش تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو غزوہ احد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ میں بعض دیگر مؤرخین کی طرح اس معرکے کو مسلمانوں کی شکست تصور نہیں کرتا۔ میرے نزدیک اس کے لیے ''ہزیمت'' کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں۔ میں اسے غزوہ احد کے ایک مرحلے میں مسلمانوں کو پہنچنے والا صدمہ کہنا پسند کرتا ہوں۔

ب: دوسرا مرحلہ

دشمن شکست سے دوچار ہو کر افراتفری میں بھاگنے لگا۔ اس موقع پر مسلمانوں کو غزوہ بدر کی

صورتحال کا یاد آنا فطری بات تھی۔ چونکہ اس دن بھی دشمن اسی طرح بھاگا تھا، اس لیے انہوں نے سمجھا کہ اس دن کی طرح آج بھی انہیں فتح حاصل ہو چکی ہے اور اب مالِ غنیمت جمع کرنے کا موقع ہے۔ دشمن اپنا مال واسباب چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا اور اونٹ اور گھوڑے مسلمانوں کے منتظر کھڑے تھے۔ بظاہر مالِ غنیمت جمع کرنے سے کوئی امر مانع نہ تھا، لہٰذا تیرانداز بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے۔ اگرچہ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں رسول اللہ ﷺ کا حکم یاد دلایا، لیکن وہ آپ ﷺ کے حکم کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے۔ ان کی رائے میں آپ ﷺ کے حکم کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے اختتام تک اپنی اپنی جگہوں پر رہا جائے، چونکہ اب جنگ ختم اور دشمن پسپا ہو چکا ہے، اس لیے اب یہاں رہنا ضروری نہیں۔ ان کے خیال میں شکست خوردہ دشمن کا پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ غزوہ احد کا دوسرا مرحلہ تھا۔

ج: تیسرا مرحلہ

تیراندازوں کا اپنی جگہیں چھوڑنا صفوں میں رخنہ ڈالنے کے مترادف تھا اور خالد بن ولید جیسے عبقری قائد کی نظروں سے اس بات کا اوجھل ہونا ممکن نہ تھا۔ انہیں ایک بہترین موقع مل چکا تھا۔

چنانچہ مسلمان تلواریں نیاموں میں ڈالے مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف تھے اور بعض آرام کے لیے خیموں میں جا چکے تھے کہ خالد بن ولید اپنی جگہوں پر موجود چند ایک تیراندازوں کو قتل کرتے ہوئے مسلمانوں کے عقب سے ان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان بے خبری کے عالم میں گھیرے جا چکے تھے، نیز جنگ کے لیے درکار نفسیاتی کیفیت بھی ان میں معدوم ہو چکی تھی۔ اس سے بھی خالد بن ولید کو فائدہ پہنچا اور ان کا کام آسان ہو گیا۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔

یہاں ایک اور نقطے کے طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مسلمان غزوہ احد کے لیے نکلتے وقت تذبذب کا شکار تھے۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں رہنا چاہتے تھے، لیکن صحابہ نے باہر نکلنے پر اصرار کیا تھا۔ یہ ان کے طرز عمل کا منفی پہلو تھا پھر دوسری لغزش ان سے یہ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے تیراندازوں کو اپنی جگہوں پر ڈٹے رہنے اور انہیں نہ چھوڑنے کا حکم دیا تھا، لیکن انہوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ قرآن کریم ان لغزشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا﴾ (آل عمران: ۱۵۵) ”ان کے بعض افعال کے سبب شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔“ یعنی

آغاز میں ان سے مدینے میں رہنے کے لیے کہا گیا، لیکن انہوں نے مدینے سے نکلنے پر اصرار کیا پھر جنگ کے دوران تیراندازوں کو اپنی جگہوں پر ڈٹے رہنے کا کہا گیا، لیکن وہ مال غنیمت جمع کرنے یا اس کے جمع کرنے میں دوسرے مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے اپنی جگہوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مسلمان پہلی نصیحت پر کان نہ دھرنے کی وجہ سے برائی کے چکر (Vicous Circle) میں پھنس گئے، جس کے نتیجے میں ان سے دوسری بار بھی غلطی سرزد ہوئی۔ اگر اللہ تعالیٰ بُرائی کے اس چکر کے تسلسل کو نہ روکتے تو مسلمانوں سے پے در پے غلطیاں ہوتیں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے، اس لیے اس نے اپنی اس مقرب جماعت کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا۔

صحابہ کرام یہ سمجھ کر کہ جنگ ختم ہو چکی ہے، مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوئے تھے۔ اگرچہ عام لوگوں کے لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کے حق میں یہ لغزش تھی، یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کو بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے پر تنبیہ فرمائی تھی۔[84] جس پر نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رو پڑے اور انہیں روتے ہوئے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔[85] ان کے دلوں میں دنیا کی طرف میلان تھا اور نہ ہی ان کو یہ شایاں تھا، بلکہ ان کے لئے دنیا سے دور رہنا ضروری تھا۔ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن مقربین خدا کا شہداء کے خون سے رنگین میدان میں مالِ غنیمت اکٹھا کرنا بعد میں ان کے لیے شدید احساسِ ندامت کا باعث بنتا، تاہم اللہ تعالیٰ نے انہیں فوری طور پر تنبیہ فرما کر اس ندامت سے بچا لیا۔

لیکن اس کے بعد ایک اور مصیبت پیش آ گئی۔ ہر نئی مصیبت پہلی مصیبت کو فراموش کرا دیتی۔ یکے بعد دیگرے مصائب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے بڑی مصیبت مشرکین کا رسول اللہ ﷺ کا محاصرہ کرنا اور آپ ﷺ کی شہادت کی افواہ کا پھیلنا تھا۔ یہ خبر مسلمانوں پر بجلی بن کر گری اور اس نے پہلی تمام مصیبتوں کو فراموش کرا دیا، تاہم اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی اور مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دشمن کے آپ ﷺ تک پہنچنے سے پہلے ہی آپ ﷺ کے گرد انسانی گوشت پوست کا مضبوط حصار بنا لیا۔ کتنی ہی خواتین جو ہاتھ میں پانی کا مشکیزہ اور زخمیوں کے لئے مرہم لیے زخمیوں کو پانی پلانے اور ان کی مرہم پٹی کرنے کے لیے نکلی ہوئی تھیں، رسول اللہ ﷺ کی مدد کے لیے جا پہنچیں۔ ان میں سب سے پیش پیش حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ جو منظر ان کے سامنے تھا اسے دیکھ کر خوف سے رگوں میں خون جم جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے گرد گوشت

پوشت کا حصار ایک ایک کر کے گرتا جا رہا تھا اور دشمن آہستہ آہستہ آپ ﷺ کے قریب آ رہا تھا۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ آپ ﷺ کے گرد گوشت پوست کے حصار کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مکمل طور پر گرنے سے پہلے آپ تک دشمن کی رسائی محال تھی۔ بغض و عداوت کی ہر تلوار آپ ﷺ پر سونتی ہوئی تھی اور غم و غصے کے تیر اور نیزے آپ ﷺ پر برسائے جا رہے تھے، لیکن یہ سب کے سب آپ ﷺ کو اپنے حصار میں لیے ہوئے اہل ایمان میں سے کسی نہ کسی سے ٹکرا رہے تھے حتیٰ کہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ آپ ﷺ کے گرد موجود ہر بازو کاٹ دیا گیا اور ہر سر اڑا دیا گیا اور غصے میں بھرے ہوئے دشمن کا ایک گروہ آپ ﷺ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان سے میرا دفاع کون کرے گا؟'' یہ سنتے ہی حضرت نسیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ میں موجود چیزوں کو پھینکا اور یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ کی طرف دوڑ پڑیں: ''یارسول اللہ ﷺ! میں آپ ﷺ کی حفاظت کروں گی۔'' چنانچہ وہ اپنی تلوار لے کر دائیں بائیں سے آپ ﷺ کا دفاع کرنے لگیں۔ وہ آئی تو زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے تھیں، لیکن جب حالات کی سنگینی بڑھی تو وہ غضبناک شیرنی بن گئیں۔ رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے ان کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی، جس کا ایک بازو تلوار کے وار سے کٹ چکا تھا۔ وہ اس کی طرف دوڑیں اور اس کے زخم پر پٹی باندھ کر اس سے کہا: ''جاؤ! رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرو۔'' اور پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے اتنے کم فاصلے پر لڑ رہی تھیں کہ انہیں آپ ﷺ کی زیرِ لب گفتگو بھی سنائی دے رہی تھی پھر اچانک ان کی کمر میں ایک گہرا زخم لگا۔ پہلے انہوں نے اپنے بیٹے کو لڑائی کے لیے بھیجا تھا اور اب خود رسول اللہ ﷺ کے قرب میں لڑ رہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم جیسا حوصلہ کس کا ہوگا؟'' انہوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی: ''یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مجھے آپ کی رفاقت نصیب ہو۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے جنت میں اپنی رفاقت کی دعا کی۔ (86) جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ دعا سنی تو انہوں نے کہا کہ وہ قیامت تک آپ ﷺ کے دفاع میں لڑ سکتی ہے۔

ان صحابیہ کی زندگی اس قسم کے مفاخر سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے عقبہ میں رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی اور آپ ﷺ کو مدینے تشریف لانے کی دعوت دی۔ ان کی بدولت ان کے تمام افرادِ خانہ اسلام لے آئے۔ انہوں نے غزوہ احد میں رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا اور موت کا بہادری سے سامنا کیا۔ وہ پردے کی آیات کے نزول پر اس وجہ سے غمزدہ ہو گئیں کہ اب ان کے لیے عملی جہاد میں حصہ لینا ممکن نہ ہوگا۔ جب جھوٹے نبیوں کا ظہور ہوا تو وہ جنگ یمامہ میں شریک ہوئیں،

جہاں ان کا ایک بازو کٹ گیا اور بیٹا شہید ہو گیا۔ بلاشبہ انہوں نے ایک انتہائی غیر معمولی خاتون کی طرح زندگی بسر کی۔ (87)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ غزوہ احد کے موقع پر لڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر کو سچا سمجھنے والے مسلمانوں کو پکار پکار کر کہہ رہے تھے: ''رسول اللہ ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ اٹھو اور جس مقصد کی خاطر رسول اللہ ﷺ نے اپنی جان دی ہے، اس کی خاطر تم بھی اپنی جان دے دو۔'' (88) رسول اللہ ﷺ کے گرد پھر سے صحابہ جمع ہو گئے، دشمن کا حملہ پسپا کر دیا گیا اور صدمہ ختم ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے نئی حکمت عملی بنائی اور ان صحابہ کرام کو دوبارہ ہدایات دینی شروع کر دیں، جنہوں نے آپ ﷺ کے پہلے احکامات کی حکمتیں نہ سمجھی تھیں۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ربیع کی تلاش کا حکم دیا۔ ایک انصاری صحابی ان کی تلاش میں نکلے اور انہیں زخمیوں میں ایسی حالت میں پایا کہ ان میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی۔ حال پوچھنے پر انہوں نے فرمایا: ''میں مرنے والا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ سے میرا اسلام کہنا اور آپ ﷺ کو میری طرف سے کہنا: 'کسی نبی کو اس کی امت کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے جو بدلہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بہتر بدلہ ہماری طرف سے آپ کو عطا فرمائے۔' میری قوم کو میرا اسلام پہنچا کر ان سے کہنا کہ سعد تم سے کہہ رہا تھا: 'اگر تم میں سے ایک بھی شخص کے زندہ ہونے کی حالت میں رسول اللہ ﷺ تک دشمن کی رسائی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارا کوئی عذر قبول نہ ہوگا۔'' وہ انصاری ان کی روح کے پرواز کرنے تک ان کے پہلو میں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ان انصاری صحابی نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت سعد کی گفتگو آپ ﷺ تک پہنچا دی۔ (89)

شہادت کے رتبے پر فائز ہونے کی دعا کرنے والوں کی دعاؤں کا قبول ہونا بالکل فطری بات تھی۔ حضرت انس بن نضر، عبداللہ بن جحش اور حمزہ بن عبدالمطلب نے شہادت کی دعا مانگی تھی، لہٰذا ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ شہادت کا رتبہ پا کر آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ جو حضرات شہید نہ ہوئے تھے، وہ خون میں لت پت پڑے تھے۔ جبل احد بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس موقع پر ایک اور قسم کی آہ و بکا بھی تھی۔ یہ ان دلوں کی آہ و بکا تھی، جنہیں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر پہنچی تھی۔ اس افواہ کے نتیجے میں ان کے دل حزن والم سے اس قدر لبریز ہو گئے کہ ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ بعض صحابہ مدینے لوٹ کر مزید مجاہدین لانے کا سوچ رہے تھے اور بعض دیگر صحابہ کچھ اور حکمت عملیوں پر غور و فکر کر رہے تھے۔ صحابہ کرام اسی پریشانی اور اضطراب کی کیفیت میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے کہ ان کے کانوں میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی کڑکدار آواز پڑی:

''مسلمانو! خوش ہو جاؤ! رسول اللہ ﷺ یہاں ہیں۔'' یہ پکار غزوہ احد میں مسلمانوں کے لئے نئی زندگی کا پیغام تھا۔ مسلمان جلدی سے آپ ﷺ کی طرف لپکے اور آپ ﷺ کے گرد پھر سے گوشت پوست کی دیوار کھڑی کر دی۔ بعض صحابہ اپنے جسموں کے ذریعے آپ ﷺ کا بچاؤ کر رہے تھے، بعض آپ ﷺ کے رخساروں سے خود کے حلقے نکالنے کی کوشش کر رہے اور بعض مسلمانوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ غرض سارے مسلمان آپ ﷺ کی ایسے ہی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جیسے انسان اپنی آنکھ کی حفاظت کرتا ہے۔[90] وہاں کوئی بھی ایسا مسلمان نہ تھا، جو آپ ﷺ کے ایک دانت مبارک پر اپنی جان فدا کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کے گرد جمع ہو کر دوبارہ کبھی بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑنے کی قسم اٹھائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عظیم قائد کی طرح معاملات کی باگ دوڑ دوبارہ سنبھال لی اور گزشتہ لغزشوں کے اثرات سے محفوظ ایک نئی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے گرد موجود مسلمانوں کو بتدریج جبل احد کی طرف لے آئے اور یہاں کامیابی کا پیش خیمہ بننے والے تیسرے مرحلے کی حکمت عملی کا آغاز کیا۔[91]

۴۔ صدمے سے فتح تک

یہ تیسرا مرحلہ کھلی فتح تھی، کیونکہ مسلمانوں نے اس میں دشمن کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ درحقیقت ابوسفیان مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، کیونکہ وہ مدینے پر چڑھائی کے ارادے سے آیا تھا، لیکن صفوان بن امیہ نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا: ''مسلمان شدید غم و غصے کی حالت میں ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک انداز میں نہ لڑ پڑیں، اس لیے واپس چلو۔'' چنانچہ وہ لوٹ گئے۔[92]

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے بظاہر ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دیا۔ اس سے گویا تقدیر صحابہ کرام کو یہ سبق سکھانا چاہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کو محض اپنے لطف و کرم سے براہ راست فتح عطا فرمائی ہے۔ تمہاری تلواریں تو محض ظاہری اسباب ہیں، ورنہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ایک فتح کے بعد دوسری فتح عطا فرماتے ہیں۔

غزوہ احد کا آغاز و اختتام فتح و نصرت سے عبارت تھا، جبکہ اس کے درمیان میں مسلمانوں کو وقتی طور پر شدید دھچکا لگا، تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو مشکل ترین لمحات میں بھی تنہا نہیں چھوڑا، بلکہ وعدے کے مطابق ان کی مدد و نصرت فرمائی، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ

اللّٰہُ وَعْدَہُ إِذْ تَحُسُّونَہُم بِإِذْنِہِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ وَاللّٰہُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ()إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللّٰہُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾(آل عمران:۱۵۲-۱۵۳-) ''اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا (یعنی) اس وقت جبکہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو دکھا دیا۔ اس کے بعد تم نے ہمت ہاری اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے اور اس کی نافرمانی کی۔ بعض تو تم میں سے دنیا کے خواستگار تھے اور بعض آخرت کے طالب۔ اس وقت خدا نے تم کو ان (کے مقابلے) سے پھیر دیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور خدا مؤمنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب تم لوگ دور بھاگے جاتے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ تم کو تمہارے پیچھے کھڑے بلا رہے تھے تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی یا جو مصیبت تم پر واقع ہوئی ہے، اس سے تم اندوہناک نہ ہو اور خدا تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔'' اللہ اور تمہارے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَأَوْفُواْ بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (البقرة: ٤٠) ''اور اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں اس اقرار کو پورا کر دوں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ اس معاہدے کی خلاف ورزی ہرگز نہ کریں گے، لیکن اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو اللہ پر بھی اس کی پاسداری لازم نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد میں اپنے وعدے کا ایفا کر دیا تھا تب ہی تو تم اس کی مشیت و ارادے سے کافروں کا قلع قمع کر رہے تھے، لیکن جب تم نے حکم نبوی کے بارے میں جھگڑا کیا اور اس کی نافرمانی کی تو تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کچھ دیر صبر کرنے کی بجائے تم نے جلدی مچائی اور احکامات کا انتظار نہ کیا۔ تاجدارِ رسالت ﷺ اپنے خیمے میں ان احکامات کے اجراء کے لیے مناسب وقت کا انتظار فرما رہے تھے کہ تم نے جلدی کا مظاہرہ کر کے آپس میں اختلاف کیا، جس کے نتیجے میں ہر نیا فیصلہ نئے اختلاف رائے کو جنم دیتا اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر چلتا، جس سے تمہاری وحدت اور مضبوطی جاتی رہی۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری مرضی کے نتائج دکھائے تو تم میں سرکشی پیدا ہوئی، حالانکہ یہ بات تمہیں شایاں نہ تھی، کیونکہ تم خدا کے مقرب بندے ہو۔ کسی اور کے لیے اس قسم کے طرزِ عمل کی گنجائش نکل سکتی تھی، لیکن تمہارے لیے اسے اختیار کرنا درست نہ تھا، کیونکہ تم رسالت و نبوت کے ہالے کے گرد موجود تھے۔ تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہ کر ان کے ارشادات سنتے ہو اور ان سے براہ راست علم حاصل

کرتے ہو، نیز اس سے پہلے تمہیں خوشنودی خداوندی کا پروانہ بھی مل چکا تھا، لیکن جب تم نے دنیا کا کم قیمت مال ومتاع دیکھا تو تمہارے دلوں میں اس کی طرف میلان پیدا ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے تم سے لے کر تمہیں اس سے محروم کر دیا۔ اگر تم آخرت کو اپنا مقصد بناتے تو دنیا خود چل کر تمہارے پاس آتی، لیکن تم کسی نہ کسی حد تک دنیا کی طرف جھک گئے، حالانکہ تمہیں اپنی تمام کوششیں آخرت کے حصول کے لئے صرف کرنی چاہئیں تھیں۔ دنیا تو قانونِ فطرت کے مطابق تمہیں حاصل ہو ہی جاتی، یعنی اگر تم آخرت کے طلبگار بنتے تو دنیا تمہارے پیچھے دوڑی چلی آتی۔ بہرکیف! اب غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس قدر شدید صدمے کے بعد بھی اتنی بڑی کامیابی حاصل کر لی، جسے ہم بجا طور پر فتح کہہ سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کفار کے دلوں پر ایسی دھاک بٹھائی کہ ابوسفیان اور اس کے لشکر نے جلدی سے مکہ کی راہ لی۔ اس کے بعد آپ ﷺ بھی مدینے لوٹ آئے۔

ج: حمراء الاسد کی طرف پیش قدمی

مدینہ منورہ لوٹنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ اہل مکہ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے ہیں، حتیٰ کہ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ تم نے کوئی کارِنمایاں سرانجام نہیں دیا، کیونکہ تم نے مسلمانوں کی صرف شوکت کو توڑا ہے، لیکن ان کا پوری طرح قلع قمع نہیں کیا ہے۔ ان میں ابھی بھی ایسے راہنما موجود ہیں، جو تمہارے خلاف لشکر کشی کر سکتے ہیں۔(93)

رسول اللہ ﷺ ابھی مدینے پہنچے ہی تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان مدینے پر حملہ کرنے کے لیے آرہا ہے۔ ابھی زخمیوں کو اپنی مرہم پٹی کرنے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔ بہت سے زخمیوں کی حالت ابھی خطرے میں تھی۔ بعض زخمی نقل و حرکت کرنے سے بھی عاجز تھے، لیکن اس کے باوجود وہ حمراء الاسد کی طرف چل پڑے۔ مشرکین مکہ کے دلوں پر دھاک بٹھانے اور ان کی نقل و حرکت کو مفلوج کرنے کے لیے یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک تہدیدی اقدام تھا۔ آپ ﷺ نے مدینے میں اعلان فرمایا: ''میرے ساتھ صرف غزوہ احد کے شرکا آئیں۔''(94) آپ ﷺ کی اس پکار پر شدید زخمی صحابہ بھی لبیک کہتے ہوئے ایسے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے مردے قبروں سے اٹھتے ہیں اور مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کی پکار پر صحابہ کرام کے اس طرح اٹھ کھڑے ہونے پر شاعر بوصیری کا درج ذیل شعر صادق آتا ہے:

لو ناسبت قدره آياته عظماً أحيا اسمه حين يدعى دارس الرمم

اگر آپ ﷺ کے معجزات عظمت میں آپ ﷺ کی ذات گرامی کے ہم پلہ ہوتے تو آپ ﷺ کا نام پکارنے پر بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جاتیں۔

تاریخ میں ایسے کسی ایک آدمی کا بھی ذکر نہیں ملتا، جس نے رسول اللہ ﷺ کی اس آواز پر لبیک نہ کہا ہو۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے ہاتھ یا پاؤں سے محروم ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود لنگڑاتے ہوئے اور انتہائی دشواری کے ساتھ اپنے جسم کو گھسیٹتے ہوئے نکل پڑے۔ غزوہ احد کے شرکا میں سے ایک صحابی کہتے ہی۔ ''غزوہ احد میں ہم دو بھائی رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک ہوئے اور زخمی ہو کر واپس آئے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے منادی نے دشمن کے تعاقب کے لیے نکلنے کا اعلان کیا تو ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کہا: 'کیا ہم سے رسول اللہ ﷺ کا کوئی غزوہ چھوٹ جائے گا؟' بخدا! ہمارے پاس سواری کے لیے کوئی جانور نہ تھا اور ہم دونوں شدید زخمی تھے، لیکن پھر بھی ہم

رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکل پڑے۔ چونکہ میں اپنے بھائی کی بہ نسبت کم زخمی تھا، اس لیے جب وہ چلنے سے عاجز آ جاتا تو میں اسے اٹھالیتا اور کچھ راستہ وہ خود چلتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے ہمراہ مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔''(95)

جب قریش کو مسلمانوں کی اس پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ خوفزدہ ہو گئے اور ابوسفیان نے بغیر وقت ضائع کئے فرار ہونے میں عافیت سمجھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کا لشکر جو بظاہر شکست خوردگی کی حالت میں نکلا تھا، نعرے بلند کرتا ہوا حمراء الاسد کے مقام پر پہنچ گیا۔ وہاں مسلمانوں نے تین دن سوموار، منگل اور بدھ کو قیام کیا، زخمیوں کی جسمانی و روحانی مرہم پٹی کی اور پھر مدینے واپس لوٹ آئے۔

اس پیش قدمی میں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا، لیکن مسلمانوں پر غلبے کے تمام تر دعوؤں کے باوجود، جونہی ابوسفیان کو رسول اللہ ﷺ کی اپنے لشکر کے ہمراہ پیش قدمی کی خبر ملی، وہ خوفزدہ ہو گیا اور فوراً مکہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرح دشمن کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔(96) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معرکے میں کون سا فریق فاتح تھے اور کون سا فریق مفتوح کہلانے کے لائق ہے؟ راہ فرار اختیار کرنے والے قریش فاتح ہیں یا جارحانہ اقدام کرنے والے مسلمان؟ کوئی بھی دوسرا عسکری راہنما شکست کو اتنی واضح فتح میں نہیں بدل سکتا۔ غزوہ احد میں رسول اللہ کی فراست و بصیرت کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔

معزز قارئین کرام! اس موضوع پر اختصاصی دسترس نہ ہونے کے باوجود ضرورت کے پیش نظر میں نے غزوہ بدر اور غزوہ احد میں رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اگر میری گفتگو میں کوئی کمی کوتاہی رہ گئی ہو تو میں آپ سے اس پر معذرت خواہ ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کا امیدوار ہوں۔

۱- حالات کے مطابق بدلتی حکمت عملی

ذیل میں میں غزوہ بدر اور غزوہ احد کہ جس کا آغاز و اختتام فتح اور درمیان دھچکا تھا، کے دوران آپ ﷺ کی حکمت عملی پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر، احد اور خندق سمیت ہر معرکے میں ایک نئی حکمت عملی اپنائی، اس سے جہاں دشمنوں کی توقعات غلط ثابت ہوئیں اور وہ حیران و ششدر رہ گئے، وہیں مسلمانوں کے نقصان میں بھی بہت کمی ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کے تمام غزوات میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی مجموعی تعداد ایک سو سے کچھ زائد

ہے۔آپ ﷺ بے مثال راہنما تھے۔عہد رسالت میں مسلمانوں کو حقیقی سعادت حاصل تھی۔اب اس کا حصول ممکن نہیں۔ذرا تصور کیجئے کہ آپ ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز سے ہی عرب وعجم کے خلاف اعلانِ جنگ کیا، لیکن اس قدر جنگوں میں شرکت کے باوجود آپ ﷺ کو انتہائی کم نقصان اٹھانا پڑا۔

غزوہ احد میں آپ ﷺ نے غزوہ بدر کی حکمت عملی سے مختلف حکمت عملی اپنائی۔آپ نے خاص خاص ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے فدائیوں کو تعینات کیا۔پیچھے سے آکر دشمن کو حملہ آور ہونے سے روکنے کے لیے ایک مخصوص مقام پر تیر اندازوں کو مقرر فرمایا۔بنفس نفیس صف بندی کرائی اور انہیں جوش دلا کر ان میں مسابقت کا جذبہ پیدا کیا۔مثلاً حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر تلوار دی کہ وہ اس کا حق ادا کریں گے اور جب ابودجانہ اپنی سرخ پٹی باندھ کر صفوں کے درمیان اترا کر چلنے لگے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایسے موقع کے سوا اللہ تعالیٰ اس طرح چلنے کو ناپسند فرماتے ہیں۔''(97)

آپ ﷺ کے اسی ارشاد گرامی سے فقہائے کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ سپاہیوں کے لیے اپنی مونچھوں کو بڑھانا مستحب ہے، تاکہ کفار کے دلوں پر ان کا رعب زیادہ بیٹھے، نیز محاذ جنگ پر سپاہی موت سے جس قدر بے خوفی کا مظاہرہ کریں، اس پر جس قدر فخر کریں اور جس قدر شان سے چلیں اتنا ہی بہتر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ حکمت عملی غزوہ بدر میں استعمال نہیں فرمائی، لیکن غزوہ احد میں اپنائی اور صحابہ کرام میں مسابقت کا جذبہ ابھارا۔ہر صحابی چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار اسے دے دیں، لیکن آپ ﷺ نے وہ تلوار ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو دی، اس پر باقی صحابہ بھی جان کی بازی لگا کر لڑے اور ان میں سے ہر ایک ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی طرح بن گیا۔

ایک اور حکمت عملی جو آپ ﷺ نے غزوہ احد میں استعمال کی، لیکن غزوہ بدر میں نہیں اختیار فرمائی، وہ غزوہ احد میں عورتوں کی شرکت تھی۔ایک صحابیہ حضرت نسیبۃ رضی اللہ عنہا کی شجاعت کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔اگرچہ ہمیں یقینی طور پر نہیں معلوم کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے غزوہ احد میں شرکت کی تھی یا نہیں، لیکن معتبر تاریخی ذرائع سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد ماجد کے چہرے سے خون صاف کیا تھا اور جب انہوں نے دیکھا کہ پانی کے ذریعے آپ ﷺ کا چہرہ صاف کرنے سے خون کے بہاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کا ٹکڑا لے کر اسے جلایا اور اسے زخم پر رکھ دیا، جس سے خون بہنا بند ہو گیا۔(98) اس سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زخمیوں کی مرہم پٹی اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے بعض خواتین کو غزوہ احد میں ساتھ لائے تھے۔

۲- غزوہ احد کے وقتی صدمے کے اسباب

اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ غزوہ احد میں فتح کے دو مراحل کے درمیان کچھ کمزور پہلو بھی سامنے آئے تھے، جن کے درج ذیل اسباب تھے:

اول: رسول اللہ ﷺ نے آغاز سے ہی مدینہ منورہ میں رہ کر دفاعی حکمت عملی اختیار کرنے کو ترجیح دی تھی، لیکن صحابہ کرام جوش اور ولولے میں اس حکمت عملی کی گہرائی کا ادراک نہ کر سکے، حالانکہ ان پر رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی علی الاطلاق اطاعت لازم تھی، یہی بات جنگ کے دوران تیراندازوں کے طرز عمل کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کے احکامات کی یہ مخالفت کچھ وقت کے لیے تھی، لیکن اس کی وجہ سے مسلمانوں کو شدید دھچکا لگا۔

دوم: ان حضرات نے اپنی روحانی دنیا اور فطرت سے بغاوت کی، کیونکہ دنیا کی طرف میلان ان کی طبیعت میں شامل نہ تھا اور مکہ مکرمہ میں اپنی تمام مملوکہ جائیداد چھوڑ کر مدینہ منورہ ہجرت کر کے انہوں نے اس بات کو ثابت کر دکھایا تھا۔ چونکہ جس گھڑی میں وہ آخرت سے سب سے قریب تھے، اس وقت مالِ غنیمت اور دنیا کے مال واسباب میں مشغول ہونا مقربین خدا کے حق میں غفلت تصور ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان مقرب بلکہ مقرب ترین حضرات کو بطور سزا کے جسمانی تکلیف میں مبتلا کیا۔ یہ تنبیہ صرف صحابیت کے مقام پر فائز حضرات کے لیے تھی، کیونکہ ''حسنات الأبرار سیّئات المقرّبین'' کے قاعدے کے تحت جو کام ہمارے لیے نیکی اور باعث ثواب ہو سکتا ہے، وہ ان کے حق میں گناہ تصور ہوتا ہے۔

سوم: غزوہ اُحد میں مسلمانوں کو پہنچنے والے صدمے کا ایک اہم سبب فریق مخالف کی صفوں میں خالد بن ولید جیسی عسکری اعتبار سے عبقری شخصیت کی موجودگی کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خالد بن ولید جنہوں نے بعد میں اسلام کے لیے جلیل القدر خدمات پیش کیں، کی ہمیشہ فتح یاب ہونے کی خصوصیت کی حفاظت فرمائی، گویا یہ ان کی قابل قدر خدمات کا پیشگی بدلہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شجاعت وجوانمردی کے پیکر اور ہمیشہ فتح سے ہمکنار ہونے والی خدا کی اس تلوار نے مستقبل میں روم وفارس پر بجلی بن کر گرنا تھا، لہٰذا اگر اس معرکے میں انہیں شکست ہو جاتی تو شاید وہ اسلام کے لیے اتنی بلند حوصلگی کے ساتھ خدمات پیش نہ کر سکتے۔ (99)

چہارم: غزوہ بدر میں شرکت نہ کرسکنے والے حضرات ہمیشہ بڑے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شہادت کی دعا کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر انہیں اس بلند مرتبے پر فائز فرمایا۔ غزوہ احد کے اس صدمے کے دوران جب حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر بے حوصلہ اور مضطرب صحابہ کو دیکھا تو ان سے کہا: ''اے لوگو! اگر محمد (نعوذ باللہ) قتل ہوگئے ہیں تو ان کا پروردگار تو زندہ ہے۔ اٹھو اور جس مقصد کی خاطر محمد ﷺ لڑے ہیں تم بھی لڑو۔ اے اللہ! میں ان لوگوں کی باتوں پر آپ سے معذرت کرتا ہوں اور ان کے طرزِ عمل سے آپ کے سامنے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' پھر وہ تلوار نکال کر لڑنے لگے، یہاں تک کہ شہید ہوگئے، چونکہ ان کے گمان میں رسول اللہ ﷺ شہید ہوچکے تھے، اس لئے وہ بھی شہادت کا رتبہ پا کر جلد از جلد آپ ﷺ سے جاملنا چاہتے تھے۔ (100)

تقریباً ان تمام حضرات کی دعا قبول ہوئی، جنہوں نے شہادت کی دعا کی تھی۔ بھلا جو صدقِ دل سے شہادت کی دعا کرے وہ اس سے محروم ہوسکتا ہے؟ کئی صدیاں بعد سلطان مراد اول نے ''معرکہ کوسوو'' سے کچھ دیر پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ''اے اللہ! اُمتِ محمد ﷺ کو فتح کی عزت عطا فرما اور مجھے شہادت نصیب فرما۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا، چنانچہ مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی اور معرکے کے اختتام پر سلطان مقتولین کے درمیان چل رہے تھے کہ ''میلوش''(101) نامی ایک سرب کے خنجر سے شہید ہوگئے۔ اس طرح اس عظیم انسان کی دعا قبول ہوئی اور وہ شہادت کا رتبہ پا کر اپنے پروردگار سے جاملے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعاؤں کو قبول فرماتے ہیں، اس لیے غزوہ احد میں بھی صحابہ کرام کی شہادت کی بار بار مانگی ہوئی دعائیں قبول ہوئیں اور ان صحابہ کی شہادت سے بظاہر ایسے لگا جیسے مسلمانوں کے لشکر کو پسپائی ہورہی ہے۔

پنجم: احد کا معرکہ دراصل حاضر اور مستقبل کے صحابہ کے درمیان معرکہ تھا، یعنی یہ معرکہ ان لوگوں کے درمیان جو اسلام قبول کرکے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بن چکے تھے اور حضرت خالد بن ولید، عمرو بن عاص، عکرمہ اور ابن ہشام جیسے ان حضرات کے درمیان تھا، جنہوں نے مستقبل میں صحابیت کے مقام پر فائز ہوکر اسلامی فتوحات کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے، جن کی فطرت میں شکست کو قبول کرنا شامل ہی نہ تھا، لہٰذا ایسے حضرات کے احساسات کو

مجروح کیے بغیر انہیں اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے غزوہ احد میں مسلمانوں کے لشکر کا عارضی طور پر پسپائی اختیار کرنا ناگزیر تھا۔

ششم: غزوہ احد کے اس دھچکے میں مسلمانوں کے لیے توحید کا درس تھا۔ ہوسکتا تھا کہ غزوہ بدر کی فتح کی وجہ سے بعض صحابہ کی نظر میں ظاہری اسباب کی اہمیت زیادہ ہو جاتی۔ اگر چہ دشمن کے مقابلے میں عزت و افتخار کے جذبات کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن صحابہ جیسی مقرب ہستیوں کے دلوں میں ایک لمحے کے لیے بھی ایسے خیال کا گزرنا گناہ تصور ہوتا تھا۔ فتح و شکست مشیت خداوندی سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں غزوہ بدر میں فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ اگر بعض صحابہ کرام فتح کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر و مشیت کی بجائے اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے تو یہ شرک خفی سمجھا جاتا، حالانکہ وہ حضرات شرک سے کوسوں دور تھے۔ اگر چہ سارے صحابہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے اور فکری طور پر اسے قبول کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کو اس سلسلے میں حق الیقین کے مقام تک پہنچانا چاہتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد میں عین فتح کے لمحات میں مسلمانوں کو زبردست دھچکا پہنچا کر انہیں شکست خوردہ کر دیا اور پھر انہیں یہ یاد دلانے کے لیے کہ صرف اللہ ہی کی مشیت کی حکمرانی ہے، انہیں ایسے وقت میں فتح نصیب فرمائی، جب وہ اس کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، ارشاد خداوندی ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (آل عمران: ۲۶) ''کہو کہ اے خدا! (اے) بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے اور بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

غزوہ احد میں اس آیت مبارکہ کے معانی کھل کر مسلمانوں کے سامنے آگئے، کیونکہ انہیں ان معانی کا عملی طور پر تجربہ ہوا اور انہوں نے مشیت خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے پورا ہوتے ہوئے دیکھا۔ اگر چہ اس دوران انہیں ظاہری طور پر کچھ نقصان بھی پہنچا، لیکن اس دن ایمان اور نور توحید کہ جس کی تہہ میں احدیت کا راز مضمر تھا، کے اعتبار سے انہیں وہ دولت حاصل ہوئی، جس کے مقابلے میں اس ظاہری نقصان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

اس سے انکار نہیں کہ تلوار اور اچھی تیاری کا اپنا حق ہے اور یہ فتح و نصرت کے اسباب میں سے ہیں، لیکن بنیاد مشیت و ارادہ خداوندی ہے۔ وہ تنہا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ اس عارضی

دھچکے کے دوران مسلمانوں سے یہ کہنا چاہ رہے تھے: ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت پر نظر نہ رکھو گے تو کبھی بھی فتح نہ پاسکو گے۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ فتح شکست میں بدل سکتی ہے۔ لہٰذا جس طرح مشیت خداوندی کے بغیر فتح کا حصول ممکن نہیں، اسی طرح اس کے بغیر ہزیمت سے بچنا بھی ممکن نہیں۔

ہر مسلمان کو توحید کے اس قسم کے عملی سبق کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے صحابہ کرام نے اس قسم کے عظیم سبق کے سلسلے میں ہماری نمائندگی کی ہو، نیز رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی اس عارضی سزا نے مسلمانوں کو تنبیہ کی اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی تجاویز پیش کرنے کے بارے میں محتاط بنادیا۔ مسلمانوں کو حاصل ہونے والا یہ عظیم الشان ادب کچھ کم فائدہ نہ تھا۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الأيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّهُ الَّذِينَ آمَنُواْ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاء وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) ''اگر تمہیں زخم (شکست) لگا تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں اور اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو متمیز کردے اور تم میں سے گواہ بنائے اور خدا بے انصافوں کو پسند نہیں کرتا۔''

لیکن اللہ تعالیٰ جن دنوں کو بدلتے ہیں، ان میں اکثر مسلمانوں کی مصلحت ہوتی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا، کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (الأعراف: ۱۲۸) ''اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔'' اگرچہ آج ہم بدامنی کے ماحول میں جی رہے ہیں، لیکن قرآن ہمیں روشن مستقبل کی نوید سنا رہا ہے۔ غزوہ احد میں بھی ایسی صورت حال پیش آئی تھی، لیکن انجام کار اہل ایمان کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ درست ہے کہ غزوہ احد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا، لیکن اس صدمے میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ اسے ہزیمت کہنا قطعاً درست نہیں، بلکہ یہ مختلف پہلوؤں پر فتح تھی۔

۳۔ شکست خوردگی کے احساس کا خاتمہ

غزورہ احد کے بعد رسول اللہ ﷺ طاقت کا عملی مظاہرہ کرکے مدینہ منورہ واپس لوٹ آئے۔ طاقت کے اس عملی مظاہرے کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے پہلے والے جذبے زندہ ہوگئے، وہ پہلے سے زیادہ تجربہ کار اور حساس ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں مضمر باریکیوں اور حکمتوں کو پہلے سے بہتر طریقے سے سمجھنے لگے۔

تاہم غزوہ احد کے دوران مسلمانوں کو عارضی طور پر پہنچنے والے صدمے کی خبر فوراً مدینے کے گردونواح میں پھیل گئی، جس سے بعض عرب قبائل اور یہودیوں کو شہ ملی، لہٰذا غزوہ احد میں مسلمانوں کے مجروح ہونے والے وقار کو بحال کر کے ان کی حقیقی طاقت کا مظاہرہ کرنا ناگزیر تھا، جس میں کسی قسم کی تاخیر کی بالکل گنجائش نہ تھی۔

ہجرت کے چوتھے سال رسول اللہ ﷺ بنونضیر سے لڑنے کے لیے نکلے۔ یہ یہودی قبیلہ مشرکین مکہ کا معاون رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے متعلق آداب کی تمام حدیں عبور کر چکا تھا، بلکہ دو مرتبہ آپ ﷺ کو شہید کرنے کی بھی کوشش کر چکا تھا۔ اسے مدینے کے منافقوں اور مشرکین مکہ کی مدد پر بھروسا تھا۔ وہ اپنے مضبوط قلعوں میں اپنے آپ کو مسلمانوں کی دسترس سے محفوظ سمجھتا تھا اور اسی گھمنڈ میں آپ ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکا تھا۔

تاہم صرف پندرہ دن کے محاصرے کے نتیجے میں وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور صرف منقولہ سامان ساتھ لے جانے کی شرط پر مدینہ سے جلاوطنی پر راضی ہو گئے، لیکن اس کے باوجود موت سے بچ جانے پر وہ بہت خوش تھے، اسی خوشی میں انہوں نے مدینہ سے روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ایک ایسا شاندار جشن منایا، جس کی نظیر اہل مدینہ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایسے لوگوں کے گھٹیا پن پر حیرت ہوتی ہے کہ اپنا گھر بار اور وطن چھوڑنے پر حزن وملال کے اظہار کی بجائے جشن منانے میں مصروف تھے۔ (102)

د: بدرصغری

ابوسفیان نے غزوہ احد سے واپسی پر مسلمانوں سے کہا تھا: ''اگلے سال بدر کے مقام پھر تمہارے ساتھ مقابلہ ہوگا۔'' رسول اللہﷺ نے ایک صحابی سے کہا: ''کہو: ٹھیک ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے درمیان مقابلے کی جگہ طے ہے۔'' لہٰذا رسول اللہﷺ آئندہ سال اپنے پورے لشکر کے ہمراہ بدر کے مقام پر آئے اور آٹھ دن تک وہاں ابوسفیان کے آنے کا انتظار کرتے رہے، لیکن مشرکین کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا، لہٰذا آپﷺ مدینے لوٹ آئے۔ اسلامی تاریخ میں اس غزوہ کو غزوہ بدرالصغری (چھوٹا غزوہ بدر) یا بدرالآخرۃ (دوسرا غزوہ بدر) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس غزوے میں مسلمانوں نے خوفزدہ مشرکین کو چیلنج کیا، لیکن وہ مقابلے میں نہ آئے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو کسی نہ کسی حد تک غزوہ بدر کی طرح کی کامیابی حاصل ہوئی۔ قبیلہ عبدالقیس کے بعض لوگوں نے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے ان کے درمیان یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ ابوسفیان بہت بڑے لشکر کے ہمراہ بدر کی طرف آرہا ہے، لیکن اس افواہ سے مسلمانوں کا ایمان اور مضبوط ہوگیا۔ قرآن کریم اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُواْ لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَاناً وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (آل عمران: ١٧٣) ''(جب) ان سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ کفار نے (تمہارے مقابلے) کے لیے (لشکر کثیر) جمع کیا ہے تو ان سے ڈرو، تو ان کا ایمان اور زیادہ ہوگیا اور کہنے لگے: 'ہم کو خدا کافی اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔' ''

چنانچہ اہل ایمان غزوہ بدرالصغری سے انتہائی اطمینان کے ساتھ واپس آئے اور صحرائے عرب کے قبائل میں امن وامان کی صورت حال پھر سے بحال ہونے لگی۔

ہ: غزوۃ ذات الرقاع

ہجرت کے چوتھے سال طاقت کے اس قسم کی عملی مظاہرے سال بھر ہوتے رہے۔ اسی عرصے میں بنو ثعلبہ اور بنو غطفان کی شاخ بنو محارب نے مدینہ منورہ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ جب رسول اللہﷺ کو اس منصوبے کی اطلاع ملی تو آپﷺ چارسو مسلمانوں کے ہمراہ ذات الرقاع نامی مقام تک گئے، لیکن یہ دونوں قبیلے مسلمانوں کی آمد کی اطلاع پاکر اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے، اس لیے اس غزوے میں جنگ کی نوبت نہ آئی۔ (103) تاہم مسلمانوں کے حق میں اسے فتح سمجھا گیا۔

و: غزوۃ بنی المصطلق یا غزوۃ المریسیع (104)

ہجرت کے پانچویں سال غزوہ بنی المصطلق پیش آیا، جسے غزوۃ المریسیع بھی کہتے ہیں۔ مریسیع مدینہ منورہ سے نو فرسخ کے فاصلے پر واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ یہاں کے مشرکین مکہ کے کہنے میں آ کر مدینے پر حملہ کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ ان کی سرکوبی کے لیے رسول اللہ ﷺ ایک لشکر تیار کر کے مریسیع مقام کی طرف روانہ ہوئے۔ جب بنو المصطلق کو مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور میدان میں مریسیع کے باشندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا۔ انہوں نے مسلمانوں سے جنگ کی، لیکن مسلمانوں نے ان پر غلبہ پا لیا۔ مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ ہوا، البتہ ایک انصاری نے غلطی سے ایک صحابی ہشام بن صبابہ کو دشمن کا آدمی سمجھ کر قتل کر دیا۔ دشمن کے دس آدمی جنگ میں کام آئے۔ مسلمان چھ سو قیدیوں، دو ہزار اونٹوں اور پانچ ہزار بکریوں کے ہمراہ مدینے لوٹ آئے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی فتوحات کے سلسلے میں ایک نئی فتح کا اضافہ تھا۔(105)

اس غزوے سے واپسی پر منافقین مسلمانوں کے درمیان نفاق و نزاع کے بیج بونے اور مال غنیمت سے مستفید ہونے کی غرض سے ان کی صفوں میں گھس آئے، یہاں تک کہ انہوں نے ایک کنویں سے اونٹ کو پانی پلانے کے حق پر ایک انصاری صحابی کے حلیف اور ایک مہاجر صحابی کے مزدور کے درمیان پیدا ہونے والے چھوٹے سے جھگڑے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، لیکن انہیں اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اسی غزوے سے واپسی پر عبداللہ بن ابی بن سلول نے یہ کہہ کر اپنے نفاق کا اظہار کیا تھا کہ بخدا! مدینے پہنچ کر ہم میں سے عزت والا ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔ عزت والے سے اس کا اشارہ اپنی ذات کی طرف تھا اور ذلت والے سے (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد تھی۔ جب اس کی اطلاع اس منافق کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی کو ہوئی، جو ایک جلیل القدر صحابی تھے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یارسول اللہ! مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی کو اس کی باتوں کی وجہ سے قتل کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر آپ نے ایسا کرنا ہی ہے تو مجھے حکم دیجئے۔ میں اس کا سر کاٹ کر آپ کے خدمت میں پیش کر دوں گا۔ بخدا! قبیلہ خزرج بخوبی جانتا ہے کہ اُس میں مجھ سے زیادہ اپنے والد کا فرمانبردار کوئی شخص نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کسی اور کے ذریعے اسے قتل کروا دیں اور پھر اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ جائے اور میں اسے قتل کر بیٹھوں اور اس طرح ایک کافر کے بدلے ایک

مؤمن کی جان لے کر جہنم میں چلا جاؤں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں، ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، بلکہ جب تک وہ زندہ ہے ہم اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ اور حسن سلوک کریں گے۔'' مدینے کے قریب پہنچ کر عبداللہ اپنے باپ عبداللہ بن ابی بن سلول کے راستے میں کھڑے ہو گئے اور اس کہا: ''بخدا! جب تک رسول اللہ ﷺ اجازت نہ دیں گے اس وقت آپ مدینے میں داخل نہیں ہو سکتے۔'' چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اس نے آپ ﷺ سے مدینے میں داخلے کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی، جس پر اس کے بیٹے نے اسے مدینے میں داخل ہونے دیا۔ (106)

جنت کی حوروں کی طرح پاکدامن ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق واقعہ افک بھی اسی غزوے سے واپسی پر پیش آیا۔ قرآنی آیات نے بعد میں آپ رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی کی تصدیق کر دی۔ (107)

ز: رات کو سفر کرنے والا

رسول اللہ ﷺ اپنے تمام اسفار کے لیے رات کا انتخاب فرماتے۔ رات میں ایک اور راز بھی ہے۔ قرآن کریم نے اشارات و کنایات میں آپ ﷺ کو اس بات کی تعلیم دی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اہل ایمان کو رات کے وقت ہی لے کر فرار ہوئے تھے، ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَأَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ﴾ (الدخان: ۲۳) "(خدا نے فرمایا کہ) میرے بندوں کو راتوں رات لے کر چلے جاؤ اور (فرعونی) ضرور تمہارا تعاقب کریں گے۔" یہی حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو بھی دیا تھا: ﴿فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ﴾ (ھود: ۸۱) "کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے۔" معراج کی رات تاجدارِ نبوت ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی، جہاں آپ ﷺ جبرائیل امین کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ معراج کا واقعہ بھی رات کو پیش آیا تھا، ارشادِ خداوندی ہے: ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِیْ بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الاسراء: ۱) "وہ (ذات) پاک ہے، جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک، لے گئی جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں،، تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں، بیشک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔"

تقریباً سارے انبیائے کرام نے رات کو سفر کیا ہے۔ رات کے وقت منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ ایسی راتیں قربِ خداوندی اور وصول الی اللہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات مبارکہ میں رات کی قسم اٹھائی ہے۔ رات کی تاریکی میں خیر و بھلائی کے پرنور اعمال کے باعث رات دن سے بھی زیادہ پُرنور ہو جاتی ہے۔ صوفی شاعر ابراہیم حقی ارضرومی کہتے ہیں:

یا عین ماھذا النوم؟ تعالی واستیقظی فی اللیالی
وتأمّلی . . . تأمّلی سیر الکواکب فی اللیالی

"اے آنکھ! یہ نیند کیسی ہے؟ آؤ اور راتوں کو جاگ کر رات کے وقت ستاروں کی نقل و حرکت پر غور و فکر کرو۔"

جس نے بھی قربِ خداوندی کی منزلیں طے کی ہیں، رات کے وقت ہی کی ہیں۔ رات کے وقت جب انسان سجدے میں اپنے آنسوؤں سے زمین کو تر کرتا ہے تو اس کی روح میں بلندی پیدا ہوتی

ہے۔ جس انسان کے در و دیوار اس کی آہ و بکا سننے کے عادی ہوں، اس کی رسائی ایسے آفاق تک ہو جاتی ہے، جن کی مسافت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، لیکن یہ منزلیں رات کے وقت ہی طے ہوتی ہیں۔ جو لوگ رات کو سو رہتے ہیں، وہ کبھی منزل نہیں پا سکتے۔ اگر آپ برزخ کے عذاب سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کی کوئی رات بھی تہجد سے خالی نہیں رہنی چاہیے۔ نماز تہجد کو کبھی نہ چھوڑو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کبھی نہیں چھوڑا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں: ''لندن کے کہر آلود شہر میں میں نے بیس برس گزارے، لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی رات تہجد کی نماز چھوڑی ہو۔''

جو شخص رات کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ اپنی زبان سے نکلنے والے ہر ہر لفظ کی بازگشت اپنے وجدان میں محسوس کرتے ہوئے قربِ خداوندی کی مسافت طے کرتا چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی مادی اور روحانی مسافتیں رات کو ہی طے فرمائیں۔ آپ ﷺ رات کو سفر اور دن کو آرام فرماتے اور دشمن کو اچانک آ لیتے۔ دشمن اچانک آپ ﷺ کو اپنے سامنے پا کر گھبرا جاتا: ﴿فَـإِذَا نَـزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاء صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ ﴾ (الصفات: ۱۷۷) ''مگر جب وہ ان کے میدان میں اترے گا تو جن کو ڈر سنایا گیا تھا ان کے لیے بُرا دن ہو گا۔''

یہ آیت مبارکہ اس منظر کی کچھ تصویر پیش کرتی ہے۔ آپ ﷺ کا اپنے لشکر کے ہمراہ کسی دشمن کے میدان میں اترنا اس کا آخری دن شمار ہوتا اور وہ دن اس کے لیے برا ثابت ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ صبح سویرے دشمن پر حملہ کرتے۔[108] سحری کے وقت اذان واقامت کی آواز سے اس علاقے کے لوگوں کے اٹھنے یا نہ اٹھنے سے ان کے دین کے بارے میں بھی علم ہو جاتا۔ سحری کے وقت تجلیاتِ الٰہیہ کی بادِ نسیم چلتی ہے۔ صوفی شاعر ابراہیم حقی کہتے ہیں:

تهبّ نسائم التجلّی فی السحر   فیاعینیّ! استیقظا عند السحر

''سحری کے وقت تجلی خداوندی کی بادِ نسیم چلتی ہے۔ میری آنکھو! سحری کے وقت بیدار ہو جاؤ۔''

سحری کا وقت مؤمن کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس وقت مؤمن پر تجلی خداوندی کی ہوائیں چلتی ہیں اور وہ نماز کی تیاری کر کے روحانی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ دشمن پر حملے کے لیے ہمیشہ فجر کے وقت کا انتخاب فرماتے تھے۔ جب دشمن جمائیاں لیتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھتا تھا تو اہل ایمان کو اپنے سامنے چاق و چوبند کھڑے دیکھتا۔ عام طور پر رسول اللہ ﷺ یہی حکمت عملی اختیار فرماتے تھے، چنانچہ جب آپ ﷺ نے خیبر کی فصیل کے

پاس "الله أكبر! خربت خيبر!"، "اللہ اکبر! خیبر برباد ہوگیا" کا نعرہ لگایا تو وہ لرز اٹھی، لیکن یہ کسی کو پتا نہ چل سکا کہ یہ لشکر وہاں کیسے پہنچ گیا۔(109) اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ جنگ کے دوران بڑی تیز رفتاری سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ تیز رفتار اونٹ بھی رفتار میں آپ کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ غزوہ بنی المصطلق بھی ایسے ہی تیز رفتار غزوات میں سے تھا۔ جب اس غزوے سے واپسی پر نفاق نے سر اٹھایا تو آپ ﷺ اپنی فراست سے بھانپ گئے کہ نفاق کے اس فتنے کے اثرات کو پھیلنے سے روکنے کا بہترین طریقہ مسلمانوں کو مسلسل سفر میں رکھنا ہے، چنانچہ مسلسل سفر کی حالت میں رہنے کی وجہ سے منافقین کو فتنے کی آگ بھڑکانے کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔(110) اگرچہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بناتا رہتا، لیکن اسے ان منصوبوں کو حتمی صورت دے کر عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ ملتا۔ سارے مسلمان تیز رفتاری سے چل رہے ہوتے بلکہ دوڑ رہے ہوتے۔ روانگی اور واپسی اتنی تیزی سے ہوئی کہ سارے مسلمان تھک کر چور ہوگئے، چنانچہ جونہی آپ ﷺ نے انہیں ستانے کی اجازت دی وہ ایسی گہری نیند سوئے کہ دوسرے دن سورج کے طلوع ہونے کے بعد اٹھے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا جب فجر کی نماز طلوعِ آفتاب کے بعد ادا کی گئی۔(111)

ہجرت کے پانچویں سال غزوات کا یہ سلسلہ سال بھر چلتا رہا، جس کے نتیجے میں قبائل عرب کو یقین ہوگیا کہ وہ انفرادی طور پر رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ نہیں کرسکتے، چنانچہ انہوں نے اکٹھے مل کر آپ ﷺ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور متحد ہوکر مدینے پر حملہ کرنے کے لیے چل پڑے۔

ح: غزوہ خندق یا احزاب

شوال پانچ ہجری کو جب بنونضیر کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تو وہ خیبر جا کر مقیم ہو گئے، لیکن وہاں وہ ایک طرف اہل خیبر کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف اکسانے لگے تو دوسری طرف قریش اور قبیلہ غطفان کے بعض سرداروں سے رابطے شروع کر دیئے۔ چونکہ یہ دونوں قبیلے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے بھرپور کوشش کرتے اور ہر وقت اسی منصوبہ بندی میں لگے رہتے، اس لیے وہ اس قسم کی کسی بھی تجویز کا خیر مقدم کرنے کے لیے بالکل تیار تھے، پھر ان دو قبیلوں کے ساتھ بنو سلیم، بنو اسد، بنومرہ، بنوفزارہ، بنو اشجع اور بنوسعد بھی مل گئے۔ اس طرح تقریباً وہی صورت حال بن گئی، جو معرکہ ''چتق قلعہ'' میں تھی، جس میں انگریزوں نے ہندوستانیوں، افریقیوں اور آسٹریلیا وغیرہ کی بہت سی اقوام کے ساتھ مل کر حملہ کیا تھا۔

عرب قبائل کے اتحاد اور یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر اتفاق کیا اور دس ہزار نفوس پر مشتمل لشکر کے ہمراہ مدینے کی طرف چل پڑے۔ رسول اللہ ﷺ کو خفیہ خبر رسانی کے مؤثر نظام کے ذریعے اس لشکر کشی کی اطلاع مل چکی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو جمع فرما کر چند دنوں میں پیش آنے والی جنگ کے بارے میں مشورہ کیا۔ آپ ﷺ نے متعدد تجاویز میں سے حضرت سلمان فارسی کی مدینے کے گرد خندق کھود کر دفاعی جنگ لڑنے کی تجویز کو پسند فرمایا۔ یہ ایک نئی حکمت عملی تھی، جس سے اس علاقے میں اس وقت تک کوئی بھی واقف نہ تھا۔ قریش اور اس کے اتحادی غزوہ بدر یا احد جیسی جنگ کے منتظر تھے، جبکہ انہیں ایک ایسی غیر متوقع حکمت عملی سے واسطہ پڑنے والا تھا، جس کے بارے میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آپ ﷺ نے خندق کھودے جانے کی خبر کو پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کے آس پاس کے علاقے میں پہرہ دار مقرر کر دیئے، جو باہر سے کسی کو بھی مدینے کے قریب نہ آنے دیتے تھے، جس کے نتیجے میں خندق کی کھدائی انتہائی خفیہ انداز میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور جب کفار کا لشکر مدینے کے قریب پہنچا تو اپنے سامنے خندق دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے تین ہزار صحابہ کرام کے ساتھ خندق کی کھدائی کا کام شروع فرمایا۔ آپ ﷺ نے بنفس نفیس کھدائی میں حصہ لیا۔ ہر فرد کے حصے میں ایک ذراع لمبی خندق کھودنا تھی۔ صحابہ کرام کی ٹولیاں بنادی گئیں۔ ہر ٹولی کے ذمہ دس ذراع لمبی خندق کھودنا تھی اور ان ٹولیوں کے درمیان مسابقت شروع ہو گئی۔ خندق کی گہرائی اتنی رکھی گئی کہ اگر اس میں کوئی گھڑ سوار گر جاتا تو اپنے گھوڑے سمیت اس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا، اسی طرح اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ماہر ترین گھڑ سوار بھی اسے نہیں پھلانگ سکتا تھا۔

اب یہ خندق مکمل طور پر اٹ چکی ہے۔ کاش! اگر یہ باقی ہوتی تو ہم اس خندق کو دیکھ سکتے، جس کی کھدائی اور مٹی کی منتقلی میں رسول اللہ ﷺ نے شرکت فرمائی۔ دورِ حاضر میں اس کے موجودہ آثار کی صحت کے بارے میں ہمیں علم نہیں، لیکن اگر عسکری علوم کا کوئی ماہران آثار کا گہرائی سے جائزہ لے کر ان کے اسی خندق کے آثار ہونے کے احتمال کو درست بتائے تو پھر اس سلسلے میں سنجیدہ اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہوگی۔

رسول ﷺ نے مسلمانوں کو اجر و ثواب کی ترغیب دلانے کے لیے خندق کی کھدائی میں بنفسِ نفیس حصہ لیا۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے ان کے شوق اور جذبے میں اضافہ ہوا۔ بعض اوقات آپ ﷺ انہیں آپس میں مسابقت کرنے پر ابھارتے، کبھی مہاجرین کی تعریف فرماتے اور کبھی انصار کی۔

صحابہ کرام بھوکے پیاسے تھے اور ہر ایک نے اپنے پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا تھا، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے دو پتھر باندھ رکھے تھے، لیکن بھوک اور پیاس سے ان کی ہمت اور ولولے میں کوئی کمی نہ آئی تھی، بلکہ وہ یہ شعر پڑھتے:

نحن الذين بايعوا محمداً على الجهاد ما بقينا أبداً

''ہم وہ لوگ ہیں، جنہوں نے محمد ﷺ کے دستِ مبارک پر تادمِ آخر جہاد کرتے رہنے کی بیعت کی ہے۔''

آپ ﷺ اس کے جواب میں فرماتے:

اللهم لا عيش الا عيش الآخرة   فاغفر للأنصار و المهاجرة

''اے اللہ! مزے کی زندگی تو آخرت کے زندگی ہے۔ انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما۔''

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ مل کر درج ذیل اشعار پڑھتے:

اللهم لو لا أنت ما اهتدينا و لا تصدقنا و لا صلينا

فأنزلن سكينةً علينا و ثبّت الأقدام ان لاقينا

ان الألى قد بغوا علينا وان أرادوا فتنة أبينا

''اے اللہ! اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہدایت نہ پاتے، نماز پڑھتے اور نہ ہی زکوٰۃ دیتے۔

اے اللہ! ہم پر سکینہ نازل فرما اور دشمن سے مقابلے کے وقت ہمیں ثابت قدم رکھ۔

ان لوگوں نے ہم پر ظلم وستم کیا ہے اور جب انہوں نے فتنہ برپا کرنا چاہا تو ہم نے انکار کر دیا۔''

رسول اللہ ﷺ ''أبینا'' کے لفظ کو بلند آواز سے بار بار دہراتے۔[112]

رسول اکرم ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا اور صحابہ کرام کی صف بندی اس طریقے سے کی کہ سلع پہاڑی ان کے عقب میں آ گئی۔[113] میں جنگی امور کا ماہر نہیں ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی ہر پہلو سے درست تھی، خاص طور پر سلع پہاڑی کو اپنے عقب میں رکھنا انتہائی درست اقدام تھا۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سارے اقدامات ہنگامی بنیادوں پر طویل غور وخوض کے بغیر اٹھائے تھے، لیکن اس کے باوجود سب کے سب درست ثابت ہوئے۔

مدینہ کے دفاع کی تدابیر اختیار کرتے وقت بنوقریظہ کی طرف سے حملے کے امکان کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صحابہ کرام کی ایک جماعت کو اس محاذ کے دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی۔[114] اس طرح تمام احتمالات کو ملحوظ رکھا گیا اور کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

خندق میں ایک تنگ مقام بھی تھا، جہاں سے ماہر گھڑ سوار اصیل گھوڑے کے ذریعے خندق کو عبور کر سکتا تھا۔[115] سرسری نظر میں یہ کوتاہی معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بات نہ تھی، بلکہ یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کی حیرت انگیز فراست کارفرما تھی، کیونکہ اسے دیکھ کر مشرکین کے سب سے بہادر اور اہم ترین لوگوں نے اسے پھلانگنے کی کوشش کرنی تھی، جس کے نتیجے میں انہوں نے مسلمانوں کے نرغے میں آ جانا تھا۔ شروع میں کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب بعض واقعات رونما ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دشمن کے بہادر ترین سپاہیوں نے قسمت آزمائی کی اور یکے بعد دیگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

قریش کے شہسواروں میں سے بنو عامر بن لؤی کے عمرو بن عبدوُدّ، بنو محارب بن فہر کے ضرار بن خطاب بن مرداس اور عکرمہ بن ابی جہل اور ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی نے جنگی لباس پہنا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر نکلے۔ جب وہ بنو کنانہ کے گھروں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے ان سے کہا: ''اے بنو کنانہ! جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج تمہیں پتا چل جائے گا کہ شہسوار کسے کہتے ہیں؟'' جب وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے آگے بڑھے تو ان کے سامنے خندق آ گئی۔ اسے دیکھ کر کہنے لگے: ''یہ تو ایسی تدبیر ہے، جسے اہل عرب اختیار نہیں کرتے۔'' پھر وہ خندق کے ایک اور مقام پر پہنچے اور اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑایا۔ گھوڑے خندق عبور کر گئے اور خندق اور سلع پہاڑی کے درمیان چکر لگانے

لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ہمراہ ان کے مقابلے کے لیے نکلے اور جس جگہ سے انہوں نے خندق عبور کی تھی اسے گھیرے میں لے لیا۔ گھڑسوار ان کی طرف سرپٹ دوڑے چلے آ رہے تھے۔[116] سب سے پہلے عمرو بن عبدوُدّ نے خندق عبور کی تھی۔ اگرچہ وہ عمر رسیدہ انسان تھا، لیکن اس کے باوجود اسے سو آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے مبارزت کی دعوت دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔ جب اس نے اپنے مقابلے میں ایک کم عمر نوجوان کو دیکھا تو اس کا مذاق اڑایا اور اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا، کیونکہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک نوعمر مدمقابل سے لڑنے کو اپنی شہرت کے منافی سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ کر اسے اپنی ہی تلوار سے مار ڈالا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جب مقابلہ شروع ہوا تو پہل کرتے ہوئے عمرو بن عبدوُدّ نے ایک خطرناک وار کیا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی ڈھال پر روکا۔ تلوار ڈھال کو کاٹتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر پر لگی، جس سے ان کا سر زخمی ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے اس کے کندھے پر وار کیا۔ اس پر مسلمانوں نے بھی نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اگر عمرو بن عبدوُدّ کی موت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وار سے نہ ہوتی تو مسلمانوں کے نعرہ تکبیر کی شدت سے ضرور واقع ہو جاتی۔ عمرو بن عبدوُدّ کی موت سے جہاں مشرکین کو شدید دھچکا لگا، وہیں مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔[117]

عمرو بن عبدوُدّ کے بعد ضرار، عکرمہ اور ہبیرہ بھی آئے، لیکن وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔[118] آخر میں عرب کا مشہور ترین شہسوار نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی نکلا اور خندق عبور کر کے دوسری طرف آ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن وہ مقابلے سے بھاگتے ہوئے خندق میں جا گرا۔ مسلمانوں نے اس پر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ نوفل نے سوچا کہ پتھروں سے مرنا اس کو شایاں نہیں ہے، لہٰذا اس نے چیخ کر کہا: ''اے عرب کے لوگو! مجھے اس سے بہتر طریقے سے قتل کرو۔'' چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خندق میں اتر کر اسے قتل کر دیا۔[119] یہ محاصرے کا مشکل ترین دن تھا، لیکن ایک ماہ کے بعد محاصرہ کمزور پڑ گیا اور کفار کے حوصلے پست ہو گئے، کیونکہ دس ہزار افراد کو کھانا کھلانا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

جب بنوقریظہ نے دیکھا کہ مشرکین خندق کو عبور نہ کر سکے اور جس نے اسے عبور کرنے کی کوشش کی وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو انہوں نے اس قلعے پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا، جس میں مسلمانوں نے

خواتین کو رکھا ہوا تھا اور ایک آدمی کو حملے سے پہلے جاسوسی کی غرض سے بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اس یہودی کو قلعے کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ اس کی گھات میں بیٹھ گئیں اور اچانک حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور اس کا اسلحہ اتار کر قلعے میں لے گئیں۔ جب یہودیوں نے دیکھا کہ ان کا بھیجا ہوا آدمی قتل ہو گیا ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ اس قلعے میں عسکری قوت موجود ہے، لہٰذا انہوں نے اس پر حملہ کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔[120]

دشمنانِ اسلام اس عزم کے ساتھ آئے تھے کہ وہ چند ہی دنوں میں مسلمانوں کو نیست و نابود کر کے واپس لوٹ جائیں گے، لیکن ان کا یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا اور جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ناکام و نامراد واپس لوٹنے کے سوا انہیں کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔

محاصرے کے دوران موسمی حالات بھی کفار کے لیے ناموافق بن گئے۔ سردیوں کی آمد تھی۔ اہل مکہ مدینے کی سردی برداشت نہ کر سکتے تھے، نیز انہوں نے سردی سے بچاؤ کا کوئی بندوبست بھی نہ کیا تھا۔ مزید یہ کہ رات دن مسلسل ہوا چلنے لگی، جس نے بعد میں آندھی کی صورت اختیار کر لی اور خیموں کو اکھیڑنے اور دیگوں کو الٹانے لگی۔ یہ صورت حال دیکھ کر مشرکین کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ابوسفیان کو مجبوراً واپسی کا حکم دینا پڑا۔[121]

۱۔ غزوہ خندق قرآن کریم کی روشنی میں

قرآن کریم غزوہ خندق کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس کی تفصیلات جان سکتے ہیں۔ اس معرکے میں بھی رسول اللہ ﷺ کی عسکری مہارت جھلکتی ہے۔ قرآن کریم اس معرکے کے بارے میں کہتا ہے:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَیْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیحاً وَجُنُوداً لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِیراً () إِذْ جَاؤُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا () هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالاً شَدِیداً () وَإِذْ یَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِینَ فِی قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُوراً () وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ یَا أَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَیَسْتَأْذِنُ فَرِیقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُولُونَ إِنَّ بُیُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِیَ بِعَوْرَةٍ إِن یُرِیدُونَ إِلَّا فِرَاراً () وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا یَسِیراً () وَلَقَدْ

كَانُوا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْؤُولاً﴾ (الأحزاب: ۹-۱۵) ''مومنو! خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت) کی جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کیے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر (چڑھ) آئے گا اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت) گلوں تک پہنچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت طور پر ہلائے گئے اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہنے لگے کہ خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ نے تو ہم سے محض دھوکے کا وعدہ کیا تھا اور جب ان میں سے ایک جماعت کہتی تھی کہ اے اہل مدینہ (یہاں) تمہارے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں تو لوٹ چلو اور ایک گروہ ان میں سے پیغمبر سے اجازت مانگنے اور کہنے لگا کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔ وہ تو صرف بھاگنا چاہتے تھے اور اگر فوجیں اطرافِ مدینہ سے ان پر آداخل ہوں پھر ان سے خانہ جنگی کے لیے کہا جائے تو (فوراً) کرنے لگیں اور اس کے لیے بہت کم توقف کریں، حالانکہ پہلے اللہ سے اقرار کر چکے تھے کہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور خدا سے (جو) اقرار (کیا جاتا ہے اس) کی ضرور پرسش ہوگی۔''

درج ذیل آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے جذبات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَاناً وَتَسْلِيماً﴾ (الأحزاب: ۲۲) ''اور جب مومنوں نے (کافروں کے) لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی ہے، جس کا خدا اور اس پیغمبر نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اس کے پیغمبر نے سچ کہا تھا اور اس سے ان کا ایمان اور اطاعت اور زیادہ ہوگئی۔''

حسب معمول ہم کتب سیرت میں ذکر کردہ تفصیلات میں نہیں جائیں گے، بلکہ صرف خاص خاص امور کا تذکرہ کریں گے۔ ہمارا بنیادی مقصد حضرت سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کو اجاگر کرنا ہے۔ آپ ﷺ کی فراست کے مختلف پہلو ہیں، جن میں سے ایک عسکری پہلو بھی ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ ﷺ غزوہ بدر اور احد میں عسکری قیادت کا بہترین نمونہ تھے، گو اس موضوع پر اختصاصی دسترس نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے کہ غزوہ خندق میں بھی آپ ﷺ نے بے مثال عسکری مہارت کا ثبوت دیا تھا اور غزوہ خندق ہمارے اس دعوے پر شاہد عدل ہے۔

غزوہ خندق میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے انتہائی مشکل حالات میں فتح مبین حاصل کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عظیم فراست کی بدولت جنگ کے ان حالات وواقعات پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وحی اور الہام کے ذریعے بتایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی روشنی میں بہترین حکمت عملی تشکیل دے کر اسے انسانی نقطۂ نظر سے مشکل ترین معرکے میں انتہائی کامیابی سے عملی جامہ پہنایا۔ بظاہر ان حالات میں فتح حاصل کرنا نہ صرف مشکل، بلکہ محال دکھائی دیتا تھا۔ ذیل میں ہم رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی دلیل بننے والے معرکے میں رسول اللہ ﷺ کی حکمت پر ایک نظر ڈالیں گے۔

۲- غزوہ خندق سے ماورا

۱- دشمن کا لشکر دس ہزار نفوس پر مشتمل تھا، جبکہ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی، گویا دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی اور ہر مسلمان کے مقابلے میں تین مشرک تھے، لہٰذا اس جنگ میں دوبدو لڑنے کی بجائے دفاعی حکمت عملی اختیار کرنا بڑی فراست اور دانش مندی کی بات تھی نیز جیسا کہ اوپر گزر چکا، رسول اللہ ﷺ ایک حکمت عملی کو دوبار استعمال نہ فرماتے۔ غزوہ خندق میں اسی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

۲- اس معرکے میں دشمن کی پیش قدمی کو روکنے میں خندق نے اہم کردار ادا کیا تھا، کیونکہ قریش اور ان کے اتحادیوں نے ایسی غیر متوقع صورت حال کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا، جس سے ان کے اوسان خطا اور اندازے غلط ثابت ہو جائیں گے۔

۳- خندق کے مختصر سے حصے کو اس قدر تنگ چھوڑ دینا کہ وہاں سے ماہر ترین شہسوار خندق کو عبور کر سکیں، رسول اللہ ﷺ کی اعلیٰ درجے کی ذہانت اور فراست کی دلیل ہے، کیونکہ اس حکمت عملی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ دشمن کے سب سے زیادہ ماہر، بہادر اور طاقتور شہسواروں کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گئے، جس کے نتیجے میں دشمن کے حوصلے پست اور مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوئے۔

۴- خندق کی کھدائی میں مسلمانوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بھی حصہ لیا، جس سے مسلمانوں کو سہارا ملا اور ان کے حوصلے بلند ہوئے۔ جب کھدائی کے دوران ایک ایسی چٹان آئی، جسے مسلمان نہ توڑ سکے تو رسول اللہ ﷺ نے ''بسم اللہ'' پڑھ کر اس پر ضرب لگائی۔ ضرب کے نتیجے میں چٹان سے روشنی نکلی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے شام کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئیں۔

بخدا! میں مشیت ایزدی سے اس کے سرخ محلات دیکھ رہا ہوں۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے دوسری ضرب لگائی۔ اس کے نتیجے میں بھی چٹان سے روشنی نکلی اور آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ اکبر! مجھے فارس کی خزانوں کی چابیاں دے دی گئیں۔ بخدا! میں مدائن کے سفید محل کو دیکھ رہا ہوں۔" پھر آپ ﷺ نے تیسری ضرب لگائی۔ اس کے نتیجے میں بھی اس سے روشنی نکلی اور آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ اکبر! مجھے یمن کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئیں۔ بخدا! میں اس وقت یہاں سے صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔"(122)

رسول اللہ ﷺ کے ان مبارک ارشادات نے صحابہ کرام کے حوصلوں کو اس قدر بلند کر دیا کہ نہ صرف دس ہزار کا لشکر، بلکہ اگر ساری دنیا بھی ان کے خلاف متحد ہو جاتی تو وہ ان سے لڑنے میں ذرا تردد نہ کرتے۔

۵- خندق عبور کرنے والے شہسواروں سے لڑنے کے لیے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا انتخاب ایک عمدہ انتخاب تھا، جو آپ ﷺ کی فراست کی دلیل ہے۔ یہ اختیار رضا کارانہ تھا، اجباری نہ تھا۔ آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ کس موقع پر کس کا انتخاب کرنا ہے۔

۶- آپ ﷺ نے منافقین کی اس قدر سخت نگرانی فرمائی کہ کوشش کے باوجود وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ بات نقصان سے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے پہلو سے آپ ﷺ کی فراست کی دلیل ہے۔

۷- رسول اللہ ﷺ نے اس معرکے کے دورانیے کو حتی الامکان بڑھانے کی کوشش فرمائی۔ اس میں آپ ﷺ کو کامیابی ہوئی اور اس سے آپ ﷺ نے بہت سے فوائد حاصل کیے، جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

اول: اس وقت موسم سرما کی آمد آمد تھی، جبکہ قریش اور ان کے اتحادیوں کے پاس سردی سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اگر وہ محاصرے کو جاری رکھتے تو سردی کے ہاتھوں مرتے اور اگر محاصرہ اٹھا کر واپس جاتے تو ان کی شان و شوکت خاک میں مل جاتی۔

دوم: دشمن روزانہ دس ہزار افراد پر مشتمل لشکر کی خوراک کا بندوبست کرنے پر مجبور تھا جیسے جیسے محاصرے کا دورانیہ بڑھ رہا تھا ویسے ویسے مالی بحران سنگین صورت حال اختیار کرتا جا رہا تھا اور جب بھوک، پیاس اور سردی نے بیک وقت شدید صورت اختیار کی تو ان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

سوم: دشمن کے اتحاد کے زیادہ عرصہ تک برقرار رہنے کی امید نہ تھی، کیونکہ یہ ایک مصنوعی اتحاد تھا، جس کی واحد بنیاد رسول اللہ ﷺ کی دشمنی تھی، لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس اتحاد میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں، دوسری طرف مسلمانوں کا اتفاق واتحاد ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔

چہارم: دشمن کے لشکر میں بہت سے قائدین تھے۔ان میں سے کوئی بھی دوسروں سے اپنی بات منوانے پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ان کی صورت حال صلیبی فوجوں جیسی تھی۔ابوسفیان صرف کہنے کو دشمن کی فوج کا سپہ سالار تھا۔حقیقت اس سے مختلف تھی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان قائدین کے درمیان اختلافات اور تنازعات کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔

۸۔ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں چند بڑی اہم ذمہ داریاں سونپیں اور کچھ عرصہ تک اپنے اسلام کو مخفی رکھنے کے لیے کہا۔

حضرت نعیم رضی اللہ عنہ قریش اور یہود دونوں کے ہاں قابل احترام اور لائق اعتبار شخص سمجھے جاتے تھے۔چونکہ جنگ ''حکمت عملی'' کا نام ہے، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں دشمن میں پھوٹ ڈالنے کی ذمہ داری سونپی۔زمانۂ جاہلیت میں حضرت نعیم کا بنوقریظہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، لہٰذا وہ ان کے پاس گئے اور ان سے کہا: ''تم اپنے ساتھ میری محبت اور خصوصی تعلق کو بخوبی جانتے ہو۔'' بنوقریظہ نے جواب میں کہا: ''تم ٹھیک کہتے ہو۔تم ہمارے نزدیک قابل بھروسا شخص ہو۔'' اس پر حضرت نعیم نے ان سے کہا: ''قریش اور غطفان کا معاملہ تم لوگوں سے مختلف ہے۔تم اس شہر کے باسی ہو۔یہاں تمہارا گھربار اور مال وجائیداد ہے۔تم یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتے، جبکہ قریش اور غطفان باہر سے محمد اور اس کے ساتھیوں سے لڑنے کے لیے آئے ہیں۔ان کا گھربار اور مال وجائیداد یہاں نہیں ہے۔ اگر انہیں موقع ملا تو اس سے فائدہ اٹھائیں گے، بصورتِ دیگر تمہیں اس شہر میں محمد کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائیں گے اور تم جانتے ہو کہ تم تنہا محمد کے ساتھ نہیں لڑ سکتے، لہٰذا جب تک ان کے کچھ شرفاء کو اپنے پاس رہن کے طور پر نہ رکھ لو اس وقت تک جنگ میں ان کا ساتھ نہ دو۔رہن کی صورت میں تم محمد کے خلاف جنگ میں اعتماد کے ساتھ ان کا ساتھ دے سکو گے۔'' یہ بات سن کر بنوقریظہ نے کہا: ''واقعی تم نے درست مشورہ دیا ہے۔'' پھر حضرت نعیم قریش کے پاس گئے اور ابوسفیان اور اس کے پاس بیٹھے قریشیوں سے کہا: ''تم میری اپنے ساتھ محبت اور محمد سے دوری کو بخوبی جانتے ہو۔مجھے ایک بات پہنچی ہے، جسے میں تمہاری خیر خواہی کے لیے تمہیں بتانا ضروری خیال کرتا ہوں، تاہم میرا نام

صیغۂ راز میں رکھا جائے۔" انہوں نے کہا: "ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔" اس پر حضرت نعیم نے کہا: "تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ یہودیوں کو محمد ﷺ کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر پچھتاوا ہوا ہے اور انہوں نے محمد ﷺ کی طرف پیغام بھیجا ہے کہ ہم اپنے اقدام پر شرمسار ہیں۔ کیا آپ اس پر راضی ہیں کہ ہم قریش اور غطفان کے چند شرفاء آپ کے سپرد کر دیں، جن کے آپ سر قلم کر دیں اور پھر ہم اور آپ مل کر باقی ماندہ لشکر پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کر دیں؟ اس کے جواب میں محمد نے رضامندی کا اظہار کیا ہے، لہٰذا اگر یہودی تم سے کچھ لوگ رہن کے طور پر مانگیں تو انہیں ایک آدمی بھی نہ دینا۔"

پھر حضرت نعیم نے قبیلہ غطفان کے پاس جا کر انہیں بھی اسی طرح محتاط رہنے کے لیے کہا۔ جب یہودیوں نے قریش اور غطفان سے رہن کا مطالبہ کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ نعیم نے ان سے درست کہا تھا اور بنو قریظہ کو پیغام دے بھیجا: "بخدا! ہم تمہیں اپنا ایک آدمی بھی نہیں دیں گے۔ اگر تم جنگ کے خواہش مند ہو تو جنگ کے لیے باہر نکل آؤ۔" یہ جواب سن کر بنو قریظہ کو بھی حضرت نعیم کی بات کا یقین ہو گیا اور وہ رہن کے مطالبے پر اصرار کرنے لگے، لیکن قریش اور غطفان انکار کرتے رہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی۔ (123)

رسول اللہ ﷺ کی فراست دیکھئے کہ حضرت نعیم بن مسعود کو اسلام قبول کئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ آپ ﷺ جان گئے کہ نعیم اس اہم ذمہ داری کو سرانجام دینے کے اہل ہیں اور اسے سرانجام دے سکتے ہیں اور عملاً انہوں نے اسے بحسن و خوبی ادا کر کے دکھایا۔

9- ہوا اور آندھی کے تھپیڑوں نے دشمن کو عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو دشمن کے حالات کی خبر لینے کے لیے بھیجا، چونکہ وہ آپ ﷺ کے رازوں کے امین اور آپ کے احکامات پر من و عن عملدرآمد کرنے کے جذبات سے سرشار تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے ان کا انتخاب فرمایا۔ انہیں اس مہم پر روانہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے تاکید کی: "اے حذیفہ! جاؤ اور دشمن میں گھس کر دیکھو کہ وہ کیا کر رہا ہے اور واپس آنے تک کسی قسم کا اقدام مت اٹھانا۔"

حضرت حذیفہ دشمن کی طرف گئے اور ان میں گھس گئے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جب وہ ابوسفیان کو قتل کر سکتے تھے، کیونکہ ابوسفیان ان کی طرف پشت کر کے بیٹھا تھا اور ان کے دل میں خیال آیا کہ

تیر مار کر اس کا قصہ تمام کردوں، لیکن پھر انہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک یاد آ گیا کہ واپس لوٹنے تک کوئی اقدام مت اٹھانا، لہٰذا وہ اس اقدام سے باز رہے۔ ابوسفیان مسلسل چلو! چلو! کی آواز لگا رہا تھا اور واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ قریش اور اس کے اتحادی ناکام و نامراد واپس لوٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ قرآن کریم ان کی اس دردناک کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَاناً وَتَسْلِيماً﴾ (الأحزاب: ٢٥) ''اور جو کافر تھے ان کو خدا نے پھیر دیا وہ اپنے غصے میں (بھرے ہوئے تھے) کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے اور خدا مؤمنوں کو لڑائی کے بارے میں کافی ہوا اور خدا طاقتور (اور) زبردست ہے۔'' واپسی پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سفید کپڑوں میں ملبوس سفید عمامے پہنے ہوئے شہسواروں کو کفار کے درمیان چکر لگاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے حضرت حذیفہ سے کہا: ''اپنے ساتھی سے کہنا کہ اللہ ان کے لیے کافی ہیں۔'' جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بتائی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ فرشتے تھے۔''(124)

١٠- غزوہ خندق میں رسول اللہ ﷺ نے خود قیادت فرمائی اور محاصرے کے پورے عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی محاذِ جنگ سے غیر حاضر نہ رہے۔ آپ ایک عام مسلمان کی طرح رہے اور تمام مشکلات اور کٹھن لمحات میں اپنے لشکر کے ہمراہ رہے۔ اس سے آپ ﷺ کی قیادت کی رفعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

١١- اس مشکل ترین جنگ میں مسلمانوں میں سے شہادت پانے والوں کی مجموعی تعداد صرف چھ تھی۔(125)

١٢. اس جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آئندہ ہم ان پر حملہ کریں گے، لیکن وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔''(126) آنے والے دنوں سے آپ ﷺ کی اس بات کی تصدیق ہو گئی۔

غزوہ خندق کے ذکر کے دوران دو واقعات کے تذکرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک جلیل القدر صحابی اور انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کا واقعہ ہے (127) اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی قضا ہونے والی چار نمازوں کی ادائیگی کا واقعہ ہے۔

پہلے حادثے میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بازو پر زخم لگا، جس سے مسلسل خون بہنے

لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے خصوصی اہتمام فرماتے ہوئے ان کے لیے 'مسجد' کے احاطے میں خیمہ نصب کروایا اور مسلسل ان سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ دوسرے صحابہ کرام بھی ان سے ملنے کے لیے آتے اور ان کے پاس بیٹھتے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام کے بعد سے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ سے علیحدہ نہ ہوئے تھے۔ آپ ﷺ بھی انہیں خصوصی اہمیت دیتے، یہی وجہ تھی کہ جب بنو قریظہ کے معاملے میں انہیں ثالث مقرر کیا گیا اور زخمی ہونے کی وجہ سے انہیں سواری پر بٹھا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: ''اپنے سردار کے لیے کھڑے ہو اور اسے سواری سے اتارو۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے جذبہ اخلاص و وفا میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ انہوں نے اخلاص و وفاداری کے جذبے سے زندگی گزاری اور اسی جذبے کے ساتھ وفات پائی۔ انہوں نے ہی غزوہ بدر کے موقع پر کہا تھا:

''...آپ جس سے چاہیں تعلقات قائم کریں اور جس سے چاہیں تعلقات ختم فرمائیں۔ جس سے چاہیں جنگ کریں اور جس سے چاہیں صلح کریں۔ ہمارے مال میں سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں ہمیں دیں۔ جو چیز آپ ہم سے لیں گے وہ ہمیں اس سے زیادہ محبوب ہوگی، جو آپ ہمارے لیے چھوڑیں گے۔ آپ جو حکم بھی دینا چاہتے ہیں دیجئے۔ ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ بخدا! اگر آپ برک الغماد تک بھی چل کر گئے تو ہم بھی آپ کے ہمراہ چلیں گے۔''(128)

اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتے تھے: ''اے اللہ! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ جس قوم نے آپ کے رسول کو جھٹلایا اور اسے اپنے شہر سے نکالا، مجھے اس سے لڑنے سے زیادہ کسی سے لڑنا پسند نہ تھا... اے اللہ! مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کا سلسلہ ختم فرما دیا ہے، لیکن اگر قریش کے ساتھ کوئی جنگ ہونا ابھی باقی ہے تو مجھے ان کے ساتھ لڑنے کے لیے زندہ رکھیے اور اگر آپ نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کا سلسلہ ختم فرما دیا ہے تو میرے اس زخم کو میری شہادت کا ذریعہ بنا دیجئے، نیز جب تک بنو قریظہ کے بارے میں مجھے خوش کن خبر نہ مل جائے اس وقت تک مجھے موت نہ دیجئے۔''(129)

غزوہ خندق کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ گھر لوٹ آئے، لیکن جونہی آپ ﷺ گھر میں داخل ہوئے، حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کے خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ نے ہتھیار رکھ دیئے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔'' اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ''لیکن فرشتوں نے ابھی تک ہتھیار نہیں رکھے اور وہ ابھی ابھی دشمن کے تعاقب سے لوٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

آپ کو بنو قریظہ کی طرف چلنے کا حکم دے رہے ہیں۔"[130] رسول اللہ ﷺ نے فوراً بنو قریظہ کی طرف چلنے کا حکم ارشاد فرمایا اور صحابہ کو اس سفر کی اہمیت اور اس سلسلے میں جلدی کرنے کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے انہیں عصر کی نماز وہاں پڑھنے کی تاکید فرمائی۔[131]

بنو قریظہ مسلمانوں سے خیانت کرتے رہتے تھے، جس کا خصوصی مظاہرہ انہوں نے غزوہ خندق کے موقع پر کر کے مسلمانوں کی کمر میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عورتوں کے قلعے پر حملہ کرنے کے لیے جاسوسی کی غرض سے آدمی بھیجا، لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا حلیف ہونے کے باوجود آپ ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور معاہدے کو توڑ دیا۔

ان کا جرم صرف یہی نہ تھا، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے جلاوطن کئے گئے سیاسی لوگوں مثلاً حیی بن اخطب وغیرہ جیسے دشمنانِ اسلام کے استقبال کے لیے اپنے قلعوں کے دروازے کھولے۔ ان کا یہ طرز عمل معاہدے کو توڑنے کے مترادف تھا۔

اس سب کچھ کے باوجود جب رسول اللہ ﷺ ان کی طرف گئے تھے، اگر اس وقت وہ آپ ﷺ سے معافی مانگ لیتے تو ممکن تھا کہ آپ ﷺ انہیں معاف فرما دیتے، کیونکہ آپ ﷺ ہمیشہ ان سے اچھے تعلقات قائم رکھنے کو پسند فرماتے تھے، لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے دشمنی کا راستہ اختیار کیا۔ بُرائی ان کے دلوں میں گھر کر چکی تھی، تاہم جب انہیں اپنے طرز عمل پر پچھتاوا ہوا تو انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ ان کے معاملے کا فیصلہ سعد بن معاذ کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ شرط قبول فرمالی، چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اپنے بستر سے اٹھے اور دراز گوش پر سوار ہو کر وہاں گئے، جہاں وہ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا تھا: "قوموا الی سیدکم" "اپنے سردار کے لیے اٹھو۔" (بعض روایات میں سید (سردار) کی جگہ خیر (بہتر) کے الفاظ ہیں۔) جب وہ نبی کریم ﷺ کے پہلو میں بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: "یہ لوگ تمہارے فیصلے پر قلعے سے اترے ہیں۔" چنانچہ حضرت سعد نے ان کے بارے میں تورات کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ ان کے مردوں کو قتل کیا جائے، ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کئے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے۔ فریقین کے لیے اس فیصلے کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔[132] اس طرح مدینہ منورہ ایک اور فتنے سے پاک ہو کر اپنے گردونواح سمیت پر امن شہر بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرما کر ان کی خواہش پوری فرمائی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ان کے زخم سے خون جاری ہو گیا اور وہ اپنے پروردگار سے جا ملے۔ وہ جلدی میں جنگ کے لیے نکلے تھے اور انہوں نے ایک ایسی زرہ پہن رکھی تھی، جو ان کے جسم پر پوری نہ تھی، جس کی وجہ سے ان کے بازو کا کچھ حصہ ننگا رہ گیا تھا، وہیں پر انہیں ایک تیر لگا، جو ان کی شہادت کا باعث بن گیا۔

ط: دیگر غزوات

گزشتہ صفحات میں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اٹھارہ غزوات[133] میں سے تین غزوات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے آپ ﷺ کی شخصیت کے عسکری پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم آپ ﷺ کی عظیم فراست کے دیگر گوشوں کو اجاگر کرنے کے لیے اختصار کے ساتھ اہم اہم عنوانات کے تحت دیگر غزوات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

صلح حدیبیہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا کہ کیسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کی بدولت تمام مشکلات کو حل فرمایا۔ حدیبیہ کے موقع پر جنگ کا پیش آنا یقینی نظر آ رہا تھا، لیکن آپ ﷺ ایک ایسی جنگ کو روکنے میں کامیاب ہو گئے، جس میں فریقین کے درمیان طاقت کا تناسب بہت مختلف تھا۔ اسلحے سے لیس دشمن کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی اور اس کی قیادت خالد بن ولید اور عکرمہ جیسے ماہرین جنگ کر رہے تھے، جبکہ دوسری طرف صحابہ کی تعداد چودہ سو کے لگ بھگ تھی اور وہ بھی غیر مسلح۔[134] وہ عمرہ کی ادائیگی کے ارادے سے احرام باندھ کر آئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نہ صرف اپنے صحابہ کو ایسے مشکل اور دشوار معرکے میں گھسنے سے روکنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے اس بحران کو فتح پر منتج فرمایا۔

حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال پیش آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاجرین کے دل مکہ کے شوق اور محبت کے جذبات سے لبریز تھے، حتی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے فولادی ارادے کے مالک انسان بھی مکہ کے فراق سے متاثر ہو کر درج ذیل شعر پڑھا کرتے تھے:

كل امرئ مصبّح في أهله والموت أدنى من شراك نعله

"انسان صبح اپنے گھر والوں کے ساتھ کرتا ہے، لیکن موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر ہوتی ہے۔"

اگرچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اصلی وطن مکہ کی بجائے حبشہ تھا، لیکن مکہ میں رہنے کی وجہ سے انہیں اس کے ساتھ اس قدر لگاؤ ہو گیا تھا کہ جب وہ ہجرت کر کے مدینے آئے تو انہیں بخار ہو گیا اور اس دوران مکہ کے اشتیاق میں درج ذیل اشعار پڑھتے تھے:

الاليت شعري هل أبيتن ليلةً بواد و حولي اذخر و جليل
وهل أردن يوماً مياه مجنّة وهل يبدون لي شامة وطفيل

''اے کاش! کیا میں کسی رات وادی مکہ میں بھی پہنچوں گا، جہاں میرے گرد اذخر اور جلیل کی بوٹیاں ہوں گی؟

کیا میں کبھی مجنہ کے چشمے پر جاؤں گا اور کیا مجھے شامہ اور طفیل کے پہاڑ دکھائی دیں گے؟''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ شکوہ کرتے ہوئے کہتے تھے:

انی وجدت الموت قبل ذوقه ان الجبان حتفه من فوقه[135]

''مجھے تو موت سے پہلے ہی موت آ گئی ہے۔ بزدل کی موت اس کے اوپر سے آتی ہے۔''

وطن کے شوق سے سب کے دل لبریز تھے۔ ام القری کہلانے والے مکہ کے فراق کو چھ سال بیت چکے تھے، جن میں وہ کعبہ کا طواف بھی نہ کر سکے تھے، حالانکہ ان کے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی اصلاح و تعمیر فرمائی تھی۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ﴾ (آلِ عمران:۹۶) ''پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہی ہے جو مکے میں ہے۔ بابرکت اور جہاں کے لیے موجب ہدایت۔''

جس کعبہ کی طرف مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں اشارہ ہے، وہ روئے زمین پر وجود میں آنے والی سب سے پہلی عمارت تھی اور اس کے معمار حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ اس کے بانی پہلے نبی تھے اور اس کی اصلاح و تجدید خلیل اللہ کے ہاتھوں ہوئی تھی، لیکن اب کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی افضل ترین اولاد یعنی حضرت محمد ﷺ کو اس سے جلاوطن کر دیا تھا اور پورے چھ سال بیت چکنے کے باوجود اس کی زیارت اور اس کا طواف کرنے کا خواہش مند نبی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا کوئی لمبا چوڑا مطالبہ نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ اسے اور اس کے پیروکاروں کو اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کعبے کا طواف کرنے دیا جائے۔

اس وقت کعبہ بتوں سے بھرا پڑا تھا اور اس کے اردگرد بھی بہت سے بت نصب تھے۔ مشرکین کا کعبے کے گرد طواف لائقِ استہزاء اور طواف کی روح سے خالی تھا، اسی لیے قرآنِ کریم ان کے طواف کو ''مکاء'' اور ''تصدیة'' کہتا ہے۔[136] وہ ہاتھوں سے تالیاں اور منہ سے سیٹیاں بجاتے تھے۔ عورتیں خاص طور پر رات کو کپڑے اتار کر برہنہ طواف کرتیں اور دلیل یہ پیش کرتیں کہ جن کپڑوں کو پہن کر گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، انہیں پہن کر طواف کرنا درست نہیں[137] مردوں اور عورتوں کا یہ طواف مسلمانوں کے طواف سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی بنیادیں کچھ اور تھیں، جن کا تعلق ایک ایسے دور سے تھا، جس کی تشریح و توضیح یہاں ممکن نہیں۔

رسول اللہ ﷺ لوگوں کو طواف اور عمرے کا صحیح طریقہ بتانا چاہتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کا اوّلین ہدف تھا۔ ایک ثانوی ہدف اس بات کا اظہار کرنا تھا کہ کعبہ صرف اہل مکہ یا قریش کی ملکیت نہیں ہے، بلکہ اس پر دوسروں کا بھی حق ہے، بلکہ درحقیقت اللہ کا رسول جس کے ذریعے کعبہ کی شہرت، شرف اور عظمت بحال ہونی تھی اور اس کی مقدس جماعت اس پر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ استحقاق رکھتی تھی۔ کعبہ ایک طویل عرصے سے منبر سے محروم محراب کی مانند ہو چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جس منبر کو مدینے میں رکھا تھا، اسے محراب کے قریب لانا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کعبہ ہمارا ابدی محراب ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اس پر سب سے زیادہ حق تھا۔ کعبے میں بتوں کی موجودگی کی وجہ سے آپ ﷺ ایک عرصہ تک مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے، لیکن آپ ﷺ کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی رہتیں، کیونکہ کعبے سے رخ پھیرنا آپ سے برداشت نہ ہوتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے غم کو دور کرنے اور آپ کو خوشخبری سنانے کے لیے درج ذیل آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ (البقرة: ١٤٤) ”(اے محمد) ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں، سو ہم تم کو اسی قبلے کی طرف، جس کو تم پسند کرتے ہو، منہ کرنے کا حکم دیں گے۔“

جس عرصے کے دوران رسول اللہ ﷺ نے مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کی تھیں وہ عرصہ آپ ﷺ کے لیے مسافرت اور ہجرت کا دور تھا۔ کعبہ آپ ﷺ کا محراب اور مدینہ منبر تھا، لہٰذا کعبے کا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا ضروری تھا۔ چونکہ عمرے کی ادائیگی اس منزل کی طرف پہلا قدم تھا، اس لیے آپ ﷺ اسلامی اصولوں اور عقیدے کے مطابق اور اسلامی فکر اور روح کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی فرماتے رہتے تھے۔ اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا۔ حج آپ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں فرض ہوا تھا، اسی لیے آپ ﷺ نے صرف ایک بار حج فرمایا، جسے قرآن کریم نے ”الحج الأکبر“ سے موسوم کیا ہے۔[138] عمرے کو حج اصغر کہا جاتا ہے۔

عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ حجِ اکبر اس حج کو کہتے ہیں، جس میں عرفہ کا دن جمعہ کے دن ہوتا ہے، حالانکہ حج اکبر کا اطلاق حج کے ایّام میں ادا کیے جانے والے حج پر ہوتا ہے اور حج اصغر کا اطلاق عمرہ پر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا تیسرا ہدف اپنی مبارک جماعت کو قبائل کے سامنے پیش کرنا تھا، تاکہ وہ دیکھیں کہ جب وہ گزرتے ہیں تو راستے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، کسی کے باغ میں داخل ہوتے

ہیں اور نہ ہی کسی کے گھر اور مال ومتاع کو لوٹتے ہیں۔ وہ ایسی بری حرکات سے کوسوں دور ہیں۔ ایسے دور میں کہ جب اتنی طاقت کی حامل فوج عام طور پر لوٹ مار ضرور کرتی تھی، یہ فوج اطمینان وسکون کی فوج دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس سفرِ حج میں سارے عرب کے سامنے اسلام کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل تھی، کیونکہ جو لوگ بھی انہیں دیکھتے وہ عام طور پر اپنے دل میں ضرور سوچتے: "یہ کون لوگ ہیں؟ ہم نے ایسے لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ یہ تو فرشتہ سیرت انسان ہیں۔"

چونکہ مکہ جاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پیشِ نظر مذکورہ بالا اہداف تھے، اس لیے صحابہ کرام نے اپنے ہمراہ صرف تلواریں لیں اور وہ بھی نیاموں میں تھیں۔ حدیبیہ کے مقام تک کوئی خاص بات پیش نہ آئی۔ یہاں کسی نے انہیں بتایا کہ قریش اپنی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ تمہیں روکیں گے، حالانکہ امن فوج جنگ یا لڑائی کی خواہش مند نہ تھی، کیونکہ وہ اس مقصد کے لیے آئی ہی نہ تھی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کو بہت دکھ ہوا۔ آپ ﷺ صحابہ کرام کو عمرے کی ادائیگی کی خوشخبری سنا چکے تھے اور وہ آپ ﷺ کی معیت میں اسلامی اصولوں کے مطابق عمرے کے شعائر کی ادائیگی کے لیے شوق واشتیاق کے ساتھ آئے تھے۔ جاہلیت میں انہوں نے جو حج اور عمرے کئے تھے وہ حج اور عمرہ کہلائے جانے کے لائق نہ تھے، تاہم اب وہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں آسمانی وحی کی ہدایات اور اسلامی اصولوں کے مطابق ان شعائر کو ادا کرنے والے تھے۔

حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے اور آپ ﷺ نے اپنی ذات اور صحابہ کرام کی شجاعت پر بھروسا ہونے کے باوجود انہیں ٹھہر جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اگر میں نے اللہ پر بھروسا اور اعتماد کر کے مشرکین سے جنگ کی تو مجھے ضرور فتح حاصل ہوگی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا، بلکہ انتظار کرنے کو ترجیح دی، تاہم ان رکاوٹوں کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا، جب آپ ﷺ نے اسلام کی خاطر موت تک لڑنے پر اپنے صحابہ سے بیعت لی۔ اس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے برکت نازل فرمائی: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ()وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (الفتح: ۱۸-۱۹) "(اے پیغمبر) جب مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی اور بہت سے غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور خدا غالب حکمت والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا حال جانتے تھے۔ اگر رسول اللہ ﷺ ان سے جان دینے کے لئے کہتے تو وہ جان دے دیتے۔ اگر آپ ﷺ ٹھہرنے کا فرماتے تو وہ ٹھہر جاتے اور اگر آپ ﷺ انہیں کعبے کا طواف کرنے کا کہتے وہ ضروری اسلحہ نہ ہونے کے باوجود حکمِ نبوی پر عمل کر کے دکھاتے۔

قرآنی شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینہ نازل فرمائی اور ان کی اس خودداری کے عوض ان سے قریبی فتح کا وعدہ فرمایا، البتہ ایک بات جس کی رسول اللہ ﷺ کو توقع تھی اس سال وقوع پذیر نہ ہوئی، بلکہ اس وقت پوری ہوئی، جب صحابہ کرام نے ایک سال بعد اسلامی شعائر کے مطابق کعبہ کا طواف اور حجرِ اسود کا استلام کیا۔ اس سفر کے باقی تمام مقاصد پورے ہو گئے۔ دیہاتیوں نے یہ بات دیکھی اور اس پر یقین کر لیا کہ یہ لشکر جہاں سے بھی گزرتا ہے، وہاں امن اور سکون قائم کرتا ہے۔ یہ لشکر مدینے سے مکہ کی طرف جاتے ہوئے بہت سے دیہاتیوں اور بدوؤں کے خیموں کے پاس سے گزرا اور بہت سے لوگوں سے ملا۔ ان کے دلوں پر پڑنے والے اس اچھے تأثر کے مستقبل میں ثمرات ظاہر ہونے تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے اگلے دو تین سالوں میں دائرہ اسلام میں داخل ہو کر صحابہ کے ساتھ فتح مکہ کے لیے روانہ ہونا تھا، نیز قریش اور دوسرے مشرکین کو احساس ہو گیا کہ کعبہ صرف قریش کی ملکیت نہیں، بلکہ اس پر سب کا حق ہے، جن میں فخرِ انسانیت ﷺ اور ان کے صحابہ کرام پیش پیش ہیں۔

درحقیقت قریش اس معاہدۂ صلح میں، جس پر ان کے اور آپ ﷺ کے دستخط موجود تھے، اس حقیقت کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، کیونکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: ”آپ اس سال مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس لوٹیں گے۔ آئندہ سال ہم مکہ سے نکل جائیں گے اور آپ اپنے صحابہ کے ہمراہ اس میں داخل ہو کر تین دن تک اس میں ٹھہریں گے۔ آپ کے پاس ایک سوار والا اسلحہ ہوگا اور تلواریں نیاموں میں ہوں گی۔ اس کے سوا کسی اور اسلحے کے ساتھ آپ مکہ میں داخل نہیں ہوں گے۔“(139)

یہ مسلمانوں کی مستقل حیثیت کا اعتراف تھا۔ اس سے پہلے عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ مکہ اور کعبہ مشرکین اور خاص طور پر قریش کی ملکیت ہے۔ انہوں نے سب کو اس بات پر قائل کیا ہوا تھا اور سب پر مشرکین کے وضع کردہ شعائر کی پابندی ضروری تھی۔ کوئی اور اپنے لیے علیحدہ شعائر وضع نہیں کر سکتا تھا، جبکہ صلح حدیبیہ کے معاہدے کی شرائط کے ضمن میں مسلمانوں کے لیے اپنے شعائر کے مطابق عمرہ کرنے اور کعبے کا طواف کرنے کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے صرف چودہ سو صحابہ کے ہمراہ ان سے کافی بڑے لشکر کے مقابلے میں فتح حاصل کی۔ اس فتح سے جہاں آپ ﷺ نے لوگوں کے دلوں کو جیتا، وہیں سب سے اپنی حیثیت بھی منوائی۔

مثلاً عروہ بن مسعود اور سہیل بن عمرو قریش کے نمائندے بن کر رسول اللہ ﷺ سے مذاکرات کرنے کے لیے آئے تھے، لیکن جب انہوں نے صحابہ کرام کا نبی اکرم کے ساتھ تعلق اور جذبہ محبت دیکھا اور آپ ﷺ کے رویے، بارعب شخصیت، اللہ تعالیٰ پر مضبوط ایمان، خوف و خشیت اور آپ پر نبوت کے آثار کا مشاہدہ کیا تو وہ بہت متاثر ہوئے، ان کے دلوں پر برف کی جمی ہوئی دبیز تہیں پگھل گئیں، ان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا اور وہ دونوں مستقبل قریب میں اسلام قبول کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ جب وہ مکہ لوٹ کر گئے تو انہوں نے قریش کے مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ اور بے لچک موقف کو تبدیل کر کے ان کے بارے ان کے دلوں میں موجود نفرت کو کم کیا۔ اس طرح اسلام کا تسامح اور مشرکین کی ہٹ دھرمی اور عناد بہت سے لوگوں کے موقف کی تبدیلی کا باعث بن گیا۔ اس سلسلے کی بعض زندہ مثالیں موجود ہیں۔ (140)

آشفتہ حال لوگ یکے بعد دیگر نبی اکرم ﷺ کی صف میں شامل ہو رہے تھے۔ بعض اوقات بظاہر صلح حدیبیہ پسپائی دکھائی دیتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ بہت سے فوائد کی حامل فتح تھی۔ اس میں قریش کی طرف سے امن اور حملہ نہ کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی، نیز اس معاہدۂ صلح میں بنو بکر نے قریش کے ساتھ اور بنو خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ تحالف کیا۔ اس صلح کا تقاضا یہ تھا کہ ایک فریق دوسرے فریق پر حملہ نہیں کرے گا۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے لیے انتہائی مسرت کا باعث تھی، کیونکہ صحرائے عرب میں آپ ﷺ کو ایسے دس پر امن سال میسر آ گئے تھے، جن میں آپ اسلام کا پیغام قبائل عرب تک پہنچا سکتے تھے۔

۱- خیبر: فتنوں کا گڑھ

حدیبیہ سے لوٹتے ہی رسول اللہ ﷺ نے فتنوں کے گڑھ خیبر کا رخ کیا۔ یہودی وہاں فتنے پیدا کرتے، کبھی بنو نضیر کے ساتھ ہو جاتے اور کبھی غطفان اور قریش کے ساتھ اتحاد کرتے۔ غرض وہ ہر وقت مسلمانوں کے خلاف فتنوں اور سازشوں کے جال بننے میں مصروف رہتے اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے منصوبے بناتے رہتے۔ قریش کو انہوں نے اکسایا تھا اور جنگ احد اور خندق کے پیچھے بھی ان کا ہاتھ تھا۔

چونکہ اب ان کی سرزنش کرنے کا وقت آن پہنچا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف ایک غیر متوقع اور سریع الحرکت جنگ کی تیاری شروع کی۔ غزوہ خیبر میں آپ ﷺ کے ہمراہ صرف وہی

صحابہ شریک ہوئے، جو عمرے کے شعائر ادا نہ کر سکے تھے۔ اب وہ جہاد کے ذریعے اس کمی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔

چونکہ قبیلہ غطفان کے لوگ خیبر والوں کے حلیف تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ کو ان کی طرف بھیجا۔ (141) قبیلہ غطفان کے لوگوں نے سمجھا کہ انہی کے ساتھ جنگ کرنا مقصود ہے، لہٰذا انہیں اپنی فکر پڑ گئی اور ان کا خیبر سے رابطہ منقطع ہو گیا، جس کی وجہ سے وہ ان کی کوئی مدد نہ کر سکے، تاہم رسول اللہ ﷺ کا اصل ہدف خیبر تھا۔ چونکہ خیبر کے یہودیوں کو مسلمانوں کے حملے کا کھٹکا لگا رہتا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ ان پر غیر متوقع طور پر حملہ آور ہونے کے لیے رات رات کو سفر کرتے، جس کے نتیجے میں ایک صبح جب یہودی بیدار ہوئے تو انہوں نے خیبر کو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے محاصرے میں پایا۔

اہل خیبر اس صبح بھی حسب معمول کدالیں، بیلچے اور آلاتِ زراعت اٹھائے اپنے کھیتوں اور باغات کی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے، لیکن وہ جونہی اپنے قلعوں سے باہر نکلے اپنے سامنے رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر خوف کے مارے مبہوت رہ گئے اور جب اس غیر متوقع صورتحال کی حیرت سے باہر نکلے تو واپس اپنے قلعوں کی طرف دوڑے، جبکہ اس دوران رسول اللہ ﷺ کے "اللہ اکبر! خربت خیبر" "اللہ اکبر! خیبر برباد ہو گیا۔" کے نعروں سے زمین کانپ اٹھی۔ (141) خیبر کا معاملہ اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والا تھا اور ان کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، تاہم اس کے باوجود مسلمانوں کو خیبر فتح کرنے کے لیے حیدر کرار کی ضرورت پیش آئی۔ (143)

خیبر کی فتح کی تکمیل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری دی تھی کہ وہ پرچم ایک ایسے شخص کو دیں گے، جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شخصیت تھی۔ (144) خیبر کا علاقہ مختصر عرصے میں بہت کم جانی نقصان کے ساتھ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا خیبر کے قیدیوں میں شامل تھیں، لیکن وہ اس قدر خوش قسمت تھیں کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اسلام لانے کے بعد ان عظیم خاتون کا اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے میں بڑا اہم کردار تھا (145) اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے سابقہ اثر و رسوخ اور مرتبے سے بھی کام لیا۔

۲- غزوہ موتہ

اگرچہ رسول اللہ ﷺ اس غزوے میں شریک نہ تھے، لیکن اس میں صحابہ کرام نے شجاعت کے

ایسے جوہر دکھائے کہ یہاں اس غزوے کے تذکرے کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اس غزوے کی وجہ سے اسلام کا دنیا میں چرچا ہوا اور اسی میں رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ ترین صحابہ حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ یکے بعد دیگرے شہید ہو کر وہیں مدفون ہوئے اور وہاں سے ان کی روحیں جنت کی طرف پرواز کر گئیں۔ یہ غزوہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی عسکری مہارت کا بھی آئینہ دار ہے۔ یہ پہلا معرکہ تھا، جس میں وہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل تھے۔[146]

صلح کی مدت کے دوران رسول اللہ ﷺ نے مختلف ریاستوں کے بادشاہوں اور سربراہوں کو دعوتی خطوط لکھے۔ ان میں سے بعض نے اثبات اور بعض نے نفی میں جواب دیا اور بعض نے تو ادب واحترام کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے انتہائی غیر مناسب جواب دیا۔[147] بُصری کے عیسائی گورنر شرحبیل بن عمرو کا جواب بھی تیسری قسم سے تعلق رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ عربی تھا لیکن اس نے اپنے مذہبی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کے قاصد حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے قاصد کا قتل قابل معافی جرم نہ تھا، نیز اس حرکت کے دوسرے سربراہانِ مملکت کے رویوں پر بھی بُرے اثرات مرتب ہو سکتے تھے، اس لیے آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور لے پالک بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت مین تین ہزار نفوس پر مشتمل ایک لشکر تشکیل دیا اور ارشاد فرمایا: ''زید بن حارثہ لشکر کے امیر ہیں۔ اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے اور اگر عبداللہ بن رواحہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو چاہیں اپنا امیر نامزد کر لیں۔''[148]

جب مسلمانوں کا لشکر مؤتہ کے مقام پر پہنچا تو ان کے مقابلے میں دشمن کا لشکر دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھا۔ اگرچہ تین ہزار اور دو لاکھ کے درمیان حیرت انگیز حد تک فرق تھا، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے یہ کہتے ہوئے جنگ کرنے کو ترجیح دی کہ ہم فتح سے ہمکنار ہوں گے یا پھر جام شہادت نوش کریں گے۔

پہلے تینوں سپہ سالار یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے اور پرچم ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہوا حضرت خالد بن ولید کے پاس آ گیا، جن کے ہاتھ میں اس دن نو تلواریں ٹوٹیں۔[149] حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب قیادت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی تو وہ دشمن سے لڑنے کے ساتھ ساتھ بڑی مہارت سے مزید نقصان اُٹھائے بغیر مدینے کی طرف پسپائی اختیار کرنے کا راستہ بھی تلاش کرنے لگے۔ عسکری نقطہ نظر سے یہ پسپائی بہت بڑی کامیابی

تھی۔ اگرچہ پسپائی اختیار کرنا صحابہ کرام کی عادت نہ تھی اور اس پر ان کے دلوں میں سخت کڑھن تھی، لیکن قرآنی معیار کی رو سے ایسا کرنا ضروری تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید، جعفر اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادت کی خبر پہنچنے سے پہلے ہی صحابہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''پرچم زید نے پکڑا۔ وہ شہید ہو گئے، پھر اسے جعفر نے لیا۔ وہ بھی شہید ہو گئے، پھر اسے ابن رواحہ نے پکڑا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔'' (یہ بتاتے ہوئے آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔) پھر اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے اسے لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی۔ (150)

ایک روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ تینوں جنت میں ایک موتی کے بنے ہوئے خیمے میں ایک تخت پر بیٹھے میرے سامنے پیش ہوئے۔ مجھے زید اور ابن رواحہ کی گردنوں میں تھوڑا سا خم دکھائی دیا، گویا جب ان پر موت کی غشی طاری ہوئی انہوں نے اعراض کیا یا اپنے چہروں کو پھیرا ہو، لیکن جعفر نے ایسا نہیں کیا۔'' (151) اس سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ کو بھی موت ناپسند تھی، لیکن یہ ناپسندیدگی ناجائز حد تک نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے اس مشاہدے کا تعلق عالم برزخ یا عالم مثال سے ہوگا۔

اگرچہ مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی، لیکن اس کے باوجود اس معرکے نے رومیوں کے دلوں پر مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مزید نقصان اٹھائے بغیر مسلمانوں کے لشکر کو بحفاظت واپس لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق اس معرکے میں مسلمانوں کے بارہ افراد شہید ہوئے۔ (152) معرکہ مؤتہ نے اس علاقے کے لوگوں کو مسلمانوں کی موجودگی کا احساس دلایا اور رومیوں میں دین اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ وہ ایمان لائے یا نہیں؟ یہ دوسری بات ہے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ لوگوں کی زبانوں پر رسول عربی محمد ﷺ کا تذکرہ ہونے لگا۔

ایک سال کی تیاری کے بعد بالآخر اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا وقت آ گیا: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللّٰهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَلِكَ فَتْحاً قَرِيباً () هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا﴾ (الفتح: ٢٧-٢٨) ''بے شک خدا نے اپنے پیغمبر کو سچا (اور) صحیح خواب دکھایا کہ تم خدا نے

چاہا تو مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر امن وامان سے داخل ہو گے اور کسی طرح کا خوف نہ کرو گے۔ جو بات تم نہیں جانتے تھے اس کو معلوم تھی، سو اس نے اس سے پہلے ہی جلد فتح کرا دی۔ وہی تو ہے، جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت (کی کتاب) اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور حق ظاہر کرنے کے لیے خدا ہی کافی ہے۔''

۳۔ فتح مکہ کی طرف پیش رفت

رسول اللہ ﷺ کے خواب سچے ہوا کرتے تھے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز نیند میں سچے خوابوں سے ہوا۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی مانند شرمندۂ تعبیر ہوتا۔''(153)

رسول اللہ ﷺ نے خواب میں اپنے آپ کو مسجد حرام میں اسی طرح داخل ہوتے ہوئے دیکھا، جس طرح اوپر ذکر کردہ آیت مبارکہ نے اس کی منظر کشی کرتے ہوئے تائید کی ہے۔ اگرچہ نبی کریم ﷺ کے خواب بھی الہامی اور وحی سے قریب تر ہوتے تھے، لیکن بعض اوقات ''رؤیا'' (خواب) کا لفظ ''رؤیت'' (دیکھنے) کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بعض اوقات جنت، جہنم، لوح محفوظ اور قیامت تک پیش آنے والے بعض واقعات کا مشاہدہ کراتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اطمینان وسکون کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو کر حج اور عمرے کے فرائض ادا کرتے ہوئے دکھایا۔ یہ مشاہدہ حالت خواب میں بھی ہو سکتا ہے اور حالت بیداری میں بھی، تاہم ان دونوں میں سے کسی حالت میں بھی ہو، اس سے نتیجے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ واقعات بعینہ اسی طرح پیش آئے، جس طرح آپ ﷺ نے انہیں دیکھا تھا۔ یہ منظر فتح مکہ کی طرف مشیر تھا اور واقعات مسلمانوں کو فتح کی طرف لے جا رہے تھے۔

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر قریش اور ان کے حلفاء اور مسلمانوں اور ان کے حلفاء کے درمیان صلح ہوئی تھی، لیکن جب قریش کے حلیف قبیلے بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر کے غارت گری کی تو صلح کی شرائط پوری نہ رہیں۔ ابو سفیان کو اس حملے کے انجام بد کا احساس ہو چکا تھا، لہٰذا وہ صلح کے برقرار رہنے کو یقینی بنانے کے لیے فوراً مدینے کی طرف روانہ ہوا، لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔(154)

تلوار پچھتاوے پر سبقت کر چکی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے جنگ کی تیاری شروع فرما دی۔ آپ ﷺ ہمیشہ اپنی نیت اور ہدف کو صیغہ راز میں رکھتے تھے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنے قریب ترین

وزیروں اور مشیروں سے بھی اپنے ارادے کو راز میں رکھا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملنے گئے تو رسول اللہ ﷺ کو سفر کی تیاری فرماتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ آپ ﷺ کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''بخدا! مجھے اس بارے میں کچھ خبر نہیں۔''(155)

فتح مکہ کی تیاری اس قدر رازدارانہ تھی کہ آپ ﷺ نے اسے اپنے قریب ترین ساتھی اور ہجرت کے ہم سفر سے بھی مخفی رکھا۔ یہ آپ ﷺ کی عسکری بصیرت کا ایک اور پہلو ہے۔ سلطان محمد فاتح نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سیکھی تھی، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے: ''اگر میری داڑھی کو بھی میرے راز کا پتا چل جاتا تو میں اسے کاٹ دیتا۔'' رازداری میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی نے انہیں ایک عظیم فاتح بنا دیا۔

جب رسول اللہ ﷺ کسی جنگی مہم کا ارادہ فرماتے تو اصل ہدف کو ہمیشہ صیغہ راز میں رکھتے اور ایسے قرائن پیدا کرنے کی کوشش فرماتے، جن سے کسی اور ہدف کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا۔ میرے خیال میں دورِ حاضر کے فوجی کمانڈر بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی مقام پر حملہ کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں تو کسی دوسرے مقام پر شور شرابا برپا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے اصل ارادوں کو پوشیدہ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ الف، ب یا ج میں سے کس مقام پر حملہ کریں گے۔ یہ حکمت عملیاں چودہ سو سال کے ارتقا کا نتیجہ ہیں، لیکن ان کے موجدِ اول رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اگرچہ آپ ﷺ نے کسی تعلیمی ادارے میں تربیت حاصل کی تھی اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ سے براہِ راست حصولِ علم کے نتیجے میں آپ ﷺ امی ہونے کے باوجود علم کے اُس مقام پر فائز ہوئے کہ دل آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک طرف رسول اللہ ﷺ اپنے ہدف کو دشمن سے پوشیدہ رکھتے تو دوسری طرف اپنے وضع کردہ خبر رسانی کے نظام کے ذریعے دشمن کی ہر خبر پر نظر رکھتے۔ آپ ﷺ کی یہ حکمت عملی وحی سے ہوتی تھی یا آپ کی فراست سے، اِس سے اِس نتیجے پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ ﷺ صحرائے عرب کے حالات سے ایسے ہی باخبر رہتے جیسے اپنی ہتھیلی سے۔

اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک بدری صحابی کو جب مکہ کی طرف پیش قدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے اجتہادی غلطی کے سبب اہلِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ کی روانگی کی اطلاع دینے کے لیے ایک عورت کے ہاتھ مکہ کی طرف پیغام بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کی اطلاع ہو گئی

اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کو عورت کو گرفتار کر کے اس سے وہ خط لینے کے لیے بھیجا، جس پر فوراً عملدرآمد ہو گیا۔ (156)

یہ معاملہ مخفی رہا یہاں تک کہ مکہ کے قریب پہنچنے تک کسی کو بھی اس لشکر کی پیش قدمی کا علم نہ ہو سکا اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ابوسفیان کو اپنے پاس بلایا تو اہل مکہ کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اگر وہ سب سے تیز رفتار گھوڑے یا اونٹنی پر سوار ہو کر فرار ہونے کی کوشش کرتے تب بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچ کر نہ نکل سکتے۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھے۔

رسول اللہ ﷺ فریقین کے مفاد کی خاطر بہت ہی احتیاط فرماتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ مسلمانوں اور کفار کے لشکروں میں سے کسی کے بھی شرکا کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ کی اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں سے صرف تین شہداء کے نقصان پر مکہ معظّمہ جیسا عظیم شہر فتح ہو گیا، حالانکہ بہت سے اہل مکہ نے بے وقوفی کا ثبوت دیتے ہوئے آخر دم تک لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا لشکر دس ہزار نفوس پر مشتمل تھا، حالانکہ دو سال پہلے آپ ﷺ صرف سولہ سو افراد کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے لشکر کی حقیقی شان و شوکت کے اظہار کے لیے ہر سپاہی کو مکہ کے سامنے ایک بلند مقام پر آگ جلانے کا حکم دیا۔ چونکہ اہل مکہ کی رائے میں آگ کا ہر الاؤ ایک مستقل خیمے کی نشاندہی کرتا تھا، اس لیے جب انہوں نے آگ کے دس ہزار الاؤ دیکھے تو انہوں نے مسلمانوں کے لشکر کے تیس ہزار افراد پر مشتمل ہونے کا تخمینہ لگایا۔ اس کے نتیجے میں ان کے حوصلے پست ہو گئے اور انہیں ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا، چنانچہ جب ابوسفیان نے وادی بطحاء کو آگ کے الاؤ سے روشن دیکھا تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے مکہ لوٹ کر اہل مکہ کو ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیا۔ یہ زمانہ جاہلیت کی آخری رات تھی، کیونکہ مسلمانوں اور فتح مکہ کے درمیان صرف ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ (157)

رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی کے مختلف متبادل موجود رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے مکہ میں داخل ہونے والے لشکر کو چھ حصوں میں تقسیم فرما کر اسے مکہ کے چھ اطراف سے داخل ہونے کا حکم فرمایا۔ حضرت خالد بن ولید کے لشکر کے سوا کسی کو بھی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ صرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں جمع ہونے والے کفار کی جمعیت کو منتشر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ (158)

ابوسفیان واحد انسان تھا، جو مکہ میں مسلمانوں کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک جملے ''جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ محفوظ ہے۔'' سے اس کا دل موم کر دیا۔ ابوسفیان کو اس قدر قدر و منزلت کامل جاننا انہیں کسی بھی قسم کی بیوقوفانہ حرکت سے باز رکھنے کے لیے کافی تھا، بلکہ وہ ہتھیار ڈالنے کی ترغیب دینے والوں میں پیش پیش تھے۔ بلاشبہ سارے اہل مکہ ابوسفیان کے گھر میں نہیں سما سکتے تھے، نیز خانہ خدا کعبۃ اللہ ابوسفیان کے گھر کی بہ نسبت اس رعایت کا زیادہ سزاوار تھا، اسی لیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص کعبہ میں داخل ہوگیا وہ بھی محفوظ ہے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے امن و امان کے قیام اور فوج کی نقل و حرکت میں آسانی پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو گھروں سے نکلنے سے روکتے ہوئے ایک فوری فیصلہ فرمایا کہ جس شخص نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا وہ بھی مامون ہے۔[159] اس فیصلے کے نتیجے میں اہل مکہ کی طرف سے کسی بھی قسم کی مزاحمت کا احتمال ختم ہوگیا۔

اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے دیگر غزوات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی سیاسی اور عسکری حکمت عملی پر غور کریں تو یہ آپ ﷺ کی عسکری عبقریت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ تنہا فتح مکہ ہر منصف مزاج انسان کو آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اپنی حکمت عملی کے ہر اقدام پر اس قدر اعتماد تھا کہ یوں لگتا جیسے آپ اس سے پہلے کئی مرتبہ مکہ کو فتح کر چکے ہوں۔ آپ ﷺ نے اپنی حکمت عملی کو تمام تر تفصیلات کے ساتھ عملی جامہ پہنایا اور تمام ضروری اقدامات اٹھائے۔ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے فوراً بعد عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے، جس خودداری اور عالی حوصلگی کا مظاہرہ فرمایا اس کی بدولت اہل مکہ کے دل موم ہوگئے اور وہ دھڑا دھڑ قبول اسلام کا اعلان کرنے لگے۔ وہ کس قدر شیریں اور لطیف عالی ظرفی تھی، جس کے نتیجے میں اہل مکہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور ان کی مخفی صلاحیتوں کو حرکت و عمل میں لانے کا وقت آ پہنچا۔

سبحان اللہ! یہ کس قدر عظیم انقلاب تھا کہ جو لوگ کل تک آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، وہ آج آپ ﷺ کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔ رسول اللہ ﷺ کوئلے پر نظر کرم ڈال کر اسے ہیرا بنا دیتے۔ جب خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے تو پھر ہمیں کسی اور تشبیہ کی کیا ضرورت؟[160] رسول اللہ ﷺ نے کفر و شرک کی غلاظت میں لت پت لوگوں کو ایک ہی دن میں آسمانِ ہدایت کے ایسے درخشندہ ستارے بنا دیا، جو قیامت تک مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنے رہیں گے۔

۴- غزوہ حنین کی لغزش

فتح مکہ سے پہلے بہت سے قبائل عرب حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے، تاکہ جس فریق کو بھی غلبہ حاصل ہو اس کے ساتھ مل جائیں، چنانچہ جب مکہ فتح ہوگیا تو قبیلے کے قبیلے دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے، تاہم قبیلہ ثقیف اور قبیلہ ہوازن کو یہ صورتحال ناگوار گزری اور انہوں نے اپنے حق میں حالات کے مزید بگڑنے کا سدباب کرنے کے لیے فوری طور ر بیس سے تیس ہزار نفوس پر مشتمل مشترکہ فوج تیار کی، جس میں بہت بڑی تعداد ڈاکوؤں اور لٹیروں کی تھی۔ (161)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ کو ان قبیلوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے لیے بھیجا۔ ان صحابی نے معلومات اکٹھی کر کے آپ ﷺ کو بتایا کہ ثقیف اور ہوازن نے حنین کے مقام پر ایک بہت بڑی فوج جمع کر رکھی ہے۔

چونکہ یہ دونوں قبیلے بہادری اور تیر اندازی میں معروف تھے، اس لیے ان کے مقابلے کے لیے نومسلم نوجوان صحابہ کرام کی اکثریت پر مشتمل لشکر کا ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا اور بلاتاخیر حنین کی طرف پیش قدمی کرنے کے احکامات جاری فرمادیئے، کیونکہ حالات مسلمانوں کے حق میں ناموافق بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر دشمن کو مکہ پر حملہ کرنے کا موقع مل جاتا تو مکہ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تاک میں رہنے والے لوگوں کو انہیں نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ آجاتا، جبکہ دوسری طرف اگر مکہ کے وہ نومسلم حضرات جنہیں اپنے وقار کے مجروح ہونے کا احساس تھا، دشمن کے خلاف جنگ میں شرکت کرتے تو اس سے جہاں ان کے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی وہیں انہیں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اپنی وحدت کا احساس بھی ہوتا۔

مسلمانوں کا لشکر بارہ ہزار نفوس پر مشتمل تھا، جن میں سے دو ہزار افراد صدق دل سے مسلمان نہ ہوئے تھے۔ باقی فوج کی اکثریت بھی ناتجربہ کار نوجوانوں پر مشتمل تھی، جن کی قیادت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ اسلامی لشکر نے دشمن پر گھوڑے دوڑا دیئے اور دشمن کی چال کو سمجھے بغیر اگلے دستے دشمن کے درمیانی حصوں پر حملے کرنے لگے، لیکن جب دشمن کی طرف سے ان پر تیروں کی بارش ہونے لگی تو وہ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے، کیونکہ تیر بڑی شدت سے اور صحیح نشانے پر پھینکے جا رہے تھے، نیز مسلمانوں نے زرہیں بھی نہیں پہنی ہوئی تھیں، تاہم مسلمانوں نے جنگی چال چلتے ہوئے پسپائی اختیار کی تھی، جسے دشمن نہ سمجھ سکا اور جونہی تیر اندازوں نے مسلمانوں کو پسپائی

اختیار کرتے ہوئے دیکھا انہوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں اور خوشی سے شور مچاتے ہوئے مسلمانوں کے پیچھے دوڑ پڑے، جس کے نتیجے میں وہ غیر شعوری طور پر ایک ایسے جال میں پھنس گئے، جس نے انہیں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور چند ہی لمحوں میں ان میں سے بہت سے لوگ قتل ہو گئے اور باقی طائف کی طرف فرار ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔(162)

جس طرح غزوہ احد کے دوران ہزیمت کے آثار ظاہر ہوئے تھے، اسی طرح غزوہ حنین کے آغاز میں ہی ظاہری طور پر شکست کے آثار نمودار ہو گئے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مشکل ترین مراحل میں بھی ہمیشہ برقرار رہنے والی اپنی فطری شجاعت اور اعلیٰ فراست کی بدولت اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے شکست فاش کو فتح مبین میں بدل دیا۔ جب اسلامی لشکر خوفزدہ ہو کر پسپائی اختیار کر رہا تھا اس وقت رسول اللہ ﷺ دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے اور آپ کے چچا حضرت عباس یا ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہما نے آپ ﷺ کو دشمن کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے آپ کے خچر کی لگام پکڑ رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ اپنی رعب دار آواز میں کہہ رہے تھے:

أنا النبی لا کذب   أناابن عبد المطلب

''میں نبی ہوں۔ اس میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں۔ میں عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے عباس! ببول کے درخت والوں کو آواز دو۔'' جس پر صحابہ کرام لبیک لبیک کہتے ہوئے اور تلواریں لہراتے ہوئے آپ ﷺ کی طرف دوڑ پڑے۔ اس طرح پسپائی کا مختصر سا دورانیہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آئے اور جنگ مسلمانوں کی فتح مبین پر اختتام پذیر ہوئی۔(162)

یہاں میں ایک اہم نقطے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا ضروری خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اٹھارہ غزوات میں شرکت فرمائی اور سب میں آپ ﷺ کو فتح حاصل ہوئی، لیکن میرے خیال میں آپ ﷺ کی عسکری عبقریت کے مظاہرے کے لحاظ سے غزوہ احد اور غزوہ حنین آپ کے اہم ترین معرکے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے غزوات میں حالات آپ ﷺ کی حکمت عملی کے موافق رہے اور آپ کو بسہولت فتح حاصل ہو گئی، لیکن ان دو معرکوں میں غیر متوقع طور پر ایسی مشکلات پیش آئیں، جن کی وجہ سے آپ ﷺ کو اپنی حکمت عملی تبدیل کرنی پڑی اور دشمن کو نقصان پہنچانے کا سنہری موقع میسر آ گیا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ فتح سے ہمکنار ہوئے۔ ان مشکلات کے پیش

آنے میں رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی کا کوئی دخل نہ تھا، اسی لیے ان دو معرکوں میں اپنے لشکر کو شکست سے دو چار ہونے سے بچا کر فتح سے ہمکنار کرنا اس عظیم قائد کی فکری عبقریت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۵- غزوہ تبوک

غزوہ تبوک رسول اللہ ﷺ کے تیز ترین معرکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ افواہ بنی تھی کہ بازنطینی سلطنت نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ مدینے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ اس قسم کی افواہوں سے جہاں مسلمانوں کو پریشانی لاحق ہوئی وہیں یہ مسلمانوں کے بدخواہ قبائل کے لیے باعث مسرت بنیں۔ سب کو غسانیوں سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کی امید تھی۔

اگر چہ رسول اللہ ﷺ اپنے تمام غزوات میں رازداری کی پالیسی اختیار فرماتے تھے، تاہم اس غزوے کا آپ ﷺ نے واضح طور پر اعلان فرمایا اور قریبی قبائل سے اسلحے اور افرادی قوت کی صورت میں مدد لینے کے لیے آدمی روانہ فرمائے۔

اس عرصے میں مدینے اور اس کے قرب و جوار کے حالات سخت خراب تھے۔ گرمی کی شدت تھی اور خشک سالی کا دور دورہ تھا، اس پر مستزاد یہ کہ پھلوں کے پکنے کا موسم قریب تھا، لیکن اس کے باوجود کتنے ہی تنگ دست صحابہ کرام اس غزوے میں شرکت کے لیے سواری مانگنے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جب آپ ﷺ ان کے لیے سواری کا بندوبست نہ فرما سکتے تو وہ آشکبار آنکھوں کے ساتھ لوٹتے۔ قرآن کریم نے اس منظر کی تصویر کشی کر کے اسے دوام بخش دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ﴾ (التوبة: ٩٢) ''اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ جو تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں، جس پر تم کو سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''

اس موقع پر منافقین بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہ رہے، بلکہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے اور انہیں اس سفر سے باز رکھنے کے لیے سرگرم رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ہر حیلہ استعمال کر ڈالا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود بالآخر رسول اللہ ﷺ تیس ہزار نفوس پر مشتمل لشکر کے ہمراہ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں بیس دن قیام فرمایا، تاہم چونکہ بازنطینیوں کو اس لشکر سے ٹکر لینے کی ہمت نہ

ہوئی، اس لیے اس غزوے میں جنگ کی نوبت نہ آئی، لیکن مسلمانوں کے تبوک تک پیش قدمی کرنے کے ہر سننے والے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ دشمن کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا، جس کی وجہ سے ان کے حوصلے ایسے ہی پست ہوئے، جیسے میدانِ جنگ میں شکست فاش کی وجہ سے ہوتے ہیں، اس کے نتیجے میں جہاں بہت سے عیسائی قبائل نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اختیار کرکے جزیہ دینے کو قبول کیا، وہیں بعض قبائل نے قبولِ اسلام کا اعلان بھی کیا۔[164] اسی وجہ سے غزوہ تبوک کو آپ ﷺ کی فتوحات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔[165]

اوپر ہم نے بعض واقعات کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے عسکری پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم کسی بھی عسکری رہنما میں پائی جانے والی چند عمومی مگر ضروری خصوصیات کا تذکرہ کریں گے، تاکہ ہمیں آپ ﷺ کی عسکری عبقریت اور فراست کا زیادہ وضاحت کے ساتھ علم ہوسکے۔

تیسری فصل:

قائد کے ضروری اوصاف

کسی بھی عسکری قائد میں عسکری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ قیادت کی تمام خوبیوں کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ عسکری قائد ایک راہنما بھی ہوتا ہے۔ ان اوصاف کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

۱- ہر قائد میں درست فیصلے کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔ کوئی بھی مہم سر کرنے کے لیے درست فیصلوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، لیکن جس طرح بعض اوقات فیصلے سرے سے ہی غلط ہوتے ہیں، اسی طرح بعض اوقات غلطی کا تعلق ان کے لیے مناسب وقت کے انتخاب کے ساتھ ہوتا ہے۔ صحیح وقت سے پہلے یا بعد میں اٹھائے جانے والے فیصلے غلط تصور ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی قائد کا صحیح فیصلہ کسی بھی عام فیصلے سے اس حیثیت سے ممتاز ہوتا ہے کہ وہ بالکل مناسب وقت پر اٹھایا جانے والا صحیح اقدام ہوتا ہے۔

بعض اوقات ہنگامی حالات میں فوری طور پر فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ایک راہنما دوسروں سے اس حیثیت سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ فوری طور پر درست اور دانش مندانہ فیصلے کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اگرچہ جلد بازی میں کیے گئے فیصلے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ جلد بازی عام طور پر درستگی کی ضد ہوتی ہے، جن کا اکٹھے پایا جانا مشکل ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود حقیقی راہنما ایسے مشکل اوقات میں بھی ان دو متضاد چیزوں کو جمع کر سکتا ہے۔

۲- راہنما کو فطری طور پر بہادر ہونا چاہیے۔ بزدل آدمی حقیقی راہنما نہیں بن سکتا۔ راہنما کو جری اور مضبوط دل ہونا چاہیے، کیونکہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تنہا رہ جائے، ایسے حالات میں فطری بہادری ہی اسے ذلت سے بچا سکتی ہے۔ ایسے مشکل حالات میں جب قائد و راہنما کو اپنی دعوت کی ذمہ داری تن تنہا اٹھانی پڑتی ہے، اسے اپنے اہداف کے حصول کے لیے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے، جیسے اس کی پشت پر ہزاروں لوگ موجود ہوں۔

قائد و راہنما کو موت سے کبھی خائف نہیں ہونا چاہیے۔ ہر بات سے ڈرنے اور قدم قدم پر اندیشوں کا شکار ہونے والا انسان کبھی بھی اپنی جماعت کا نظم و نسق کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتا۔

۳- حقیقی قائد غیر متزلزل ارادے کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے کو واپس لیتا ہے اور نہ ہی اپنے عقیدہ وایمان سے پھرتا ہے۔ وہ ہمیشہ پرامید رہتا ہے اور مایوسی کو خواب میں بھی اپنے قریب نہیں آنے دیتا۔ وہ مایوسی کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ راستے کی مشکلات خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، وہ اس کے عزم کو متزلزل کر سکتی ہیں اور نہ ہی ارادے کو کمزور۔ وہ بلند حوصلگی اور روحانی طاقت کے ذریعے مایوسی پر غلبہ پالیتا ہے۔ وہ فولادی ارادے کا مالک ہوتا ہے، جس کے بغیر وہ عوام کی قیادت نہیں کر سکتا۔

۴- راہنما اپنی ذمہ داریوں کا بخوبی ادراک رکھتا ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری اس کی شخصیت کا اٹوٹ انگ ہوتا ہے۔ اگر اس کے حامی ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ جائیں تب بھی وہ آخر دم تک اپنی دعوت کی ذمہ داریوں کو تن تنہا اٹھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ مستقل طور پر اس کے فکری اطمینان کا باعث بننے والے اس احساسِ ذمہ داری کو کوئی رکاوٹ کمزور نہیں کر سکتی۔

۵- راہنما کو دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے زمانے سے آگے کا سوچنا چاہیے۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو ایسے ہی محسوس کر لیتا ہے، جیسے وہ ماضی کے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسی بنیاد پر اپنے احکامات صادر کرتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر اس کی توقعات ہمیشہ غلط ثابت ہوں اور اس کے اندازے کبھی بھی درست ثابت نہ ہوں تو اس کے لئے معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان کو بھی اپنی بات کا قائل کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔

راہنما کو اپنے فیصلوں کو حتمی حیثیت دینے کے لیے مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے، بصورتِ دیگر اسے بدلتے حالات کے مطابق بار بار اپنے فیصلوں میں تبدیلی کرنی پڑے گی، جس کے نتیجے میں اس کی جماعت بے اتفاقی اور فکری اختلافات کا شکار ہو کر تحلیل ہو جائے گی۔ بار بار فیصلوں کی تبدیلی کے جماعت کی وحدت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ہر فرد کی مختلف رائے ہوتی ہے، لہٰذا قائد کو اعلیٰ درجے کی فراست وبصیرت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۶- قائد کو نفسیاتی طور پر مستقل مزاج انسان ہونا چاہیے۔ وہ کسی بھی صورت حال سے متاثر نہیں ہوتا۔ بڑی سے بڑی فتح وکامرانی بھی اس میں کوئی تبدیلی لاسکتی ہے اور نہ ہی اسے فریب میں مبتلا کر سکتی ہے۔ ناکامی کی صورت میں بھی اس کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔

راہنما گھٹیا پن سے کوسوں دور رہتا ہے اور عمر بھر سادہ اور زاہدانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کی زندگی میں پرسکون موسیقی جیسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، بلکہ ایک اچھے راہنما کی زندگی کا اختتام اس کے

آغاز سے بہتر ہوتا ہے، لیکن ایسا اسی صورت میں ممکن ہے، جب راہنما انتہائی متواضع طبیعت کا مالک ہو، تاکہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام اور اپنے پرانے دوستوں کو فراموش نہ کرے۔

۷- قائد انسانی صراف ہوتا ہے۔ وہ افراد کی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے اور اپنے ماتحت افراد کی صلاحیتوں کو دوسروں کی بہ نسبت بہتر طور پر جانتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کس شخص کو کہاں اور کس مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا ہے۔ جو شخص اپنے ماتحتوں کی صلاحیتوں کے مطابق کامیابی کے ساتھ کاموں کو تقسیم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ راہنما تو درکنار ایک اچھا منتظم کہلانے کے بھی لائق نہیں۔

راہنما ہر ذمہ داری اس کے لیے موزوں ترین انسان اور اسے سب سے بہتر طریقے سے ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے شخص کے سپرد کرتا ہے۔ قائد لوگوں کی صلاحیتوں سے سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے اور ہمیشہ ان کی صلاحیتوں کو درست مصرف پر لگا کر ان سے بھرپور استفادہ کرتا ہے۔ چونکہ راہنما کے پاس لوگوں کی صلاحیتوں کو پرکھنے کا بہترین ملکہ ہوتا ہے، اس لیے عام طور پر اسے اپنے فیصلوں سے رجوع کرنے کی نوبت نہیں آتی، تاہم چند استثناؤں کے سوا کسی بھی انسان کے لیے ایسی صورتحال سے بچنا ممکن نہیں۔

۸- قائد اپنی رعایا سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کی رعایا کا ہر فرد دوسروں کی بہ نسبت اپنے آپ کو اس کے دل سے قریب تر پاتا ہے۔ رعایا بھی اس کے ساتھ محبت سے پیش آتی ہے۔ اسے رعایا پر اور رعایا کو اس پر مکمل اعتماد ہوتا ہے۔

۹- زندگی کے کسی بھی مرحلے میں اس پر کسی قسم کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کا ماضی اس کے حال کی طرح پاکیزہ اور لوگوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اچھے یا برے ارادے سے اس کے ماضی کی چھان بین کرے تو اس میں کسی ایسی بات نہیں پا سکتا، جس کی وجہ سے اسے شرمندگی اٹھانے پڑے۔ اگر ساری دنیا اس کی دشمن ہو جائے تب بھی اس کی عفت و نیک نامی پر شکوک و شبہات کے سائے نہیں ڈال سکتی، بشرطیکہ سچائی کا التزام اور جھوٹ اور بہتان طرازی سے اجتناب کیا جائے۔

۱۰- قائد کی شخصیت ہمہ جہت اور بہت سی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ وہ ہر پہلو سے معاشرے میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کا کردار بے داغ ہوتا ہے۔ اسے جتنا کریدا جائے اتنا ہی نکھرتا ہے۔

انسانی تاریخ نے بہت سے عظیم قائدین کو اپنے اوراق میں محفوظ رکھا ہے، لیکن ان میں سے کسی میں بھی اوپر ذکر کردہ تمام صفات نہیں پائی جاتیں، بلکہ ان میں ان میں سے صرف بعض صفات کے حاملین کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہے۔

اسکندر اعظم، ہنبل (Hannibal)، نپولین (Nepolean)، ہٹلر (Hitler)، محمد فاتح، سلطان سلیم اول، سلطان بایزید، جلال الدین خرزم شاہ، صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد اور چالیس سال تک روس کے خلاف برسر پیکار رہنے والے امام شامل اگرچہ عظیم قائدین تھے، لیکن اگر اوپر ذکر کردہ صفات کی روشنی میں ہم ان کی شخصیات کو پرکھیں تو ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کا سب سے عظیم قائد حضرت محمد ﷺ کی شخصیت کے ساتھ موازنہ کیا جا سکے۔

دنیا میں صرف حضرت محمد ﷺ کی واحد شخصیت ہے، جس میں کامیاب قیادت کی تمام صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ آپ رسولِ خدا تھے اور عمر بھر آپ ﷺ کے تمام اقدامات کے ساتھ تائید خداوندی شامل حال رہی۔

الف: حیاتِ نبوی ﷺ پر ایک طائرانہ نظر

رسول اللہ ﷺ کے تمام فیصلے برق رفتار اور بالکل درست ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کا کوئی فیصلہ بھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ اوپر ہم اس سلسلے میں تفصیل سے مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ خاص طور پر غزوہ احد اور حنین کے موقع پر آپ کے درست فیصلوں نے یقینی شکست کو فتح مبین میں بدل دیا۔

آپ ﷺ فطری طور پر بہادر تھے۔ آپ نے ایک طویل اور مشکل راستہ اختیار فرمایا اور اس پر چل کر پوری دنیا کو چیلنج کیا۔ آپ ﷺ عمر بھر بلا خوف وخطر اس راستے پر چلتے رہے، بلکہ جب آپ کی فوج میں شکست کے آثار ظاہر ہونے لگتے، آپ ﷺ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر خود دشمن پر حملہ آور ہوتے حتیٰ کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسے بہادر شہسوار بھی بول اٹھے: ''غزوہ بدر کے موقع پر ہماری یہ حالت تھی کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی اوٹ میں پناہ لیتے تھے۔ آپ دشمن سے ہماری بہ نسبت سب سے قریب تھے۔ اس دن آپ ﷺ سب سے زیادہ بہادری سے لڑ رہے تھے۔''(166)

امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نجد کے علاقے میں ایک غزوے میں شرکت کی۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ واپس لوٹے تو راستے میں دوپہر کے وقت ایک ایسی وادی میں پڑاؤ ڈالا، جس میں کانٹے دار درخت بکثرت تھے۔ لوگ درختوں کے سائے کی تلاش میں بکھر گئے۔ آپ ﷺ بھی ببول کے ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے اور اپنی تلوار اس کی شاخوں کے ساتھ لٹکا دی۔ ہم سوئے ہوئے تھے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے پکارنے کی آواز سنی۔ آپ کے پاس ایک بدو کھڑا تھا۔ آپ ﷺ نے ہمیں بتایا کہ میں سویا ہوا تھا کہ اس نے مجھ پر میری تلوار سونت لی۔ میری آنکھ کھلی تو وہ اس کے ہاتھ میں لہرا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا: ''تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' میں نے (تین بار) کہا: ''اللہ۔'' آپ ﷺ نے اسے کوئی سزا نہ دی اور بیٹھ گئے۔(167) اس واقعے سے آپ ﷺ کی شجاعت اور خدا پر آپ کے اعتماد اور بھروسے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک رات مدینہ والوں نے ایک خوفناک آواز سنی اور صورتحال جاننے کے لیے گلیوں میں نکل آئے۔ مزید تفصیل امام بخاری کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے: ''رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر انسان تھے۔ ایک رات مدینہ کے لوگ ایک آواز سن کر گھبرا گئے اور جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف گئے۔ راستے میں انہیں

رسول اللہ ﷺ زین کے بغیر ابوطلحہ کے گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار اور گلے میں تلوار لٹکائے ملے۔ آپ ﷺ ان سے پہلے آواز کی سمت چلے گئے تھے اور انہیں بتایا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"(168)

وہ آواز سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے سنی۔ آپ ابوطلحہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر آواز کی سمت گئے اور کسی بھی خطرے کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے واپس لوٹے۔ ایک ایسی آواز کی طرف اکیلے چل پڑنا، جس کی وجہ سے سارے مدینے والے گھبرا گئے تھے، آپ ﷺ کی فطری شجاعت کی دلیل ہے۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے اور مشرکین کے قریب آنے پر آپ ﷺ کی زندگی کے بارے میں فکرمند تھے تو آپ ﷺ نے انہیں یہ فرما کر تسلی دی کہ تمہارا ایسے دو شخصوں کے بارے میں کیا خیال ہے، جن کے ساتھ تیسرا خود خدا ہو؟(169) نیز حسد اور غصے سے مغلوب دشمنوں کے محاصرے کے دوران گھر سے باہر نکلنا کیا انتہائی بہادری نہیں۔ آپ ﷺ غیر متزلزل ارادے کے مالک تھے، کیونکہ آپ ﷺ کا ارادہ مشیت خداوندی سے مربوط تھا۔

ب: عظمت کا اعلیٰ ترین مقام

آپ ﷺ کے والد ماجد کا آپ ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا، گویا آپ ﷺ رحم مادر میں ہی یتیم ہو گئے تھے، اسی لیے آپ ﷺ پدری سہارے اور مدد کی طرف دیکھنے کے عادی نہ ہوئے۔ والد کا سہارا بعض اوقات انسان میں سستی اور کاہلی کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے انسان کی قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے کی دعوت دی۔

چھ سال کی عمر میں آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ ماں انسان کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔ دل میں ماں کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ آپ ﷺ سے یہ سہارا بھی چھن گیا۔ حوادثِ زمانہ آپ ﷺ کی تربیت کررہے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فخر کائنات کا ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہا۔

آٹھ سال کی عمر میں آپ کے سر سے داد کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ وہ مکہ اور اہل مکہ کا سہارا تھے، لیکن بالآخر ان کی زندگی کا چراغ بھی گل ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ ان حوادثات کے ذریعے آپ ﷺ کی توجہ اعتماد وسکون کا باعث بننے والی اپنی ذات اقدس کی طرف مبذول کرانا اور آپ ﷺ کے گرد وپیش سے اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ بننے والی ہر چیز کو ہٹا دینا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود آپ ﷺ کے معاون وسہارا بن کر براہ راست آپ ﷺ کی پرورش کرنے والے تھے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ انسانی فطرت کے باعث ہر سہارا چھننے پر آپ کو شدید صدمہ پہنچتا ہو، لیکن آپ ﷺ کے لیے اپنی منتظر گراں بار ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیاری کرنا اور اپنے ارادوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ضروری تھا، تاکہ اگر ساری کی ساری دنیا آپ ﷺ سے رخ پھیر لے اور آپ کو تن تنہا چھوڑ دے تب بھی آپ کے پائے استقلال میں فرق آئے اور نہ ہی آپ کو لمحہ بھر کے لیے تردد ہو۔ اگرچہ ایسی صورت حال پیش نہیں آئی، لیکن اگر بالفرض پیش آتی تو آپ ﷺ کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ آتی، بلکہ آپ ﷺ اپنے راستے پر چلتے رہتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ﷺ اپنے زخمی اور بکھرے ہوئے صحابہ کو جمع کر کے دشمن کی فوج کے تعاقب کا حکم کیسے دیتے؟ آپ ﷺ کی قوتِ ارادی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی ذات کو اور اپنے پیروکاروں کو پہنچنے والے زخموں کے باوجود دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے اپنی فوج کی قیادت فرما رہے تھے۔

آپ ﷺ عمر بھر کبھی بھی نہیں گھبرائے حتیٰ کہ ان لمحات میں بھی جب آپ کے شیر دل صحابہ

اِدھر اُدھر بکھر گئے آپ ﷺ ثابت قدم رہے اور اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹے۔ بلاشبہ آپ ﷺ غیر متزلزل اور فولادی ارادے کے مالک تھے۔

کون سی تکلیف تھی جو آپ ﷺ کو مکہ والوں سے نہ پہنچی تھی، لیکن آپ ﷺ کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ پہلے آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ کا انتقال ہوا پھر آپ کے چچا بھی داغ مفارقت دے گئے۔ یہ دونوں آپ کا سب سے مضبوط سہارا تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ مایوس ہوئے اور نہ ہی آپ پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔

جب آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے تو طائف کے لوگوں نے سنگ باری کر کے آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا، یہاں تک کہ آپ کو ایک باغ میں پناہ لینی پڑی۔ آپ ﷺ سے ایک فرشتے نے آ کر کہا: ''اگر آپ چاہیں تو میں ایک پہاڑ اٹھا کر طائف والوں پر رکھ دوں؟'' اگرچہ آپ ﷺ کے جسم اطہر سے خون بہہ رہا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔[170] آپ ﷺ کس قدر مضبوط ارادے کے مالک تھے کہ اپنے ارادے سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہ ہٹتے! انسان موت تک ایسے قائد کی پیروی کرتے ہوئے اس پر اپنی ہر چیز نچھاور کر سکتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ ایسا راہنما اسے آدھے راستے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ بھلا ایسے ضعیف الارادہ شخص کے پیچھے کیسے چلا جا سکتا ہے، جو ہر لمحہ اپنا ارادہ بدلتا رہتا ہے، مشکل گھڑیوں میں اپنے رفقاء کو تنہا چھوڑ دیتا ہے اور ان طے شدہ فیصلوں سے پھر جاتا ہے، جن کی خاطر ہزاروں افراد قربانیاں دے چکے ہوتے ہیں اور اب اس سے بھی اسی قربانی کا انتظار ہوتا ہے۔ ایسا شخص کیونکر قیادت و پیشوائی کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے؟ آج انسانیت جس مایوسی کا شکار ہے، اس کا سبب قیادت و پیشوائی کے ایسے ہی دعویداران ہیں۔

رسول اللہ ﷺ انتہائی ذمہ دار اور مضبوط ارادے کے بہادر انسان تھے۔ آپ ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن کریم اگر پہاڑوں پر اترتا تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ آپ کو تبلیغ دین کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ آپ ﷺ کے ذمے ایک ایک انسان کو ذات باری تعالیٰ سے روشناس کرانا تھا۔ یہ کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزارنا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھالی۔ آپ ﷺ نے دلوں کو جیتا اور ہر ہر فرد کی صلاحیتوں کا ادراک کیا۔

دعوت اسلام کی تبلیغ آپ ﷺ کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس کے سوا آپ ﷺ کو دنیا کی کسی چیز کی فکر تھی اور نہ آخرت کا غم۔ جنت کے مناظر اور قاب قوسین کا مقام بھی آپ ﷺ کو اس ہدف اور ذمہ داری

سے غافل نہ کرسکا۔ اس مقام سے جہاں ستارے آپ ﷺ کے قدموں میں سنگریزوں کی مانند بچھا دیئے گئے تھے، آپ ﷺ مشقتوں اور تکلیفوں سے بھری اس دنیا میں ہمارے درمیان رہنے کے لئے لوٹ آئے، کیونکہ آپ ﷺ کے جسد اطہر کے روئیں روئیں کو اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ آپ ﷺ کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا کہ ایک دن آپ ﷺ نے یہاں تک فرمادیا: ''بخدا میری خواہش ہے کہ میں کوئی درخت ہوتا، جسے کاٹ دیا جاتا۔''(171) اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کو اپنی گراں بار ذمہ داری کا احساس تھا اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ روزِ محشر میں آپ ﷺ کی کیفیت آپ ﷺ کے اسی احساسِ ذمہ داری کا امتداد ہوگی، اسی لیے آپ قیامت کے دن ''امتی امتی'' پکارتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوجائیں گے۔(172) درحقیقت اُس وقت آپ ﷺ کے سوا کوئی اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کی سکت بھی نہ رکھتا ہوگا، کیونکہ یہ پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک ساری انسانیت کی ذمہ داری ہوگی۔

آپ ﷺ کی بصیرت اور فراست زمان ومکان کی حدود سے ماورا تھیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ آپ ﷺ کی نگاہیں پردۂ غیب کے پیچھے جھانکتی اور دیکھتی تھیں، کیونکہ آپ ﷺ نے دنیا میں رہتے ہوئے جنت، جہنم، پل صراط اور محشر کی تمام تفصیلات بتائی ہیں۔ آپ ﷺ یہ سب کچھ دیکھ کر ہمیں بتاتے تھے۔(173) گزشتہ صفحات میں ہم یہ بات بارہا تاکید کے ساتھ کہہ چکے ہیں کہ واقعات نے آپ ﷺ کی مستقبل کے بارے میں کی گئی پیش گوئیوں کو سچ کر دکھایا۔ جس واقعے کی بھی آپ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی، وہ مناسب وقت پر ظہور پذیر ہوا اور بعض واقعات ابھی تک منصۂ ظہور پر آنے کے منتظر ہیں۔(174) آپ ﷺ کی دور اندیشی کے بارے میں جاننے کے لیے گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ ذکر کردہ صلح حدیبیہ کا مطالعہ کیجئے۔

ج: ناقابل تغیر انسان

رسول اللہ ﷺ کا اختتام زندگی ایسا ہی تھا جیسا آپ کا آغاز زندگی تھا۔ فخر کائنات ﷺ نے ساری زندگی ایک ہی انداز سے ایک جیسے اصول ومبادی کی روشنی میں گزاری۔ جس طرح کا طرز عمل آپ ﷺ نے مکہ میں اس وقت اختیار فرمایا جب آپ کے ہمراہ صرف ایک عورت، ایک بچہ، ایک غلام اور ایک آزاد شخص تھا، اسی طرح کا طرز عمل آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد افراد سے خطاب کرتے ہوئے اپنایا، بلکہ فتح ونصرت کی بلندیوں پر پہنچ کر آپ ﷺ کی تواضع میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

آپ ﷺ واحد قائد تھے، جس کی زندگی میں عمر بھر کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ذرا غور فرمایئے کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ نہیں بدلا، جنہوں نے عمر بھر آپ ﷺ کو تکلیفیں اور ایذائیں پہنچائی تھیں، اسی طرح جب دعوت میں پیش رفت ہوئی اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک افراد کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے حلقہ احباب میں وسعت وتنوع پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے اپنے پرانے دوستوں کو کبھی نہ بھلایا، بلکہ ان کے ساتھ ویسے ہی رہے جیسے پہلے رہتے تھے۔

د: تواضع کا اعلیٰ مقام

ایک دن آپ ﷺ اپنے احباب کے ہمراہ بیٹھے کوئی چیز تناول فرما رہے تھے کہ ایک زبان دراز عورت وہاں سے گزری اور آپ کو دیکھ کر کہنے لگی: "اسے دیکھو! غلاموں کی طرح بیٹھتا اور کھاتا ہے۔" اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "وأيّ عبد أعبد منـي" "مجھ سے بڑھ کر کون بندگی کرنے والا ہوگا؟" اس عورت نے کہا: "یہ خود کھا رہا ہے، لیکن مجھے نہیں کھلاتا۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم بھی کھاؤ۔" اس عورت نے کہا: "مجھے اپنے ہاتھ سے پکڑائیے۔" آپ ﷺ نے اسے اپنے دست مبارک سے لقمہ پکڑایا۔ اس پر اس عورت نے کہا: "مجھے اپنے دہن مبارک میں موجود لقمے میں سے دیجیے۔" چنانچہ آپ ﷺ نے اسے اس میں سے دیا، جسے اس نے کھایا اور اس کی برکت سے اس پر حیا کا ایسا غلبہ ہوا کہ اس نے مرتے دم تک کسی سے فحش گوئی نہ کی۔ (175)

حضرت جریر سے مروی ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رعب کی وجہ سے اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: "اطمینان رکھو! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، بلکہ خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔" (176)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ہمراہ ایک فرشتے کو بھیجا، جس نے آپ ﷺ سے کہا: "اے محمد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت وعبدیت اور نبوت وبادشاہت میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے مشاورت کے انداز سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو تواضع اختیار کرنے کا اشارہ کیا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں نبوت وعبدیت کے امتزاج کو پسند کرتا ہوں۔" (177)

دنیا کے کونے کونے سے آپ ﷺ کی خدمت میں مالِ غنیمت اور تحائف آتے، لیکن آپ ﷺ وہ سب کے سب اپنے صحابہ کرام میں تقسیم فرما دیتے اور اپنے لیے ان میں سے کچھ بھی نہ رکھتے۔ عمر بھر آپ ﷺ کا یہی طرزِ زندگی رہا یہاں تک کہ جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو تواضع کی وجہ سے آپ ﷺ کی تھوڑی مبارک آپ کی اونٹنی کی کوہان سے لگنے لگی۔ (178)

جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے اپنے پاس بیٹھے صحابہ کرام سے فرمایا تھا: "اپنے سردار کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔" (179) لیکن

آپ ﷺ اپنے لیے صحابہ کو کھڑے ہونے سے منع کرتے اور فرماتے: ''عجمی لوگوں کی طرح مت کھڑے ہوا کرو۔''(180)

رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج کے موقع پر تمام انبیائے کرام کی امامت فرمائی،(181) لیکن اس فضیلت کے باوجود آپ میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور آپ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے موسیٰ (علیہ السلام) پر فضیلت مت دو۔''(182) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی علیہ السلام سے افضل ہے۔''(183)

اگرچہ آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے سے کئی مرتبہ غیب کے پردے اٹھائے گئے، لیکن اس کے باوجود جب ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنی ایک زوجہ محترمہ کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے پاس کچھ بچیاں دف بجا کر غزوہ بدر میں شہید ہونے والے اپنے آباء واجداد کے محاسن بیان کر رہی تھیں اور ان میں سے ایک بچی نے یہ بھی کہا کہ ہمارے درمیان مستقبل کی باتوں کا علم رکھنے والا نبی ہے تو اس پر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''یوں نہ کہو! بلکہ جو باتیں پہلے کہہ رہی تھی، وہی کہتی رہو۔''(184) ایک دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات نہ کہو! کیونکہ کل کیا ہونے والا ہے، اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔(185)

تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی ایسا قائد گزرا ہے، جس کے طرز زندگی کی ہم آہنگی عمر بھر برقرار رہی۔ یہ شخصیت بلاشبہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔

۵: صلاحیتوں کا درست استعمال

اپنے پیروکاروں کی صلاحیتوں کے ادراک میں آپ ﷺ کی کوئی نظیر نہیں۔ حبشہ کی طرف ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مہاجرین کا امیر منتخب فرمایا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے ساتھ ہونے والے مکالمے سے اس انتخاب کی درستگی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ (186)

آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم کی حیثیت سے مدینے کی طرف بھیجا۔ مدینے میں حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی کارکردگی اور دعوتِ اسلام کے سلسلے میں پیش کردہ خدمات رسول اللہ ﷺ کے اس حسنِ انتخاب پر شاہد عدل ہیں۔ چونکہ اہل مدینہ کو حضرت مصعب رضی اللہ عنہ جیسے نرم مزاج اور بااخلاق انسان کی ضرورت تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ان کا انتخاب فرمایا۔ (187)

ہجرت کی رات مشرکین کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے کسی شخص کا آپ ﷺ کے بستر پر سونا ضروری تھا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ سمجھ کر وہاں سونے والے پر وار ہونے کا امکان موجود تھا، اس لیے اس ذمہ داری کو سرانجام دینے کے لیے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسے دلیر شخص کا انتخاب ناگزیر تھا۔ (188)

آپ ﷺ کی ہجرت میں رفاقت، سفر میں مصاحبت اور غار میں معیت کے لیے کس ہستی کا انتخاب ہونا چاہیے تھا؟ دوسرے لفظوں میں اہل مدینہ کو سب سے پہلے آپ ﷺ کے ہمراہ کس شخصیت کو دیکھنا چاہیے تھا؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا، جنہوں نے ہمیشہ آپ ﷺ کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کیا۔ آپ ﷺ نے بالکل آغاز سے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس منصب پر فائز فرمایا اور وہ آخر تک اس پر فائز رہے، کیونکہ آپ ﷺ کا انتخاب آغاز سے ہی درست تھا۔

آپ ﷺ کے بعد آنے والے تمام خلفائے راشدین کے انتخاب پر آپ ﷺ کے نشاناتِ انگشت نظر آتے ہیں، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خلیفہ اول، عمر فاروق کا خلیفہ دوم، عثمان غنی کا خلیفہ سوم اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا خلیفہ چہارم ہونا ضروری تھا، کیونکہ ان حضرات کی عمریں اسی ترتیب کا تقاضا کرتی تھیں۔ اس معاملے میں قدرتِ خداوندی کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو اپنی تلوار سپرد کرنے (189) سے لے کر حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کو قریش اور یہودیوں کے درمیان اختلاف کا بیج بونے کی ذمہ داری سونپنے تک آپ ﷺ کا ہر انتخاب درست تھا۔ (190) آپ ﷺ ہمیشہ اہل افراد کو ذمہ داریاں سونپنے کے اصول پر کاربند رہتے۔ چونکہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رازوں کو محفوظ رکھنے کے اہل تھے، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں بعض راز کی باتیں بتائیں۔ (191) آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ میں رہ کر خفیہ خبررسانی کی ذمہ داری سونپی، جسے انہوں نے بحسن وخوبی سرانجام دیا۔ (192)

سپہ سالاروں کا انتخاب ہو یا بادشاہوں اور سرداروں کی طرف بھیجے جانے والے سفیروں کا چناؤ ہو، صفہ کے لیے طلبہ کا انتخاب ہو یا زکوۃ وصول کرنے والے عمال کا چناؤ ہو، غرض آپ ﷺ کا ہر انتخاب درست تھا اور زمانے نے اس کی درستگی پر مہر تصدیق ثبت کی۔

کسی بھی راہنما کے لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ وہ مخصوص ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے منتخب کیے گئے افراد کے مزاج سے بخوبی واقف ہو۔ تاریخ میں بہت سے رہنماؤں اور قائدین سے اس سلسلے میں ہونے والی بڑی بڑی غلطیوں کا ذکر ملتا ہے۔ کتنے ہی قائدین کو ان کے مقرب اور خاص لوگوں نے دھوکا دیا!

رسول اللہ ﷺ نے مالیاتی امور میں حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ کی خدمات حاصل کیں۔ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں بھی مالیاتی معاملات انہی کے سپرد رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں اپنے مال سے اپنے بعض اقربا کو نوازتے تھے، جس سے یہ افواہ پھیل گئی کہ آپ ﷺ بنوامیہ کو دیگر مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہ کہتے ہوئے خزانے کی چابیاں ان کے سپرد کردیں کہ وہ اس قسم کے حالات اور افواہوں کے ماحول میں یہ کام نہیں کرسکتے۔ (193)

و: ہر دل عزیز شخصیت

رسول اللہ ﷺ ایسے قائد تھے، جن سے لوگ محبت کرتے اور آپ لوگوں سے محبت کرتے۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ وہ آپ ﷺ کے دل کے سب سے قریب ہے اور وہ آپ ﷺ سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

آپ ﷺ صحابہ سے محبت کرتے تھے۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کتنی ہی مرتبہ آپ ﷺ نے مسجد میں جھانک کر نمناک آنکھوں سے اپنے صحابہ کے چہروں کو دیکھا، کیونکہ آپ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ اگرچہ کچھ زمانے کے بعد وہ صحابہ سے پھر ملیں گے، لیکن ابھی ان سے مفارقت کا وقت قریب آ گیا ہے اور وہ عالم شہادت میں انہیں دوبارہ نہیں دیکھ پائیں گے۔ رفیق اعلیٰ کی طرف کوچ کرنے کی گھڑی آن پہنچی تھی اور آسمان والے آپ ﷺ کے منتظر تھے، لیکن اس پیکرِ وفا کی آنکھیں اپنے پیارے صحابہ کی جدائی کے غم سے اشکبار تھیں، تاہم دوسری طرف اپنے صحابہ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آپ ﷺ کا دل خوشی و مسرت سے سرشار تھا اور آپ ﷺ کے مبارک ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔(194)

آپ ﷺ اپنے صحابہ سے محبت کرتے اور ان کا دفاع فرماتے۔ آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو! اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی بقدر سونا خرچ کرے تو اس کا ثواب ان کے ایک یا نصف مُد کے ثواب کے برابر نہیں ہوسکتا۔''(195) آپ ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے: ''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔''(196) ان کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی احادیث ہیں، جو آپ ﷺ کی اپنے صحابہ کے ساتھ محبت اور ان کا دفاع کرنے کی کھلی دلیل ہیں۔

آپ ﷺ ہر دل عزیز تھے۔ لوگوں کو آپ ﷺ سے ناقابل بیان حد تک محبت تھی اور آپ ان کے دلوں میں بستے تھے۔ آپ ﷺ کی محبت کمالِ ایمان کی علامت ہے۔(197) صحابہ کرام جس طرح ایمان کے اعلیٰ مقام پر متمکن تھے، اسی طرح وہ محبت رسول کے بھی اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔

قریش نے صحابی رسول حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو ''ماء الرجیع'' کے مقام سے قید کیا تھا۔ جب وہ انہیں پھانسی کے مقام پر لے کر آئے تو ان سے پوچھا: ''کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد (ﷺ) تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر میں مامون و محفوظ ہوتے؟'' اگر وہ اس کا جواب اثبات میں دیتے تو شاید کفار انہیں رہا کر دیتے، لیکن انہوں نے جواب میں فرمایا: ''نہیں، بخدا! مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک میں کانٹا بھی چبھے۔''(198)

غزوہ احد کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا۔ اس آدمی نے انہیں شدید زخمی حالت میں پایا اور ان سے حال دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا: ''میری موت کا وقت قریب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو میرا اسلام پہنچا کر ان سے کہنا کہ سعد بن ربیع آپ ﷺ سے کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی امت کی طرف سے اس کے نبی کو جو بہتر سے بہتر بدلہ دیا ہے، وہ ہماری طرف سے آپ کو دے، نیز میری قوم کو میرا اسلام پہنچا کر ان سے کہنا کہ سعد بن ربیع تم سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم میں سے کسی ایک کے بھی زندہ ہوتے ہوئے دشمن آپ ﷺ تک پہنچ گیا تو خدا کے حضور تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔''[199]

سمیرا نامی صحابیہ میدانِ احد میں رسول اللہ ﷺ کو تلاش کر رہی تھیں۔ جب صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ ﷺ کو دیکھ لیا تو فرمایا: ''آپ کے بعد ہر مصیبت ہلکی ہے۔''[200] حالانکہ اس معرکے میں ان کے بیٹے، خاوند اور والد شہید ہو چکے تھے۔

جب نسیبہ نامی انصاریہ صحابیہ ہاتھ میں تلوار لیے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کر رہی تھیں اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان کے زخمی بیٹے کی طرف اشارہ فرما کر انہیں اس کی مدد اور مرہم پٹی کرنے کے لیے کہا۔ وہ یہ بھول ہی گئی تھیں کہ ان کا بیٹا بھی جنگ میں شریک ہے اور اب زخمی حالت میں پڑا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑیں، اس کی مرہم پٹی کی اور پھر اس سے کہا: ''میرے بیٹے! اٹھ اور رسول اللہ ﷺ کا دفاع کر۔''[201]

رسول اللہ ﷺ کی حمایت کرنے اور آپ ﷺ کی رسالت کی دعوت دینے کی پاداش میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اتنا مارا گیا کہ ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ بنو تیم انہیں کپڑے میں اٹھا کر ان کے گھر لے آئے۔ انہیں ان کے بچنے کی بالکل توقع نہ تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد اور بنو تیم شام تک ان سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور جب بالآخر بولے تو پہلی بات اپنے حبیب ﷺ کے بارے میں کی اور پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ یہ سن کر بنو تیم اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی والدہ ام الخیر سے کہا: ''اس کا خیال رکھنا اور اسے کچھ کھلانا پلانا۔'' جب سب چلے گئے تو ان کی والدہ نے کچھ کھانے پینے پر اصرار کیا، لیکن وہ یہی پوچھتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں؟ ان کی والدہ نے کہا: ''بخدا! مجھے تمہارے ساتھی کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ وہ بھی اس وقت تک کوئی چیز کھائیں گے اور نہ پئیں گے جب تک رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نہ سن لیں۔''[202]

اس جیسی سینکڑوں مثالوں سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے دلوں میں بستے تھے اور وہ آپ ﷺ کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے تھے۔ آپ ﷺ کو پرخلوص محبت کے ہالے نے گھیر رکھا تھا۔ آپ ﷺ سب کے محبوب تھے۔ آپ ﷺ کے دروازے پر کوئی پہرے دار یا دربان نہیں ہوتا تھا،(203) کیونکہ آپ ﷺ کو اپنے گرد موجود لوگوں پر مکمل اعتماد تھا۔ سارے لوگ آپ ﷺ سے محبت کرتے اور آپ ﷺ ان سے محبت فرماتے۔

ز- آغاز سے ہی معصوم ہستی

رسول اللہ ﷺ کا ماضی بے داغ تھا۔آپ ﷺ نے کبھی کوئی معیوب یا گھٹیا حرکت نہیں کی۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بچپن کے دوست تھے۔اگر وہ آپ ﷺ میں کوئی معیوب بات دیکھتے تو آپ ﷺ کے اعلانِ نبوت کرنے پر کیسے سب سے پہلے آپ ﷺ کی تصدیق کرتے؟ کیا ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے اخلاق سے متاثر نہ تھیں کہ بہت سے لوگوں کی طرف سے پیغاماتِ نکاح آنے کے باوجود انہوں نے آپ ﷺ کا انتخاب کیا۔ آیت مبارکہ ﴿الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ (النور:٢٦) ''پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے'' کے مطابق پاکیزہ خاتون حضرت خدیجہؓ نے اس پاکیزہ ہستی کے شایاں بیوی بننے کی پوری کوشش کی اور عمر بھر اس مقصد کے لئے سرگرم رہیں۔

آپ ﷺ کی اچھی عادات اور اعلیٰ اخلاق کا آپ کی بعثت سے پہلے ہی چرچا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اہل مکہ آپ ﷺ کو ''امین'' کے لقب سے پکارتے تھے۔آپ ﷺ کی ثابت قدمی اور وفائے عہد سے سب واقف تھے۔یہ بات ابوجہل اور ابولہب بھی اچھی طرح جانتے اور مانتے تھے۔آپ ﷺ سے ان کی دشمنی اور آپ ﷺ پر ان کے اعتراضات کی اور وجوہات تھیں،وگرنہ آپ ﷺ کی صداقت کے تو دشمن بھی معترف تھے۔

پاکیزگی،طہارت اور گناہوں سے اجتناب آپ ﷺ کا امتیازی وصف تھا۔آپ ﷺ ہمیشہ معصوم رہے اور کسی بھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ہم اس موضوع پر آئندہ چل کر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

سر ولیم میور (Sir William Muir) لکھتا ہے: ''محمد (ﷺ) ایک ممتاز شخصیت اور نیکی کا نمونہ تھے۔انہوں نے عمر بھر کوئی ایسا کام نہیں کیا،جس سے کسی شریف انسان کی طبیعت نفرت کرتی ہو۔انہوں نے کئی سلطنتوں کو گرایا اور بہتوں کی داغ بیل ڈالی،انہوں نے اپنی بھرپور زندگی میں فضائل کی پاسداری کی اور ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی گزاری۔''

آپ ﷺ انسانی کمزوریوں سے پاک اور اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ نبی کے علاوہ کسی اور انسان میں ان تمام اعلیٰ صلاحیتوں کا بیک وقت پایا جانا ممکن نہیں۔انبیائے کرام کے سوا

کسی اور انسان میں ان تمام صلاحیتوں کا اس قدر اونچے معیار کے مطابق پایا جانا ضروری بھی نہیں، کیونکہ مثلاً اگر وہ اپنی تجارتی صلاحیت کی وجہ سے بہترین تاجر بن بھی گیا تو اس کی سیاسی اور عسکری صلاحیتیں بے کار اور ناقابل استعمال رہیں گی، جبکہ رسول اللہ ﷺ ایک کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے منتظم اور بے مثال ماہر جنگ بھی تھے، تاہم آپ ﷺ کو انہی صلاحیتوں تک محدود سمجھنا درست نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی تخلیق تو پوری انسانیت کی نمائندگی اور راہنمائی کے لیے ہوئی تھی۔

اس معیار کی صلاحیتیں صرف انبیائے کرام کو عطا ہوتی ہیں، بصورت دیگر دوسری صفات کا وجود بے فائدہ قرار پائے گا، جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات مبرا ہے۔ آپ ﷺ خیر و فضیلت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور یہ ضروری بھی تھا، تا کہ آپ ﷺ اپنے پیروکاروں کی تمام صلاحیتوں سے بلند ہو کر ان کے لیے مرشد اور اسوہ حسنہ بنے رہیں۔ صلاحیتوں کے لحاظ سے آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے مخلص ترین پیروکار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے۔

ح: نتیجہ

سب سے پہلے ہم نے کسی بھی راہنما کے لیے ضروری صلاحیتوں کا تذکرہ کیا اور جب ہم نے اس حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا جائزہ لیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں ہی یہ تمام صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں اور اس بارے میں کوئی اور آپ ﷺ کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکا، کہ ہم اسے اس معاملے میں معیار ٹھہراتے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی صفات کامل درجے کی تھیں اور پیدائشی طور پر آپ ﷺ میں موجود تھیں، دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ کی یہ رفعت اضافی نہ تھی، بلکہ ذاتی تھی۔

آپ ﷺ اس قدر عظیم ماہر جنگ تھے کہ آپ ﷺ کی اس صلاحیت اور فراست کو عبقریت سے تعبیر کرنا بھی غلط ہے، لیکن زبان کی بے مائیگی کی وجہ سے ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور آپ ﷺ کی ذات اقدس کی طرف ''عسکری عبقریت'' کا انتساب کرنا پڑتا ہے، باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کے عسکری پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے یہ تعبیر بالکل ناکافی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت کا یہ پہلو وحی الٰہی اور رسول ہونے کی حیثیت سے آپ کی فراست سے مربوط ہے۔ ہم ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ آپ ﷺ کی شخصیت کے یہ تمام پہلو آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہیں اور آپ ﷺ کی شخصیت کے پہلوؤں کا جائزہ لیتے وقت یہ بات ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہتی ہے، خواہ ہم اس کا صراحۃً تذکرہ کریں یا نہ کریں۔

آپ ﷺ ممتاز اور غیر معمولی ماہر جنگ تھے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کو آغازِ زندگی سے عسکری ماحول میں پرورش پانے والے پیشہ ور ماہرین جنگ پر بھی برتری حاصل تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی عسکری صلاحیت اکتسابی نہ تھی، کیونکہ آپ ﷺ تو ایک امی انسان تھے۔ آپ نے اس سے پہلے محدود پیمانے پر لڑی جانے والی جنگ فجار کے سوا کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا اور اس جنگ میں بھی آپ ﷺ کی شرکت اپنے چچاؤں کو تیر پکڑانے تک محدود تھی، لیکن پھر اچانک ہی آپ بڑی حکمت عملی سے جنگیں لڑنے لگے، جن میں آپ کو ہمیشہ ایسی فتح و کامرانی اور برتری نصیب ہوتی کہ بڑے بڑے سپہ سالاروں کے لیے بھی اسے حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ یہ حسبِ ذیل وجوہ سے آپ ﷺ کی رسالت کی دلیل ہے:

اول: رسول اللہ ﷺ نے حکم خداوندی سے اپنی دعوت کا واضح لائحہ عمل تیار فرمایا۔ آپ ﷺ کا ہدف

روزِ روشن کی طرح واضح تھا، یعنی "حق کی اشاعت اور اس کے راستے میں حائل تمام رکاوٹوں کا ازالہ" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری زندگی اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے وقف کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکار روز بروز اس ہدف سے قریب تر ہوتے گئے۔ اس دوران حالات میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدف ایک ہی رہا۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ موقع پرستی آپ کی اور آپ کے بابرکت و عالی نسب پیروکاروں کی عادت نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیئس سالہ دورِ نبوت کی چھان پھٹک کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے آغاز میں کہی ہوئی کسی بات سے نہیں پھرے، بلکہ آخر دم تک اس پر قائم رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی بھی مرحلے میں جنگ کو مقاصد کا درجہ نہ ملا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے صرف آخری تدبیر کے طور پر اختیار فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مدمقابل کے سامنے ہمیشہ مختلف متبادل پیش فرماتے رہے۔ جنگ سے پہلے کے دو متبادل قبولِ اسلام اور جزیہ ہیں۔[204] جو ان میں سے کسی بھی متبادل کو اختیار کر لے اس کے خلاف جنگ کرنا روا نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مہمات پر لشکر روانہ کرتے وقت سپہ سالاروں اور سپاہیوں کو عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر مسلح افراد سے تعرض نہ کرنے کی تاکید فرماتے۔[205] اور جب حضرت خالد بن ولید اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے بعض ایسے لوگوں کو قتل کیا، جنہوں نے ان کے خیال میں خوف کی وجہ سے یا جان بچانے کے لیے اسلام کا اظہار کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سخت سرزنش فرمائی۔[206] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح ہدف مقرر فرمایا اور پھر نہ صرف آپ اور آپ کے صحابہ نے اس کے حصول کے لیے پیش رفت جاری رکھی، بلکہ صدیوں تک آپ کے بعد آنے والے مسلمان بھی آپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس کی طرف پیش رفت کرتے رہے۔

دوم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی "حملہ بہترین دفاع ہے۔" کے اصول پر مبنی تھی۔ اگرچہ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفاعی جنگیں بھی لڑنی پڑیں، لیکن یہ جنگیں بھی حملہ کرنے کے لیے راہ ہموار کرنے کی ایک حکمتِ عملی تھیں۔

سوم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقدامات بصیرت پر مبنی ہوتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسنِ اتفاق پر بھروسہ نہ فرماتے، بلکہ ایک ایک قدم اچھی طرح سوچ سمجھ کر اٹھاتے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی میں کبھی بھی کسی اقدام سے پیچھے نہ ہٹے۔ مثلاً ایک مرتبہ صحابہ کرام دشمن کی فوج کی تعداد معلوم کرنا چاہتے

تھے، لیکن اس کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ اچانک دشمن کا ایک آدمی ان کے ہاتھ آ گیا اور انہوں نے اسے بولنے پر مجبور کیا، تاہم جب وہ آدمی انہیں درست تعداد بتاتا تو وہ اسے جھوٹا سمجھ کر مارنے لگتے اور جب وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے غلط بیانی کرتا تو وہ اسے مارنا چھوڑ دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو اس آدمی کو ایذاء پہنچانے سے منع فرمایا اور پھر اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ ہر روز کھانے کے لیے کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے اس کی بتائی ہوئی اونٹوں کی تعداد سے دشمن کی فوج کی تعداد کا اندازہ لگا لیا اور ان معلومات کے مطابق حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے جنگ کی تیاری فرمائی۔(207) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بغیر سوچے سمجھے کوئی بھی اقدام نہ اٹھاتے، بلکہ اپنی حکمت عملی وضع کرنے سے پہلے اپنے اور دشمن کے حالات کا گہرائی سے جائزہ لیتے تھے۔ کسی بھی سپہ سالار میں اس وصف کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

چہارم: آپ ﷺ نقل و حرکت کے دوران مخصوص اصولوں کی پیروی کرتے اور انہیں کسی حال میں نہ چھوڑتے، مثلاً آپ ﷺ دشمن پر حملے کے وقت کی منصوبہ بندی فرماتے۔ غزوہ خیبر اس کی بہترین مثال ہے۔ آپ ﷺ نے ظاہر یہ کیا کہ فوج کا رخ قبیلہ غطفان کی طرف ہے، لیکن پھر خیبر کی طرف چل پڑے۔ اس سے جہاں بنو غطفان یہ سمجھ کر کہ آپ ﷺ ان کی طرف آ رہے ہیں قلعہ بند ہو گئے، وہیں اہل خیبر نے یہ خیال کر کے کہ انہیں ابھی کوئی خطرہ نہیں، کسی قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں، لہٰذا جب یہودی صبح سویرے غنودگی کے عالم میں آنکھیں مل رہے تھے، اس وقت مسلمان ان پر اچانک حملہ کرنے کے لیے نماز فجر سے فارغ ہو کر روحانی کیفیت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی بہترین حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ آپ ﷺ ہر قسم کی مشکلات کو چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔(208)

آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے داخل ہوئے، حتی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی معلوم نہ تھا کہ آپ ﷺ کس جانب جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اہل مکہ کے لیے یہ صورت حال بالکل ناگہانی تھی اور جب انہیں اصل صورت حال کا علم ہوا اس وقت بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔(209) اوپر ذکر کردہ غزوات کے علاوہ کتب سیرت میں موجود دیگر غزوات میں بھی رسول اللہ ﷺ نے اس اصول کی پابندی کی۔

پنجم: آپ ﷺ دشمن کے ساتھ جنگ کے لیے ایسے مقام اور وقت کا انتخاب فرماتے، جو مسلمانوں کے حق میں ہوتا اور دشمن کے لیے اس میں نقصان کا پہلو ہوتا۔ مثلاً غزوہ بدر کے موقع پر مسلمانوں نے پانی والی جگہ پر پڑاؤ ڈال کر دشمن کو پانی سے محروم کر دیا۔(210)

ششم: آپ ﷺ وقت کو بہت عمدہ طریقے سے استعمال فرماتے، مثلاً غزوہ خندق میں آپ ﷺ نے جنگ کو طوالت دی یہاں تک کہ دشمن کو موسم سرمانے آلیا اور وہ واپس لوٹنے پر مجبور ہو گیا، اسی طرح اس غزوے میں مقام کا انتخاب بھی مسلمانوں کے حق تھا۔ (211) غزوہ حنین کے وقت کا انتخاب بھی بہت مناسب تھا۔ اگر تھوڑی سی تاخیر ہو جاتی تو مسلمانوں کو حملہ کرنے کا موقع نہ ملتا، بلکہ وہ مکہ میں محصور ہو کر نا موافق حالات میں دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو جاتے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مناسب وقت پر دشمن کی طرف پیش قدمی کا حکم جاری فرما کر زمانے کے محرک کو مسلمانوں کے حق میں کر دیا، اسی طرح آپ ﷺ محفوظ مقامات پر بیٹھے دشمن کے تیراندازوں کو میدانِ جنگ میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں کی پیش قدمی کرتی ہوئی فوج نے پسپائی کا مظاہرہ کیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر محفوظ مقامات پر بیٹھے تیرانداز جو دشمن کا سب سے کارآمد ہتھیار تھے، ان کا تعاقب کرنے لگے، لیکن جونہی وہ اپنی محفوظ جگہیں چھوڑ کر میدان جنگ میں اترے ان کی امتیازی حیثیت ختم اور ان کے تیروں کی افادیت کم ہو گئی، کیونکہ اب وہ دوبدو جنگ میں شامل ہو چکے تھے، جس میں زیادہ اہمیت تلوار کی ہوتی ہے۔

ہفتم: خوراک اور ضروری سامان کی رسد کا بندوبست کسی بھی لشکر کی اہم ترین ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے کسی بھی غزوے میں آپ ﷺ کی فوج خوراک اور ضروری سامان کی رسد کی قلت کی وجہ سے جنگ سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہوئی۔ قرآن کریم نے سینکڑوں آیات مبارکہ میں سخاوت اور راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اسلام میں جہاد مال اور جان دونوں کے ذریعے ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی اس صلاحیت سے بھرپور کام لیا۔

ط: رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ شاگرد

ابھی تک ہم نے رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملی اور بعض دیگر اقدامات کی چند خصوصیات پر گفتگو کی ہے، تاہم آپ ﷺ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے تھوڑے سے عرصے میں ایک بے مثال فوج تیار کی، جس نے مختصر سی مدت میں چہار دانگ عالم میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوج کی تیاری اور تربیت میں آپ ﷺ کی کوئی نظیر نہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے بذات خود اپنی فوج کی داغ بیل ڈالی تھی اور آپ سے ہی اس بابرکت فوج نے تربیت حاصل کی تھی۔ دیگر سپہ سالاروں کی طرح آپ ﷺ نے بنی بنائی فوج کی کمان نہیں سنبھالی تھی۔ سب سے زیادہ لائق توجہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت یافتہ فوج میں درج ذیل تین اہم اوصاف پائے جاتے تھے:

(۱) عمدہ تیاری

(۲) اعلیٰ اخلاق اور بہترین تربیت

(۳) ایمانِ کامل اور اطاعت و وفاداری کا جذبہ

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "ألا ان القوة الرمی" "دیکھو! اصل قوت "رمی" (پھینکنے) میں ہے۔" [212] سے قیامت تک اسلحہ سازی کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آپ ﷺ کے روشن ارشادات میں سے ایک ارشاد ہے۔ آپ ﷺ نے عملی طور پر اپنے اس ارشاد پر عمل کر کے دکھایا اور تیر اندازی کا اہتمام فرمایا۔ تیر اندازی اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب بہت سی احادیث میں وارد ہے۔ [213] ان احادیث میں سے ایک اہم حدیث جنگ کے دوران آپ ﷺ کا حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہ ارشاد ہے: "تم پر میرے ماں باپ فدا! تیر اندازی کرو۔" [214] آپ ﷺ نے بہت سے صحابہ کو "تم پر میرا باپ فدا!" یا "تم پر میری ماں فدا!" کہا ہے، لیکن "تم پر میرے ماں باپ فدا!" حضرت سعد کے سوا کسی سے نہیں فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی فوج کو بنفس نفیس تیار فرماتے تھے۔ آپ زمانہ امن میں صحابہ کرام کو ورزشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے اور ان کے درمیان مقابلے کراتے حتیٰ کہ بعض اوقات خود بھی ان میں شرکت فرماتے۔ [215] نیز کم عمر لڑکوں کے درمیان کشتی کے مقابلے کرانا آپ ﷺ کی نظر میں ورزشی سرگرمیوں کی اہمیت کی دلیل ہے۔ [216] عہد نبوی میں اسلامی فوج جنگی حکمت عملی اور بلند حوصلگی کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کے لحاظ سے بھی بہت مضبوط تھی۔

اسلامی فوج کے اخلاق رشکِ ملائکہ تھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی فوج کی ایسی تربیت

فرمائی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتی امن وامان کی علامت بن جاتی۔ صحابہ کرام کے ہاتھوں فتح ہونے والے کسی علاقے میں کسی کی عزت وناموس کو نقصان پہنچنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ اسلامی فوج کے اخلاق اور عفت کے شعور کا حال تھا۔ بلاشبہ ان کے اعلیٰ اخلاق اور پاکدامنی کا سرچشمہ ان کا عقیدہ تھا۔ اس دور میں کوئی بھی شخص اپنے عقیدے سے متضاد طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا تھا۔ قرآن کریم اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (المجادلة: ۲۲) ''جو لوگ خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے، خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کردیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے اور وہ ان کو بہشتوں میں، جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں، داخل کرے گا۔ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔ یہی گروہ خدا کا لشکر ہے (اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔''

وہ بڑے مضبوط ایمان کے مالک تھے۔ ان کے ہدف تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ یا مشکل حائل نہ ہوسکتی تھی۔ بعض اوقات جنگ کے دوران ان کا سامنا اپنے بھائی[217] باپ یا چچا[218] سے ہو جاتا، لیکن ایسے مواقع پر جہاں انسان کی طاقت جواب دے دیتی ہے، صحابہ کرام رکے اور نہ ہی ان کے دلوں میں تردد پیدا ہوا، بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے اپنے ہدف کی طرف پیش رفت جاری رکھی۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت یافتہ فوج کی نظیر آج تک دنیا والوں نے نہیں دیکھی۔ اس فوج کی تلواریں اپنے ہی بھائی، باپ یا رشتہ دار کا گلا کاٹ سکتی تھیں۔ اس بارے میں ذرا سا تردد بھی پوری فوج کی کارکردگی کو متاثر کرسکتا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی فوج کے کسی سپاہی نے اس بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی تردد نہ کیا۔

غزوہ بدر میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا اپنے والد سے سامنا ہوا۔ وہ ایک طرف ہٹ کر دوسری طرف نکل گئے، لیکن ان کے والد نے ان کا تعاقب کیا، بالآخر وہ اس کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوگئے اور اسے قتل کردیا۔ ان کے والد کا ان کے سامنے کھڑے ہونا ان کے فریضے کی ادائیگی کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا تھا۔ دعوت کی راہ میں جو بھی حائل ہوگا، اسے ہٹانا ضروری قرار پائے گا، تاہم بعض حالات اس سے مستثنیٰ بھی ہیں، جن میں کسی قدر رحمت اور نرمی کی گنجائش موجود ہے۔ اس معاملے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تنہا نہ تھے، بلکہ دیگر صحابہ کرام بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔[219]

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ غزوہ احد میں مشرکین کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کو دیکھا، لیکن ان سے دور رہے۔ انہوں نے قبولِ اسلام کے بعد اپنے والد سے کہا: ''غزوہ احد کے موقع پر میں نے آپ کو دیکھا تھا، لیکن میں نے درگزر سے کام لیا۔'' اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لیکن اگر میں تمہیں دیکھ لیتا تو تم سے درگزر نہ کرتا۔''(220)

صحابی رسول عبداللہ بن عبداللہ بن ابی رضی اللہ عنہ اپنے والد عبداللہ بن ابی بن سلول کے طرزِ عمل پر انتہائی غمزدہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ سزائے موت کا مستحق ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد کی عزت بھی بہت زیادہ کرتے تھے۔ یہ خیال کر کے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا ہے، وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ! مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی کو اس کی باتوں کی وجہ سے قتل کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر آپ نے ایسا کرنا ہی ہے تو مجھے حکم دیجئے، میں اس کا سر کاٹ کر آپ کے خدمت میں پیش کر دوں گا۔ بخدا! قبیلہ خزرج بخوبی جانتا ہے کہ اُس میں مجھ سے زیادہ اپنے والد کا فرمانبردار کوئی شخص نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کسی اور کے ذریعے اسے قتل کروا دیں اور پھر اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر مجھ سے رہا نہ جائے اور میں اسے قتل کر بیٹھوں اور اس طرح ایک کافر کے بدلے ایک مؤمن کی جان لے کر جہنم میں چلا جاؤں۔''(221)

حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے، لیکن ان کا باپ منافقین کا سردار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس منافق کے قتل کو پسند نہ فرمایا، بلکہ اس کے بیٹے کو اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرتے رہنے کا حکم فرمایا۔

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ یہی وہ صحابی تھے، جنہوں نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ وہ اس وقت تک مدینے میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ یہ نہ کہے: ''میں ذلیل ہوں اور محمد عزت والے ہیں۔'' اس کی وجہ سے تھی کہ ان کے باپ نے کہا تھا: ''اگر ہم مدینے لوٹ کر گئے تو ہم میں سے عزت والا ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔ اس نے اپنے آپ کو عزت والا اور نبی اکرم ﷺ کو (نعوذ باللہ) ذلت والا کہا تھا۔(222) اس کا بیٹا یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

چونکہ صحابہ کرام آیت مبارکہ ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ﴾ (آلِ عمران: ۱٤٥) ''اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے۔'' پر پورا ایمان رکھتے تھے، اس لیے وہ میدانِ جنگ میں بلاخوف وخطر کود پڑتے تھے، ورنہ میدانِ جنگ میں حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی بہادری کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے۔(223)

حضرت علی بن ابی طالب بارہا بیمار ہوئے، لیکن آپ اپنے بارے میں پریشان ہونے والے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ وہ اس بیماری کی وجہ سے ہرگز نہ مریں گے، کیونکہ انہیں پورا یقین تھا کہ ان کی موت اس وقت تک واقع نہ ہوگی، جب تک رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ان کی داڑھی ان کے سر سے بہنے والے خون سے رنگین نہ ہوگی۔ (224)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا ایک کان ایک جنگ کے دوران کٹ گیا اور اس سے خون کے فوارے بہنے لگے، لیکن وہ اپنی زندگی سے متعلق فکرمند ہونے والے حضرات کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ اس زخم کی وجہ سے ان کی موت ہرگز واقع نہ ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: ''عمار کو باغی جماعت قتل کرے گی۔ عمار انہیں اللہ کی طرف بلائے گا، لیکن وہ اسے جہنم کی طرف بلائیں گے۔''(225) انہیں اس بات پر پورا یقین تھا اور اپنے اس انجام سے متعلق ذرا بھی تردد نہ تھا۔

ایسا ایمان دشمن کے سارے اندازے غلط ثابت کرتے ہوئے ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور راہ خدا میں جہاد کے دوران بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے پر اکسانے والی بے مثال شجاعت کے پیچھے کارفرما نظر آتا ہے۔ (226)

میں نہیں سمجھتا کہ صحابہ کرام کی اطاعت رسول کا تذکرہ کرنے کی کوئی ضرورت ہے، کیونکہ صحابہ کرام کی اطاعت رسول بدیہات میں سے ہے۔ صحابہ کرام کے تذکرے کے ساتھ اطاعت کاملہ کا تصور لازم ہے۔ چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اس لیے ہم اسے یہاں نہیں چھیڑیں گے۔ اوپر ہم نے رسول اللہ ﷺ کی نظر میں عسکری تربیت کی اہمیت پر کسی قدر روشنی ڈالی ہے۔ اس بحث کا حسن خاتمہ ہم دو احادیث اور ایک آیت مبارکہ کے تذکرہ پر کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''اپنی اولاد کو پیراکی اور تیراندازی سکھاؤ۔''(227) ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تیراندازی سیکھنے کے بعد اسے بھلا دیا وہ ہم میں سے نہیں (یا یوں فرمایا) اس نے معصیت کا ارتکاب کیا۔''(228) حکم خداوندی ہے: ﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ (الانفال: ٦٠) ''اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے ہیبت بیٹھی رہے گی اور تم جو راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا۔''

پانچواں حصہ

عصمتِ انبیائے کرام علیہم السلام اور
عصمتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

فصل اول

عصمت کا عمومی مفہوم

الف: عصمت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

انبیائے کرام کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ گناہوں سے پاک اور محفوظ ہوتے ہیں، اسے ''عصمت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عصمت کا لغوی معنی روکنا اور حفاظت کرنا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم اللہ تعالیٰ کا اپنے نبیوں کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھنا ہے، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے نبی کی حفاظت فرماتے ہیں اور اسے کسی گناہ کے ارتکاب کا موقع نہیں دیتے۔''

یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا تھا: ﴿يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا﴾ (هود:٤٢) ''بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ۔'' اس کے جواب میں ان کے بیٹے نے کہا تھا: ﴿قَالَ سَآوِي إِلَى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ﴾ (هود:٤٣) ''میں (ابھی) پہاڑ سے جالگوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔'' اس آیت مبارکہ میں ذکر کردہ لفظ ''يعصمني'' ''عصم'' فعل سے ماخوذ ہے، جس کا معنی حفاظت کرنا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو جواب ارشاد فرمایا اس میں بھی اسی لفظ سے ماخوذ ایک لفظ موجود ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا: ﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ ''آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں۔'' یہاں ''عاصم'' اسم فاعل کے معنی میں ہو یا اسم مفعول کے معنی میں، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ عاصم ہو یا معصوم، عصمت کا مفہوم بہر کیف موجود ہے۔

زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿وَلَقَدْ رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ﴾ (یوسف:٣٢) ''اور بے شک میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مگر یہ بچارہا۔'' یہاں ''استعصم'' کا معنی ہے ''رکا رہا''، ''اپنے آپ کو بچایا'' اور ''قریب نہیں آیا۔''

آیت مبارکہ ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعاً﴾ (آل عمران:١٠٣) ''اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔'' میں ''اعتصموا'' کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی

کو مضبوطی سے تھامے رکھو، تاکہ گرنے اور گمراہ ہونے سے محفوظ رہو، اسی طرح آیت مبارکہ ﴿وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدة:٦٧) ''اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔'' میں ''یعصمك'' میں بچانے اور حفاظت کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ب: ہر نبی معصوم ہوتا ہے۔

تمام انبیائے کرام معصوم تھے۔ان کی زندگی میں کہیں بھی کجی نظر نہیں آسکتی۔وہ منتخب اور غیر معمولی ہستیاں تھیں۔وہ نہ صرف بہترین انسان تھے، بلکہ بہترین انسانوں میں سے بھی چنیدہ انسان تھے۔انہوں نے زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا، جس سے ان کے اس انتخاب یا ان کے مقصد بعثت پر زد پڑتی ہو۔

انبیائے کرام فطرۃً صاف ستھرے اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔وہ روحانی اعتبار سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ان کے ارادے پختہ اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے دل روشن و منور ہوتے ہیں۔تجلیات الٰہیہ اپنے حقیقی پہلوؤں کے ساتھ ان کے دلوں پر منعکس ہوتی ہیں۔ان کے آئینے کی مانند شفاف دل اور ضمیر پر انوارِ خداوندی کا حقیقی عکس پڑتا ہے، جس کی برکت سے ان میں کسی بھی قسم کی کج روی پیدا نہیں ہوسکتی۔

انبیائے کرام کا ایسے ہونا بالکل معقول بات ہے، کیونکہ ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف فریضہ تبلیغ کی ادائیگی ہوتا ہے۔وہ کلام خداوندی اور احکامات الٰہیہ کے اولین مخاطب ہوتے ہیں اور ان احکامات کو من وعن انسانیت تک پہنچانا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اگر ان کی روحیں پاکیزہ، ان کی فطرت شفاف اور ان کے دل صاف نہ ہوتے تو وہ پیغامات خداوندی کو انسانیت تک من وعن نہ پہنچا پاتے، بلکہ وحی خداوندی کی شعاعیں ان کے دلوں پر پڑتے ہی پھر جاتیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے احساسات سے متاثر ہو جاتیں، جس کے نتیجے میں پیغامات الٰہیہ کی طبیعت بدل جاتی اور وہ اپنی اصلیت کھو بیٹھتے۔

انبیائے کرام ذات خداوندی سے نکلنے والے اسرار کو ہماری طرف منتقل کرنے کے لئے آئینے کا کردار ادا کرتے ہیں، لہٰذا ان آئینوں کا صاف شفاف ہونا ضروری ہے تاکہ ان کے عکس میں کسی قسم کے فریب کا امکان نہ رہے۔

چونکہ انسان ایمان، عقیدے اور عمل سے متعلق تمام احکامات انبیائے کرام سے سیکھتا ہے، اس لیے انبیائے کرام کی سیرت میں انسانوں کو دین کی کامل ترین صورت جلوہ گر نظر آنی چاہیے، تاکہ وہ ان کے نقش قدم پر چل کر دنیا و آخرت کے سعادت کو پاسکیں۔اگر لوگوں کے امام و پیشوا ہی گناہوں کا

ارتکاب کرنے لگیں تو ان کی اتباع کیونکر درست ہوگی، کیونکہ اتباع انسان میں درستگی کی تلاش کے جذبے سے پھوٹتی ہے، جبکہ ایسے شخص کی اتباع جس کا گمراہ ہونا ممکن ہو درستگی اور صراطِ مستقیم کی جستجو کے اس انسانی جذبے کی ضد ہے، لہٰذا کسی نبی نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، بلکہ وہ عمر بھر اپنے ہر قول و عمل میں انسانیت کے لیے اسوہ حسنہ بنے رہے، کیونکہ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسا انسان جو خود جنتی نہ ہو دوسروں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں جنت کی طرف لے جائے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کو لوگوں کو ہدایت دے کر جنت کا اہل بنانے کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔

انبیائے کرام کے معصوم ہونے کی وجہ سے ہی وحی پر مبنی دین کو تمام انسانی مذاہب اور ادیان پر واضح برتری حاصل ہے، بصورت دیگر الہامی دین کی برتری کے دعوی کی کوئی بنیاد نہیں رہتی۔

بلاشبہ بعثت سے پہلے انبیائے کرام کے مخصوص افکار و مبادی ہوتے ہوں گے۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں، بلکہ فطرت کا تقاضا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ بعثت سے پہلے غارِ حرا میں معتکف ہو کر حقیقت اور انسانیت کی نجات کے بارے میں غور و فکر فرماتے تھے۔ انسانیت کو تاریکی اور برائی سے بچانا آپ ﷺ کا ہدف تھا۔ یہ ہدف یہیں تک محدود تھا، لیکن انسانیت کو بچانے کا وصف آپ ﷺ کی شخصیت یا آپ کے افکار کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی آپ کو عطا ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہمارے افکار و اقدار اور وحی کے راستے جدا جدا ہیں۔ ایک کا سرچشمہ سراسر انسانی ہے اور دوسرے کا سراسر الہامی ہے۔ لہٰذا خدائی نظام کو مخلوق تک پہنچانے اور اس کی ذمہ داری اٹھانے والے نبی اور رسول کا دیگر مبادی و اقدار کے علمبرداروں سے مختلف اور ممتاز ہونا ضروری ہے اور وہ امتیاز یہی ہے کہ نہ صرف انہیں عصمت عطا کی جاتی ہے، بلکہ ان کی امتیں بھی دیگر اقوام سے بھلائی اور عصمت سے قریب تر ہونے میں ممتاز ہوتیں ہیں۔

بلاشبہ ہر انسان کے کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ بے اصول آدمی کسی کام کا نہیں ہوتا، اسی لیے بدیع الزمان سعید نورسی نے کہا تھا: ''اگر اصول فراموش ہو جائیں یا بھلا دیئے جائیں تو ذہنوں میں انانیت پیدا ہو جاتی ہے۔''

عصمت اور گناہوں سے اجتناب انبیائے کرام کی فطرت وطبیعت بن جاتی ہے۔ بعض اوقات آفتاب و ماہتاب کے چہرے پر داغ نظر آتے ہیں، لیکن نبی کی روح پر گناہوں کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا۔

اگر کسی ولی سے گناہ کا ارتکاب ہو جائے، مثلاً بلا ارادہ اس کے منہ سے کوئی خلاف حقیقت بات

نکل جائے تو اسے عمر بھر اس کا دکھ رہتا ہے، لیکن بالفرض اگر کسی نبی کی زبان سے ایسی بات نکلتی تو اس کا ضمیر اسے قیامت تک اس پر ملامت کرتا رہتا، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہ تین جملے جو انہوں نے مصلحت کی خاطر بطور تعریض کے نہ کہ غلط بیانی کے کہے تھے [229] روز محشر تک ان کے لیے باعث تکلیف بنے رہیں گے اور وہ شفاعت کے طلب گاروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھیج دیں گے۔ [230] بلاشبہ حضرت ابراہیم اور تمام انبیائے کرام کے دل ہر قسم کے گناہ سے پاک ہیں۔

آغاز میں ہمارا ارادہ صرف رسول اللہ ﷺ کی عصمت پر روشنی ڈالنے کا تھا، لیکن چونکہ تمام انبیائے کرام ایک باپ کی اولاد ہیں [231] اور ان کی حیثیت ایک باپ سے تربیت پانے والی اولاد کی طرح ہے، اس لیے ہم نے اختصار کے ساتھ تمام انبیائے کرام کی عصمت کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ آئندہ سطور میں ہم خاص طور پر محرف کتابوں میں بعض انبیائے کرام پر لگائی جانے والی تہمتوں کا قرآن کریم کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کریں گے، تاہم ہمارے موضوع کا بنیادی محور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور عصمت ہی رہے گا۔

ہر نبی معصوم ہوتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ عصمت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، کیونکہ آپ ﷺ کا خمیر تجلیاتِ الٰہیہ سے گوندھا گیا تھا اور آپ ﷺ کا قلب اطہر ہمیشہ تجلیات الٰہیہ کا مرکز بنا رہا۔ ایسے انسان کا عصمت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونا ناگزیر تھا۔

چونکہ ایک انتہائی اہم ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کا انتخاب اور چناؤ ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی ہمیشہ حفاظت فرماتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ انہیں ساری انسانیت کے لیے اسوہ حسنہ اور مینارۂ ہدایت بنانے کے لیے عصمت کی خصوصیت سے نوازتے ہیں۔ ان پر اپنے بلند مرتبے اور پاکیزہ مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہر قسم کی گندگی اور ناپاکی سے بچانا لازم ہوتا ہے، تاکہ ان کے پیروکار بھٹکیں اور نہ ہی ان کی نظریں اِدھر اُدھر اٹھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف وہی انسانیت کو اللہ اور اس کی خوشنودی تک پہنچانے کی باوثوق ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ جب صغیرہ گناہوں میں بھی رضائے الٰہی نہیں پائی جاتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ رضائے الٰہی سے محروم انسان دوسروں کی رضائے خداوندی کی طرف راہنمائی کرے۔ یہ قطعاً ممکن نہیں، لہٰذا انبیائے کرام چھوٹے بڑے ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔

ج: ہر پیغمبر چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہے۔

جمہور علماء کے مطابق انبیائے کرام صغیرہ اور کبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے گناہ کا ارتکاب بھی نہیں کرتے۔ بعض انبیائے کرام کی طرف جو بعض لغزشیں منسوب ہیں، اول تو وہ گناہ نہیں ہیں، دوسرے ان سے ان کا صدور نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے ہوا تھا۔ دونوں صورتوں میں نبی معصوم رہتا ہے، نیز ان امور کو ہم ان کے مقام کی رفعت کے پیشِ نظر لغزش سے تعبیر کرتے ہیں، ورنہ عام لوگوں کے اعتبار سے انہیں لغزش نہیں کہا جاتا۔

انبیائے کرام کیونکر معصوم نہ ہوں اور ان سے کیونکر کسی گناہ کا ارتکاب ہو، جبکہ ہم کسی معمولی سے منصب پر بھی کسی کی تقرری کرتے وقت انسانی پیمانوں کے مطابق پوری طرح چھان بین کر کے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھیں تو نبوت جیسے اہم منصب پر کسی کو فائز کرتے وقت اس کی سات پشتوں تک چھان بین ہونی چاہیے۔

یہ کس قدر ناانصافی کی بات ہوگی کہ دنیا کے کسی ثانوی اہمیت کے منصب کے لیے کسی شخص کے انتخاب کے وقت تو اس قدر چھان بین کی جائے، لیکن دنیا و آخرت دونوں سے تعلق رکھنے والی ایک انتہائی اہم ذمہ داری کے بارے میں شدید حساسیت کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ کیا کسی کو اتنی اہم ذمہ داری سونپتے وقت اس کی قابلیت اور صلاحیت کو نہیں پرکھنا چاہیے؟

ذرا غور فرمایئے! وحی پہنچانے کی ذمہ داری کے لیے ایک ایسے فرشتے کا انتخاب کیا گیا، جسے امانت داری کے اعتبار سے دیگر فرشتوں میں ممتاز مقام حاصل تھا، چنانچہ قرآنِ کریم حضرت جبرائیل علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ (التکویر: ۲۱) ''سردار (اور) امانت دار ہے۔'' یعنی آسمان اور ملأ اعلیٰ کے فرشتے اس کی اطاعت کرتے ہیں اور وہ وحی پہنچانے میں امانت دار ہے۔ یہ کس قدر نامعقول بات ہوگی کہ وحی پہنچانے والے فرشتے میں تو ان صفات کے پائے جانے کا مطالبہ کیا جائے، لیکن وحی کو انسانیت کے سامنے پیش کرنے والے نبی میں ان صفات کے پائے جانے کو ضروری قرار نہ دیا جائے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے یہ ممکن نہیں کہ ایسی مقدس ذمہ داری کسی دھوکے باز، چور، نشہ باز، یا عزتوں کو پامال کرنے والے شخص کو سونپیں۔ کسی نبی میں ایسی بری صفات کا پایا جانا کیسے ممکن ہے، جن سے ایک عام انسان کی طبیعت بھی نفرت کرتی ہے؟ انبیائے کرام پر اس قسم کی بہتان طرازی کرنے

والوں کی نہ صرف عقلوں میں، بلکہ ان کے انسان ہونے میں بھی شک کرنا چاہیے۔ ناپاک انسان پاکیزگی اور طہارت کا نمائندہ نہیں بن سکتا، ایسے انسان کو نبی کہنا ایسے ہی ناممکن ہے، جیسے کسی نبی کی طرف ایسی صفات کو منسوب کرنے والے شخص کو انسان کہنا۔

عقل جس طرح انبیائے کرام کی عصمت کو ناگزیر قرار دیتی ہے، اسی طرح انبیائے کرام کی دعوت کو اپنی زندگی کا شعار قرار دینے والے ان کے پیروکاروں کے گناہوں اور برائیوں سے بچنے کو اپنی زندگی کا مقصد و غایت بنانے کو بھی ضروری قرار دیتی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک کسی گناہ کا ارتکاب جہنم میں جانے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

عصمتِ انبیاء کا معاملہ بڑا اہم ہے۔ انبیائے کرام کی زندگیاں ان کی عصمت کی گواہ ہیں۔ اگر بعض تحریف شدہ کتابوں میں موجود خرافات سے صرف نظر کرلی جائے تو کوئی بھی ایسا انسان نہ ہوگا، جس نے انبیائے کرام کی طرف گناہوں کے ارتکاب کی نسبت کی ہو۔ قرآنِ کریم انبیائے کرام کا تذکرہ ان کی علوشان کے مطابق کرتا ہے۔

جو مقام جبرائیل، عزرائیل، میکائیل اور اسرافیل کو آسمان پر حاصل ہے، وہی مقام انبیائے کرام کو زمین پر حاصل ہے، لیکن ہمیں ان میں سے صرف انہی کا علم ہے، جن کا تذکرہ قرآن کریم نے کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر گزرا، بعض علماء کی رائے میں بعض انبیائے کرام سے بعثت سے پہلے بعض لغزشوں کا صدور ممکن ہے، لیکن اس رائے کے قائل بہت کم علماء ہیں۔ یہ ایک کمزور رائے ہے، جسے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک انبیائے کرام بچپن سے ہی معصوم ہوتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اس رائے کے حق میں متعدد دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

د: عصمتِ انبیاء کے دلائل

اللہ تعالیٰ ایک مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا احسان جتلاتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي﴾ (طٰہٰ: ۳۹) ''اور (موسیٰ) میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی (اس لیے کہ تم پر مہربانی کی جائے) اور اس لیے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔'' اس آیت مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصرِ فرعون میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت ان کی والدہ یا فرعون کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑی، بلکہ خود ان کی تربیت فرمائی۔ بھلا بچپن سے ہی اللہ تعالیٰ کی نگہبانی ونگرانی میں تربیت پانے والا یہ نبی کیونکر معصوم نہ ہوتا؟

رسول اللہ ﷺ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''اولادِ آدم میں سے ہر نومولود کو پیدائش کے وقت شیطان چھوتا ہے، جس کی وجہ سے بچہ رونے لگتا ہے، لیکن مریم اور ان کا بیٹا اس سے مستثنیٰ ہیں۔''(232) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو پیدائش کے وقت سے ہی شیطان سے محفوظ رکھا تو وہ گناہوں سے معصوم کیوں نہ ہوں گے؟

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بچپن میں دو مرتبہ بے فائدہ تفریح میں حصہ لینا چاہا، چنانچہ آپ ﷺ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے ارادے سے نکلے، لیکن دونوں مرتبہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر نیند طاری فرما کر آپ کو سلا دیا۔(233) بعثت اور پیغام رسالت کی ذمہ داری سونپے جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کی ایک ایسا منظر دیکھنے سے حفاظت فرمانا، جو بعض اوقات حرام ہوتا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہے۔

آپ ﷺ نے بچپن میں کعبہ کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ آپ ﷺ اپنی پشت پر پتھر اٹھا رہے تھے، جس کی وجہ سے آپ کی پشت زخمی ہوگئی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا: ''اپنی ازار کو کندھے پر رکھ لیجئے۔'' جیسے ہی آپ ﷺ نے ایسا کیا، آپ ﷺ غش کھا کر زمین پر گر پڑے، آپ کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری ازار مجھے دو۔'' اور پھر اسے باندھ لیا۔(234) اگرچہ یہ ایک معمولی بات تھی، جس میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا جاتا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس سے حفاظت فرمائی، کیونکہ ایک دن آنے والا تھا جب آپ ﷺ نے بدن ڈھانپنے کا حکم ارشاد فرمانا تھا اور انسانیت نے آپ ﷺ سے شرم وحیا کا سبق سیکھنا تھا۔ خلاصہ یہ کہ بچپن میں بھی آپ ﷺ کی پرورش اللہ تعالیٰ کی نگہبانی اور تربیت میں ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی

چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے بھی حفاظت فرماتے تھے۔ جس طرح مستقبل میں فوج کی کمان سنبھالنے والے جرنیلوں کے رجحانات اور میلانات جاننے کے لیے ان کے ریکارڈ کی اچھی طرح چھان پھٹک کی جاتی ہے، اسی طرح اکثر علماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ بھی اپنے نبیوں کی بچپن سے ہی کسی بھی قسم کے گناہ کے ارتکاب سے حفاظت فرماتے ہیں۔

انبیائے کرام انسانیت کی کریم اور چنیدہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ قرآن کریم انہیں ﴿الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ﴾ (ص:٤٧) ''منتخب اور نیک لوگوں'' میں سے قرار دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں انبیائے کرام افضل اور ممتاز ترین لوگوں میں سے منتخب افراد ہوتے ہیں۔

ہ: غیر انبیاء کی عصمت

اس موضوع کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا انبیائے کرام کے علاوہ کسی اور کا معصوم ہونا ممکن ہے، دوسرے لفظوں میں کیا اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کے علاوہ بعض دوسری ممتاز ترین ہستیوں کو گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ انبیاے کرام کے سوا کوئی معصوم نہیں، کیونکہ عصمت انبیائے کرام کی خصوصیت ہے۔ ان کے سوا ہر کسی سے صغیرہ یا کبیرہ گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔ ایک حدیث نبوی سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ''آدم کی ساری اولاد خطار کار ہے اور بہترین خطا کار بکثرت توبہ کرنے والے ہیں۔''(235)

تاہم یہاں اس اہم نقطے کی طرف قارئین کی توجہ دلانا ضروری ہے کہ انبیائے کرام کے سوا اور ہر کسی سے گناہ کے سرزد ہونے کے احتمال کا پایا جانا ہر کسی سے عملاً گناہ کے سرزد ہونے کے ضروری ہونے کا تقاضا نہیں کرتا، لہذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا انبیائے کرام کے علاوہ انسانیت کے لیے پیشوا اور اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھنے والی بعض عظیم دینی ہستیوں کو گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھنا ممکن ہے۔ اس سے بارہ اماموں کی عصمت سے متعلق اہل التشیع کے عقیدے کی تائید نہیں ہوتی، مثلاً اگر کوئی پوچھے کہ کیا امام ربانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے گناہ کا ارتکاب ممکن ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل ممکن ہے، کیونکہ وہ نبی نہ تھے، لہذا نظری پہلو سے ان سے گناہ کا ارتکاب ممکن ہے، لیکن کیا امام ربانی نے اپنی زندگی میں کسی گناہ کا ارتکاب کیا تھا؟ اس کا جواب اثبات میں دینا ممکن نہیں، کیونکہ کوئی بھی یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں عملاً کوئی گناہ کیا تھا، دوسرے لفظوں میں گناہ کے وقوع کے احتمال سے عملاً گناہ کے وقوع کا ضروری ہونا مستلزم نہیں آتا، کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالی اپنے مقرب بندوں کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والوں کی حفاظت فرماتے ہیں۔ درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآن کریم اس کی طرف اشارہ کرتا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (الأنفال، ۲۹) ''مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے امر فارق پیدا کر دے گا (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا) اور تمہارے گناہ مٹا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا بڑے فضل والا ہے۔''

اس آیت مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والے اہل ایمان کی حفاظت

فرماتے ہیں، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی خاصیت اور حس عطا فرماتے ہیں، جس کی بدولت وہ بری اور پاکیزہ چیزوں میں امتیاز کر سکتے ہیں اور اس طرح گناہ کی جگہوں سے دور رہتے ہیں۔

ایک دوسری آیت مبارکہ میں ارشاد خداوندی ہے: ﴿أَوَ مَن كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَ جَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (الأنعام: ۱۲۲) ''بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کر دی، جس کے ذریعے سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے، جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے، اسی طرح کافر جو عمل کر رہے ہیں وہ انہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔''

جو لوگ اس دین کی خاطر اپنی زندگیوں کو وقف کر دیتے ہیں اور اسے اپنی زندگی کا مقصد اور ہدف قرار دیتے ہیں، ان سے درج ذیل دستورِ الٰہی کے مطابق معاملہ ہوگا: ﴿أَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (البقرۃ: ٤٠) ''اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں اس اقرار کو پورا کروں گا، جو میں نے تم سے کیا تھا۔'' جب تک وہ اپنے عہد پر برقرار رہیں گے، حفظ خداوندی میں رہیں گے: ﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ (محمد: ۷) ''اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔''

لہٰذا جو لوگ اخلاص کے ساتھ ایمان اور قرآن کی خدمت کرتے ہیں، وہ ان شاء اللہ اس قسم کی ضمانت کا مظہر قرار پائیں گے اور کبھی بھی کبیرہ گناہوں میں ملوث نہ ہوں گے، بلکہ بعض اوقات ان کی صغیرہ گناہوں سے بھی حفاظت کی جائے گی، لیکن یہ ضمانت اس کی شرط کے پائے جانے اور تقدیر خداوندی کے ساتھ مشروط ہے، لیکن انبیائے کرام کے سوا کسی کے لیے بھی یقینی طور پر یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی، تاہم اگر کسی کی زندگی میں یہ حفاظت عملاً پیش آئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھا ہے، لیکن چونکہ مستقل طور پر عصمت صرف انبیائے کرام کا امتیاز ہے، اس لیے اس کے مستقبل کی ضمانت نہیں دی جا سکتی، جبکہ انبیائے کرام کی عصمت ان کی زندگی کے ہر مرحلے پر محیط ہوتی ہے۔

بعض اوقات عصمت کا عملی مشاہدہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہی، بلکہ عظیم ہستیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے، اگر ہم اپنے انفس میں جھانک

کر دیکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات گناہ میں مبتلا ہونے کے تمام اسباب موجود ہوتے ہیں، لیکن پھر اچانک حالات پلٹتے ہیں اور ہمیں اُس گناہ کے ارتکاب سے بچا کر اِس لطفِ خداوندی پر ششدر چھوڑ جاتے ہیں۔

نیز صحابہ کرام اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی بڑی بڑی نیکیاں اور عظیم خدمات مستقبل میں ان کے اور گناہوں کے درمیان مضبوط دیوار کی طرح حائل ہو جاتی ہیں، گویا آیت مبارکہ: ﴿لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ (الفتح:٢) ''تاکہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔'' کا راز ان پر بھی آشکار رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ ان کے گزشتہ نیک اعمال کی برکت سے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں، مثلاً بعض اوقات کوئی شخص کسی ایسی جگہ کی طرف روانہ ہوتا ہے، جہاں اس سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کی ٹانگ توڑ کر اسے اس بدی کے مقام تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں، اسی طرح اگر کسی شخص سے مستقبل میں آنکھ یا ہاتھ کے ذریعے کسی گناہ کے ارتکاب کا اندیشہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے آنکھوں کی بصارت اور ہاتھوں کی حرکت سے محروم کر دیتے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس محبوب بندے کو گناہوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ آخرت کی حفاظت کے مقابلے میں دنیا کے مصائب کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اسی موضوع سے متعلق ایک حدیث قدسی ملاحظہ فرمائیے: ''میرے عائد کردہ فرائض سے بڑھ کر مجھے کوئی ایسی چیز محبوب نہیں، جس کے ذریعے میرا بندہ میرا قرب حاصل کرے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں، میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔''(236)

یعنی میں اسے ہمیشہ بھلائی اور اچھی چیزیں دکھاؤں گا اور اسے برائی اور فساد سے محفوظ رکھوں گا۔ میں اس کی آنکھ بن جاؤں گا، جس کے ذریعے وہ صرف بھلائی ہی دیکھے گا، اس کے دل پر حکمت و بصیرت کی بارش ہوگی، جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مستغرق رہے گا، اسے خیر کے سوا کوئی چیز سنائی دے گی اور نہ ہی اس کا خیال بھلائی کے سوا کسی طرف جائے گا۔ بھلائی اور اس کے درمیان کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں، میں اس کے لیے انہیں ختم کر دوں گا۔ اسے میرا قرب نصیب ہوگا۔ میں اس کے دل اور اعضاء کا گناہوں میں ملوث ہونا پسند نہ کروں گا۔ یہ حدیث درج ذیل الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ''اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگے گا تو میں اسے عطا کروں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے گا تو میں اسے پناہ دوں گا۔''

لہٰذا جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے، اگر انبیائے کرام اور مقرب بندگانِ خدا سے گناہوں کا صدور ممکن بھی ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے تمام انبیائے کرام اور بعض نیک بندوں کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک نیک سیرت نوجوان بہت کم مسجد سے نکلتا اور نوافل وعبادات کی ادائیگی میں خوب محنت کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے بہت خوش تھے، لیکن پھر اچانک ہی وہ امیر المؤمنین کو باجماعت نمازوں سے غائب نظر آنے لگا۔ مساجد میں باجماعت نمازوں کی ادائیگی کی ایک حکمت یہ بھی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ فرض اور بعض کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ امام اپنی جماعت کا خیال اور اس کے شرکا پر نظر رکھتا ہے۔ اگر کسی کو غائب پاتا ہے تو اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے کہ کہیں کسی تنگی یا مشکل میں تو نہیں گرفتار؟ اگر امام امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوں اور نمازیوں کی جماعت صحابہ ہوں تو اس کے کیا ہی کہنے! جماعت کے شرکاء کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں بخوبی جانتے تھے اور ان کے حالات کی چھان بین کرتے رہتے تھے۔

اس نوجوان کا ایک بوڑھا باپ تھا۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے باپ کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس کے راستے میں ایک عورت کا گھر پڑتا تھا، جو اس نوجوان پر فریفتہ تھی اور اس کے انتظار میں راستے میں کھڑی رہتی۔ ایک رات وہ اس کے قریب سے گزرا۔ وہ اسے ورغلاتی رہی یہاں تک کہ وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو عورت اندر چلی گئی۔ جب وہ بھی اندر داخل ہونے لگا تو اسے اللہ تعالیٰ یاد آ گئے، اس کا مسئلہ حل ہو گیا اور اس کی زبان پر درج ذیل آیت مبارکہ جاری ہو گئی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ﴾ (الأعراف: ۲۰۱) ”جو لوگ پرہیزگار ہیں، جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں اور (دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں۔“ اس کے بعد نوجوان غش کھا کر گر پڑا۔ عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اسے اس کے گھر کے دروازے پر ڈال دیا۔ جب وہ گھر نہ پہنچا تو اس کا باپ اس کی تلاش میں نکلا اور اسے دروازے پر بے ہوش پایا۔ اس نے اپنے بعض گھر والوں کو بلایا اور وہ اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ رات کے کسی حصے میں اسے ہوش آیا تو اس کے باپ نے اس سے پوچھا: بیٹے! تمہیں کیا ہوا تھا؟ اس نے کہا: ”کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ باپ نے کہا: ”میں تم سے اصل صورت حال پوچھ کر رہوں گا۔“ آخر کار اس نے اصل حقیقت بتا دی۔ باپ نے

پوچھا: ''بیٹے! تم نے کون سی آیت تلاوت کی تھی؟'' اس نے وہ آیت تلاوت کی جو اس نے اس وقت پڑھی تھی اور پھر غش کھا کر گر پڑا۔ لوگوں نے اسے ہلایا جھلایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کی روح پرواز کر چکی ہے، چنانچہ انہوں نے اسے غسل دیا اور رات کے وقت ہی قبرستان لے جا کر دفن کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے والد کے پاس آ کر تعزیت کی اور کہا کہ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ اس نے کہا: ''امیر المؤمنین! رات کا وقت ہونے کی وجہ سے۔'' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے اس کی قبر پر لے جاؤ۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کی قبر پر گئے اور کہا: ''اے فلاں! ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ﴾ (الرحمان:٤٦) ''اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اس کے لیے دو باغ ہیں۔'' اس کے جواب میں نوجوان نے قبر میں سے کہا: ''اے عمر! اللہ تعالیٰ نے جنت میں مجھے دو باغ عطا فرما دیئے ہیں۔''(237)

اس واقعے میں ہمارے لیے قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر وہ نوجوان گناہ کا ارتکاب کرتا تو اس کا وبال صرف اس کی ذات تک محدود رہتا، کیونکہ وہ لوگوں کا پیشوا نہ تھا، لیکن اگر کوئی نبی ایسا گناہ کرتا تو اس کی سنگینی کے باعث زمین و آسمان کانپ اٹھتے، کیونکہ نبی کی حیثیت مقتدا اور اسوہ حسنہ کی ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بعض نیک بندوں کی بھی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں تو انبیائے کرام کی حفاظت کیسے نہ فرماتے ہوں گے؟

رسول اللہ ﷺ ایک حدیث مبارک میں ایمان کی حلاوت محسوس کرنے والے لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تین اوصاف جس شخص میں ہوں گے وہ ایمان کی مٹھاس محسوس کرے گا: وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ باقی ہر چیز سے زیادہ محبت کرے، کسی انسان سے صرف اللہ کے لیے محبت کرے اور کفر اختیار کرنے کو آگ میں پھینکے جانے کی طرح ناپسند کرے۔''(238)

لہٰذا جب ایمان کی حلاوت سے آشنا ایک عام مسلمان بھی کفر اختیار کرنے کو جہنم میں پھینکے جانے سے زیادہ برا سمجھتا ہے تو انبیائے کرام کا مقام تو اس سے کہیں بلند تر ہے۔ انبیائے کرام کی طرف گناہوں کو منسوب کرنے والوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ ان کی ایمانی قوت انہیں گناہوں کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے؟ ان کا گناہ میں مبتلا ہونا ممکن نہیں۔

اگر کوئی یہ جاننے کا خواہش مند ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے اپنے بہت سے ولیوں کو گناہوں کے

ارتکاب سے بچاتے ہیں تو اسے ان کے سوانح مثلاً ''حلیۃ الاولیاء'' وغیرہ کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے اپنے سینکڑوں ولیوں کو گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھا۔ مثلاً ایک ولی کے سامنے مشتبہ کھانا رکھا گیا۔ جب اللہ کے ان ولی نے اس میں سے ایک لقمہ لیا تو متعدد بار چبانے کے باوجود اسے نگل نہ سکے، جس سے انہیں پتا چل گیا کہ یہ حرام ہے، اس لیے انہوں نے اسے پھینک دیا۔[239] جب اللہ تعالیٰ اپنے ولی کو حرام لقمے سے بچاتے ہیں تو اپنے انبیائے کرام کو گناہوں سے کیونکر نہ بچاتے ہوں گے۔

و: عصمتِ انبیاء قرآن کریم اور کتب سابقہ کے تناظر میں

عصمت انبیائے کرام کا وصف اور نبوت کی لازمی شرط ہے۔ دنیا میں مبعوث ہر نبی اس وصف سے موصوف ہوتا ہے، جس شخص میں یہ وصف نہ پایا جائے، وہ نبی نہیں کہلا سکتا۔

عصمتِ انبیاء کے اثبات سے پہلے ہم تورات اور انجیل سے بعض مثالیں پیش کریں گے۔ یہ کتابیں تحریف شدہ ہیں اور ان میں انبیائے کرام پر بہت سی تہمتیں لگائی گئی ہیں پھر ہم قرآنِ کریم کی روشنی میں اس موضوع کا تجزیہ کریں گے اور ان تہمتوں کا جواب دیں گے، تاہم اس سے پہلے دو ایک امور کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ تورات، انجیل اور زبور وغیرہ کتب سابقہ تحریف کا شکار ہو چکی ہیں اور ان کی نصوص میں انسانی کلام خلط ملط ہو چکا ہے، اس لیے ان میں حقیقت کی تلاش اور درست فکری رجحان کی حفاظت ممکن نہیں۔ انسانیت سے گرے ہوئے تکلیف دہ امور کی انبیائے کرام کی طرف نسبت کرنا اسی تحریف کا نتیجہ ہے اور یہ ان کے محرف ہونے کی ایک مستقل دلیل ہے۔ اگر اور دلائل نہ بھی ہوتے تب بھی ان کی تحریف کو ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کی حفاظت کی ضمانت نہیں اٹھائی، لیکن قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹) ''بے شک یہ کتاب نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور یقیناً ہم اس کے نگہبان ہیں۔'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم کا مصدر الہامی ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار خود خدا ہے، اسی لیے قرآنی احکامات کے قیامت تک نافذ العمل رہنے پر اجماع ہے۔ قرآن کریم انبیائے کرام کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ان تحریف شدہ کتابوں میں انبیائے کرم کی ذات سے متعلق قرآن کریم سے معارض جو باتیں بھی مذکور ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ ان میں انسانی احساسات اور جذبات شامل ہو کر اصل نصوص کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں۔ کسی بھی انسان کو نبوت اور عصمت کے موضوع پر لب کشائی کی اجازت نہیں۔ ماضی سے متعلق ان غیبی معاملات کو زیر بحث لانا صرف انبیائے کرام کو زیب دیتا ہے، کیونکہ ان کا ذریعہ علم وحی الٰہی ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے نبی ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، اس لیے آپ ﷺ کے بعد کسی کو بھی اس موضوع پر لب کشائی کی اجازت نہیں۔ آپ ﷺ نے ہر اہم موضوع پر گفتگو کی، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ

السلام یہ کہتے ہوئے یہ حق آپ کے لیے چھوڑ گئے تھے: ''اب میں تم سے زیادہ گفتگو نہ کروں گا، کیونکہ اس جہان کا سردار میرے بعد آیا ہی چاہتا ہے۔''(240)

اگرچہ میں باطل کی تصویر کشی کو پسند نہیں کرتا، لیکن پھر بھی میں اس مقام پر ان تحریف شدہ کتابوں میں موجود بہتان طرازیوں کی بعض مثالیں ذکر کرنے اور ان سے متعلق قرآنی موقف کی وضاحت کرنے پر مجبور ہیں۔ میں ان بہتانوں اور باطل نصوص کا رد کرنے اور انبیائے کرام کی عصمت وبراءت کو ثابت کرنے کے لیے انہیں ذکر کرنے پر ان انبیائے کرام کی پاکیزہ روحوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔

ز: انبیائے کرام سے متعلق کتب سابقہ میں انتہائی نازیبا بہتان طرازیاں

تورات کی کتاب پیدائش میں حضرت لوط علیہ السلام پر بہتان طرازی کی بدترین مثال موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے شراب کے نشے میں مدہوش ہوکر (نعوذ باللہ) اپنی بیٹیوں سے بدکاری کی اور انہی سے ان کی نسل کا سلسلہ جاری ہوا۔ ذرا غور فرمائیے! اللہ تعالیٰ نے سدوم اور عمورہ کی بستیوں کے باشندوں کو صرف اس لیے ہلاک کیا تھا کہ انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام جیسے پاکیزہ سیرت نبی کی باتوں پر کان دھرنے کی بجائے ان کا اور ان کی پاکیزگی و پاکدامنی کی دعوت کا تمسخر آڑایا اور اس کے نتیجے میں اجتماعی طور پر سزا کے مستحق ٹھہرے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کی پاکدامنی کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو بھی ان دھنسے ہوئے شہروں اور منہدم دیواروں کے کھنڈرات ہی اس کی کافی دلیل ہوتی۔ کیا اتنے نازیبا مضامین پر مشتمل کتاب کو الہامی کتاب کہا جاسکتا ہے؟

کتاب پیدائش کے اڑتیسویں باب میں لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہوزا جن کے نبی ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا، نے اپنی بہو سے بدکاری کی، جس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام جیسے انبیائے کرام کے اسلاف پیدا ہوئے۔

بلاشبہ انبیائے کرام پر اس قسم کے لگائے جانے والے انتہائی نازیبا الزامات صریح جھوٹ اور بے بنیاد من گھڑت قصے کہانیاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آپ ﷺ تک ساری نسل نکاح کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ (241) ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام ایک باپ کی اولاد ہیں۔ (242) جس طرح رسول اللہ ﷺ کے نسب مبارک میں زنا کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اسی طرح دیگر تمام انبیائے کرام کے نسب بھی بدکاری سے پاک ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور اوپر جس یہوذا کا ذکر ہوا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ کسی نبی کے گھر میں بدکاری کا واقعہ پیش آنا ممکن نہیں۔ اسلامی فقہ کے مطابق کسی دوسرے شخص کی موجودگی میں ولد الزنا کو نماز میں امام بنانا مکروہ ہے۔ (243) ایسے شخص کا نبوت کے مقام پر سرفراز ہوکر ساری انسانیت کا امام بننا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

کتاب سلاطین کے گیارہویں باب میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام زندگی کے آخری ایام میں مرتد ہوکر بتوں کی پرستش کرنے لگے تھے۔ ایسے نبی پر یہ بہتان کیسے لگایا جاسکتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی بادشاہت سے نوازا ہو اور وہ نبی کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر اور اس کی بندگی بجالاتا ہو۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے روح، کلمہ اور نفخہ ربانی تھے، جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام میں پھونکا تھا۔[244] حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ تھے۔[245] حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے۔[246] اور اللہ تعالیٰ نے آل داؤد علیہ السلام کو ﴿ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْراً ﴾ (سباء: ١٣) ''اے آل داؤد شکر کرتے ہو۔'' کہہ کر خطاب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اوپر ذکر کردہ اوصاف کے ساتھ اپنے انبیاء کا تذکرہ کیا ہے۔

عہد قدیم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے سپہ سالار ''اوریا'' کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے اور اس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کرادیا۔[247]

ایسی گھٹیا حرکت کی نسبت، جسے ایک آدمی خواب میں بھی دیکھ کر استغفار کرنے لگے، ایک ایسے معزز نبی کی طرف کی گئی ہے، جس کے حق میں اللہ تعالیٰ نے ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴾ (ص: ٣٠) ''بہت خوب بندے تھے اور اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے'' کہہ کر گواہی دی ہے۔ ایسی کتاب بھلا الہامی کیسے ہو سکتی ہے؟ کسی نبی سے ایسی حرکت کے محض امکان کا خیال بھی نبوت وانبیاء کے مقام سے مکمل طور پر ناواقفیت کی دلیل ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام تو بکثرت بندگی اور آہ وزاری کرنے والے نبی تھے۔ آپ کی مجلس میں جو لوگ بیٹھتے ان پر بھی گریہ طاری ہو جاتا۔ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے لو لگائے رکھتے اور کسی بھی لمحے اپنے خالق سے غافل ہوتے اور نہ ہی عبدیت کا احساس ان سے جدا ہوتا۔[248] رسول اللہ ﷺ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے پسندیدہ نمازیں اور روزے حضرت داؤد علیہ السلام کی نمازیں اور روزے ہیں۔ وہ آدھی رات تک آرام کرتے، ایک تہائی رات تک نماز پڑھتے اور رات کے چھٹے حصے میں پھر سو جاتے نیز وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔''[249]

وہ بادشاہ تھے اور خزانوں کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں، لیکن انہوں نے کھانے کا ایک لقمہ خریدنے کے لیے بھی ان سے فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے اخراجات اپنی ذاتی اور ہاتھ کی کمائی سے پورے فرماتے۔ ایسے معزز نبی پر جو ایک ایک لقمے پر اپنے نفس کا محاسبہ فرماتے اور خدا کی بندگی ان کا خصوصی اور امتیازی وصف تھا، یہ تحریف شدہ کتاب ایسے گھٹیا اور نازیبا بہتان باندھتی ہے، جن کا سوچا بھی نہیں جا سکتا اور جو ان کے مقام نبوت سے کوسوں دور ہیں۔ خدا کے یہ پاکیزہ سیرت نبی اس الزام سے بری ہیں اور اس من گھڑت واقعے کا ان سے تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

عہد قدیم میں ایک اور عجیب وغریب اور ناقابل سمجھ دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ سے کشتی کی اور اللہ پر غالب آ گئے۔ اہل مغرب، جن کی

عقل آنکھوں میں اتر آئی ہے، میں مادی فکر اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے ایک عام انسان کی طرح ایک نبی کے ساتھ کشتی کرنے میں کوئی استبعاد نہیں سمجھتے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے قبولِ اسلام سے پہلے نبی ﷺ سے جو بات کہی تھی وہ ایسے لوگوں کا بہترین جواب ہے۔ انہوں نے کہا تھا: "اے میرے بھتیجے محمد! جب میں رات کے وقت صحرانوردی کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بڑے ہیں کہ انہیں چاردیواری میں محصور کیا جائے۔"

قارئین! ذرا غور فرمایئے، جس کتاب کے الہامی ہونے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں، اس کی فکری سطح حضرت حمزہ کے قبولِ اسلام سے پہلے کہ احساسات اور شعور سے بھی فروتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس قدر سطحیت اور جمود کی حامل کتاب کو کیسے الہامی تصور کیا جا سکتا ہے؟ کیا انسان انبیائے کرام کے بارے میں ان کتابوں میں ذکر کردہ باتوں کی تصدیق کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ موجودہ تورات اور انجیل اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیائے کرام کے بارے میں اس قسم کے بہتانوں اور انحرافات سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بہتانوں اور انحرافات کا سرچشمہ ہے۔

قرآن کریم انبیائے کرام پر لگائے گئے تمام الزامات کی تردید کرتا ہے، کیونکہ وہ انبیائے کرام کی غیر مشروط طور پر پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ ہدایت کے مینار اور راہنمائے کامل ہیں، جن کی ہر معاملے میں پیروی لازم ہے۔ تمام انبیائے کرام رضائے الٰہی کو ہماری طرف منعطف کرنے والے آئینے ہیں۔ ان آئینوں پر ذرہ برابر بھی گرد و غبار کا پایا جانا ممکن نہیں۔ قرآن کریم اور نبی اکرم ﷺ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے انبیائے کرام کے حسین پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں انبیائے کرام سے متعلق بعض عبارات سے غلط فہمی کی بنیاد پر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں انبیائے کرام کی طرف گناہوں اور خطاؤں کی نسبت کی گئی ہے۔ اس غلط فہمی کا باعث ان کی تنگ نظری کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ کے محدود سانچوں کی وجہ سے لغزش کھانا ہے۔ اگر وہ حضرات زیادہ گہرائی سے غور و فکر کرتے تو اپنے پہلے سے قائم کردہ خیالات سے چھٹکارا پا لیتے، اسرائیلی روایات کا جواب دے سکتے، جمہور علمائے کرام کی طرح سوچتے اور انبیائے کرام کی پہلے سے زیادہ عزت و احترام کرتے۔

دوسری فصل

عصمت اور دیگر انبیائے کرام

اس موضوع سے متعلق آیات مبارکہ کو زیرِ بحث لانے سے پہلے ہم بعض امور کی طرف اختصار کے ساتھ قارئین کی توجہ مبذول کرانا مناسب خیال کرتے ہیں۔

اول: اگر کوئی نبی بہتر چیز کے ہوتے ہوئے محض اچھی چیز کا انتخاب کرے تو اگر چہ یہ ہمارے اعتبار سے غلطی نہیں، لیکن اس کے حق میں لغزش شمار ہوتی ہے، کیونکہ اگر چہ اس نے اچھی ہی چیز کا انتخاب کیا ہے، لیکن مقربِ خدا ہونے کی وجہ سے اسے بہتر چیز کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔ ہم ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرض کریں ایک شخص مکمل قرآنِ کریم کی تلاوت کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ کتنے دنوں میں ایک دفعہ قرآنِ کریم کی تلاوت مکمل کرے؟ اس بارے میں اس کے سامنے دو ترجیحات ہوسکتی ہیں۔ ایک ترجیح یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ معانی پر غور وفکر کرتے ہوئے دس روز میں قرآنِ کریم کی تلاوت مکمل کرے۔ دوسری ترجیح یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اس بنیاد پر سات دنوں میں قرآنِ کریم کی تلاوت مکمل کرے کہ یہ اللہ کے کلام کے ساتھ زیادہ لگاؤ اور محبت کی دلیل ہے۔

فرض کریں اس نے پہلی ترجیح کو اختیار کرتے ہوئے دس دنوں میں قرآنِ کریم کی تلاوت مکمل کی، لیکن اللہ تعالیٰ کی زیادہ خوشنودی دوسری ترجیح میں پائی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ کی رضا کو دوسری صورت میں پانا بہتر تھا، تاہم پہلی صورت بھی اچھی ہے اور اس میں کسی قسم کا گناہ نہیں کہ اسے اختیار کرنے والے کو قصوروار ٹھہرایا جائے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے بہتر انتخاب کے ہوتے ہوئے محض اچھے انتخاب کو پسند کیا۔ لہٰذا ایسی صورت میں اس کی طرف گناہ کی نسبت کرنا صحیح نہیں۔

انبیائے کرام اپنے اجتہاد سے جن امور کا انتخاب کرتے ہیں، ان کی اصل حقیقت بھی یہی ہوتی ہے، لہٰذا ان کی طرف گناہ کے ارتکاب کی نسبت کرنا ممکن نہیں۔ ہم اس موضوع پر آگے چل کر دوبارہ گفتگو کریں گے۔

دوم: انبیائے کرام کی شخصیات کا ایک اہم پہلو اجتہاد ہے۔ وہ ایسے انفرادی اور اجتماعی امور اور احکامات کے بارے میں اجتہاد کرتے ہیں، جن کے بارے میں ان پر وحی نازل نہیں ہوئی

ہوتی۔ اکثر اوقات ان کے اجتہادات مرادِ خداوندی کے بالکل مطابق ہوتے ہیں، البتہ ہمیشہ رضائے خداوندی کی جستجو میں رہنے کے باوجود بہت کم مواقع پر ان کے اجتہادات اپنے ہدف کو مکمل طور پر حاصل نہیں کر پاتے۔ ان کی علوشان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ان کے حق میں لغزش تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ ان سے رضائے الٰہی کے ہدف کو بالکل درستگی کے ساتھ پانا مطلوب ہوتا ہے، تاہم ان کی اجتہادی خطا کو کبھی بھی گناہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے ان کی عصمت پر زد پڑتی ہے اور نہ ہی ان سے اس پر باز پرس ہوتی ہے۔ بالفرض اگر اس سے برعکس صورت حال ہوتی، گو ایسا ممکن نہیں، تب بھی ہمیں اس موضوع پر لب کشائی کرنا زیب نہ دیتا۔

سوم: ایسی معمولی لغزشیں ان سے مقام نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے سرزد ہوئی تھیں۔ "الزلة" کا لفظ یہاں معمولی سے ڈگمگانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ کہ مکمل طور پر زمین پر آگرنے کے مفہوم میں۔ اب ہم اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں اور انسانیت کے باپ حضرت آدم علیہ السلام سے آغاز کرتے ہیں۔

الف: سیدنا آدم علیہ السلام

قرآن کریم حضرت آدم علیہ السلام کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى () ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى﴾ (طه: ۱۲۱-۱۲۲) ''اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو وہ اپنے مقصد سے بے راہ ہوگئے پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔'' آیت مبارکہ میں "اجتباء" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ جس کا معنی ہے: ''انتخاب کرنا'' اور ''چننا''۔ اس کا اطلاق کسی چیز کو نیچے گرنے اور بلبلوں کی طرح ادھر اُدھر بکھرنے سے بچانے پر بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو ایسی صورت حال میں گرفتار ہونے سے بچالیا۔

آیت مبارکہ میں ذکر کردہ لفظ "عصی" پر ہم بعد میں گفتگو کرتے ہوئے ثابت کریں گے کہ اس میں معصیت کے مفہوم کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا۔ سردست ہم سیدنا آدم علیہ السلام کے موضوع کو جاری رکھتے ہیں۔ ہم اطاعت کا سبق حضرت آدم علیہ السلام سے سیکھ سکتے ہیں، کیونکہ انہوں نے لغزش سرزد ہوتے ہی گرنے سے اپنی حفاظت کرنے والے پروردگار کی طرف رجوع کیا ﴿قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (الأعراف: ۲۳) ''دونوں عرض کرنے لگے کہ پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔''

اگرچہ ان سے لغزش ہوئی، لیکن اس لغزش کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سے یہ لغزش ''انتخابِ نبوت'' سے پہلے سرزد ہوئی تھی۔ اس دور میں حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت اس ننھے سے پودے کی سی تھی، جو تند و تیز ہواؤں سے جھک جاتا ہے، لیکن جڑ سے نہیں اکھڑتا، بلکہ آندھی کے تھمتے ہی پہلے کی طرح سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مؤمن کو کھیتی سے اور کافر کو ایسے تناور درخت سے تشبیہ دیتے ہوئے، جو دیکھنے میں تو بڑا خوبصورت دکھائی دیتا ہے، لیکن اگر آندھی سے اکھڑ جائے تو دوبارہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا، ارشاد فرماتے ہیں: ''مؤمن کی مثال اس نرم و نازک کھیتی جیسی ہے، جس کے اوراق ہوا کے رخ پر جھک جاتے ہیں، لیکن جب ہوا تھمتی ہے تو سیدھے ہو جاتے ہیں، یہی کیفیت مؤمن کی مصائب میں ہوتی ہے، جبکہ کافر کی مثال مضبوط درخت کی سی ہے، جسے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہتے ہیں، اکھیڑ پھینکتے ہیں۔''[250]

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت سے پہلے لغزش ہوئی تھی، مزید برآں یہ لغزش درحقیقت بھول تھی۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (طه: ۱۱۵) ''اور ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں ارادے کی پختگی نہ پائی۔''

اور ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (البقرة: ۳۵) ''اور ہم نے کہا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ پیو، لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا، نہیں تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔''

لیکن سیدنا آدم علیہ السلام سے بھول ہوگئی، جو انسانی فطرت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع کا تجزیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''چونکہ آدم سے بھول ہوگئی، اس لیے اسے ان کی اولاد کی سرشت میں رکھ دیا گیا۔''(251) رسول اللہ ﷺ جو انسانی فطرت کے سب سے بہتر شناسا تھے، نے اس موضوع پر بڑے اچھے طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ بھولنا انسان کی عادت ہے، چونکہ آدم علیہ السلام بھی انسان تھے، اس لیے ان سے بھی بھول ہوگئی۔ اس حدیث میں انسان اور اس کے کردار پر موروثی خصوصیات کے اثرات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس موضوع کے ماہرین کو اس اشارے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ حاصل یہ کہ ہماری فطرت میں بھول ہمارے باپ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے آئی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے سیدنا آدم علیہ السلام کی فطرت اور کروموسومز میں ودیعت کیا تھا، اس لیے ہم اس سے چھٹکارہ نہیں پا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان کا ذکر فرما کر ان کے بارے میں پیدا ہونے والے سوئے ظن کا ازالہ فرمایا اور اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا ﴿وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (طه: ۱۱۵) ''اور ہم نے ان میں ارادے کی پختگی نہ پائی۔'' ہم نے انہیں اس لغزش کے کرنے پر پرعزم نہیں پایا، بلکہ اس کا صدور ان سے بلا ارادہ بھول میں ہو گیا تھا۔

وہ ممنوعہ پھل کس نوعیت کا تھا، اس بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ ان سب کا یہاں ذکر کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، وگرنہ یہ صفحات پھل فروش کی دکان بن جائیں گے۔ وہ پھل جو، گندم، چاول، کھجور یا انگور وغیرہ میں سے کوئی بھی ہو، اس سے ہمارے موضوع پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قابلِ توجہ امر اس پھل کو کھانے کے بعد پیش آنے والی صورت حال ہے۔ اس بارے میں ہماری رائے دیگر آرا سے کسی قدر مختلف ہے۔

ہماری رائے میں ممنوعہ پھل سے مراد وہ انسانی طبیعت ہے، جسے روکنا سیدنا آدم علیہ السلام کے بس میں نہ تھا اور اسی کے باعث نسل انسانی میں اضافہ ہوا۔ یہی بات انسانیت کی ماں حواء کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ہماری رائے میں درخت کے قریب جانے سے مراد وہ طرز عمل ہے، جس کے نتیجے میں نسل انسانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

اگرچہ ہم اس بارے میں اپنی رائے کو صحیح ترین قرار نہیں دیتے، لیکن ہمارے خیال میں اس بارے میں دیگر آراء کے ساتھ اس رائے کا اضافہ مفید ثابت ہوگا۔ اگر یہ رائے درست ہے تو یہ فضل خداوندی ہے، بصورتِ دیگر ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

نسیان اور خطا کے حکم شرعی کی طرف منتقل ہونے سے پہلے میں قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا پسند کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنِ کریم میں متفرق طور پر بیان کردہ واقعات کی کڑیاں ملا کر مکمل صورت میں پیش کرنا چاہیے۔ یہی بات سیدنا آدم علیہ السلام کے واقعے پر بھی سچی ثابت ہوتی ہے۔ ایک خاص مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام اور حواء کو ممنوعہ درخت یا پھل کے قریب جانے سے منع کیا تھا، لیکن یہ مرحلہ کس قدر طویل تھا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، تاہم بظاہر یہ ایک طویل مرحلہ تھا، جس کے نتیجے میں حضرت آدم علیہ السلام کو یہ ممانعت فراموش ہوگئی اور وہ بھول کر ممنوعہ پھل کھا بیٹھے۔

خطا پر محاسبہ نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میری امت سے بھول چوک اور حالت اکراہ میں کیے گئے کام کا گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔''(252) خود قرآنِ کریم ہمیں بھول چوک ہو جانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کی تلقین کرتا ہے ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا﴾ (البقرۃ:۲۸٦) ''اے پروردگار اگر ہم سے بھول یا چوک ہوگئی تو ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا۔'' یہ آیت مبارکہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے پڑھے جانے والے اوراد میں شامل ہے۔

سیدنا آدم علیہ السلام بھول گئے اور غلطی سے ممنوعہ پھل توڑ بیٹھے۔ جب یہ کام خطا اور نسیان کے نتیجے میں سرزد ہوا، جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس پر محاسبہ نہیں تو پھر سیدنا آدم علیہ السلام کو کیونکر گناہ گار یا قصوروار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

جب ایک عام انسان بھی اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ظلم وعصیان کی حیثیت رکھنے والے کاموں سے اجتناب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور چنیدہ انبیائے کرام ظلم وعصیان سے کیسے اجتناب نہ کرتے؟ میری رائے میں اس کے برخلاف رائے قائم کرنا انتہائی غفلت ہے، بلکہ بعض علمائے کرام

نے تو اس مفہوم کے ساتھ اس آیت مبارکہ کی تلاوت کرنے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ بلاشبہ ہر انسان غلط مفہوم مراد لیے بغیر اس آیت مبارکہ کی تلاوت اور تفسیر و تشریح کر سکتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور کسی نبی کے بارے میں ایک عام انسان کی حیثیت سے گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ ان کے بارے میں قرآنی اسلوب کو ان تصریحات کی بجائے، انہیں حاصل قربِ خداوندی کے مقام کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ اسلاف اس مفہوم کو "حسنات الأبرار سیئات المقرّبین" "نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین کے حق میں برائیاں سمجھی جاتی ہیں۔" سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر حکومتی اہلکار کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اسے زیادہ سخت سزا دی جاتی ہے اور اگر قانون سے واقف حکمران یا وکیل قانون شکنی کریں تو انہیں دوچند سزا دی جاتی ہے، اسی طرح انبیائے کرام بھی اللہ تعالیٰ کے ملازم ہوتے ہیں اور گناہوں کے ارتکاب کی حقیقت سے دوسروں سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے حضرات کے گناہ کے مرتکب ہونے کی صورت میں سزا کا دوچند ہو جانا بالکل طبعی بات ہے نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ حرم کعبہ میں کسی گناہ کا ارتکاب کسی اور مقام پر اسی گناہ کے ارتکاب سے زیادہ قبیح اور برا ہوتا ہے۔(253) اسی طرح قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گناہ کا ارتکاب کرنے کی صورت میں ان کے لیے دوچند سزا کا ذکر کیا ہے۔(254)

اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ قربِ خداوندی کا مظہر ہے اور وہاں آئے ہوئے لوگ رحمان کے مہمان ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی عورت کو زوجہ رسول ہونے کا شرف حاصل ہونا قربِ خداوندی کی علامت ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں وحی کا نزول ہوتا ہے اور وہاں ہر وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آمد و رفت رہتی ہے، لہٰذا "الغرم بالغنم" "فائدے کی بقدر نقصان" کے اصول کے مطابق ایسے گھر میں گناہ کے ارتکاب کی سزا طبعی طور پر زیادہ ہونی چاہیے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کا بھی یہی معاملہ ہے۔ چونکہ انہیں قربِ خداوندی سے نوازا جاتا ہے اور انہیں اکثر و بیشتر وحی لانے والے فرشتے کی معیت نصیب ہوتی ہے، اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے اور ان کی علوشان اس کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کی معمولی سی غلطی کو بھی گناہ قرار دیتے ہوئے گناہ کے طور پیش کیا جائے۔ میں یہاں یہ بات دوبارہ کہتا ہوں کہ اس گناہ و سزا کو کسی عام انسان یا ولی کے گناہ یا سزا کے معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا، بلکہ یہ ان کے مقام نبوت کے پیشِ نظر صرف صورۃً گناہ ہوتا ہے، حقیقۃً نہیں، اسی لیے اس پر "ذنب" کا اطلاق درست نہیں۔

فرض کریں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی بیوی کو چھونے اور اس سے مقاربت کرنے سے منع فرمایا تھا، لیکن چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا علم تھا، اس لیے جو کچھ بھی انہیں پیش آنے والا تھا، وہ اسے جانتے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ جس چکر میں وہ داخل ہو چکے ہیں، وہ انہیں بار بار گھمائے گا یہاں تک کہ ان میں ودیعت جذبے کے زیر اثر ان کے لیے طے شدہ نقطے تک انہیں پہنچا دے گا، چنانچہ انسانی ارادے جس کے خط نے عالم اسرار میں ایک مخصوص نقطے پر مشیت ایزدی کے خط کو قطع کیا، نے انہیں اس نتیجے تک پہنچا دیا۔ اگر ہم اسے نسیان نہ بھی کہیں باوجود اس کے کہ قرآن کریم اسے نسیان ہی کہتا ہے، تب بھی اس بارے میں نرم اور مؤدبانہ لب ولہجہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

اس موقع پر بخاری، مسلم اور ترمذی میں مروی ایک حدیث نبوی کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان مباحثہ ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اے آدم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی روح پھونکی، لیکن آپ نے لوگوں کو گمراہ کیا اور انہیں جنت سے نکالا۔" اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: "اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی ہم کلامی کے لیے منتخب فرمایا۔ کیا تم مجھے ایک ایسے عمل پر ملامت کرتے ہو، جس کا کرنا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے لکھ دیا تھا۔" اس طرح حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مباحثے میں غالب آ گئے۔"(255)

اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ اس مباحثے میں حضرت آدم علیہ السلام حق پر تھے اور انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء اور ان کے اسماء کا علم عطا کیا گیا تھا۔ وہ عمر بھر ان اسماء کے اسرار کے ہجوم میں سرگرداں رہے، لہٰذا ایسے شخص سے قصداً گناہ کے ارتکاب کے امکان کا دعویٰ محض غفلت کا نتیجہ ہے۔ یہاں ایک احتمال یہ بھی موجود ہے کہ اس پھل سے ممانعت مخصوص عرصے کے لیے ہو اور حضرت آدم علیہ السلام کو اس کا علم بھی ہو، لیکن انہوں نے اپنے اجتہاد کے پیش نظر وقت سے پہلے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر اپنا روزہ توڑ دیا ہو۔ ممکن ہے جو عمل اب اگر حلال طریقے سے کیا جائے تو ثواب کا باعث ہوتا ہے، اس وقت عارضی طور پر حضرت آدم علیہ السلام کے لیے ممنوع ہو یا یہ ممانعت ان کے قربِ خداوندی کے پیش نظر ہو اور اسی وجہ سے ان کے اس طرز عمل کو لغزش سے تعبیر کیا گیا ہو۔

جو معیار ہم نے سیدنا آدم علیہ السلام کے حق میں قائم کیا ہے، یہ ہمیں دوسرے انبیائے کرام کا مقام سمجھنے میں بھی مدد دے گا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ عصمت کے وصف کے ساتھ متصف تھے اور ان کی طرف منسوب لغزشیں اس مفہوم میں گناہ نہیں، جو عام طور پر گناہ سے سمجھا جاتا ہے۔

ب: سیدنا نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی نجات کے لیے اپنے پروردگار سے دعا کی، لیکن اس پر ان کی تنبیہ ہوئی۔ بعض اوقات پہلی نظر میں یہ بات کسی نبی کے حق میں لغزش معلوم ہوتی ہے۔ انسانیت کے دوسرے باپ کہلانے والے اس معزز نبی کی صورتحال جاننے کے لیے ہمیں قرآن کریم کی روشنی سے ہدایت لینی ہوگی۔ قرآن کریم حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کا درج ذیل الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے: ﴿وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ﴾ (ھود: ٤٥) اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ پروردگار میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے تو اس کو بھی نجات دے تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حاکم ہے۔''

اپنی امت کے سر پر پڑنے والی مصیبت کے انتظار میں حضرت نوح علیہ السلام جذباتی ہو گئے تھے اور کسی بھی دوسرے انسان کی طرح اپنے بیٹے کے انجام کے بارے میں فکرمند تھے، لیکن کیا ان کی فکرمندی اس کے دنیوی انجام کے بارے میں تھی یا اس کے حالت کفر میں مرنے پر تھی؟ بلاشبہ ان کی فکرمندی اپنے بیٹے کی صرف دنیا اور جسم و جان پر نہ تھی، بلکہ اس کی ابدی و سرمدی زندگی پر تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ ابدی سعادت اور دردناک عذاب دونوں سے بخوبی واقف تھے۔ کون سا باپ ہوگا جو اپنے بیٹے کے اس قدر خوفناک انجام پر شفقت سے کانپ نہ اٹھتا ہو؟

ان کے دردمند دل سے نکلنے والی اس آہ کے جواب میں درج ذیل ارشاد خداوندی نازل ہوا، جس نے حقیقت حال واضح کر دی: ﴿قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ (ھود: ٤٦) ''اللہ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے۔ وہ تو سراسر بد عمل ہے، تو جس چیز کی تم کو حقیقت معلوم نہیں اس کے بارے میں مجھ سے درخواست ہی نہ کرو اور میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ نادان نہ بنو۔''

یعنی اگرچہ وہ تمہارا خون ہے، تمہاری بیوی نے اسے جنا ہے اور اس نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہے، لیکن وہ تمہارے گھرانے سے نہیں ہے، کیونکہ تمہارے گھرانے میں وہ لوگ داخل ہیں، جو

تمہارے راستے پر چلیں گے، جبکہ وہ برے اعمال کا ارتکاب کر کے بدی کے چکر میں پھنس گیا ہے۔اس نے تمہاری نافرمانی کی اور کفار کے ساتھ ہولیا، جو اس کے غرق ہونے کا باعث بنا اور اس طرح وہ اپنی ہمیشہ کی منزل کھوٹی کر بیٹھا۔تم مجھ سے کسی ایسی بات کا سوال مت کرو، جس کا تمہیں کما حقہ علم نہیں۔میں تمہیں جاہلوں میں شامل ہونے سے محفوظ رکھوں گا، کیونکہ تم علم ومعرفت اور محبت کو پانے کے مستحق ہو۔تم اپنے مولائے برحق کو جانتے ہو اور میرے مقرب انبیاء میں شامل ہو، لہٰذا تمہیں اس قسم کی درخواست کرنا زیب نہیں دیتا۔

ساڑھے نوسو سال میں حضرت نوح علیہ السلام کی یہ واحد لغزش تھی کہ انہوں نے غرق ہونے کے قریب اپنے بیٹے کو بچانے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی۔انہوں نے درج ذیل وجوہ کی بنا پر یہ دعا مانگی ہوگی:

اول: قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھرانے کے افراد اور اہل ایمان کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا تھا ﴿حَتَّى إِذَا جَاء أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلاَّ مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ (هود: ٤٠) ''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا تو ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر قسم کے پالتو جانوروں میں سے جوڑا جوڑا یعنی ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ لے لے اور جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے کہ ہلاک ہو جائے گا اس کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو ایمان لایا ہو، اس کو کشتی میں سوار کر لو اور ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے وحی کی بنیاد پر کشتی بنائی اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر لوگوں کو اس میں سوار ہونے کی دعوت دی۔ان کے گھرانے کے افراد ان کی دعوت کے مخاطب تھے، لیکن اب وہ اپنے بیٹے کو موجوں میں گھرا ہوا دیکھ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے اور ان کے پروردگار کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی، جس کی وہ پناہ لیتے۔جب سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو اس کا در پھر بھی کھلا رہتا ہے۔ان کے پاس بھی اپنے پروردگار کے در پر صدا لگانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے کی نجات کے لیے اپنے پروردگار کے حضور التجا کی، اپنے پروردگار کے بتانے پر انہیں اچانک پتا چلا کہ ان کا بیٹا ان کے گھرانے میں داخل نہیں، جبکہ وہ اسے اپنے گھر کے افراد میں شامل سمجھ رہے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر تنبیہ فرمائی تو انہوں نے فوراً اپنے پروردگار کی طرف رجوع کیا اور درج ذیل دعا کرتے ہوئے معافی مانگی: ﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلاَّ تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (هود: ٤٧) ''نوح

نے کہا پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں، جس کی حقیقت مجھے معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں فرمائے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ التجا کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کو اصل حقیقت کا علم نہ تھا، لیکن جونہی انہیں علم ہوا انہوں نے فوراً استغفار کیا۔ کیا اس طرزِ عمل کو خطا کہا جا سکتا ہے؟ کس کا ضمیر اس کو گوارا کرے گا؟

دوم: حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے اپنے بیٹے کی ہدایت کا ہی تو سوال کیا تھا۔ کیا یہ کسی بھی باپ کے لیے بالکل طبعی بات نہیں؟ پھر باپ بھی ایسا جو نبی بھی ہو اور ساری انسانیت کی ہدایت کے لئے پوری جدوجہد کرتا ہو۔ لہٰذا کیا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کی ہمیشہ کی زندگی کو بچانے کے لیے اپنے پروردگار کے سامنے گڑگڑانا طبعی، بلکہ اچھی بات نہ تھی؟ حضرت نوح علیہ السلام تو ایسے انسان تھے، جنہوں نے ساری انسانیت پر سایہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔

پھر یہ نبوی رحمت کا معاملہ تھا، جس کی وسعت کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ وسیع رحمت نہ ہوتی تو انبیائے کرام کے لیے اپنے کندھوں پر نبوت کے بوجھ کو اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔ ذرا غور فرمایئے! ایک ماں کو اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگانے اور اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وسیع رحمت وشفقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے کسی نبی یا کسی اولوالعزم رسول کو عطا کی گئی رحمت کا اندازہ لگایئے، جنہوں نے ساری بنی نوع انسانی کی تمام جائز دنیوی واخروی ضروریات کی کفالت کا بیڑا اٹھایا ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم مشرکین وکفار کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی اسی نفسیاتی کیفیت کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا﴾ (الکھف: ٦) ''اے پیغمبر اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم ان کے پیچھے رنج کر کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔'' رسول اللہ ﷺ ہمارے بارے میں اپنی کیفیت کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''میری اور میری امت کی مثال اس شخص جیسی ہے، جس نے آگ روشن کی پھر جانور اور پتنگے اس میں گرنے لگے۔ میں تو تمہیں کمر سے پکڑے ہوئے ہوں، لیکن تم ہو کہ اس میں گھسے جاتے ہو۔''(256)

یہ نبوی رحمت کا مقام ہے، چونکہ حضرت نوح علیہ السلام نبی تھے، اس لیے ان میں بھی یہ رحمت موجود تھی، لیکن جونہی انہوں نے خدائی تنبیہ سنی، فوراً اللہ کی طرف رجوع کیا اور اپنی درخواست سے دستبردار ہوتے ہوئے اپنے پروردگار سے معافی کے خواستگار ہوئے۔

اب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی دعاؤں میں پائی جانے والی مماثلت پرغور فرمائیے۔ دونوں حضرات اپنی خطا کا علم ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے حضور ملتے جلتے اسلوب میں دعاومناجات کی، جس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کا خمیر اور تخلیق ایک جیسی تھی۔ چونکہ دونوں نے ایک ہی مکتب میں ایک علام الغیوب معلم کے سامنے زانوائے تلمذ طے کیے تھے، اس لیے دونوں کا ایک جیسے انداز میں اپنی غلطی سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ اگر چہ قرآنِ کریم نے دونوں کی انابت اور رجوع کو مختلف الفاظ میں تعبیر کیا ہے، لیکن دونوں کا اسلوب ایک ہی ہے۔

سوم: ایک شرعی قاعدہ ہے: ''حکم ظاہری صورت حال کے مطابق لگایا جاتا ہے۔'' یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے نفاق کا علم ہونے کے باوجود اس کی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی، اسی طرح آپ ﷺ نے اور بھی بہت سے منافقین کی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی اور ان کا راز فاش نہ فرمایا۔[257] کیونکہ ظاہری طور پر وہ نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے اور دیگر تمام اسلامی شعائر بجالاتے تھے۔

شاید حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہو۔ ہوسکتا ہے ان کا بیٹا منافق ہونے کے باوجود بظاہر ایمان کا اظہار کرتا ہو یا اس کے نفاق کا اسی وقت سطحی طور پر اظہار ہوا ہو اور حضرت نوح علیہ السلام ظاہر پر حکم لگا کر اسے اپنے گھرانے میں شامل کر رہے ہوں۔ ظاہر کے مطابق حکم لگانا کسی بھی حالت میں گناہ نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا، بلکہ اپنی ذمہ داری ادا کی تھی۔ اس معزز نبی کا تصور تو کیجیے، جس نے اپنی قوم کی ہدایت کے لئے ساڑھے نوسو سال تک اپنی ساری توانائی خرچ کرڈالی، لیکن اس کے جواب میں اسے تمسخر واستہزاء کا نشانہ بنایا گیا اور مجنون کہا گیا، لیکن وہ کبھی بھی ہمت نہیں ہارا اور نہ ہی اس کے ارادے مضمحل ہوئے، باوجود اس کے کہ اس پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ (هود: ٤٠) ''اور ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔''

اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں جاننے کے لیے سورہ نوح کی تلاوت کرنی چاہیے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس معزز نبی اور گناہ کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا، جتنا فاصلہ زمین وآسمان کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اللہ ﷺ اور حضرت نوح علیہ السلام کی شفاعت کے ذریعے نجات عطا فرمائے۔ آمین

ج: سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء اور خلیل اللہ تھے۔ان کے دل میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔وہ اتنے عظیم انسان تھے کہ آتش نمرود بھی ان کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی۔وہ ایسی چنیدہ شخصیت تھی کہ جہاں بھی جاتی اپنے دل میں بسائی ہوئی جنت کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ساری انسانیت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے انتساب پر مسرت محسوس کرتی ہے،لیکن آپ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنی مشابہت پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:"معراج کے موقع پر جب میری انبیائے کرام سے ملاقات ہوئی تو میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔وہ تمہارے ساتھی سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔"(258) ساتھی سے آپ ﷺ کی مراد اپنی ذات سے تھی۔آئندہ صفحات میں ہم ان کی عصمت کا جائزہ لیں گے اور ان کے ہاں عصمت کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ا۔ سورج، چاند اور ستارے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ستاروں کی پرستش کی اور نہ ہی شرک کے قریب گئے۔ان کے ستاروں، چاند اور سورج کو اپنا پروردگار کہنے کا شرک سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔

اب ہم قرآن کریم کی روشنی میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں:﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَباً قَالَ هَـٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لا أُحِبُّ الآفِلِينَ ()فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغاً قَالَ هَـٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لأكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ()فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَـٰذَا رَبِّي هَـٰذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾(الأنعام: ٧٦-٧٨)"جب رات نے ان کو (پردہ تاریکی سے) ڈھانپ لیا تو (آسمان میں) ایک ستارہ نظر پڑا، کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے،لیکن جب وہ بھی چھپ گیا تو بول اٹھے کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا رستہ نہیں دکھائے گا تو میں ان لوگوں میں ہو جاؤں گا، جو بھٹک رہے ہیں پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے میرا پروردگار یہ ہے۔یہ سب سے بڑا ہے،مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے:لوگو!جن چیزوں کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدائشی طور پر حنیف تھے، اس لیے ان سے سورج، چاند اور ستاروں کو حقیقی معنی میں اپنا پروردگار کہنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا وہی شخص سوچ سکتا ہے، جو جان بوجھ کر اس آیت کے سیاق وسباق کو نظر انداز کر دے ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (الأنعام: ٧٤) ''اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تم کیا بتوں کو معبود بناتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہو۔''

﴿وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ﴾ (الأنعام: ٧٥) ''اور ہم اس طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے تا کہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں ہو جائیں۔''

لہٰذا من گھڑت قصوں سے بھری ہوئی کتابیں چاہے کچھ بھی کہیں، عالم غیب سے اس قدر مضبوط قلبی تعلق رکھنے والے نبی سے کچھ دیر کے لیے بھی ستاروں کو اپنا معبود کہنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، مزید برآں اللہ تعالیٰ نے انہیں نہ صرف زمین وآسمان کی بادشاہت دکھائی، بلکہ انہیں ملکوت یعنی ظاہری عالم کے پردوں کے پیچھے موجود عالم کا مشاہدہ بھی کرایا، جس کے نتیجے میں انہیں نہ صرف ایمانِ یقینی کا درجہ حاصل ہوا، بلکہ وہ اس کے آخری مقام حق الیقین تک پہنچ گئے، لہٰذا گزشتہ آیات مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایمانِ یقینی کے مقام پر فائز تھے اور اس واقعے سے وہ اپنی قوم پر بعض حقائق آشکار کرنا چاہتے تھے۔

جس طرح عرب دورِ جاہلیت میں دوسرے ستاروں سے زیادہ درخشاں اور نمایاں ہونے کی وجہ سے 'شعریٰ' ستارے کی پرستش کرتے تھے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی ستارہ پرست تھی۔ بابل کے قدیم باشندے ستاروں کو پوجتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دور سے چھوٹا سا دکھائی دینے والے ایک ستارے کو دیکھ کر اپنے گرد موجود لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی اور پھر ان کی ذہنی سطح کے لحاظ سے ایک چھوٹی سی مگر حقیقت پر مبنی تنبیہ فرمائی۔ آپ کی گفتگو بالکل درست تھی اور جھوٹ کے شائبہ سے بھی پاک تھی۔ آپ علیہ السلام اپنی ہر دلیل کے ذریعے ان کے ایک آسمانی خدا اور زمین پر اس کے نمائندے کا ابطال کرتے۔[259] انہوں نے اپنی گفتگو کے ذریعے یکے بعد دیگران کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ یہ ان کا فرض منصبی تھا۔

بعض مفسرین نے "هذا ربی" کے جملے کے شروع میں ہمزہ استفہام محذوف مان کر اسے استفہام انکاری قرار دیا ہے۔(260) اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؟ جس کا منطقی جواب یہی تھا کہ ہرگز نہیں، یہ میرا معبود نہیں۔ یہ ایک تفسیر ہے، تاہم ہمارے نزدیک پسندیدہ تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی قوم کے معبودوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اپنی قوم کو مباحثے کی ایک خاص سطح پر لانے کے لیے انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی۔ ان کے سامنے اس کے سوا کوئی حل نہ تھا۔ ان کی قوم نے یہ دیکھ کر کہ وہ ان کے معبودوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں ان کی بات پر کان لگائے، لیکن جب ان کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان مباحثہ اپنے اختتام کو پہنچا تو ایمانی لشکر کو کفر وشرک کی فوج پر فتح حاصل ہو چکی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو سورج چاند اور ستاروں کا مشاہدہ کرایا اور انہیں دکھایا کہ یہ سارے ڈوبنے والے ہیں۔ یہ سارے کے سارے طلوع ہو کر آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہیں اور بالآخر غروب ہو جاتے ہیں۔ جو چیز مخصوص قوانین کے تحت وجود میں آکر بڑی ہوتی ہے اور پھر غروب ہوتی ہے، وہ کائنات پر فرمانروائی نہیں کر سکتی۔ ایک حادث چیز اپنی جیسی حادث چیز پر کیسے حکومت کر سکتی ہے؟ انہوں نے اپنی قوم سے سب پہلے یہ کہا: ﴿لا أحب الآفلين﴾ "مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔" یہ پہلی تنبیہ تھی کہ دل میں ڈوبنے اور غروب ہونے والوں کے لیے جگہ نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی غروب ہونے والے لائق اتباع ہوتے ہیں، کیونکہ وہ غروب ہو کر چھپ جاتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا حبیب دو، جس پر زوال نہ آئے، جو میری ذات سے خود مجھ سے بھی قریب تر ہو، جو میرے دل کی دھڑکنوں اور خواہشوں سے واقف ہو اور انہیں پورا کرنے پر قادر ہو۔

اگلے مرحلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں چاند دکھاتے ہیں، لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ بھی غروب ہو جاتا ہے، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک لطیف اشارے کے ذریعے انہیں ان کی گمراہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں: ﴿لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ﴾ (الأنعام:۷۸) "اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا رستہ نہیں دکھائے گا تو میں ان لوگوں میں ہو جاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں۔"

تیسرے مرحلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سب سے بڑے معبود سورج کو دیکھا۔ انہوں نے دو چھوٹے معبودوں کو گرانے سے آغاز کیا تھا اور اب ان کے سب سے بڑے معبود کی باری تھی، لہٰذا جب وہ بھی غروب ہو گیا تو انہوں نے اپنی قوم کے ضمیر کو جھنجوڑتے ہوئے فرمایا: ﴿انی

برئ مماتشر کون ﴾ (الأنعام:۷۹) ''جن چیزوں کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔''

اب آخری ضرب لگانے کا وقت آ چکا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے گرم جوش الفاظ میں کہا: ﴿إِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِیْفاً وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (الأنعام:۷۹) ''میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا، جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ بات آغاز میں ہی کہہ دیتے تو ان کی بات کوئی بھی نہ سنتا، لیکن آپ علیہ السلام نے ان کے حالات اور ذہنی سطح کی رعایت کرتے ہوئے ان سے بتدریج گفتگو فرمائی، جس کے نتیجے میں وہ آپ کی گفتگو غور سے سننے لگے۔ اگر آپ علیہ السلام بتدریج گفتگو نہ فرماتے تو کوئی آپ کی گفتگو سننے کے لیے تیار ہوتا اور نہ ہی آپ علیہ السلام کسی کو متاثر کر پاتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے ہر ہر فرد پر ''لا الہ الا اللہ'' کی حقیقت آشکار کرنے کے لیے اپنی فراست سے یہ طریق کار اختیار کیا۔ یہ انداز گفتگو مکمل طور پر قرآنی انداز گفتگو سے ہم آہنگ ہے، کیونکہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور دونوں ایک ہی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہاں میں آپ کی توجہ ایک اہم نقطے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام فرماتے ہیں: ﴿إِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ﴾ (الأنعام:۷۸) ''جن چیزوں کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو، میں ان سے بیزار ہوں۔''

یہ جملہ اسمیہ ہے اور عربی زبان میں جملہ اسمیہ استمرار کا فائدہ دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں تمہارے معبودوں سے پہلے بھی بری تھا اور اب بھی بری ہوں، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کسی قول وعمل میں شرک کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ آپ علیہ السلام کی تعبیرات آپ کی عمدہ حکمت عملی کا ایک اہم مرحلہ تھیں۔ حاصل یہ کہ آپ علیہ السلام کی گفتگو میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی، جس سے آپ کی عصمت پر زد پڑتی ہو۔

۲- مُردوں کو زندہ کرنا

ایک دوسری بات جسے ان کی لغزش سمجھا جاتا ہے، وہ ان کا اپنے پروردگار سے مُردوں کو زندہ

کرنے کا مطالبہ کرنا ہے۔ قرآن کریم اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ (البقرہ: ۲۶۰) ''اور جب ابراہیم نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا؟ خدا نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، لیکن (میں دیکھنا) اس لیے (چاہتا ہوں تاکہ) میرا دل اطمینان کامل حاصل کرلے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایمان وروح کے میدان کے عظیم شہسوار تھے، جو ہمیشہ مزید کی جستجو میں رہتے اور ان کا دل مزید معرفت الٰہیہ کی تلاش میں بے قرار رہتا، یہی وجہ تھی کہ ہم انہیں مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا مشاہدہ کرکے معرفت کے نئے آفاق تک رسائی پانے کے لیے بے تاب دیکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں مردوں کو زندہ کرنے کی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ کہنے کی بجائے کہ کیا آپ مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں؟ یہ کہا تھا: ''آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی درخواست کو قبول فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ چار پرندوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ مانوس کریں اور پھر انہیں ذبح کرکے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کریں اور ہر پہاڑ پر ان میں سے ہر ایک کا ایک ٹکڑا رکھ کر انہیں اپنے پاس بلائیں۔ آپ علیہ السلام کے بلانے پر وہ پرندے آپ علیہ السلام کے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ قرآن کریم اس واقعے کی یوں منظرکشی کرتا ہے: ﴿قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا﴾ (البقرۃ: ۲۶۰) ''خدا نے فرمایا کہ چار جانور پکڑ کر اپنے پاس منگالو (اور ٹکڑے ٹکڑے کرادو) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔''

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے انہیں مردوں کو زندہ کرنے کی مثالوں میں سے جو ہر سال موسم بہار میں ہزاروں بار وقوع پذیر ہوتی ہیں، صرف ایک مثال دکھائی تھی، تاہم اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خصوصی تحفے کی صورت میں پیش کرکے اپنے انبیاء میں سے ایک عظیم نبی کا اعزاز فرمایا، تاکہ وہ ایمانِ یقینی کے درجے کو پالیں اور ایمان کے چشمے سے سیراب ہوکر اطمینان کے مقام پر فائز ہوجائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میٹھے چشمے سے چلو بھر بھر کے پیتے جاتے، لیکن ان کی پیاس کم نہ ہوتی۔ ان کا یہ مطالبہ کسی

شک وشبہ یا تردد کا نتیجہ نہ تھا، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہیں یا نہیں؟ ان کی یہ درخواست ایسے ہی تھی جیسے آپ کسی بہت بڑے ماہر فنونِ لطیفہ سے کہیں: ''مجھے آپ پینٹنگ کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھنے کا موقع دیجیے۔'' یا جیسے آپ کسی بڑے خوش نویس سے کہیں: ''آپ میرے سامنے خطاطی کیجیے تاکہ میں آپ کو خوبصورت تحریر لکھتے ہوئے دیکھ سکوں۔'' اس قسم کی درخواست میں مخاطب کو عاجز کرنے کا کوئی پہلو شامل نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس کے فن میں دلچسپی کا اظہار اور اس کا اعتراف کرنے کا ایک انداز ہے، نیز یہ اس کے فن کی باریک باتیں سمجھنے اور مرحلہ وار وجود میں آنے والے ایک عمدہ منظر کی تصویر کشی کی کیفیت میں غور وفکر کرنے کی عظیم سعادت کے حصول کی خواہش کا اظہار ہے، یہی وجہ تھی کہ سوال مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کے بارے میں تھا نہ کہ اس کے امکان یا عدم امکان کے بارے میں۔

سید قطب اس موقع پر لکھتے ہیں: ''یہ قدرت الٰہیہ کی کاریگریوں تک رسائی کا ایک شوق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو نہایت ہی حلیم الطبع، راضی برضا، صاحب خشوع، عبادت گزار اور خدا کے مقرب اور دوست تھے کی جانب سے اس خواہش کا اظہار دراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بعض اوقات اللہ کے برگزیدہ اور انتہائی مقرب بندوں کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی کاریگریوں کے راز ہائے بستہ تک رسائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

اس خواہش کا تعلق ایمان کی موجودگی، مضبوطی، کمال اور ثبات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ یہ کسی دلیل یا قوتِ ایمانی میں اضافے کا مطالبہ نہ تھا۔ یہ ایک اور چیز ہے، جس کا اپنا ذوق ہے۔ یہ امرِ الٰہی کو عملاً وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھنے کا روحانی شوق ہے اور انسانی وجود میں اس تجربے کا ذوق ایمان بالغیب کے ذوق سے مختلف ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار سے اور ان کا پروردگار ان سے ہم کلام ہے، جس سے بڑھ کر کوئی ایمان ہے اور نہ ایمان کی کوئی دلیل، لیکن اس کے باوجود انہوں نے دست قدرت کو کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہا، تاکہ ان کے ذوق کی تسکین ہو اور وہ اس کے ہم نفس بن کر اس میں گھل مل جائیں۔ یہ ایمان کے آخری درجے کے ماسوا ایک اور چیز ہے۔''(261)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مقام کے شایاں ایمان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بعض اوقات ان پڑھ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کے محدود آفاق سے ماورا کوئی چیز ہے اور نہ ہی اس کے اختیار کردہ راستے سے بہتر کوئی راستہ ہے۔ کیا محی الدین ابن عربی نے حالت سکر میں یہ نہ کہا تھا کہ خاتم الانبیاء خاتم الاولیاء کے سامنے زانوائے تلمذ طے کرتا ہے؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کی عقل ان کی حیثیت کے مطابق

بنائے گئے گنبد میں محصور تھی اور جب وہ اپنے لیے مخصوص دروازے سے گزرنے لگے تو دروازہ ان پر تنگ پڑ گیا۔ ایک بہت بڑے محل کے مقابلے میں یہ دروازہ بہت چھوٹا تھا۔ یہ دروازہ اس محل کے ایک چھوٹے سے کمرے کے دروازے جتنا تھا، لیکن حضرت ابرہیم علیہ السلام جس دروازے سے داخل ہوئے تھے، وہ ایک بہت بڑی فصیل اور عظیم شہر کا دروازہ تھا اور ان کا گنبد آسمان تھا، جس میں آپ کو سورج، چاند اور ستاروں تک رسائی حاصل تھی، لہٰذا بڑے سے بڑے ولی کی معرفت کا افق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔ ہم تو پانی کے ایک پیالے سے سیراب ہو جاتے ہیں، لیکن آپ علیہ السلام کی علمی پیاس بجھانے کے لیے سمندر بھی ناکافی تھا، یہی وجہ تھی کہ اس قدر وسعت قلبی کی مالک یہ شخصیت جب بھی اپنے پروردگار کی کوئی دلیل یا نشانی دیکھتی تو محبت سے زار و قطار رونے لگتی۔

حضرت شمس تبریزی نے حضرت جلال الدین رومی سے پوچھا تھا: ''کیا حضرت محمد ﷺ بڑے ہیں، جنہوں نے فرمایا تھا: ''اے اللہ ہم آپ کو اتنا نہ پہچان سکے جتنا آپ کو پہچاننے کا حق ہے۔'' یا حضرت بایزید بسطامی بڑے ہیں، جو کہا کرتے تھے: ''میں کتنا پاک ہوں اور میری شان کس قدر بلند ہے۔'' حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بڑا حیران کن جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''ہم ان دو مقولوں سے ہی بسطامی پر حضرت محمد ﷺ کی لامحدود فوقیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس سمندر کی مانند تھے، جس کا بھرنا کبھی ممکن نہیں، جبکہ بسطامی اس پیالے کی مانند تھے، جو فوراً بھر کر بہنے لگا۔''(262)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام معرفت خداوندی سے سیرابی کی کسی حد سے واقف نہ تھے۔ وہ ہمیشہ مزید کی جستجو میں رہتے اور اپنے پروردگار کی مزید معرفت مانگتے رہتے، یہی وجہ ہے کہ بخاری و مسلم میں مروی ایک حدیث میں آپ علیہ السلام فرماتے ہیں: ''ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کرنے کے زیادہ حق دار ہیں۔''(263) یعنی جب ہم مردوں کے زندہ کیے جانے کے بارے میں شک نہیں کرتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام تو بدرجہ اولیٰ اس قسم کے شک وشبہے سے پاک ہوں گے۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین کنایات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی تین دروغ گوئیوں یا زیادہ درست الفاظ میں تین کنایات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ جھوٹ کبیرہ

گناہ ہے، اس لیے کسی نبی کی زبان سے جھوٹ کا نکلنا اس کی عصمت اور قابل بھروسا ہونے میں مخل ثابت ہوتا ہے۔ کسی بھی صاحب ایمان سے جھوٹ کا صدور ممکن نہیں۔

رسول اللہ ﷺ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''حضرت ابراہم علیہ السلام نے صرف تین مواقع پر جھوٹ بولا۔''(264) یہاں جھوٹ اپنے معروف مفہوم کی بجائے کنایہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بظاہر لغوی پہلو سے یہ توجیہ تکلف معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر اس تعبیر پر غور کریں تو مفہوم کے اعتبار سے یہ توجیہ بالکل درست ہے، کیونکہ حقیقی جھوٹ کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرنا ممکن نہیں، لہٰذا یہاں جھوٹ کا لغوی معنی مراد نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے لیے ہم ''کنایہ'' کی تعبیر اختیار کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ بعض اوقات مزاح بھی فرماتے تھے، لیکن مزاح میں بھی آپ ﷺ حق بات ہی ارشاد فرماتے، مثلاً آپ ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مزاحاً فرماتے: ''اے دو کانوں والے!''(265) یقیناً حضرت انس رضی اللہ عنہ دو کانوں والے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک خاتون سے گفتگو کرتے ہوئے پوچھا: ''کیا تم اس شخص کی بیوی ہو، جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے؟'' اس خاتون نے عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ میرے شوہر کی آنکھوں میں تو سفیدی نہیں ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''ہر آنکھ میں سفیدی ہوتی ہے۔'' ایک مرتبہ ایک خاتون آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: ''یارسول اللہ! دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمائیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ام فلاں! جنت میں بوڑھی عورتیں داخل نہیں ہوں گی۔'' یہ سن کر وہ خاتون روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے بتاؤ کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاء () فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَاراً ﴾ (الواقعة: ٣٥-٣٦)(266) ''ہم نے ان کو پیدا کیا تو ان کو کنواریاں بنایا۔''

نبی اکرم ﷺ مزاح میں بھی بہت اچھے الفاظ کا انتخاب فرماتے تھے۔ انبیائے کرام کا مقام انہیں مزاح میں بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ وہ ساری انسانیت کے لیے نمونہ اور اسوۂ حسنہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ مزاح میں جھوٹ بولیں گے تو لوگ سنجیدگی میں جھوٹ بولنے لگیں گے، لہٰذا کسی بھی نبی کا کسی برے کام کا نمونہ بننا ممکن نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدائشی طور پر حنیف اور بتوں کے دشمن تھے۔ آپ علیہ السلام ان کے

سامنے ڈٹ گئے، ان کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور بعثت سے پہلے بھی بت پرستی کے خلاف برسرپیکار رہے، یہاں تک کہ وہ دن آ پہنچا جب انہوں نے تمام بتوں کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی عادت تھی کہ وہ مستقبل کے حالات جاننے کے لیے ستاروں کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ ان کے عقائد کے مطابق معبود آسمان میں ستاروں پر رہتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ستارے انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو قائل کرنے اور اپنے مقصد کو پانے کے لیے ستاروں کی طرف دیکھا، لیکن اس بارے میں ان کی سوچ اپنی قوم کو سوچ سے بالکل مختلف تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''میں بیمار ہوں۔'' یہ ان کا پہلا جھوٹ یا زیادہ درست لفظوں میں پہلا کنایہ تھا۔ ابھی ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ انہوں نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ دوسرا کنایہ انہوں نے اس وقت استعمال فرمایا جب انہوں نے سارے بتوں کو توڑ کر سب سے بڑے بت کی گردن پر کلہاڑا لٹکا دیا اور جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ ہمارے بتوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا تو انہوں نے فرمایا: ''یہ ان میں سے سب سے بڑا ہے۔ اس سے پوچھو۔''

تیسری بات جس کا تعلق ان کی زوجہ سے تھا کو قرآن کریم نے ذکر نہیں کیا۔ آپ علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے فرمایا تھا کہ اگر کوئی تم سے تمہارے بارے میں پوچھے تو اسے بتانا کہ میں اس کی بہن ہوں۔''(267)

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین کنایات ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم ان پر تفصیلی گفتگو کریں گے تاکہ واقعات کی اصل حقیقت معلوم ہونے کے بعد ہم آپ علیہ السلام کی عصمت کی حقیقت جان سکیں۔

الف: ''میں بیمار ہوں۔''

قرآن کریم پہلے واقعے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ () إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ () إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ () أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ () فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ () فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ () فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ () فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ()﴾ (الصفات: ۸۳-۹۰) ''اور انہی کے پیروں میں ابراہیم تھے۔ جب وہ اپنے پروردگار کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کن چیزوں کو پوجتے ہو؟ کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب ہو۔ بھلا پروردگار عالم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی اور کہا میں تو بیمار

ہوں تب وہ ان سے پیٹھ پھیر کر لوٹ گئے۔“ ”میں بیمار ہوں۔“ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصود اپنی بے چینی کے اصل سبب کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ بت ان کے حزن والم کا باعث تھے۔انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے جب تک وہ ان بتوں کو نہیں توڑیں گے، اس وقت تک وہ راحت کا مزہ نہ چکھ سکیں گے اور جب آپ علیہ السلام نے اپنے گرد موجود لوگوں کے اپنے ساتھ مذہبی تہوار میں شرکت کے اصرار پر ان سے کہا کہ میں بیمار ہوں تو وہ آپ علیہ السلام کو جسمانی لحاظ سے بیمار سمجھ کر واپس چلے گئے، لیکن جونہی وہ لوگ نکلے آپ علیہ السلام اپنی بیماری کے حقیقی سبب بتوں کو توڑنے کے لیے دوڑ پڑے، تاہم اپنی قوم کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ایسا کنایہ استعمال کیا کہ وہ آپ علیہ السلام کا حقیقی مقصود نہ جان سکی، لیکن آپ علیہ السلام اپنی گفتگو میں جھوٹ کی طرف ذرا بھی مائل نہ ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات تھی کہ ان کی قوم ان کے حقیقی مقصود کو نہ سمجھ سکی اور حق کو سننے سے بہری قوم سے ایسا ہونا بعید بھی نہ تھا اور یہی ان کی غلطی کا سرچشمہ تھا۔

اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقعہ پر کنایہ کا استعمال کیا تھا، لیکن وہ اتنے مستقیم المزاج انسان تھے کہ انہیں اس کنایے کے استعمال سے بھی اس قدر کوفت ہوئی کہ وہ قیامت کے دن اس کے یاد آنے پر اپنے پاس شفاعت کی غرض سے آنے والے لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھیج دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: ”آپ دنیا میں اللہ کے نبی اور خلیل تھے۔آپ اپنے پروردگار سے ہمارے حق میں شفاعت کریں۔“ وہ اپنے جھوٹوں (کنایات) کو یاد کر کے کہیں گے: ”نفسی، نفسی، موسیٰ کے پاس جاؤ۔“ (268)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ مثلاً ”میں بیمار ہوں۔“ کا کنایہ استعمال فرمایا۔اب ذرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد اور بزعم خود خدام اسلام کہلانے والوں کے دعوؤں کا موازنہ کیجئے تاکہ آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشادات کی براءت کا اندازہ ہو۔

آج سچ اور جھوٹ میں تذبذب آسان اور جھوٹ عام ہو چکا ہے، اس لیے اب کنایہ کے استعمال سے بھی احتراز کرنا چاہیے، بلکہ ان تین مواقع سے بھی بچنا چاہیے، جہاں نبی کریم ﷺ نے جھوٹ کی اجازت دی ہے۔(269) اس کی وجہ یہ ہے کہ دورِ نبوی میں سچ اور جھوٹ کے درمیان وسیع خلیج حائل تھی۔ صحابہ کرام سچائی کے علمبردار تھے اور مسیلمہ اور اس کے پیروکار جھوٹ کے نمائندے تھے۔ یہ خلیج پہلے موجود تھی، لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔

حق کے نمائندوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ سکون اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ پہلی شرط ہے۔ ضروری ہے کہ ہم جھوٹ سے دور رہیں۔ جب ہم اس بارے میں اس قدر حساسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس بارے میں انبیائے کرام خصوصاً نبی اکرم ﷺ کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حساسیت کا خود اندازہ لگا لیجیے، جن سے ہم نے سچائی سیکھی ہے۔

ب: بل فعله

دوسرا کنایہ حسبِ ذیل ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِه عَالِمِينَ () إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ () قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ () قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ () قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ () قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَى ذَلِكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ () وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ () فَجَعَلَهُمْ جُذَاذاً إِلَّا كَبِيراً لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ () قَالُوا مَن فَعَلَ هَذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ () قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ () قَالُوا فَأْتُوا بِهِ عَلَى أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ () قَالُوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هَذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ () قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ﴾ (سورة الأنبياء: ٥١-٦٣)

"اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی ہدایت دی تھی اور ہم ان (کے حال) سے واقف تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں، جن (کی پرستش) پر تم معتکف (وقائم) ہو؟ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ (ابراہیم نے) کہا کہ تم بھی (گمراہ ہو) اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس (واقعی) حق لائے ہو یا (ہم سے) کھیل (کی باتیں) کرتے ہو۔ (ابراہیم نے) کہا (نہیں) بلکہ تمہارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں اس (بات) کا گواہ (اور اسی کا قائل) ہوں اور خدا کی قسم! جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔ پھر ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا، مگر ایک بڑے (بت) کو (نہ توڑا) تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ کہنے لگے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ کس نے کیا؟ وہ تو کوئی ظالم ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے، اسے ابراہیم کہتے ہیں۔ وہ بولے کہ اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہ رہیں۔ (جب ابراہیم آئے تو بت پرستوں نے) کہا کہ بھلا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ تو نے کیا ہے؟

(ابراہیم نے) کہا: بلکہ یہ ان کے ان بڑے (بت) نے کیا(ہوگا)۔اگر یہ بولتے ہوں تو ان سے پوچھ لو۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا گیا: ﴿ ءَأَنتَ فَعَلْتَ هَذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ ﴾ اس کے جواب میں انہوں نے ارشاد فرمایا: ﴿ بَلْ فَعَلَهُ ﴾ اور اس کے بعد سکوت اختیار فرمایا۔قرآن کریم میں یہاں علامت وقف ہے، جس کا مقصد یہی ہے کہ تلاوت کرتے ہوئے یہاں وقف کیا جائے۔فعلہ میں موجود ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے،لیکن انہوں نے اپنی گفتگو کی مہارت سے لوگوں کی توجہ بڑے بت کی طرف مبذول کرادی۔حقیقت میں انہوں نے دو علیحدہ علیحدہ جملے بولے تھے،لیکن ان کی ادائیگی ایسے طریقے سے کی کہ سننے والوں کو وہ ایک ہی جملہ لگا، جس کے نتیجے میں وہ آپ علیہ السلام کے حقیقی مقصود کو نہ سمجھ سکے۔پہلا جملہ ہے: ﴿ بَلْ فَعَلَهُ ﴾ اور دوسرا جملہ ہے: ﴿ كَبِيرُهُمْ هَذَا ﴾ لیکن آپ علیہ السلام نے ان کی ادائیگی ایسے طریقے سے کی کہ سننے والوں کو یہ ایک ہی جملہ ﴿ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا ﴾ لگا۔جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ﴿ كَبِيرُهُمْ هَذَا ﴾ کہا تو اس میں کنایہ کے ساتھ ساتھ کفر اور بت پرستی پر لطیف پیرائے میں طنز بھی تھا،لیکن ان کے ذہن بتوں کے خیال میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ وہ اس طنز کو بھی نہ سمجھ سکے۔چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت کی طرف "کبیر" (بڑے) کے لفظ سے اشارہ کیا تھا،اس لیے وہ آپ علیہ السلام کے ارادے اور نیت کو نہ سمجھ پائے۔بت پرستی،فکری جمود اور نور الٰہی سے محروم ذہن اور دل ہلاکت کے مستحق ہیں۔

ج: "وہ میری بہن ہے۔"

تیسرے واقعے میں تو جھوٹ کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، بلکہ اس پر تو کنایہ کا اطلاق بھی درست نہیں۔آپ علیہ السلام کی گفتگو بالکل درست اور سچی تھی، کیونکہ آپ علیہ السلام نے اپنی بیوی حضرت سارہ سے فرمایا تھا کہ اگر نمرود اور اس کے کارندے اس سے پوچھیں تو وہ ان سے کہے: "میں اس کی بہن ہوں۔" اور اگر وہ حضرت ابراہیم سے اس کے بارے میں پوچھتے تو وہ فرماتے: "وہ میری بہن ہے۔" اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے کہ وہ میری بیوی ہے تو وہ لوگ اس پر دست درازی کرتے اور آپ علیہ السلام اور آپ کی زوجہ محترمہ شدید مشکلات کا شکار ہو جاتے، بلکہ ہوسکتا ہے انہیں اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کر رخت سفر باندھنا پڑتا،مزید برآں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو حقیقت کے عین مطابق تھی، کیونکہ ارشاد خداوندی: ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ (الحجرات: ۱۰) "مومن تو

آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' کی رو سے تمام اہلِ ایمان اخوت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ایمان سب سے پہلا رشتہ ہے، جو انسان کو دوسروں سے جوڑتا ہے اور اس رشتے کی عدم موجودگی میں ایک ماں باپ کی اولاد بھی آپس میں بھائی بھائی نہیں سمجھے جاتے۔زمان و مکان کا اختلاف ایمانی بھائیوں کے درمیان حائل نہیں ہوسکتا۔مؤمن مرد اور مومن خواتین بلاتفریقِ جنس اخوت کے رشتے سے منسلک ہیں۔باہمی قربتوں کے باقی سارے نقاط کا درجہ اس اخوت کے بعد آتا ہے، لیکن ایمان کا رشتہ پھر بھی برقرار رہتا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی رشتے اور تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کو اپنی بہن کہا تھا اور یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی تھی حتیٰ کہ اسے کنایہ بھی نہیں کہا جاسکتا، تاہم دل اور عقل کے اندھوں کو یہ بات کب سمجھ میں آنے والی تھی؟ اس ساری بحث سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

(۲) انبیائے کرام کے نقشِ پا اور راستے پر چلنے والوں کو چاہیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ جھوٹ نہ بولیں، بلکہ اس کے قریب بھی نہ جائیں۔حقیقی مؤمن کی نظر اگر کسی حرام منظر پر پڑ جائے یا اس کی زبان پر ایک دفعہ بھی کوئی جھوٹی بات آجائے تو اس کا ضمیر عمر بھر کرب و الم میں گرفتار رہتا ہے، بلکہ حزن و ندامت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔مرشد حضرات کو چاہیے کہ وہ چاہے کسی بھی مقام پر پہنچ جائیں، ساری زندگی انحراف سے بچتے ہوئے استقامت کے ساتھ گزاریں۔

۴- اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت

اب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس لغزش کا جائزہ لیتے ہیں، جو اُن سے اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی وجہ سے صادر ہوئی تھی۔آپ علیہ السلام نے کھلی گمراہی میں مبتلا اپنے والد کے لیے کیوں دعائے مغفرت کی؟ کیا ان جیسے نبی کے لیے صرف اپنی رسالت پر ایمان لانے والوں پر اکتفا کرنا بہتر نہ تھا؟ پھر انہوں نے اپنے والد کے بارے میں اس قدر اصرار کیوں کیا؟ کیا یہ ان کی خطا تھی؟ ہم ایک معصوم نبی کی طرف خطا کی نسبت کیسے کرسکتے ہیں؟ اور اگر ان سے اس موقع پر غلطی ہوئی تھی تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ دیگر مواقع پر ان سے غلطی نہیں ہوئی؟ ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں؟ اور کیا ہم یہ بات جاننے کے بعد اطمینانِ خاطر کے ساتھ انبیائے کرام کی پیروی کرسکتے ہیں؟

یہ وہ بنیادی شبہ ہے، جسے ماضی کے ملاحدہ نے اٹھایا تھا اور آج جدت پسندی کے بعض

علمبردار بھی اسے دہراتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا تھا: ﴿وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ﴾ (الشعراء:٨٦) ''اور میرے باپ کو بخش دے کہ وہ گمراہوں میں سے ہے۔'' قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے سبب کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ﴾ (التوبة:١١٤) ''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کا مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا، جو وہ اس سے کر چکے تھے، لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔ کچھ شک نہیں کہ ابراہیم بڑے نرم دل اور متحمل تھے۔''

قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے والد کے ساتھ وعدہ کرنے کے واقعے کو یوں بیان کرتا ہے: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَاؤُا مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ رَّبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ (الممتحنة:٤) ''تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقا کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں۔ (اور) تمہارے (معبودوں کے کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ، ہم میں اور تم میں ہمیشہ کھلم کھلا عداوت اور دشمنی رہے گی۔ ہاں ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اور میں خدا کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور ہمیں لوٹ کر آنا ہے۔''

ان آیات مبارکہ میں ایمان اور کفر کے درمیان ابدی عداوت کے پائے جانے کی واضح دلالت موجود ہے۔ کفر کی فطرت میں ایمان کے خلاف ابدی عداوت پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کافر کے دل میں مسلمانوں کے خلاف عداوت مخفی ہوتی ہے اور اس کے دل میں کسی مسلمان کی محبت کا پایا جانا ممکن نہیں۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کی گمراہی کا تذکرہ موجود ہے، لیکن یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں کسی نقص کا باعث نہیں، اس لیے کہ ممکن ہے رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد میں سے بھی بعض تک نورِ توحید نہ پہنچا ہو۔ عقیدۂ توحید کے بارے میں عبدالمطلب، ہاشم اور لؤی وغیرہ کے موقف کی کسی کو خبر نہیں، تاہم ہمیں اتنا یقین ہے کہ چونکہ یہ حضرات ''زمانہ

فترت''میں گزرے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ اسی بنیاد پر معاملہ ہوگا، لیکن اس کے باوجود ان میں سے کسی میں کسی نقص کا پایا جانا رسول اللہ ﷺ کے انسانیت تک پیغام رسالت پہنچانے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے۔

اول: آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے واضح گمراہی میں مبتلا قرار دیتے تھے، لیکن اس سے ان کی نبوت پر آنچ نہیں آتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات آزر سے حضرت ابراہیم جیسے انسان اور حضرت نوح علیہ السلام سے کنعان جیسے شخص پیدا فرماتے ہیں۔ بعض اوقات شیطان صفت لوگوں سے فرشتہ سیرت انسان پیدا ہوتے ہیں اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مردہ چیز سے زندہ کو اور زندہ چیز سے مردہ کو پیدا فرماتے ہیں۔ اس کی قدرت ہر چیز پر محیط ہے اور کوئی بھی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے آزر جیسے مردہ شخص سے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے زندہ انسان کو پیدا فرمایا، جو لوگوں کو نئی زندگی عطا کرتے تھے اور انہیں دو سنہری سلسلوں کا باپ بنایا۔ ان کے دو بیٹے نبوت سے سرفراز ہوئے۔ ان کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں نبوت کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر رک گیا، لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں نبوت کا سلسلہ رسول اکرم ﷺ تک جاری رہا۔

دوم: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے دعا کرنا بالکل انسانی اور فطری رویہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے چچا ابوطالب کو کلمہ توحید کی دعوت دیتے ہیں، ان کی ہدایت کی حسرت کرتے ہیں اور ان کی وفات کے بعد فرماتے ہیں: ''بخدا جب تک مجھے روکا نہ گیا اس وقت تک میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا۔''(270) حالانکہ آپ ﷺ کے چچا نے چالیس برس تک آپ ﷺ کی معاونت کی تھی اور آپ کی خاطر ہر قسم کی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کی تھیں حتیٰ کہ جب قریش نے مسلمانوں کے ساتھ قطع تعلقات کا اعلان کیا اس وقت بھی انہوں نے آپ ﷺ کو تنہا نہ چھوڑا۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کا عمر بھر اپنی حفاظت اور مدد کرنے والے چچا کی ہدایت کی حسرت کرنا بالکل طبعی اور فطری بات تھی، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت کرنا بالکل فطری بات تھی، کیونکہ آخر وہ ان کے وجود کا سبب تھا اور اس نے ان کی پرورش کی تھی، نیز دین کی بھی تعلیم ہے کہ والدین کا عقیدہ کچھ بھی ہو، اولاد انہیں اف تک نہ کہے۔(271)

سوم: تبلیغ انبیائے کرام کی زندگی کا مقصد تھا، لیکن ہدایت ان کے دائرہ اختیار سے خارج تھی۔ ان کا فرض ہمیشہ حق اور حقیقت کی تبلیغ کرنا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر جائز وسیلہ استعمال کرنا تھا، یہی

وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قبولِ ہدایت کی خاطر اپنے والد کے دل کو نرم کرنے کی پوری کوشش فرماتے، چنانچہ ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت اسی مقصد کے لئے ہو، خصوصاً جبکہ دعا ہدایت کا ایک اہم وسیلہ ہے اور کسی بھی شخص کی ہدایت سے ناامید ہونا درست نہیں، کیونکہ باوجود اس کے کہ آیت مبارکہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (البقرة:٦) ''جو لوگ کافر ہیں، انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' اس بارے میں صریح ہے کہ بعض کفار ہرگز ہدایت نہ پائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجہل، ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط جیسے ہٹ دھرم کفار کی ہدایت کے لیے بارہا کوشش کی اور انہیں بارہا ہدایت کی طرف دعوت دی، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے والد کی ہدایت کے لیے دعا سمیت ہر وسیلہ استعمال کیا۔ ان کے اللہ تعالیٰ سے اپنے والد کے لیے گڑگڑا کر دعا کرنے کا یہی سبب تھا، کیونکہ انہیں ایمان کا مقام اطمینان حاصل تھا، تاہم جونہی انہیں مشیت خداوندی کا علم ہوا وہ فوراً دعا سے باز آ گئے اور معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اس راستے پر چل پڑے، جس کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ سے آملتا ہے اور انہیں انسانیت تک پیغام رسالت پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اپنی قوم کو تبلیغ کرنا ان کی ذمہ داری تھی اور اس سے ان کے والد کے استثناء کی کوئی وجہ نہ تھی اور اگر اس کے ساتھ فطری میلان کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان کا بیک وقت بیٹا اور نبی ہونا اپنے باپ کی ہدایت کی خاطر جدوجہد کرنے پر اصرار کا باعث تھا۔ قرآن کریم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے والد کی ہدایت کی کس قدر حسرت و رغبت تھی اور وہ اس کی طرف سے پیش آنے والی ہر وقت کی خشونت و درشتی کی پرواہ کیے بغیر اسے ہمیشہ ''يَا أَبَتِ!'' (اے میرے پیارے باپ!) کہہ کر پکارتے تھے: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا () إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا () يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا () يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا () يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا﴾ (مريم:٤١-٤٥) ''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو۔ بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ

آپ کے کچھ کام آسکیں۔ابا! مجھے ایسا علم ملا ہے، جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جائیے، میں آپ کو سیدھی راہ پر چلادوں گا۔ابا! شیطان کی پوجا نہ کیجئے۔ بے شک شیطان خدا کا نافرمان ہے۔ابا! مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو خدا کا عذاب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس طرح دیگر انسانیت کے سامنے اپنا نورانی پیغام رکھتے تھے، اسی طرح اسے اپنے باپ کی خدمت میں بھی پیش کرتے تھے۔کیا کوئی بیٹا ایسا بھی ہو سکتا ہے، جو دل کی گہرائی سے اپنے والد کی ہدایت کا خواہاں نہ ہو اور اس مقصد کی خاطر اپنی تمام تر کوشش صرف نہ کرتا ہو، خصوصاً جبکہ وہ بیٹا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والا ہو۔

چہارم: بعض مفسرین کرام کی رائے میں عربی زبان میں "الأب" کا لفظ ''دادا'' اور ''اسلاف'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لہٰذا ممکن ہے، جس شخص کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "یا أبت" کہہ کر مخاطب کیا ہو وہ ان کا ''باپ'' نہ ہو بلکہ ان کا دادا، چچا یا کوئی اور رشتہ دار ہو۔[272] ''اب'' کی جمع ''آباء'' 'اجداد' اور ''اسلاف'' کے معنی میں استعمال ہوتی ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ﴾ (یوسف:۳۸) ''اور اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے مذہب پر چلتا ہوں۔''

اس آیت مبارکہ میں آبائی کا لفظ ''اجدادی'' (میرے اجداد) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''آبائنا الأولین'' کی تعبیر تو قرآن کریم میں بکثرت استعمال ہوئی ہے، لہٰذا ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کے بیٹے نہ ہوں، بلکہ ان کے پوتے یا بھتیجے ہوں، بلکہ بعض روایات میں تو صراحت ہے کہ آپ علیہ السلام تارح کے بیٹے تھے۔[273] اس کے سوا کسی اور کے بھی بیٹے ہو سکتے ہیں۔اتنے وسیع احتمالات کی موجودگی میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی گمراہی کے واضح ہو جانے کے بعد اس کے لیے دعائے مغفرت نہیں فرمائی، خصوصاً جبکہ قرآن کریم ان کی ایک اور دعا بھی نقل کرتا ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ (ابراھیم: ۴۱) ''اے پروردگار! حساب (کتاب) کے دن میری اور میرے ماں باپ کی اور مومنوں کی مغفرت کیجیو۔''

اس موضوع کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاکیزگی، نزاہت، معصومیت، ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب اور آپ کی نبوت کی عظمت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ آپ علیہ السلام نے ہمیشہ حق بات کہی اور حق کی طرف داری کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام موحّد انسان اور تسلیم مطلق کی علامت تھے، یہی وجہ تھی کہ انہیں ''خلیلیت'' کے مقام پر فائز کیا گیا تھا۔ آیت مبارکہ: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلاً﴾ (النساء:١٢٥) ''اور خدا نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا۔'' اسی مقام خلیلیت کی طرف مشیر ہے۔ انہوں نے احکامات خداوندی سے سر مو انحراف نہ کیا۔ جب ان سے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے لمحہ بھر بھی تردد نہ کیا۔(274) اور جب انہیں حکم ملا کہ اپنی بیوی اور بیٹے کو لے جا کر ایک بیاباں میں چھوڑ آئیں تو اس حکم کی تعمیل میں بھی انہوں نے لمحہ بھر کے لیے پس و پیش نہ کی اور انہیں صحراء میں چھوڑ کر واپس نظر ڈالے بغیر لوٹ آئے۔(275)

ایک موقع پر انہیں دھکتی ہوئی آگ میں ڈال کر ان سے ان کی زندگی کا امتحان لیا گیا، لیکن انہیں معمولی سا بھی قلق و اضطراب نہ ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک فرشتے نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مدد کی پیش کش کی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میرا پروردگار میرے حالات سے باخبر ہے، اسی تسلیم مطلق کا انعام تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو ان کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی کا باعث بنا دیا۔(276)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس قدر عظیم المرتبت نبی تھے اور آپ علیہ السلام کا اپنے پروردگار کے ساتھ اس قدر مضبوط تعلق تھا۔ ان سے کسی گناہ کے سرزد ہونے کا سوچنا ان کے حقیقی مقام سے ناواقفیت کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

وہ رحمت و شفقت کا پیکر تھے اور اسی رحمت و شفقت کے جذبے کے تحت اپنے والد کی ہدایت کے خواہاں تھے، لیکن جب انہیں اپنے والد کی حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس سے لاتعلقی کا اظہار فرما دیا۔ ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے والد کو گندگی سے ملوث بجو کی شکل میں تبدیل کر دیں گے اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے دیکھیں گے تو ان کے دل سے اپنے باپ کے ساتھ فطری لگاؤ ختم ہو جائے گا۔(277)

د: حضرت یوسف علیہ السلام: پاکدامنی کی علامت

تورات حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں افتراءات سے بھری پڑی ہے۔کوئی افتراء ایسا نہیں جو اہل کتاب نے ان پر نہ لگایا ہو، یہاں تک کہ انہوں نے انہیں ایک عام انسان کے مقام تک گرادیا، حالانکہ وہ پاک صورت و پاک سیرت نبی اور دیگر انبیائے کرام کی طرح معصوم تھے۔

تاہم بڑے افسوس کے ساتھ ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض مفسرین نے تورات یا اسرائیلیات سے متاثر ہوکر ان سے کچھ ایسی باتیں لیں اور ان کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کی، جن کی نسبت کسی معصوم نبی کی طرف کرنا درست نہیں۔ہم دیگر انبیائے کرام کی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت پر بھی قرآنی آیات کی روشنی میں گفتگو کریں گے۔ہماری یہ کوشش آیات مبارکہ کے واضح مفہوم کی وضاحت کی ایک صورت ہوگی۔قرآنی آیات کے معانی کا ادراک رکھنے والا کوئی بھی شخص اگر خالی الذہن ہوکر سورت یوسف علیہ السلام کو پڑھے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا پھر انہیں غلام کی حیثیت سے فروخت کیا گیا اور مصر کے وزیر نے انہیں خرید کر اپنے گھر میں اپنے بیٹے کی حیثیت سے ان کی پرورش کی، لیکن جب وہ جوان ہوئے تو وزیر کی بیوی کے دل میں ان کے بارے میں مخصوص قسم کے جذبات پروان چڑھنے لگے اور آخرکار ایک دن اس نے دروازے بند کرکے ان کے وصال کی خواہش کا اظہار کردیا۔حضرت یوسف علیہ السلام اس مطالبے پر کانپ اٹھے۔انہوں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا، چنانچہ وہ وہاں سے دوڑ پڑے، لیکن عورت نے انہیں آلیا اور ان کی قمیص کو پیچھے سے پھاڑ ڈالا، جونہی دروازہ کھلا، دونوں نے سربراہ خانہ کو وہاں موجود پایا۔یہاں حضرت یوسف علیہ السلام ایک دوسری آزمائش میں گرفتار ہوگئے، کیونکہ وزیر کی بیوی ان پر الزام کا سہارا لے کر کہنے لگی: ﴿مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا﴾ (یوسف: ۲۵) ''جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے اس کی اس کے سوا کیا سزا ہے؟''

یہاں اس سلسلے کی قرآنی آیات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ﴾ (یوسف: ۲۳) ''تو جس عورت کے گھر وہ

رہتے تھے،اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور دروازے بند کر کے کہنے لگی (یوسف) جلدی آؤ۔انہوں نے کہا کہ خدا پناہ میں رکھے۔وہ (یعنی تمہارے میاں) تو میرے آقا ہیں۔انہوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے (میں ایسا ظلم نہیں کرسکتا۔) بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔"

اس آیت مبارکہ میں درج ذیل اہم نقاط ہیں:

اول: قرآن کریم نے اس عورت کی غیبت نہیں کی، کیونکہ اس نے عورت کا نام ذکر کرنے کی بجائے صرف اتنا بتانے پر اکتفا کیا کہ وہ اس گھر کی مالکن تھی۔دروازے عورت نے بند کیے تھے اور گناہ کی اشتعال انگیز اور فتنہ ور دعوت عورت کی طرف سے آئی تھی،لیکن پیکر عفت کی طرف سے اس کا جواب ﴿معاذالله﴾ (خدا کی پناہ) کی صورت میں ملا۔اس جواب کے نتیجے میں حضرت یوسف علیہ السلام قیامت تک کے نوجوانوں کے لیے پاکدامنی کی علامت اور اسوہ حسنہ بن گئے۔

یہ آیت مبارکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے قطعی انکار پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے:﴿انہ ربی﴾ سے حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یا تو اللہ تعالیٰ سے تھی اور وہ گناہ کے ارتکاب کو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کی ناقدری کے مترادف سمجھتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کرنے والے کبھی بھی فلاح نہیں پاسکتے۔یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے اس عورت کا خاوند مراد ہو اور اس میں اس کے اپنی بیوی سے ﴿أكرمی مثواه﴾ "اس کو عزت واکرام سے رکھو۔" کہنے کی طرف اشارہ ہو۔اس عورت کے خاوند نے حضرت یوسف علیہ السلام پر بڑا احسان کیا تھا۔حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ کیسے ممکن تھا کہ اس احسان کا بدلہ ناقدری اور نافرمانی کی صورت میں دیتے؟

یہاں ایک اور اہم اور لائقِ توجہ نقطہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا گناہ کے ارتکاب سے فرار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں یا عورت کے خاوند کے ان کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ سے نہ تھا۔یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو تھا اور اس کے اظہار سے مقصود اس بات کو عورت کے لیے قابل فہم بنانا تھا۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کے گناہ سے دور ہونے کا سبب ان کے سب سے پہلے جملے ﴿معاذالله﴾ (خدا کی پناہ!) میں پوشیدہ تھا،لہٰذا ان کے گناہ سے فرار کا سبب خوف خدا تھا اور یہی مقبول تقوی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام گناہ کے نتائج سے باخبر تھے۔گناہ ظلم، حدود سے تجاوز اور بدی کے

چکر (Vicious Circle) میں داخلے کے مترادف ہے، جس کا نتیجہ دنیا و آخرت میں خسارے کی صورت میں نکلتا ہے۔

جس آیت مبارکہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا موقف سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، وہ اس آیت کے فوراً بعد والی آیت: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ﴾ (یوسف: ٢٤) ''اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انہوں نے اس کا قصد کیا۔ اگر وہ اپنے پروردگار کی نشانی نہ دیکھتے (تو جو ہوتا ہوتا)۔'' ہے۔ آیت کی وضاحت کرنے سے پہلے اس میں موجود بعض الفاظ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں غلط فہمی کا باعث بننے والا لفظ "ھمّ" ہے۔

یہ فعل ماضی کا صیغہ ہے، جو مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اور فاعل کی مناسبت سے اس کے معنی کا تعین کیا جاتا ہے۔ علم لسانیات کا اصول ہے کہ اگر دلیل مخالف موجود نہ ہو تو کسی بھی لفظ کا بنیادی اور حقیقی معنی مراد لینا ضروری ہوتا ہے۔ بعض معمولی اختلافات کے ساتھ علمائے لسانیات اس لفظ کا حقیقی معنی قلق اور حزن بیان کرتے ہیں۔ اس کا مصدر ''الھمّ'' استعمال ہوتا ہے۔ قلق قلبی اضطراب اور شدید حزن والم میں گرفتار ہونے کو کہتے ہیں۔ زلیخا کی طرف اس فعل "ھمّت" کی نسبت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جرأت دیکھ کر اسے شدید غم پہنچا اور اس کا دل بے چین ہو گیا۔

دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کو حزن والم اس لیے پہنچا کہ وہ اس گھر میں ایک غلام کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اگر وہ فرار ہوتے تو انہیں گرفتار کر کے پھر اس گھر میں لوٹا دیا جاتا اور وہ عورت دوبارہ ان پر مسلط ہو جاتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس عورت کے لیے غم کا باعث تو اس لیے تھے کہ وہ ان کے عشق کی آگ میں جل رہی تھی، لیکن خود حضرت یوسف علیہ السلام کا قلق و اضطراب اپنی پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کی خاطر تھا اور ان کا یہ قلق اس وقت ختم ہوا، جب انہوں نے اپنے پروردگار کی طرف سے ''برہان'' کو دیکھ لیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حفظ وامان میں ہیں، جو کسی کو بھی انہیں گناہ میں ملوث کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے براہین کے ذریعے انہیں اپنی خصوصی حفاظت میں لے رکھا ہے، تاہم اس علم اور یقین کے حصول تک وہ بہت کٹھن مرحلے سے گزرے۔ تفاسیر کا مطالعہ کرتے وقت یہ امور ضرور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

دوم: زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنا بنانے کو اپنا ہدف قرار دے چکی تھی۔ یہ اس کی غایت تھی۔ ایک دوسری آیت اس کی اس کیفیت کو یوں بیان کرتی ہے: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا﴾ (یوسف: ٣٠)

''اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔'' دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کا موقف درج ذیل تھا: ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (یوسف: ۲۴) ''یوں اس لیے (کیا گیا) کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔'' اس آیت مبارکہ میں ''مخلَصین'' کا لفظ بہت اہم ہے۔ مخلَص اور مخلِص دو مختلف اصطلاحیں ہیں۔ ہر نبی مخلَص ہوتا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی مخلَصین میں سے تھے۔

مخلِص صاحب اخلاص کو کہتے ہیں، جو ہر کام صرف رضائے الٰہی کی خاطر کرتا ہے، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت ابھی راستے میں اور جستجو کے مرحلے میں تھے۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ابھی ''سیر الی اللہ'' کے مقام پر تھے اور جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف چلتا ہے تو سیدھے راستے سے بھٹکنے سے بچنے اور استقامت کی حفاظت کے لیے اپنے اعمال اور کردار کے ذریعے جدوجہد شروع کرتا ہے۔

مخلَص اس عظیم المرتبت انسان کو کہتے ہیں، جو قلق سے چھٹکارا پا کر اخلاص کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ وہ مخلِص کے راستے کو طے کر کے ''سیر من اللہ'' کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسا شخص ان غلطیوں اور لغزشوں سے مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا ہے، جن میں ہمارے جیسے لوگ گرفتار ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایسے لوگوں میں شامل تھے اور اس مقام پر فائز تھے، لہٰذا کسی ایسے کام یا کردار کی نسبت مخلَص یوسف علیہ السلام کی طرف کیسے کی جا سکتی ہے، جو کسی مخلِص کے لیے بھی مناسب نہیں؟

سورت یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کو پانچ مقامات پر محسنین میں سے قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زمین و آسمان، دوست و دشمن اور خالق و مخلوق سب حضرت یوسف علیہ السلام کے یقین اور اپنے نفس کے محاسبہ و نگرانی کرنے کی گواہی دیتے ہیں۔

جب یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں صفت احسان کے پائے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (یوسف: ۲۲) ''اور نیکوکاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔'' قید خانے میں جب بھلے اور برے ہر ایک کو آپ علیہ السلام کے علم وہبی اور آپ کی فکر کی گہرائی و پاکیزگی کا اندازہ ہوا تو انہوں نے آپ علیہ السلام کو اپنا

مرجع بنالیا۔ وہ آپ علیہ السلام کی باتوں پر یقین اور آپ کے سامنے اپنی مشکلات پیش کرنے لگے: ﴿نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (یوسف: ۳۶) ''ہمیں ان کی تعبیر بتا دیجئے کہ ہم تمہیں نیکو کار دیکھتے ہیں۔''

چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام ہر آزمائش میں پورے اترے، دوست اور دشمن سب کے دلوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے اور کوئی بھی چیز دنیا کی رنگینیوں کے بارے میں ان کے موقف میں تبدیلی نہ لاسکی، اس لیے اللہ تعالیٰ مردانگی کی اس علامت کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (یوسف: ۵٦) ''اسی طرح ہم نے یوسف کو ملک (مصر) میں جگہ دی اور وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔ ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔'' یہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لیے بشارت اور ضمانت کا اعلان تھا۔

اور جب وہ دن آیا جب آپ علیہ السلام کے حسد میں مبتلا بھائی حسد سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہوئے تو آپ علیہ السلام سے کہنے لگے: ﴿إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (یوسف: ۷۸) ''ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں'' اور بالآخر جب حضرت یوسف علیہ السلام پختگی اور اطمینان کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ گئے تو انہوں نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (یوسف: ۹۰) ''جو شخص خدا سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو خدا نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

لہٰذا ہر کسی سے حسن کردار کی شہادت حاصل کرنے والے انسان سے سنن الٰہیہ کے مطابق ممکن نہیں تھا کہ وہ انحراف وحرمان کا شکار یا پستی وبلند کے درمیان متذبذب ہوتے۔

اللہ تعالیٰ آپ علیہ السلام کو محسنین میں سے قرار دیتے ہیں۔ جب ہم ایمان کے راستے عمل اور عمل کے راستے ایمانِ حقیقی اور پھر بالآخر احسان کے مقام پر پہنچتے ہیں، جو ہماری پرواز کا آخری مقام ہے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ انبیائے کرام کا پہلا مقام ہے، جہاں سے وہ اپنے سلوک کا آغاز کرتے ہیں۔

جس احسان کی وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''احسان یہ ہے کہ اللہ

کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔"[278] وہ ہمارا آخری لیکن انبیائے کرام کا پہلا مقام ہوتا ہے، لہٰذا اسی پہلو سے تمام امور کا جائزہ لینا چاہیے۔ انبیائے کرام کو اپنے اوپر قیاس کرنے سے ہم طرح طرح کی غلطیوں کا شکار ہو جائیں گے اور حقیقت کو کبھی نہ پا سکیں گے۔

زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دو بالکل مختلف عالموں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک پر عشق و محبت کا غلبہ تھا، جس کی وجہ سے اس کی قوتِ ارادی مفلوج ہو چکی تھی، اسے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی اور وہ اپنے احساسات اور جذبات کی دنیا میں رہتا تھا، جبکہ دوسرے انسان کی نظریں عالم آخرت پر لگی ہوئی تھیں، وہ محسن اور مخلص نبی تھا اور عالم آخرت میں پرواز کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔

ان دونوں انسانوں کے لیے "ھَمّ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن اس لفظ کا معنی ان دونوں انسانوں اور ان کے اہداف کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہے۔ دونوں کی روحانی، ثقافتی اور علمی سطح کے اختلاف کے پیش نظر دونوں کے لیے اس لفظ کے مختلف معانی مراد لینے چاہئیں۔

آئندہ سطور میں پیش کردہ خاکے سے دونوں کے درمیان موجود اختلاف واضح ہو جائے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام عفت و پاکیزگی کی طرف دوڑ رہے تھے، جبکہ زلیخا شہوت اور گناہ کی طرف لپک رہی تھی۔ دونوں دوڑ رہے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام آگے آگے اور زلیخا ان کے پیچھے پیچھے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں گناہ کی طرف ذرا سا بھی میلان ہوتا تو تعاقب کی صورت یوں نہ ہوتی، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کی غایت کچھ اور تھی اور وہ کسی بلند مقصد کی طرف متوجہ تھے۔ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کمرے سے باہر نکلنے سے روکنے کے لیے ان کی قمیص کو پکڑا تو وہ پیچھے سے پھٹ گئی، تاہم وہ دروازہ کھول کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور زلیخا ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہاں دونوں نے وزیر کو اپنے سامنے پایا۔ اس غیر متوقع صورت حال میں عورت کو اپنے دفاع کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام پر اپنے اوپر دست درازی کرنے کا الزام لگانے کے سوا کوئی اور بات نہ سوجھی، لیکن ایک خاموش گواہ کی موجودگی کی وجہ سے شوہر اس کی بات سے مطمئن نہ ہو سکا۔ وہ گواہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھٹی ہوئی قمیص تھی، جو اپنی زبانِ خموشی سے انتہائی بلیغ عورت کو خاموش کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ صورتحال نہ صرف اس وقت وہاں موجود اس عورت کے ایک رشتہ دار پر، بلکہ ایک چھوٹے سے بچے پر بھی عیاں تھی۔ حاصل یہ کہ صورتحال واضح ہو گئی اور حضرت

یوسف علیہ السلام بری ثابت ہوئے، کیونکہ ان کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اگر اقدام ان کی طرف سے ہوتا اور عورت دفاع کرتی تو آپ علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹنی چاہیے تھی۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نظر آنے والی براہینِ الٰہیہ میں سے ایک تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پھٹی ہوئی قمیص کی وجہ سے ان کی حفاظت فرما کر ان کے روشن مستقبل کی راہ ہموار کی۔

حضرت یوسف کا "ھمّ" (قلق) اپنے حبیب کی خاطر تھا، جبکہ زلیخا کا "ھمّ" (قلق) اس کے حبیب کی خاطر تھا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفسرین اللہ تعالیٰ کی دائمی نگرانی میں رہنے والے معزز نبی کے "ھمّ" (قلق) اور شہوت سے مغلوب عورت کے "ھمّ" (قلق) کے درمیان پائے جانے والے بہت واضح فرق میں امتیاز نہ کرنے کی غلطی کا شکار ہوئے اور دونوں کو ایک ہی پلڑے میں رکھ دیا، گویا دونوں کی فکر جسمانی شہوت کی دبیز تہوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں ایسی تمام تفاسیر، شروح اور تعلیقات پر نظر ثانی کیے جانے کو ضروری سمجھتا ہوں، جو کتاب و سنت پر مبنی نہیں۔ اس تصحیح پر اسرائیلیات کا شکار ہونے والے نیک نیت مفسرین کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ اس قسم کی غلطیوں کی وجہ سے نہ جانے کتنی برکات سے محروم رہے ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ انبیائے کرام کو عام انسانوں کی طرح سمجھتے ہیں وہ ان کے روحانی ماحول اور روح پرور انفاس سے محروم رہتے ہیں۔

باقی یہ کہنا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کی دعوت کی طرف مائل ہو کر گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کر لیا تھا الا یہ کہ انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنی انگلی منہ میں چباتے ہوئے دیکھا، جس کا مقصد انہیں متنبہ کرنا تھا، محض مغالطہ اور محرف کتابوں کا من گھڑت اسرائیلی قصہ ہے۔ اسلامی کتابوں سے اس قسم کے جھوٹے قصوں کو نکال دینا چاہیے۔

عظیم ولی حضرت عبدالعزیز دباغ آیت مبارکہ: ﴿ولقد همّت به همّ بها﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زلیخا نے اپنے مقصد کو پانے کا ارادہ کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے روکنے کا ارادہ فرمایا، جس کے لیے اگر انہیں زلیخا کو مارنا یا اس پر ہاتھ اٹھانا پڑتا تو شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔[279] اس ولی نے اپنی کتابوں میں اور بھی بہت سے عمدہ معارف واشارات ذکر کیے ہیں۔

جس ہستی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے "ان الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم خلیل اللہ"[280] فرمایا ہو اس کے بارے میں بھلا کوئی

اور بات کیسے تصور کی جا سکتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ اسلام کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام، جد امجد حضرت اسحاق علیہ السلام اور والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام تھے، لہٰذا آپ علیہ السلام بجا طور پر ''الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم'' تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے جس مقام کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب ہمارے جیسے عام لوگوں کے دل میں اتنے بڑے گناہ کا خیال نہیں آتا تو ایک پاکیزہ نبی اور خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ کا اس سطح تک گرنا کیسے ممکن ہے؟ یہ بات حکمت و دانش کے اعتبار سے نا قابل فہم ہے۔

جب عورتوں کی آزمائش اور حیلے اپنی انتہا کو پہنچ گئے تو اس نبی نے اپنے پروردگار کے حضور التجا کی: ﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ﴾ (یوسف:۳۳) ''یوسف نے دعا کی کہ پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں، اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔'' یعنی وہ قید خانے کی تاریکی، تعفن اور مشکل زندگی پر راضی ہو گئے اور اسے عالیشان محل میں نفیس ساز و سامان کے ساتھ رہنے پر ترجیح دی۔ کیا ان کا اپنی پاکدامنی اور پاکیزگی کی حفاظت کی خاطر تقریباً نو سال تک قید خانے کی تکلیفوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنا ان کی عصمت کی دلیل نہیں۔ ان عورتوں نے آپ علیہ السلام پر فریفتہ ہو کر آپ کے حسن کے سامنے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ انہوں نے آپ علیہ السلام کے موقف کو کمزور کرنے کے لیے زلیخا کے آپ پر فریفتہ ہونے کی خبر کو پھیلایا اور آپ کا قرب حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے کیے، لیکن انہوں نے ہر بار اپنے سامنے فولادی ارادے کے مالک مرد مؤمن کو پایا اور اس سے اپنا مقصد حاصل نہ کر سکیں۔

آپ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے التجا کی اور مدد مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور پر امن قید خانے کی دیواروں میں آپ علیہ السلام کو ان عورتوں کے مکر و فریب سے محفوظ رکھا۔ اس وقت سے قید خانہ خدا اور قرآن کی دعوت دینے والوں کا استقبال کر رہا ہے اور اسے ''مدرسة یوسفیة'' کہا جانے لگا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پاکدامنی کے بارے میں اس قدر حساس تھے کہ جب انہیں قید خانے سے رہا کیا جانے لگا تو انہوں نے اس وقت تک قید خانے سے نکلنے سے انکار کر دیا جب تک لوگ ان کی پاکدامنی کا مکمل طور پر یقین نہیں کر لیتے اور ان کی پاکیزگی پر قطعی دلیل قائم

نہیں ہو جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عفت و پاکدامنی کے ساتھ زندگی گزارنا اور چیز ہے اور پاکیزگی و پاکدامنی کو ثابت کرنا بالکل مختلف چیز ہے۔ آپ کی پاکدامنی کا اثبات آپ کی مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے ضروری تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام قید خانے سے اسی وقت نکلے، جب زلیخا نے برسرِعام آپ علیہ السلام کی مثالی پاکدامنی کا اعتراف واقرار کیا۔ اگر کوئی شخص زلیخا کے اپنے گناہ کا اعتراف کرنے کے بعد بھی اس معزز نبی کی طرف گناہ کے ارتکاب کی نسبت کرنا چاہے تو اسے کیا کہا جائے؟

تیسری فصل

رسول اللہ ﷺ کی عصمت

سارے انبیائے کرام ہی معصوم ہیں، لیکن سید الانبیا ﷺ عصمت سے بھی بلند تر ہیں، کیونکہ وہ سلطان الانبیاء، تخلیق کائنات کی غایت اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو مخصوص زمان و مکان کے لیے مبعوث فرمایا، لیکن آپ ﷺ کی رسالت قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے۔ (281) نبوت کے شعر کو قافیہ کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے محبوب ترین ہستی کو اس شعر کا قافیہ بنایا اور اسے آسمانِ نبوت میں چہچہانے والے بلبل کا مقام عطا فرمایا۔

کسی نبی نے وجود کی اتنی جامع، عام اور کلی وضاحت نہیں کی، جتنی آپ ﷺ نے فرمائی۔ چونکہ دوسرے انبیائے کرام کے دور تک علوم میں اتنی ترقی ہوئی تھی اور نہ ہی کائنات کی حقیقت پر اتنی گہرائی کے ساتھ غور خوض کیا گیا تھا، اس لیے یہ بات ان کے فرض منصبی میں داخل ہی نہ تھی۔ یہ خصوصیت رسول اللہ ﷺ کے دور اور آپ ﷺ کے بعد کے ادوار کے نصیب میں تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے ارشادات اور صحیح سائنس اور سائنسی انکشافات کے درمیان کسی قسم کا تعارض نہیں پایا جاتا۔

ہر نبی درخشاں ستارہ تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ خورشید منور تھے، جس کی ضیا پاش کرنوں کے سامنے سارے ستاروں کی روشنی گم ہوگئی۔ بوصیری نے کیا خوب کہا ہے:

فانه شمس فضل هم كواكبها   يظهرن أنوارها للناس في الظلم

''آپ ﷺ آفتابِ فضیلت ہیں اور انبیائے کرام آپ کے ستارے ہیں، جو تاریکی میں انسانیت کے لیے روشنی کرتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ معصومین کے سردار اور بادشاہ ہیں۔ آپ ﷺ کی عصمت ان کی عصمت سے اور آپ کی پاکدامنی ان کی پاکدامنی سے بڑھ کر ہے۔

آپ ﷺ کے سخت ترین دشمن بھی آپ ﷺ پر کوئی حقیقت پر مبنی الزام نہ لگا سکے۔ آپ کے مخالفین نے آپ کو ''مجنون'' کہا۔ اگر وہ آپ کو محبت خداوندی میں سرگرداں یا اس کی محبت میں گھلنے والا کہتے تو یہ سچ ہوتا۔

وہ آپ ﷺ کو ساحر کہتے تھے، کیونکہ کوئی کتنا ہی ہٹ دھرم کیوں نہ ہوتا وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پگھل جاتا اور اپنے کفر کی بنیادوں کو ہلتے اور ٹوٹتے ہوئے محسوس کرتا۔ کتنے ہی لوگ آپ علیہ السلام کی گفتگو کے سحر میں گرفتار ہوئے اور اپنا سب کچھ آپ کے راستے میں لٹا دیا۔ دلِ بینا سے محروم کفار اس مظہر کی توجیہ آپ ﷺ کو ساحر قرار دے کر کرتے۔ دراصل وہ ایمان کی طاقت وقدرت، کمال کی تجلی اور جمال کی جاذبیت سے بے خبر تھے۔

جب انہوں نے آپ ﷺ کو قیامت تک مستقبل کے حالات بتاتے ہوئے سنا تو انہوں نے آپ ﷺ کو ''کاہن'' قرار دیا، کیونکہ انہوں نے اس قسم کی باتیں صرف کاہنوں سے ہی سنی تھیں، لیکن اگر وہ ذرا بھی غور کرتے تو آپ ﷺ کے سچے کلام اور کاہنوں کی جھوٹی باتوں میں پایا جانے والا فرق سمجھ لیتے۔ (282)

اگر رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) مجنون ہوتے تو روئے زمین پر ایک بھی عقل مند نہ ہوتا، باقی سحر اور کہاوت جیسی غیر سنجیدہ حرکات کا آپ ﷺ کی ہستی میں پایا جانا اور بھی دور از کار بات ہے۔ آپ ﷺ کو ایسی باتیں کبھی خواب میں بھی نہ سوجھی تھیں، بلکہ آپ ﷺ کے خواب بھی آپ ﷺ کی بیداری کی زندگی جتنے حقیقی ہوتے تھے، کیونکہ عالم آخرت سے آپ ﷺ پر منکشف ہونے والی غیب کی خبریں آپ ﷺ کی رسالت کے ہی بعض پہلو ہوتے تھے۔ (283)

کفار نے آپ ﷺ کے بارے میں حکمت ودانش سے متعارض یہ تمام باتیں کہیں، لیکن انہوں نے آپ ﷺ کی عصمت اور عفت کے بارے میں کچھ کہنے کی کبھی ہمت نہ کی، کیونکہ دوست و دشمن سب اچھی طرح جانتے تھے کہ اس قسم کی بات خود الزام لگانے والے کو مشکل میں ڈالنے اور اس کے لیے ندامت کا باعث بن جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر ہزاروں لوگوں نے ہزاروں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے بعض روشنی کی طرف لپک کر اس کے گرد چکر لگانے والے پروانوں کی مانند تھے اور بعض دن کے اجالے سے خوف کھانے والی چمگادڑوں کی مانند تھے، تاہم نقطۂ نظر، اصول ومبادی اور مذاہب کے اختلاف کے باوجود سب کے سب آپ ﷺ کی عصمت اور عفت پر متفق نظر آتے ہیں۔

کسی درجے میں ہم بھی اس نور کے گرد چکر لگانے والوں میں شمار ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کی عصمت وعفت سے متعلق ہماری گفتگو دراصل آپ علیہ السلام کے بارے میں حق کے اظہار کی ایک

صورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان سطور کو پڑھنے والے آپ ﷺ کی عصمت وعفت کے بارے میں صرف میری تحریر پر اکتفانہ کریں، بلکہ اسلاف کی کتابوں کی طرف بھی مراجعت کریں تاکہ یہ کتابیں اوران کے صاف دل مؤلفین ان کے مرشد ثابت ہوں۔ یہ دل ہمیشہ حق تعالیٰ کو اپنے پاس پاتے ہیں۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی کماحقہ معرفت صرف ایسے ہی دلوں کے ذریعے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

الف: قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ سے متعلق وارد تنبیہات

قرآن کریم میں بعض مقامات پر رسول اللہ ﷺ کو براہ راست تنبیہ کی گئی ہے۔ان تنبیہات کی وجہ سے بعض اوقات آپ ﷺ کی عصمت پر بظاہر زد پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں: ''کیا خطا کے بغیر تنبیہ کی جاسکتی ہے؟'' لیکن ہم ہمیشہ کی طرح اب بھی اصرار کرتے ہیں کہ یہ تنبیہات کسی گناہ یا غلطی کے ارتکاب کا نتیجہ ہرگز نہ تھیں، بلکہ بعض اوقات اجتہاد کی بنیاد پر زیادہ اچھی چیز کے ہوتے ہوئے محض اچھی چیز کو اختیار کرنے پر ہوتی تھیں۔ آپ ﷺ جیسی حسن و جمال کی علامت ہستی کے لیے روا نہ تھا کہ اجمل اور احسن کے ہوتے ہوئے جمیل یا حسن کا انتخاب فرماتے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم زیادہ صاف اور پاکیزہ چشمے کے پانی کی موجودگی میں اس کی بہ نسبت کم صاف پانی پئیں۔ اگر انبیائے کرام حوضِ کوثر کے پانی کے ہوتے ہوئے آبِ زم زم پئیں تو اس پر ان کو تنبیہ کی جاسکتی ہے۔ہم سے اس وقت باز پرس ہوتی ہے، جب ہم پھسل کر جہنم کی وادی میں جاگرتے ہیں، لیکن انبیائے کرام اگر آسمان میں پرواز کرتے ہوئے ذرا سی اپنی جگہ تبدیل کریں تو ان سے باز پرس ہوتی ہے، لہٰذا انبیائے کرام کو اپنے دنیوی معیاروں پر پرکھنا اور ان کے بارے میں اس زاویے سے احکامات لگانا جائز نہیں۔ انہیں تو محل میں بلائے جانے اور بادشاہ کے حضور پیش ہونے کا شرف عطا کیا گیا ہے۔ انہیں محل سے باہر کھڑے ان لوگوں کے مساوی کیسے قرار دیا جاسکتا ہے، جو محل کے باغ کے بیرونی دروازے کے قریب بھی نہیں آسکتے؟ دونوں کے لیے ایک ہی معیار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ محل سے باہر موجود لوگوں کا تبسم نیکی سمجھی جاتی ہے، لیکن بادشاہ کے حضور کھڑے لوگوں کا تبسم بعض اوقات گستاخی تصور ہوتی ہے۔ دونوں قسم کے لوگوں کے لیے پیمانے بالکل جدا ہیں، لہٰذا قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کو کی جانے والی تنبیہات کو بھی اسی پہلو سے دیکھنا چاہیے۔

وہ تنبیہات کیا ہیں؟ اور نبی کریم ﷺ کو اس انداز سے کیوں مخاطب کیا گیا ہے؟ آئندہ سطور میں ہم اس قسم کی چند مثالوں پر روشنی ڈالیں گے، جو اگرچہ بظاہر تنبیہ نظر آتی ہیں، لیکن ان کی تہہ میں آپ ﷺ کی تعریف و توصیف مضمر ہے اور بظاہر گناہ نظر آنے والے اعمال درحقیقت نیکی ہیں۔ اس سے ہمارے اس یقین میں اضافہ ہوگا کہ عفت اور عصمت میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ عصمت کے پہلو سے آپ ﷺ کی نبوت کی ایک دلیل ہے۔

ب: رسول اللہ ﷺ کو کی جانے والی تنبیہات کا پس منظر

ا: بدر کے قیدیوں کا معاملہ

درج ذیل آیات بدر کے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بظاہر ان میں رسول اللہ ﷺ کو تنبیہ کی گئی ہے: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّهُ يُرِيدُ الآخِرَةَ وَاللّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ () لَّوْلاَ كِتَابٌ مِّنَ اللّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ () فَكُلُواْ مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلاَلاً طَيِّباً وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (الأنفال:٦٧-٦٩) "پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہادے۔تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔اور خدا غالب حکمت والا ہے،اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے لیا ہے،اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب (نازل) ہوتا۔"

نبی کریم ﷺ اور گزشتہ انبیائے کرام کو زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ قیدی بنا کر رکھتے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا؟اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک دوسروں کی مدد کے بغیر نبی کے حالات مستحکم اور زمین پر اس کے قدم جم نہ جائیں اس کے لیے کفار کو قیدی بنانا اور انہیں فدیے کے بدلے رہا کرنا روا نہ تھا،کیونکہ قیدی نہ بنانے کے صورت میں اہل ایمان کو روئے زمین پر تسلّط قائم کرنے،قوت حاصل کرنے،دشمن کے مقابلے میں طاقت کے توازن کو قائم کرنے اور طاقت کے حصول میں مدد ملتی۔آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ اسی مقصد کو پانا چاہتے تھے۔بلاشبہ یہاں اجتہاد کی گنجائش موجود تھی،لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے افضل اور بہتر اجتہاد بھی موجود تھا۔حاصل یہ کہ تم نے اجتہاد کے ذریعے حسن کو اختیار کیا،لیکن احسن جو منشائے خداوندی بھی تھا،تمہاری نظروں سے پوشیدہ رہا۔اگر تقدیر میں یہ بات لکھی نہ جاچکی ہوتی کہ میں تمہارے فدیہ لینے پر تمہیں سزا نہ دوں گا تو تم پر دردناک عذاب نازل ہو چکا ہوتا،تاہم چونکہ یہ کتاب اور حکم ازل سے موجود ہے،اس لیے تم پر اس قسم کا عذاب کبھی نہ آئے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر جس میں نصرت خداوندی مسلمانوں کے دلوں پر شبنم کے قطروں کی مانند اتری تھی،کے بعد مشرکین کو واپس لٹا کر مسلمانوں کے دلوں میں پندرہ سال سے بھڑکنے والی آگ کو بجھا دیا،کیونکہ ظلم وستم اور دکھ کی کوئی قسم ایسی نہ تھی،جو مسلمانوں نے ان کفار کے ہاتھوں نہ سہی

تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو ان کے گھر بار اور وطن سے نکالا، لیکن انہوں نے یہ تمام مصائب و آلام بغیر کسی مزاحمت کے برداشت کیے، کیونکہ اس وقت تک مزاحمت کی اجازت نہ تھی، آخر کار انہیں اپنا دفاع کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ مظلوم تھے اور ﴿ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴾ (حج: ۳۹) "اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔" چنانچہ مسلمان اپنا دفاع کرنے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے لگے۔ غزوہ بدر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان پہلا بڑا معرکہ تھا، جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور انہوں نے بہت سے کفار کو قیدی بنایا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ تھا اور اس کے بارے میں پہلے سے کوئی حکم خداوندی موجود نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ کی طرح اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ اس مشورے میں جو بات طے ہونی تھی، اس نے قیدیوں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا تعین کرنا تھا۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اخلاقِ کریمانہ کے زیرِ اثر اور اللہ تعالیٰ کی سابقہ ہدایات کی روشنی میں ان قیدیوں کو رہا کرنا چاہتے تھے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴾ (الحجر: ۸۵) "تو تم (ان لوگوں سے) اچھی طرح سے درگزر کرو۔" ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (النحل: ۱۲۵) "(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ۔" اسی کا نتیجہ تھا کہ عفو و درگزر آپ ﷺ کی طبیعت ثانیہ اور آپ کے اخلاق کا لازمی حصہ بن گئی تھی۔ کسی اور برتاؤ کی آپ سے توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی، کیونکہ قرآن کریم آپ ﷺ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴾ (القلم: ٤) "اور تمہارے اخلاق بڑے (عالی) ہیں۔" ہر انسان کو اخلاق کا کچھ حصہ نصیب ہوتا ہے، لیکن چونکہ آپ ﷺ تخلق باخلاق اللہ کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، اس لیے آپ ﷺ کی شخصیت تمام اخلاق کی جامع اور قرآن کریم کی آیات اور سورتوں سے پھوٹنے والی اخلاقی تعلیمات کا مظہر تھی۔ (284)

رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کا اندازہ لگانے کے لیے سالہا سال تک آپ ﷺ کو ایذائیں پہنچانے والے کفارِ مکہ کے ساتھ آپ ﷺ کے سلوک اور برتاؤ پر غور کرنا کافی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے کفار سے وہی بات فرمائی، جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ﴿ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ (یوسف: ۹۲) "(یوسف نے) کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (وملامت) نہیں ہے۔" (285)

رسول اللہ ﷺ کی طبیعت اور اخلاق کا میلان ہمیشہ نرمی کی طرف رہتا تھا، لیکن اس کے باوجود

آپ ﷺ ہر معاملے میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مشورہ مانگا تو انہوں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! یہ ہمارے چچازاد بھائی اور خاندان کے افراد ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں، جو ہمارے لیے کفار کے خلاف قوت کا باعث بنے گا، نیز ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اسلام کی ہدایت دے دے، جس کے نتیجے میں وہ ہمارے دست و بازو بن جائیں گے۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ حضرت عمرؓ بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: ''اے ابن خطاب! تمہاری کیا رائے ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''بخدا میری رائے ابوبکر کی رائے سے مختلف ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ میرے فلاں رشتہ دار کو میرے حوالے کریں تاکہ میں اس کی گردن اڑاؤں، عقیلؓ علی کے حوالے کریں تاکہ وہ اس کی گردن اڑائیں اور حمزہ کے فلاں بھائی کی گردن زنی کے لیے اسے حمزہ کے سپرد کریں تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھ لیں کہ ہمارے دلوں میں مشرکین کے ان سرداروں اور سرخیلوں کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔''(286)

آراء بالکل واضح تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے قیدیوں کو رہا کرنے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے انہیں قتل کرنے کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: ''اے ابوبکر! تمہاری مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہے، جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (ابراھیم: ٣٦) ''سو جس شخص نے میرا کہا مانا وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔'' نیز تمہاری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے، جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (المائدة: ١١٨)(287) ''اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے۔) بے شک تو غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہی بات درج ذیل الفاظ میں ارشاد فرمائی: ''حوض (کوثر) پر میری امت میرے پاس آئے گی اور میں اس سے دوسروں کو ایسے ہی روکوں گا جیسے آدمی دوسروں کے اونٹوں کو اپنے اونٹوں سے روکتا ہے۔'' صحابہ کرام نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ ہمیں پہچانیں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، تمہاری ایک مخصوص نشانی ہوگی، جو تمہارے سوا کسی میں نہ ہوگی۔ تم میرے پاس ایسی حالت میں آؤ گے کہ وضو کے اثر سے تمہاری پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔ تم میں سے ایک گروہ کو میرے پاس آنے سے روک

دیا جائے گا، اس پر میں کہوں گا: "اے میرے پروردگار! یہ تو میرے ساتھی ہیں۔" ایک فرشتہ جواب میں مجھ سے کہے گا: "کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعات ایجاد کیں؟" ایک دوسری روایت میں ہے: کہا جائے گا: "آپ کو خبر نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعات ایجاد کیں۔" اس پر میں بندۂ صالح والی بات کہوں گا: ﴿وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيداً مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيد﴾ (المائدة: ١١٧)[288] "اور جب تک میں ان میں رہا ان (کے حالات) کی خبر رکھتا رہا۔ جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا تو تو ان کا نگران تھا اور تو ہر چیز سے خبردار ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سب سے پہلے شاگرد تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کا اندازِ فکر رسول اللہ ﷺ کے اندازِ فکر سے ملتا جلتا تھا، یہی وجہ تھی کہ بہت سے مواقع پر دونوں کے فیصلے ایک جیسے ہوتے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں ایک اولوالعزم نبی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اے عمر! تمہاری مثال حضرت نوح علیہ السلام جیسی ہے، جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّاراً﴾ (نوح: ٢٦) "میرے پروردگار! کسی کافر کو روئے زمین پر بستا نہ رہنے دے۔" نیز تمہاری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی ہے، جنہوں نے فرمایا تھا: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلاَ يُؤْمِنُواْ حَتَّى يَرَوُاْ الْعَذَابَ الأَلِيمَ﴾ (یونس: ٨٨)[289] "اے پروردگار! ان کے مال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں، جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔"

ان دو اولوالعزم نبیوں نے اپنی قوم کے کفار کی طرف سے پہنچنے والی مسلسل ایذاؤں پر صبر کیا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کی قوموں کی ہٹ دھرمی بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ ان نبیوں کے لیے مذکورہ بالا دعاؤں کے ذریعے خدا کے حضور التجا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ان کافروں کا زندہ رہنا زندوں اور مردوں سب کے حق میں برا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو قبول فرمایا اور ان کافروں پر اپنی صفت قہاریت کی تجلی ڈال کر انہیں ہلاک کر دیا۔

آخر کار بردبار طبیعت اور اخلاقِ کریمانہ کی بدولت رسول اللہ ﷺ نے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے کر اسلام کے دست و بازو بنائیں گے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا۔ اس واقعے کی بقیہ تفصیل خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے:

"...رسول اللہ ﷺ نے میرے مشورے کی بجائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو اختیار فرمایا۔ دوسرے دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا: "یارسول اللہ ﷺ! آپ اور آپ کے ساتھی کس سبب سے رو رہے ہیں؟ تاکہ اگر مجھے رونا آئے تو میں بھی روؤں اور اگر مجھے رونا نہ آئے تب بھی آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے بہ تکلف رونے کی کوشش کروں۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں تمہارے ساتھیوں کی طرف سے کفار سے فدیہ لینے کے مشورے پر رو رہا ہوں۔ ان پر آنے والا عذاب مجھے اِس درخت سے زیادہ قریب دکھایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ () لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ () فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (الأنفال: ٦٧-٦٩) "پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔ اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے لے لیا ہے، اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب (نازل) ہوتا۔" ان آیات میں اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے لیے مالِ غنیمت کو حلال قرار دے دیا ہے۔"[290]

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اجتہاد کی صلاحیت اور اجازت عطا کی تھی۔ آپ ﷺ نے اجتہاد کے ذریعے "حسن" کو اختیار فرمایا، لیکن اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ اس کی محبوب ترین شخصیت "احسن" اور "اجمل" کو اختیار کرتی، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو تذکیر و تنبیہ فرمائی، وگرنہ یہاں کسی گناہ کا ارتکاب نہیں پایا گیا، مزید برآں ان آیات مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کے لیے اختیار کردہ اسلوب ﴿لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (الأنفال: ٦٨) "اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے لیا ہے، اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔" ہے۔ عربی زبان میں "لولا" کا لفظ ایک چیز کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری چیز کی نفی پر دلالت کے لیے استعمال ہوتا ہے، لہٰذا اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ازل سے ایک حکم صادر ہوا، جس کے تحت تم غنیمت لوگے اور اس سے استفادہ کروگے۔

یہی وجہ ہے کہ اس اجتہاد کے بعد بھی غنیمت، جس کے ضمن میں قیدی بھی داخل تھے، حرام قرار

نہیں پائی اور یہ سارا واقعہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعے کی طرح محض ایک آزمائش تھی، جس میں ''احسن'' کو چھوڑ کر ''حسن'' کو اختیار کیا گیا تھا۔ غزوہ بدر کے بعد تمام امور اپنی سابقہ حالت پر آ گئے، جیسا کہ درج آیت مبارکہ سے پتا چلتا ہے ﴿فَإِذا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّى إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنّاً بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ذَلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ﴾ (محمد: ۴) ''پس جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو جو زندہ پکڑے جائیں انہیں مضبوطی سے قید کر لو پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر، یہاں تک کہ فریق مقابل لڑائی کے ہتھیار رکھ دے۔ یہ حکم یاد رکھو اور اگر اللہ چاہتا تو اور طرح سے ان سے انتقام لے لیتا، لیکن اس نے چاہا کہ تم میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم خداوندی اپنی فراست سے جانا تھا۔ اس حکم کی طرف سبقت کرنا اچھی بات تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی حکم کے آنے کا انتظار کرنا زیادہ بہتر تھا۔

نیز وہ پانچ امور جو صرف رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوئے اور آپ کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے انہیں شمار کرتے ہوئے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: ''اور میرے لیے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا، مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے حلال نہ تھا۔''(291) چنانچہ مالِ غنیمت جو غزوہ بدر سے پہلے تک حرام تھا اور پہلے انبیائے کرام کے لیے حلال نہ تھا، وہ ایک ایسی آیت مبارکہ کے ذریعے مسلمانوں کے لیے حلال قرار پایا، جس میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کو عتاب کیا گیا ہے۔

ایک اور لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ مالِ غنیمت کی حلت کا حکم رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد کے بعد نازل ہوا۔ اجتہاد میں اگر مجتہد صحیح نتیجے پر پہنچے تو اسے دہرا ثواب ملتا ہے اور اگر اس سے غلطی ہو جائے تو ایک ثواب پھر بھی ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمومی اخلاق کے پیش نظر آپ علیہ السلام کے پاس اس اجتہاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کے اجتہاد کے فوراً بعد حکم نازل ہو گیا۔

مالِ غنیمت کی حلت دینی نصوص سے ثابت ہے۔ یہ اخلاص کے منافی ہے اور نہ ہی جہاد کے راہِ خدا میں ہونے سے متصادم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالِ غنیمت اور دشمنوں کے مالی وسائل پر قبضہ کرنے سے دشمن کی طاقت میں کمی اور مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوتا تھا، نیز یہ اخلاص کے مطلوبہ

معیار پر پورا نہ اترنے والے مسلمانوں کے لیے ترغیب کا باعث بھی تھا، مزید برآں یہ جہاد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے والے مجاہدین کے لیے ناگزیر ذریعہ معاش تھا، بشرطیکہ جہاد سے ان کا مقصود محض کسبِ معاش نہ ہو، تاہم کسی کو مالِ غنیمت وصول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہر انسان کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرح یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ''میں نے مال و دولت کی خاطر اسلام قبول نہیں کیا۔''(292) لیکن ہر کسی سے ایسی قربانی کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہونے سے پہلے میں حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق ''ثمرۂ ممنوعہ'' کی طرف اشارہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پھل کے ذریعے آزمایا اور پھر بعد میں اسے ان کے لیے حلال قرار دے دیا، میری رائے میں یہی صورتحال غزوہ بدر کے موقع پر مالِ غنیمت کے بارے میں پیش آئی کہ پہلے اس کے ذریعے آزمائش کی گئی اور پھر تفصیلی احکام نازل فرما کر اسے حلال قرار دے دیا گیا۔ چونکہ ان احکام میں اجتہاد کی گنجائش موجود تھی، اس لیے گناہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تاہم اس موقع پر انسانی فطرت میں دنیوی مال و متاع کی طرف میلان پر تنبیہ اور اس میلان کو حد سے بڑھانے پر خبردار کیا گیا ہے۔

درحقیقت اس تنبیہ سے تمام مسلمانوں کو نصیحت کرنا مقصود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر میں تو پہلے دنیا کی طرف میلان تھا اور نہ بعد میں۔ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کی صورت میں اس تنبیہ کے مخاطب مسلمان تھے اور یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا تاکہ ان کی عزتِ نفس مجروح ہوئے بغیر، انہیں نصیحت حاصل ہو جائے۔ اس سے خدائی تربیتی نظام میں مخاطبین کے حق میں ملحوظ رکھی جانے والی حساسیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

۲- غزوہ تبوک

اگرچہ غزوہ تبوک میں جنگ کی نوبت نہ آئی اور مسلمان بازنطینیوں سے عملاً جنگ کیے بغیر واپس آ گئے، لیکن مسلمانوں نے اس جنگ کے لیے بڑی سنجیدگی سے تیاری کی تھی۔ چونکہ یہ بازنطینیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی، انہیں اس کے لیے مکمل تیاری کرنے کا حکم دیا اور نفیرِ عام کی صورت میں جنگ کے لیے نکلے، تاہم بعض لوگوں نے مختلف قسم کے عذر پیش کر کے آپ ﷺ سے جہاد پر نہ جانے کی اجازت مانگی اور آپ ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔ اس موقع پر آیت مبارکہ: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ

يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ ﴾ (التوبة: ٤٣) ''خدا تمہیں معاف کرے۔ تم نے پیشتر اس کے کہ تم پر وہ لوگ بھی ظاہر ہو جاتے جو سچے ہیں اور وہ بھی تمہیں معلوم ہو جاتے، جو جھوٹے ہیں، ان کو اجازت کیوں دی؟'' نازل ہوئی، جس میں بظاہر رسول اللہ ﷺ پر عتاب کا اظہار کیا گیا ہے۔ ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنكَ ﴾ کے الفاظ دیکھ کر بعض لوگوں کو یوں لگتا ہے، جیسے اس موقع پر آپ ﷺ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا تھا، لیکن ہماری رائے میں اس جملے کا مفہوم ''اے خدائی عفو وکرم کی مظہر شخصیت!'' کی تعبیر سے قریب تر ہے۔

اس قسم کی تعبیر سے بات کا آغاز آپ ﷺ کی دلجوئی کے لیے کیا گیا اور تنبیہ پر مشتمل عبارت کو بعد میں ذکر کیا گیا، جس کے نتیجے میں دلجوئی کی فضا قائم ہوگئی، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ آغاز میں ہی رسول اللہ ﷺ سے فرماتے: ﴿لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ ﴾ تو شاید خشیت الٰہیہ سے آپ ﷺ کا قلب اطہر پھٹ جاتا۔ سید البشر ﷺ کے حق میں اس ادب کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا، یہی وجہ ہے کہ نحاس، مہدوی اور مکی جیسے ماہرینِ لسانیات اور مفسرین حضرات کی رائے میں یہ آیت مبارکہ تنبیہ کی بجائے ہدایات پر مشتمل ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ اپنے رسول اللہ ﷺ سے یوں کہنا چاہتے تھے:

''جو بھی آپ کے پاس اجازت لینے کے لیے آیا آپ نے اسے بلا روک ٹوک اجازت دے دی، حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ اجازت مانگنے والوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں، جو بظاہر اسلام کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان کے دل نفاق وفساد سے بھرے ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ آپ نے انہیں اجازت کیوں دی؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس موقع پر اپنے ایمان کو ہمیشہ سچ ثابت کرنے والے سچے اور کھرے اہل ایمان ان جھوٹے منافقوں سے ممتاز ہو جاتے جن کے بارے میں آپ نے خود کہا تھا کہ جب (ان میں سے کوئی) بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے اور اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔''[293]

ایسے لوگوں کا پول کھولنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ ایک نہ ایک دن ان کی حقیقت رسول اللہ ﷺ پر کھلنے والی تھی، لیکن آپ ﷺ کی نرم مزاجی اور تسامح پسندی نے اس معاملے کو کچھ مؤخر کر دیا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کو تنبیہ کی بجائے تذکیر کی گئی ہے، بلکہ غور کیا جائے تو اس سے آپ ﷺ کی مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ حاصل یہ کہ یہاں آپ ﷺ کی زیادہ اچھا اور بہتر طرز عمل اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کیونکہ یہی آپ ﷺ کو شایاں تھا۔

زمخشری کی رائے میں چونکہ یہاں ''عفو'' کا ذکر ہے، اس لیے گناہ کا پایا جانا بھی ناگزیر ہے،(294) لیکن امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں اس رائے کو سختی سے رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بات ہمارے حق میں تو درست ہوسکتی ہے، لیکن جب انبیائے کرام کے بارے میں ''عفو'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اسے صرف تکریم وتوصیف پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے۔(295) ہماری بھی یہی رائے ہے اور ہم اسے رسول اللہ ﷺ کی مدح پر محمول کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا رسول اللہ ﷺ بہت ہی صاحب فراست انسان تھے۔ آپ ﷺ معاملات سے بخوبی واقف تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ احکامات پر کیسے عملدرآمد کرانا ہے، تاہم اس آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک متبادل حکمت عملی پیش کی گئی ہے، وہ یہ کہ ان لوگوں کو پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی تاکہ منافقین اور اہل ایمان کے درمیان فرق واضح ہوجاتا۔ منافقین کو اجازت دے کر ایک ایسا موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے تھا کہ جس کا سہارا لے کر وہ اچھی طرح پہچانے جانے سے بچ جائیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر رسول اللہ ﷺ منافقین کو اجازت نہ بھی دیتے، تب بھی وہ مسلمانوں کے ساتھ اس غزوے میں شریک نہ ہوتے، لیکن اس صورت میں ان کی منافقت کا پول کھل جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی تھا اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے بھی یہی چاہتے تھے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منافقین کے بارے میں بتادیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ اس امتحان کے ذریعے ان کے نفاق کو ظاہر کرنا چاہتے تھے، تاہم رسول اللہ ﷺ کے فطری عفو وکرم کے باعث انہیں عدم شرکت کی اجازت دینے سے یہ موقع ضائع ہوگیا۔

یہ طرز عمل رسول اللہ ﷺ کے عمومی اخلاق کا نتیجہ تھا۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کی پردہ دری فرمائی اور نہ ہی کسی کا نام لے کر اس کی غلطی کی نشان دہی کی، بلکہ آپ ﷺ ہمیشہ اشارات وکنایات میں بلاتعین صحابہ کی غلطیوں کی اصلاح فرماتے، جس کے نتیجے میں کسی بھی شخص کی عزتِ نفس مجروح نہ ہوتی۔ ہر انسان اپنی طبیعت اور اخلاق کے مطابق رویہ اختیار کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنے اعلیٰ اخلاق کے مطابق طرز عمل اختیار فرماتے تھے۔ کوئی بھی نبی کسی کی پردہ دری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے مخاطب کو نقصان پہنچانے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے کسی شخص کے عیوب کو ظاہر کرکے اسے رسوا یا شرمندہ کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں، مثلاً آپ ﷺ ایک ایک منافق کو جانتے تھے اور ان کے سرغنے سے بھی واقف تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس راز کو کبھی افشا نہ فرمایا، بلکہ ان کے ساتھ بھی دیگر اہل ایمان جیسا برتاؤ فرماتے رہے، حتیٰ کہ ایک دن ایک منافق نفاق سے تائب ہوکر ندامت کا اظہار کرتے

ہوئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کو بتایا کہ وہ بہت سے منافقین کو جانتا ہے اور ان کے ناموں کے اظہار اور انہیں توبہ کرنے کی دعوت دینے کے لیے تیار ہے، لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ کسی کی پردہ دری پسند نہ فرماتے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اُس کی اس تجویز کو قبول نہ فرمایا۔

عبداللہ بن ابی بن سلول آپ ﷺ کا سخت ترین دشمن تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ اس کے ظاہر کے مطابق برتاؤ فرماتے اور چاہتے کہ وہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہو جائے جیسا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ اس کی موت تک اس کی ہدایت سے مایوس نہ ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں نفاق پر مرنا لکھ دیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے کفن دینے کے لیے آپ ﷺ سے آپ کی قمیص مانگی، نیز اس کی نماز جنازہ پڑھانے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی درخواست کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تمام مطالبات کو قبول فرمایا۔ آپ ﷺ نے اسے اپنی قمیص عطا فرمائی اور اس کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔(296) چونکہ اس منافق کا بیٹا اور بیٹی مخلص مسلمان تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اس کی تمام حرکتوں کو برداشت فرمایا اور اس کا راز افشا نہ فرمایا۔

اس کی مزید وضاحت اس مثال سے ہوتی ہے کہ ایک صحابی نے اپنی کنیز فروخت کرنا چاہی، لیکن وہ اس کی ''ولاء'' اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، حالانکہ اسلامی قانون کی رو سے غلام کی ولاء اسے آزاد کرنے والے کو ملتی ہے۔ مطالبہ درست تھا اور نہ ہی مناسب، بلکہ اسلامی قانون سے متصادم تھا۔ ممکن ہے اس صحابی کو اس بارے میں اسلامی قانون کا علم نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس معاملے کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر ڈانٹ نہیں پلائی، بلکہ آپ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور کسی کا نام لیے بغیر اس حکم کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''ولاء غلام کو آزاد کرنے والے کا حق ہے۔''(297)

اس بارے میں اور بھی بہت سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی گنہگار اپنے گناہ کی وجہ سے آپ ﷺ سے ڈرتا تھا اور نہ ہی آپ ﷺ کسی کو اس کے گناہ یا غلطی کی وجہ سے پریشان کرتے تھے۔

اجازت کے اس معاملے میں بھی آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ نے اہم کردار ادا کیا۔ آپ ﷺ نے اجازت مانگنے والوں میں سے کسی کی پردہ دری کرنے کو پسند نہ فرمایا اور ان کے ظاہر کو قبول کرتے ہوئے انہیں اجازت دے دی۔ آپ ﷺ بہت وسیع ظرف کے مالک تھے، چنانچہ ارشادِ ربانی

ہے: ﴿اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ﴾ (الانشراح: ۱) ’’(اے محمد) کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ (بے شک کھول دیا)۔‘‘ آپ ﷺ کی شخصیت میں اس آیت مبارکہ کے راز کا اظہار ہوتا تھا۔ جب منافقین کسی معاملے میں جھوٹ بولتے تو آپ ﷺ انہیں فضیحت کرنے کی بجائے ان کے جھوٹ پر پردہ ڈال دیتے اور انہیں عملی طور پر اخلاقِ نبویہ کا مشاہدہ کراتے۔ آپ ﷺ کس قدر عظیم نبی ہیں کہ جن کی مدح سرائی میں تورات، انجیل اور فرقان حمید سب رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

۳۔ سورت عبس

بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ سورت عبس میں رسول اللہ ﷺ پر عتاب کا اظہار کیا گیا ہے اور بعض لوگ اس کی آڑ میں آپ ﷺ کی روز روشن کی طرح واضح عصمت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، اسی لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سورت کا شان نزول ذکر کرنے کے بعد آپ ﷺ کی عصمت کے اثبات کے لیے اس سورت کی بعض آیات کے مفہوم کی وضاحت کریں۔

ان آیات کے شان نزول کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ پیغام رسالت پہنچانے اور دین کی دعوت دینے کے لیے عتبہ اور ابوجہل جیسے سردارانِ قریش کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ بھرپور توجہ کے ساتھ اس دعوتی گفتگو میں مصروف تھے کہ ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: ’’جو باتیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائی ہیں وہ مجھے بھی سکھائیے اور پڑھائیے۔‘‘ چونکہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے قریش کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہونے کا علم نہ تھا، اس لیے انہوں نے اپنی یہ بات بار بار دہرائی۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کی یہ قطع کلامی پسند نہ آئی اور آپ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ان سے منہ پھیر لیا، جس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اگر ہم اس موضوع کو اس پہلو سے دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ صحابی بصارت سے محروم نہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ پر عتاب نہ ہوتا۔ حاصل یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے نابینا ہونے کی وجہ سے ان سے تسامح برتنا چاہیے تھا، لہٰذا آپ ﷺ کی ناگواری اور اعراض تنبیہ کا باعث بنا۔ یہ اس واقعے کی بالکل سطحی توجیہ ہے۔ اگر ہم گہرائی سے دیکھیں کریں تو ہمیں اس توجیہ کی سطحیت کا اندازہ ہو جائے گا اور اس صورت حال کا ایک اور رُخ سامنے آئے گا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی بھی مجلس میں آنے کے کچھ آداب و شرائط ہوتے ہیں،

پھر رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضری کسی عام مجلس میں حاضری سے بالکل مختلف تھی۔ اس میں کسی عام مجلس والا طرز عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی قرآنی آیات میں مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضری کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً کب حاضر ہوا جائے؟ کتنی دیر ٹھہرا جائے؟ (298) اور کیسے پست آواز میں آپ ﷺ سے گفتگو کی جائے۔ (299) غرض اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور کی مسلمانوں کو تعلیم دی تھی۔

یہ حکم اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کے دوران بھی ہے۔ نمازی کے آگے سے گزرنے کی ممانعت اس کی عمدہ مثال ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو تنبیہ کی جانی چاہیے، جبکہ مالکی فقہ کے مطابق اسے بزور بازو ایسا کرنے سے روکا جائے اور اگر وہ اس پر اصرار کرے تو اس کے سینے پر ضرب لگانے کی بھی اجازت ہے۔ (300) اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا سلطانِ جہاں اور مالک الملک کے حضور کھڑے ہو کر اس سے محوِ گفتگو ہوتا ہے۔ جب گفتگو میں مصروف دو عام انسانوں کے درمیان سے گزرنا معاشرتی آداب کی رو سے مناسب نہیں تو نمازی کے آگے سے گزرنا کیسے روا ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو اس کام کے گناہ کا علم ہوتا تو اس کا چالیس (دن، ماہ یا سال وغیرہ) تک کھڑے رہنا اس کے آگے سے گزرنے سے بہتر ہوتا۔'' (301) جس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کے کچھ آداب ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی مجلس کے بھی کچھ آداب ہیں۔

اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے دل کے الہامات کو جمود کا شکار سنگ دل لوگوں کی طرف منتقل کر رہے تھے۔ قرآن کریم لوگوں کی ہدایت پر آپ ﷺ کی حرص کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً﴾ (الکہف: ۶) ''اے پیغمبر! اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔'' نیز ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (الشعراء: ۳) ''اے پیغمبر! شاید تم اس (رنج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔''

آپ ﷺ جب بھی کسی کافر کو دیکھتے تو آپ ﷺ کو شدید دکھ ہوتا اور غم کی شدت سے آپ کی جان نکلنے لگتی۔ نبی کریم ﷺ پوری توجہ کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دینے میں مصروف تھے کہ ایک صحابی نے آ کر گفتگو شروع کر دی اور اس وقت قائم فضا میں خلل ڈال دیا۔ اگرچہ نابینا ہونے کی وجہ سے آنے والا شخص معذور تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ بھی ناگواری کا اظہار اور اعراض کرنے میں شرعاً معذور تھے۔ ہم اس واقعے کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کرنے والوں سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان کے موقف کو غلط قرار دیتے ہیں۔

یہ جواب تو اس صورت میں ہے، جب یہ واقعہ اسی انداز میں پیش آیا ہو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، لیکن یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند ابن حنبل اور مستدرک وغیرہ حدیث کی معتبر کتابوں میں یہ واقعہ اس طرح مذکور نہیں، جس طرح بعض کتب تفسیر میں مذکور ہے، جن میں نبی کریم ﷺ، ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ، ابوجہل اور عتبہ کے نام کی تصریح ہے۔ محقق مفسرین نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے شخص کے مختلف نام ذکر کیے ہیں، بلکہ ان میں اس بات پر بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا وہ شخص واقعی بصارت سے محروم تھا یا اسے مجازاً نابینا کہا گیا ہے۔ یہ صورت حال اس واقعے کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی متقاضی ہے۔

اس سلسلے میں ابن ام مکتوم کے علاوہ سات ناموں کا تذکرہ ملتا ہے، گویا ناموں کی کل تعداد آٹھ ہے اور اس واقعے میں ابن ام مکتوم کے نام کے حق میں کوئی ترجیحی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بہت سے غزوات کے موقع پر اس جلیل القدر صحابی کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام نامزد فرمایا۔ راجح قول کے مطابق انہوں نے جنگ قادسیہ میں شہادت پائی[302] نیز وہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ماموں زاد بھائی ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے قرابت دار بھی تھے، لہٰذا ان کے اس مجلس میں حاضر ہونے کی کوئی وجہ ترجیح موجود نہیں، مزید برآں ان کے بینائی سے محروم ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا انہیں مدینہ میں اپنا قائم مقام نامزد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مناسب اقدام اٹھانے اور گفتگو کے آداب سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا ہماری رائے میں اس واقعے کے ضمن میں ذکر کردہ ناموں میں ان کے نام کے شامل ہونے کا احتمال سب سے کمزور ہے۔

ممکن ہے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والا نابینا شخص بری نیت سے آیا ہو۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اس کے عدم اخلاص کا علم تھا، اس لیے آپ ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اعراض فرمایا، جو بالکل فطری ردعمل تھا، تاہم ہم اپنی توجیہ پر اصرار کرتے ہیں اور نہ ہی اسے بہت مضبوط قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ابن ام مکتوم سے متعلق روایت اس سے زیادہ قوی نہیں ہے، لہٰذا ہم دونوں احتمالوں کو مساوی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یہاں ایک اور قابل توجہ نقطہ بھی ہے، وہ یہ کہ بعض اہل علم کی رائے میں "عبس" اور "تولّی" کی ضمیر کا مرجع ولید بن مغیرہ ہے۔ "عبس" کا لفظ قرآن کریم میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ ایک دفعہ اس مقام پر اور دوسری دفعہ سورت مدثر میں ایک کافر کے بارے میں۔ سورت مدثر میں مذکور کافر ولید بن مغیرہ ہو یا نہ ہو (عقاد کی رائے میں سورت مدثر میں مذکور کافر ولید بن مغیرہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ آیت

مبارکہ اسے ''زنیم'' (ولدالزنا) قرار دیتی ہے، جبکہ حضرت خالد بن ولید کے والد اگرچہ کافر تھے، لیکن معروف النسب اور خاندانی انسان تھے اور معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔) صحیح احادیث سے اس شخص کے ولید بن مغیرہ ہونے کی تائید نہیں ہوتی۔ جب قرآن کریم نے "عبس" کا لفظ ایک کافر کے لیے استعمال کیا ہے تو وہ اسے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کیسے استعمال کرسکتا ہے، جن کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم رہتا تھا۔

یہی بات "تولّی" کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ فعل فرعون کے بارے میں استعمال کرتے ہوئے کہا ہے: ﴿فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ﴾ (طٰہٰ: ٦١) ''تو فرعون لوٹ گیا۔'' اگرچہ یہ فعل صرف فرعون کے لیے استعمال نہیں ہوا، لیکن اس اسلوب میں اسی کی مانند لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے،(303) لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآنِ کریم اس قسم کے دو فعل یکے بعد دیگرے رسول اللہ ﷺ کے لئے استعمال کرتے ہوئے آپ ﷺ کی شخصیت کی ایسی تصویر پیش کرنے کو مناسب خیال کرے؟

آخری احتمال پیش کرنے والے حضرات کی بات لائقِ توجہ ہے۔ ممکن ہے ان کی رائے درست ہو۔ ان کے رائے میں "عبس" اور "تولّی" کا فاعل رسول اللہ ﷺ کی ذات نہیں، بلکہ حقیقت کو دیکھنے سے محروم کافر ہے، جو اندھوں کی طرح آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تیوری چڑھا کر آپ ﷺ سے منہ پھیر لیا۔ اگر عصمت انبیاء کو پیش نظر رکھا جائے تو شاید یہ احتمال صحیح ہو۔ میرے علم کے مطابق کوئی روایت اس رائے سے متصادم نہیں، لہٰذا اگر آیت کے سیاق وسباق سے اس کی تائید ہوتی ہو تو اس احتمال کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اوپر ذکر کردہ امور جن میں سے بعض کو ہم نے ''محتمل'' اور بعض کو ''مضبوط'' قرار دیا ہے، سے ہمارا مقصود سنت مطہرہ کے تقدس کو ثابت کرنا ہے۔ بعض لوگ رسول اللہ ﷺ کی تنبیہ پر مشتمل آیات کو سرسری انداز میں پیش کر کے سنت مطہرہ کے مقام کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس الٰہی ماخذ کے بارے میں غیر مناسب دعوے کر کے مسلمانوں کے دلوں میں نبوت اور سنت کے مقام کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کمزور اور بے بنیاد ہیں اور ان کا متبادل پیش کیا جاسکتا ہے، تاہم انسانیت حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے مقام سے بخوبی واقف ہے۔

رسول اللہ ﷺ ایک ممتاز اور بے مثال انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک منفرد دور میں آپ ﷺ کے ساتھ ایک مضبوط تعلق قائم فرما کر آپ پر وحی نازل فرمائی، جسے آپ ﷺ نے انسانیت

تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ ﷺ کی عصمت کی حفاظت فرمائی، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ جذبہ وفاداری کے اظہار اور آپ ﷺ کے ہم پر واجب حق کی ادائیگی کے لئے آپ ﷺ کی عصمت کا دفاع کریں، یہی وجہ ہے کہ ہم اس موضوع پر اتنے جذباتی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ بہت سے ملکی اور بیرونی افراد اور ادارے اس عظیم اور یکتائے زمانہ شخصیت کو عام لوگوں کی طرح نقد و جرح کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم آپ ﷺ کی عصمت و عفت کے دفاع کو اپنی عزت و ناموس کے دفاع پر مقدم سمجھتے ہیں، تاہم ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہماری صلاحیتیں محدود اور دشمنانِ اسلام اور ان کے حواریوں کے مقابلے کے لیے ناکافی ہیں، کیونکہ وہ تخریب میں اور ہم تعمیر میں مصروف ہیں۔ وہ عالمی سطح پر پروپیگنڈے کے حیران کن وسائل سے کام لیتے ہیں، جبکہ ہمارے پاس حقیر سے ذرائع ہیں، تاہم جس طرح وہ ہر دور میں عقلی اور علمی سطح پر مغلوب رہے ہیں، اسی طرح مستقبل میں بھی ان کا یہی انجام ہوگا، کیونکہ وہ چھلنی سے آفتاب کو چھپانا چاہتے ہیں، اگرچہ ہم ان کے اٹھائے گئے ہر سوال کا جواب نہیں دے سکتے، لیکن ہمیں اپنے آباؤاجداد کے اس قدیم مقولے کی صداقت پر یقین ہے:

لو کل کلب عوی ألقمته حجراً لأصبح الصخر مثقالاً بدینار

''اگر تم نے ہر بھونکنے والے کتے کے منہ میں پتھر دے دیا تو ایک مثقال پتھر کی قیمت ایک دینار ہو جائے گی۔''

یہاں میں رسول اللہ ﷺ سے متعلق ایک اہم موضوع کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ مستقبل سے متعلق آپ ﷺ نے جو پیش گوئیاں فرمائی تھیں، انہیں آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور وہ ہمارے حالات پر پوری اترتی ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ''دھواں پھیل جائے گا۔ مؤمن کو تو مثل زکام کے لگے گا اور کافر کے جوڑ جوڑ سے نکلے گا۔''(304)

مادی فلسفہ جو حق اور حقیقت کی بات سننے کے لیے تیار نہیں، نے نہ صرف کفر و الحاد میں مبتلا انسانوں کو روحانی اعتبار سے تباہ و برباد کر دیا ہے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان بھی شکوک و شبہات پھیلا دیئے ہیں، جس کے نتیجے میں یہ مرض مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکا ہے۔

عربی زبان سے نابلد اور اس کے اسرار و رموز سے ناآشنا بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے معانی یعنی ترکی ترجمہ ان کے لیے کافی ہے، نیز انہیں سنت مطہرہ اور احادیث نبویہ کی بھی

ضرورت نہیں۔ یہ اتنا معمولی مسئلہ نہیں، جتنا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے، بلکہ یہ مہم ابو جہل، عتبہ اور شیبہ کے دور سے شروع ہوئی اور علم کے لبادے میں گولڈزیہر (Goldziher) جیسے مستشرقین کے دور تک جاری رہی ہے، نیز والٹیر (Volter) جیسے لوگوں کی وجہ سے اسے ڈرامہ اور ادب کی دنیا میں پذیرائی ملی۔ اس کے سوتے ملک سے باہر ہیں۔ اسلامی ممالک کے بعض لوگ ان کے ثانوی نمائندے ہیں، جو شہرت یا معمولی مادی مفاد کی خاطر مخصوص کردار کرتے ہیں، چنانچہ آپ نے انہیں یہ کہتے سنا ہوگا: ''ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔ ہم ترجمے کی مدد سے ہر مشکل کو حل کر سکتے ہیں۔ عربی زبان کی کیا ضرورت ہے؟ کیا درجہ اجتہاد تک پہنچنے کے لیے قرآنِ کریم کے معانی کا ترجمہ ہمارے لیے کافی نہیں؟''

اس قسم کے باتیں عالم کفر کی تیار کردہ ایک منظم سازش کا صرف ایک حصہ ہے اور ان کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ فضا ان کے حق میں سازگار ہے یا نہیں، اگر انہیں فضا سازگار نظر آئی تو یہ باتیں اس حد تک محدود نہ رہیں گی۔

آج ہمیں ماضی کے کسی بھی دور سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی عزت و احترام کا احیا کرنے کی ضرورت ہے۔ احترام کے وہی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جو آپ ﷺ کے بارے میں صحابہ کرام اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ ہمارے لیے اس شعور کو اپنی شخصیت کا جزو لاینفک بنانا ناگزیر ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم رسول اللہ ﷺ کی عصمت سے اچھی طرح آگاہ ہوں اور اس کے برخلاف کسی احتمال پر سوچنے کے لیے بھی تیار نہ ہوں۔

صحابہ کرام آپ ﷺ کی مجلس میں آپ کی گفتگو سنتے ہوئے ایسے بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ (305) اس مجلس میں حضرت ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم جیسے بڑے بڑے صحابہ کرام بھی کسی کسی وقت ہی بات کرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ وحی الٰہی سے مؤید نبی کی مجلس میں بیٹھے ہیں، جس کی باتیں سننا متکلم ازلی کی باتیں سننے کے مترادف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر پر پوری آب و تاب کے ساتھ وحی الٰہی کا پرتو پڑتا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ سے واقف حضرات خاموشی کے ساتھ آپ کی گفتگو سننے کو ترجیح دیتے۔ کوئی اور کلام آپ ﷺ کے کلام کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا اور جب ہمیں صحابہ کرام کے فہم کا ذوق حاصل ہوگا تو ہم بھی آپ ﷺ کے بھلائی اور حسن سے مزین کلام کو غور سے سنیں گے اور اس میں اپنے صدیوں پرانے لاعلاج امراض کا علاج تلاش کریں گے۔

سنت نبویہ کا انکار یا بے توقیری کفر کا پیش خیمہ ہے۔ جو شخص اس راستے پر چلے گا، اس کا رسول

ﷺ سے رشتہ ٹوٹ جائے گا اور وہ امت مسلمہ کے دائرے سے نکل کر ابوجہل وغیرہ کے گروہ میں شامل ہو جائے گا۔

یہ انداز فکر انتہائی خطرناک ہے اور اس خطرے سے نمٹنے کا واحد طریقہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے گہری واقفیت پیدا کرنا ہے۔ بلاشبہ آپ ﷺ کی شخصیت کا ایک اہم ترین پہلو آپ کی عصمت ہے۔ سارے دین کا مدار اسی پر ہے اور اس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی بہت سی خرابیوں کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اسی لئے ہم اس موضوع پر بڑے اہتمام کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں۔

۴۔ قبیلہ ثقیف کی تجویز

اس سلسلے میں دو آیات کا تذکرہ ضروری ہے:

ان میں سے ایک آیت مبارکہ حسب ذیل ہے: ﴿وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ()وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ()إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا﴾ (الاسراء: ۷۳-۷۵) ''اور اے پیغمبر! جو وحی ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچلا دیں، تاکہ تم اس کے سوا اور باتیں ہماری نسبت بنا لو اور اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے، اس وقت ہم تم کو زندگی میں بھی (عذاب کا) دونا اور مرنے پر بھی دونا مزہ چکھاتے پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔''

قبیلہ ثقیف رسول اللہ ﷺ سے اپنے لیے بعض امتیازات کا خواستگار تھا۔(306) انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے تین سال تک ''لات'' بت کو منہدم نہ کیے جانے کا مطالبہ کیا، لیکن آپ ﷺ نے ان کے اس مطالبے کو مسترد فرما دیا۔ وہ ایک ایک سال کی کمی کے ساتھ یہ مطالبہ دہراتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے اپنی آمد سے ایک ماہ بعد تک کی مہلت مانگی، لیکن آپ ﷺ نے کسی بھی مقررہ مدت تک مہلت دینے سے انکار فرما دیا۔ بظاہر وہ یہ مطالبہ اس لیے کر رہے تھے تاکہ اپنی عورتوں، بچوں اور کم فہم طبقے کی طعن و تشنیع سے محفوظ رہیں۔ چونکہ وہ اپنی قوم کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کرنا چاہتے تھے، اس لیے وہ اس بت کو منہدم کر کے انہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے نماز کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیئے جانے اور اپنے بتوں کو خود اپنے ہاتھوں سے نہ توڑنے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس کے جواب

میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جہاں تک تمہارے بتوں کو خود تمہارے ہاتھوں سے توڑنے کا تعلق ہے، ہم تمہیں اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، لیکن نماز میں کوئی رعایت نہیں، کیونکہ نماز کے بغیر دین میں کوئی بھلائی نہیں۔'' یہ آیت مبارکہ اس قبیلے کے موقف اور اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے جرأت مندانہ موقف کی وضاحت کرتی ہے اور ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ میں کوئی ایسی بات نہیں، جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی عصمت پر زد پڑتی ہو۔

وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ آپ ﷺ کے دل کو اپنے حق میں مائل کر لیں گے، اسی لیے انہوں نے اس قسم کی بچگانہ تجویزیں پیش کیں۔ وہ جاہل اور وحی و نبوت کے مفہوم سے نا آشنا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ آپ ﷺ لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے شدید خواہش مند ہیں، اس لیے آپ ﷺ ہماری ایک بڑی تعداد کو دائرہ اسلام میں داخل ہوتا دیکھ کر نہ صرف ہمیں بعض خصوصی امتیازات سے نوازیں گے، بلکہ ہمارے حق میں بعض فرائض سے بھی چشم پوشی فرمائیں گے۔

یہ ان کی توقعات تھیں، لیکن رسول اللہ ﷺ کے دل میں ایسی کسی بات کا خیال تک نہیں آیا۔ دین ایک وحدت سے عبارت ہے۔ اگر اس کے حصے بخرے کر دیئے جائیں تو ان مختلف اجزاء پر دین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس قسم کی سوچ کا علم و دانش سے کوئی رشتہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ صاحب استقامت انسان تھے۔ آپ ﷺ نے جو بات دعوت کے آغاز میں ارشاد فرمائی تھی، آخر تک اس پر قائم رہے۔ دین اسلام دین استقامت ہے، جو انسانیت کو صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا ہے، لہٰذا اس کے احکام میں تضاد کا پایا جانا ممکن نہیں۔

رسول اللہ ﷺ ایسے انسان نہ تھے کہ ایسی تجویز پر سوچنا بھی گوارا فرماتے، بلکہ آپ ﷺ کے شاگرد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنہ ارتداد کے دوران بعض قبائل کی طرف سے نماز کی ادائیگی، مگر زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی تجویز کو قبول نہ کرتے ہوئے ان سے جنگ کی۔(307) اس سے ثابت ہوا کہ ان آیات مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی گناہ کی نسبت نہیں کی گئی، بلکہ بعض جاہلوں کی کچھ ایسی تجاویز کی طرف اشارہ ہے، جن کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ ﷺ اس قسم کے افکار سے منزہ و مبرا تھے۔

دوسری آیت ﴿وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا﴾ کا حاصل یہ ہے کہ اگر ہم آپ کو پہاڑ کی مانند ثابت قدمی عطا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ آپ کے دل میں ان کی تجویز کی طرف معمولی سا میلان پیدا ہو جاتا۔ یہ بات محال کو فرض کرتے ہوئے کہی گئی ہے، لہٰذا اس آیت مبارکہ

کو رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور علوِ شان کے مظہر کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اس قدر مضبوط ایمان عطا کیا ہے کہ آپ اس سے بال برابر بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔

اگر رسول اللہ ﷺ نبوت و رسالت سے سرفراز نہ ہوتے، بلکہ کسی عام دعوت کے علمبردار یا فکری و معاشرتی مصلح ہوتے تو نرمی کا اظہار کر کے ان لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط بنانے اور ان کے دلوں کو جیتنے کے لیے آپ کے دل میں ان کی بعض باتیں مان لینے کا خیال پیدا ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے، لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ نبی تھے، اس لیے آپ اس قسم کی کمزوری سے پاک تھے۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ جو شخص دین کو من حیث المجموع قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا سے دین کے ساتھ جوڑنا فضول ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ انہیں اس قسم کی رعایتیں کیوں دیتے؟ اور ان کی خاطر دین کے احکام میں تبدیلی کیوں کرتے؟ مزید برآں آپ ﷺ تو محض نبی تھے، جن کا کام اللہ تعالیٰ کے احکامات و منہیات کو انسانیت تک پہنچانا تھا۔ احکامات و منہیات کے حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ اللہ کے سوا اس کا اختیار کسی کے پاس نہیں۔

آیت مبارکہ ﴿ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴾ سے ہم درج ذیل مفہوم بھی اخذ کر سکتے ہیں: ''اگر ہم وحی کے ذریعے آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے اور آپ کے تمام اعمال وحی کی نگرانی میں نہ ہوتے تو آپ بھی دوسروں کی طرح تبلیغِ دین کے سلسلے میں عقل و منطق کا راستہ اختیار کرتے اور ممکنہ طور پر آپ کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ بہتر ہے کہ فی الحال میں ان کی شرائط کے مطابق انہیں قبول کر لوں اور پھر رفتہ رفتہ دین کے ساتھ ان کا رشتہ مضبوط بناتا رہوں جس کے نتیجے میں ایک دن ان کا ایمان کامل ہو جائے گا، لیکن چونکہ ہم نے آپ کو ثابت قدم رکھا اور آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی آپ کے نفس کے حوالے نہیں کیا، اس لیے آپ کے دل میں اس کا خیال گزرا اور نہ ہی آپ نے ان کی طرف کسی قسم کے میلان کا اظہار کیا۔

ایک دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ آپ طبعی طور پر ان کی ہدایت کے بہت زیادہ خواہاں تھے، بلکہ ان کے ایمان نہ لانے پر افسوس سے آپ کی جان نکلنے لگتی تھی، اس لیے ان پر ہدایت کا دروازہ کھلا رکھنے کے لیے ممکن تھا کہ ان کی تجویز کی طرف آپ کا کچھ میلان ہو جاتا، لیکن ہم نے آپ کو اپنے احساسات اور جذبات کو متوازن رکھنے کے لیے استقامت کی صورت میں ایک ایسا معیار اور پیمانہ عطا کیا ہے، جس کے ذریعے آپ افراط و تفریط میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہیں۔

جذبہ رحمت میں افراط کی وجہ سے ممکن تھا کہ آپ ان کی تجویز کی طرف قدرے مائل ہو جاتے، لیکن ہم نے آپ کی اس سے حفاظت فرمائی، کیونکہ آپ میں جذبۂ رحمت متوازن ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کہاں، کتنی اور کس پر رحمت وشفقت کرنی ہے، لہٰذا آپ رحمت کے نام پر گمراہ لوگوں کو اپنی حفاظت وحمایت میں لے کر اپنی رحمت کو کبھی بھی خدا کی رحمت پر مقدم نہ کریں گے۔

مولانا جلال الدین رومی سے منسوب قول: ''آجاؤ! آجاؤ! جو کچھ بھی ہو آجاؤ!'' مفہوم کے اعتبار سے بالکل درست اور رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے ماخوذ ہے۔ آپ ﷺ بہت وسیع دل کے مالک تھے اور بلا استثناء ہر انسان کو ہدایت کی طرف بلاتے تھے۔ بالفرض اگر دو ایک انسانوں کے سوا ساری انسانیت ہدایت پا جاتی، تب بھی آپ ﷺ ان دو ایک افراد کی ہدایت کی پوری کوشش فرماتے اور اس سلسلے میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔ آپ ﷺ کے آسمان جیسی وسعت کے حامل دل میں ہر کسی کے لیے جگہ تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت نہ فرماتے تو شاید آپ ﷺ صرف اللہ کی وحدانیت کی گواہی دینے والوں کو بھی اپنی صف میں شامل فرما کر اپنے سایۂ رحمت میں لے لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو متوازن جذبات عطا فرما کر آپ ﷺ کو ایسی غلطی کے ارتکاب سے محفوظ رکھا۔

﴿لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ﴾ کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ بالفعل ان کی طرف مائل ہو گئے تھے، کیونکہ ایک ممکنہ واقعے کو عملاً وقوع پذیر سمجھنا درست نہیں۔ ایسی سوچ فکری کمزوری اور رسول اللہ ﷺ کی علوِ شان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، نیز ان آیات کے سیاق وسباق سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ان کی طرف قطعاً مائل نہ ہوئے تھے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَإِن كَادُواْ لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذاً لَّا يَلْبَثُونَ خِلافَكَ إِلَّا قَلِيلا﴾ (الاسراء: ٧٦) ''اور قریب تھا کہ یہ لوگ تمہیں زمین (مکہ) سے پھسلا دیں تاکہ تمہیں وہاں سے جلاوطن کر دیں اور اس وقت تمہارے پیچھے یہ بھی نہ رہتے مگر کم۔''

۵- فقراء کے ساتھ آپ ﷺ کا برتاؤ

ایک اور آیت بھی بظاہر تنبیہ دکھائی دیتی ہے، لیکن درحقیقت اس میں آپ ﷺ کی توصیف بیان کی گئی ہے۔ اس کا نزول اس وقت ہوا جب کچھ سردارانِ قریش نے آپ ﷺ سے غلاموں اور کمزوروں کو اپنی مجلس سے اٹھا دینے کا مطالبہ کیا، کیونکہ وہ ان مساکین کی موجودگی میں آپ ﷺ کی مجلس میں شرکت کو روا نہ سمجھتے تھے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت

خباب بن ارت، صہیب، بلال اور عمار بیٹھے تھے کہ کچھ سردارانِ قریش کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے آپ ﷺ سے کہا: ''اے محمد! کیا تم ان لوگوں کے ساتھ خوش ہو؟ اگر تم انہیں اپنے سے دور کر دو تو ہم تمہاری پیروی اختیار کر لیں گے۔''(308) اس پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں۔ ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ﴾ (الأنعام: ٥٢) ''اور جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں (اور) اس کی ذات کے طالب ہیں ان کو (اپنے پاس سے) مت نکالو۔ ان کے حساب (اعمال) کی جوابدہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی ان پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔''

سورت کہف میں اسی مفہوم پر مشتمل ایک اور آیت مبارکہ حسب ذیل ہے: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾ (الکهف: ٢٨) ''اور جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، ان کے ساتھ صبر کرتے رہو اور تمہاری نگاہیں ان میں سے (گزر کر اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگانی دنیا کے خواستگار ہو جاؤ۔ جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا۔''

جونہی رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا، بہت سے غریب لوگ اور غلام آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ غربت اور غلامی اس کافرانہ نظام میں معیوب سمجھی جاتی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین میں امتیاز اور رفعت صرف اور صرف تقوی اور خشیت الٰہیہ کی بنیاد پر ملتی تھی۔(309) اس دین کی نظر میں مالداروں کو غریبوں پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جنت چار افراد علی بن ابی طالب، عمار بن یاسر، سلمان فارسی اور مقداد بن اسود کی مشتاق ہے۔''(310) یہ چاروں کے چاروں غریب تھے۔ ساری دنیا جنت کی مشتاق ہے، لیکن جنت خود ان چاروں کی مشتاق ہے، لہٰذا آپ ﷺ سے یہ کیسے ممکن تھا کہ محبت الٰہیہ سے لبریز اور ہمہ وقت یادِ خدا میں مصروف رہنے والے اپنے مقرب احباب کو اپنے سے دور کرتے؟

ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال کو غصے میں ''حبشن کا بیٹا'' کہہ کر عار دلائی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم میں ابھی تک جاہلیت کے اثرات باقی ہیں۔'' اور پھر آپ ﷺ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''یہ تمہارے ماتحت بھائی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارا ماتحت بنایا ہے۔ اگر کسی کا کوئی بھائی اس کے ماتحت ہو تو جو خود کھائے، اس میں سے اسے بھی کھلائے۔ جو خود پہنے اس میں سے اسے بھی پہنائے۔ انہیں کسی ایسے کام پر مامور نہ کرو، جس سے وہ عاجز آ جائیں اور اگر انہیں کوئی مشکل کام کہو تو اس میں ان کا ہاتھ بھی بٹاؤ۔''(311)

آپ ﷺ اتنے متواضع نبی تھے کہ ہر کوئی آپ کی مجلس میں آ سکتا تھا۔ یہ آپ ﷺ کے دین کی فطرت اور روح کا تقاضا تھا۔ مالدار ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، حاکم ہو یا خادم تمام اہل ایمان فریضہ عبادت کی ادائیگی کے لیے ایک ہی مسجد میں حاضر ہو کر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے تھے، لہٰذا اس دین کے نبی سے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ بعض اہل ایمان کو ان کے فقر کی وجہ سے اپنے سے دور کرتے؟ کیا یہ نبی اللہ تعالیٰ سے یہ دعا نہ کرتے تھے: ''اللّھم أحيني مسكيناً وأمتني مسكيناً واحشرني في زمرة المساكين يوم القيامة.''(312) ''اے اللہ! مجھے مسکنت کی حالت میں زندہ رکھ، مسکنت کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مساکین کے زمرے میں میرا حشر فرما۔'' کیا ایسی دعا مانگنے والے سے اپنے غریب دوستوں کو اپنی مجلس سے اٹھانا ممکن ہے؟ ایسا قطعاً ممکن نہیں۔ آپ ﷺ نے اپنی مجلس سے کبھی کسی غریب کو اٹھایا اور نہ ہی آپ ﷺ کے دل میں ایسا کرنے کا کبھی خیال گزرا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ سب کی ہدایت کی خواہش مند تھے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے لیے دعا فرمائی، بلکہ ایک روایت کے مطابق تو ابوجہل جس کا نام عمرو بن ہشام تھا کو بھی دعا میں شامل فرما کر یوں دعا فرمائی: ''اے اللہ! ابوجہل اور عمر بن خطاب میں سے جو تجھے زیادہ پسند ہے، اس کے ذریعے اسلام کو عزت عطا فرما''۔(313) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو یوں بھی دعا فرمائی: ''اے اللہ! عمر بن خطاب کے ذریعے اسلام کی تائید فرما۔''(314)

ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مستقبل کے حالات پر مطلع فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہونے والی فتوحات سے آپ ﷺ کو آگاہ کر دیا ہو یا آپ ﷺ نے اپنی فراست سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں اور قابلیت کا اندازہ لگا لیا ہو، جس کے نتیجے میں ان کے لیے یہ دعا فرمائی ہو۔

سردارانِ قریش کا اسلام کی ہدایت کو قبول کرنا آپ ﷺ کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ آپ ﷺ نے ان کے دلوں کو جیتنے کے لیے متعدد بار انہیں اپنے گھر بلا کر ان کی کھانے سے ضیافت کی لیکن انہوں نے ہر بار آپ ﷺ کی دعوتِ اسلام کو ٹھکرا دیا۔ نہ جانے کتنی دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کا یہ قیمتی موقع اکابرین قریش کے سامنے پیش کیا ہوگا، لیکن انہوں نے اس کی اہمیت جانی اور نہ ہی اس کی کماحقہ قدر کی۔

اب ان بڑے سرداروں کی طرف سے آپ ﷺ کو ملاقات کی پیش کش ہوئی تھی۔ کیا ان کے دل میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی خواہش نے جنم لیا تھا؟ اگر چہ آپ ﷺ کو اس بارے میں یقین نہ تھا، لیکن یہ احتمال جتنا بھی کمزور کیوں نہ ہو، اس نے رسول اللہ ﷺ کے دل میں امید کی کرن پیدا کر دی۔ اگر یہ احتمال درست ثابت ہو جاتا تو یہ اسلام کے حق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی طرح کی فتح ونصرت سمجھی جاتی۔

تاہم انہوں نے اسلام کی روح سے متصادم تجویز پیش کی اور رسول اللہ ﷺ کو ان کی اس تجویز پر شدید افسوس ہوا۔ اس قسم کی تجاویز پہلے انبیائے کرام کے سامنے بھی پیش کی جا چکی تھیں، اس لیے آپ ﷺ نے بھی دیگر انبیائے کرام کی طرح اس تجویز کو رد کر دیا، تاہم اس پر حزن والم کو روکنا آپ ﷺ کے اختیار میں نہ تھا، کیونکہ یہ لوگ جھوٹے گھمنڈ میں اپنے گھر کی دہلیز پر آئی ہوئی ہدایت کو ٹھکرا رہے تھے۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے حزن کا باعث تھی اور آیت مبارکہ اس بارے میں آپ ﷺ کو معذور قرار دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے غریب صحابہ کو اپنی مجلس سے اٹھائے بغیر دوسروں کی ہدایت کے لیے مزید طریقوں کی جستجو میں لگے رہنے کا عزم کیا۔ آپ ﷺ کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا اور آیت مبارکہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۶۔ یاددہانی

میں یہاں ایک اہم نقطے کی طرف اشارہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ اور تمام اہل ایمان کو بہت سے احکامات کا مخاطب قرار دیا گیا ہے۔ یہ اوامر ونواہی احکامات کی مانند ہیں۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رسول اللہ ﷺ یا دیگر اہل ایمان ان کے برعکس طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے تھے، مثلاً جب قرآنِ کریم نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے

بارے میں خطاب کرتا ہے تو اس خطاب کی حیثیت اوامر کی ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ صوم وصلوۃ کی پابندی اور زکوۃ کی ادائیگی نہیں کرتے تھے اور نہ ہی یہ اس بارے میں آپ ﷺ کو تنبیہ ہے۔[315] لہٰذا آیت مبارکہ ﴿و لاتطرد الذین یدعون ربّھم بالغداۃ و العشی﴾ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے کہہ رہے ہیں: ''آپ نے اپنے پروردگار کو پکارنے والوں کو کیوں اپنے سے دور کیا؟'' یہ مفہوم آپ ﷺ کی عصمت کے منافی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا، جس سے اشارۃً یا کنایۃً بھی اس حکم کی مخالفت لازم آتی ہو، بلکہ یہ آیت مبارکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے طے شدہ فیصلے کی تائید اور آپ ﷺ کی عصمت وفراست کے اظہار کے لیے نازل ہوئی ہے۔

سورت کہف کی آیت مبارکہ ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ﴾ (الکھف:۲۸) کی روشنی میں ہماری اس بات کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے، کیونکہ صبر اپنے طرز عمل کو تبدیل نہ کرنے سے عبارت ہے۔ اگر معمولی سی بھی تبدیلی ہو جائے تو صبر کا مفہوم بے معنی ہوجاتا ہے، مثلاً اگر آپ کسی انسان کے عبادت پر صبر کرنے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادات کے بارے میں اپنے معمولات کو کبھی نہیں بدلتا۔ اگر آپ آزمائشوں میں کسی کے صبر کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آزمائشوں میں اس کا طرز عمل اور کردار ثابت قدم رہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی، اسی طرح گناہوں اور معاصی کے مقابلے میں صبر یہ ہے کہ سابقہ کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے گناہوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہا جائے، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کو ''اصبر'' کہا گیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے پہلے موقف، فیصلے اور طرز عمل کو برقرار رکھیے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پہلا موقف اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ تھا، کیونکہ صبر نیا موقف اختیار کرنے میں نہیں ہوتا، بلکہ پہلے موقف پر ثابت قدم رہنے میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ آیت مبارکہ جہاں رسول اللہ ﷺ کی مدح و توصیف ہے، وہیں آپ ﷺ کے موقف اور طرز عمل کے اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہونے کی دلیل بھی ہے۔

یہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کا نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے عمر بھر ان کی پاسداری فرمائی اور رفیق اعلیٰ سے ملاقات کے وقت آپ ﷺ گناہوں اور معاصی سے ایسے ہی پاک تھے، جیسے پیدائش کے دن بچہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔

۷۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کا نکاح

دشمنانِ اسلام رسول اللہ ﷺ کے ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کے

واقعے کو ہمیشہ آپ ﷺ پر الزام تراشی کے لیے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی سیرت صاف اور پاکیزہ رہی اور دشمنانِ اسلام کا مکروفریب ناکامی سے دوچار ہوا۔

قرآن کریم اس واقعے کا درج ذیل الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِیْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِيْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَراً زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِیْ أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَراً وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولاً﴾ (الأحزاب: ۳۷) ”اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا (یہ) کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور خدا سے ڈر اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کرتے تھے، جس کو خدا ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ خدا ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت متعلق نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دیدی) تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مؤمنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے) میں جب وہ ان سے (اپنی) حاجت (متعلق) نہ رکھیں (یعنی طلاق دے دیں) کچھ تنگی نہ رہے اور خدا کا حکم ہوکر رہنے والا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ حضرت زید سے شدید محبت فرماتے تھے۔ وہ واحد شخص تھے، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنا لے پالک بنایا تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ سے بے انتہا محبت کرتے تھے حتی کہ لوگ انہیں آپ ﷺ کا بیٹا سمجھتے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قربانی پیش کرتے ہوئے آپ ﷺ کے قرب کی خاطر اپنے والدین تک کو چھوڑ دیا، اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے اپنے دل کے دریچے کھول دیئے تھے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے انہیں آزاد کرکے اپنا لے پالک بنالیا، لیکن اس دور کے دستور کے مطابق اس کے باوجود ان کی آزاد کردہ غلام کی حیثیت ختم نہیں ہوئی۔ یہ اندازِ فکر اس معاشرے کی نفسیات میں دور تک سرایت کرچکا تھا، حتی کہ غلام آزادی کے بعد بھی دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے کو اس مرض سے نجات دلاکر اس قسم کے نظریے کی بیخ کنی کرنا ضروری تھی۔ رسول اللہ ﷺ اس معاشرتی مرض کے حل کے لیے فکرمند رہتے تھے، لیکن اس حل کا قابل عمل اور معاشرے کے لیے قابل قبول ہونا ضروری تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ آزاد کردہ غلاموں پر خصوصی توجہ دیتے اور ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ فرماتے۔

آزادی یقیناً بہت اہم چیز ہے، لیکن اس سے بھی اہم اس کی حفاظت اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ جو انسان آزادی کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا اسے آزادی دے دی جائے، تب بھی وہ آزاد انسان کی طرح طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا، چنانچہ امریکا میں جب غلاموں کو آزادی دی گئی تو یہی تکلیف دہ صورتحال پیش آئی اور حقیقی حل کئی سالوں کے بعد سامنے آیا۔ آزاد زندگی کی حقیقت سے نا آشنا غلام اپنے وسائل زندگی اور صلاحیتوں کو بیچ کر دوبارہ اپنے آقاؤں کے پاس چلے گئے۔ حالات آزاد زندگی کے لیے سازگار نہ تھے۔ اس صورتحال کو قبول کرنے کے لیے افراد نفسیاتی طور پر تیار تھے اور نہ ہی معاشرہ، جس کے نتیجے میں تحریک آزادی کے متوقع ثمرات فوراً حاصل نہ ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ ایک طرف انہیں نفسیاتی، فکری اور عملی لحاظ سے آزادی کے لیے تیار کرتے تھے تو دوسری طرف معاشرے کو انہیں آزاد افراد کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ جو لوگ کل تک مال و متاع سمجھے جاتے تھے، آج معاشرے کا حصہ بن چکے تھے۔

رسول اللہ ﷺ معاشرے کی جڑوں میں بیٹھے ہوئے اس غلط نقطہ نظر پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ یہ آسان کام نہ تھا، بلکہ انتہائی مشکل مہم تھی، لیکن آپ ﷺ اس مہم کو سرانجام دینے کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ جنگ کے دوران محاذ پر مشکل ذمہ داریاں سرانجام دینے کے لیے اپنے رشتہ داروں کا انتخاب فرماتے، اسی طرح آپ ﷺ نے مذکورہ بالا ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اپنی چچازاد بہن حضرت زینب بنت جحش جو عبداللہ بن جحش کی بہن تھیں اور اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی اس رشتہ دار کے گھر آتے جاتے رہتے تھے، کیونکہ یہ آپ کی پھوپھی کا گھر تھا۔ یہ گھر کئی سالوں سے آپ ﷺ کے اشارے کا منتظر تھا، کیونکہ آپ ﷺ کے حرم میں آنا ہر عورت کا حسین خواب تھا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، یہی وجہ تھی کہ جب آپ ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا چاہی تو انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عقد حرم کو برقرار رکھنے کی درخواست کی اور اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی۔ ان کی واحد خواہش آپ ﷺ کے قرب میں رہنا اور آپ کی زوجہ کی حیثیت سے مرنا تھی اور اس مقصد کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لیے بھی تیار تھیں۔ (316)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس پاکیزہ گھرانے سے قرابت داری پیدا کرنا چاہتے تھے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ مانگا تھا، لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کا انتظار کرنا پڑا اور ان سے کم سنی میں ہی عقد نکاح کر کے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل کرنے کی خواہش پوری کی،(317) لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی کے دل میں اپنی بیٹی کا آپ ﷺ کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش کا پیدا ہونا بالکل فطری امر تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے حرم میں شامل ہونے کی پوری اہلیت رکھتی تھیں اور ممکن ہے کہ ان کے دل میں آپ ﷺ کے حرم میں شامل ہونے کی خواہش بھی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی کے گھر جا کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا رشتہ مانگا۔ یہ سنتے ہی سارے گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، لیکن جونہی آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ وہ یہ رشتہ زید کے لیے مانگ رہے ہیں تو وہ غمزدہ ہو گئے، کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ یہ رشتہ نہ مانگتے تو وہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو مسترد کر دیتے اور انہیں داماد کی حیثیت سے قبول نہ کرتے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی بات کو مسترد کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا، اس طرح اس رشتے کی بنیاد ہی عدم رضا پر قائم ہوئی، تاہم معاشرتی پہلو سے اس رشتے سے جو مقصد حاصل کرنا مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا اعلیٰ حسب ونسب کی مالک تھیں اور ایسے ہی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی، جبکہ دوسری طرف حضرت زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آزاد کر دیئے جانے کے باوجود معاشرے میں ایک آزاد کردہ غلام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، نیز ان کا خاندان بھی اس قدر اونچا نہ تھا، لہٰذا زوجین کے درمیان ہم آہنگی اور مناسبت پیدا نہ ہو سکی۔ ممکن ہے حضرت زید رضی اللہ عنہ اپنی فراست سے یہ جان گئے ہوں کہ وہ غیر معمولی کردار، عزم اور روحانی وقلبی احساسات کی مالک اور بجا طور پر ایک نبی کے حرم میں شامل ہونے کی اہلیت کی حامل خاتون کے ہم پلہ نہیں ہیں۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں متعدد بار نبی اکرم ﷺ سے رجوع کیا اور انہیں بتایا کہ وہ اپنی بیوی سے جدائی اختیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن آپ ﷺ ہر بار ان سے فرماتے کہ اللہ سے ڈرو اور اسے اپنی زوجیت میں رکھو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس جاہلانہ سوچ کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے

اور اسی مقصد کے لیے آپ ﷺ نے یہ رشتہ کرایا تھا، لیکن گھر میں ناچاقی اور عدم مفاہمت بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ معاملہ جدائی تک پہنچ گیا۔

اگرچہ طلاق کے آثار ظاہر ہو چکے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ ایک آزاد کردہ غلام کی ایک اعلیٰ حسب ونسب کی مالک خاتون کے ساتھ شادی کے امکان کو عملی طور پر ثابت کر چکے تھے۔

رسول اللہ ﷺ مرشد تھے اور ہر مرشد کو چاہیے کہ وہ جو کچھ کہے پہلے اسے اپنی ذات اور عزیز واقارب پر نافذ کر کے دکھائے، چنانچہ آپ ﷺ نے خدائی ہدایات کے مطابق اس معاملے میں ایسا ہی کر کے دکھایا۔ اس کے بعد وحی کے افق پر طبیعت پر سخت ناگوار واقعات کے آثار نمودار ہونے لگے۔

رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے بتا دیا گیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا عنقریب ان کے حرم میں آجائیں گی، لیکن کیونکہ ابھی تک آپ ﷺ کو اس بات کا اعلان کرنے کا حکم نہیں ملا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اسے صیغۂ راز میں رکھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کسی بات کو چھپاتے تو (حضرت زینب کے نکاح سے متعلق) اس آیت کو چھپاتے۔"(318) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کے لیے حضرت زینب سے نکاح کرنا کس قدر دشوار تھا، لیکن ازل سے تقدیر خداوندی میں لکھے جا چکے نکاح کو کون روک سکتا تھا؟ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: ﴿زوّجنا کھا﴾ دوسرے لفظوں میں یہ نکاح اللہ تعالیٰ کی طرف سے پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا اور ملأ اعلیٰ اس نکاح کے گواہ تھے اور اس نکاح کا نفس پر ناگوار گزرنے والا ثمن ایک مخصوص حکم خداوندی کا اعلان تھا کہ لے پالک حقیقی بیٹوں کی طرح نہیں ہوتے، لہٰذا اگر ان میں سے کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو اگر لے پالک کا باپ چاہے تو اس کی بیوی سے نکاح کر سکتا ہے۔ دورِ جاہلیت میں لے پالک کو حقیقی بیٹے کی طرح تصور کیا جاتا تھا اور اگر اس کا انتقال ہو جاتا یا وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو اسے لے پالک بنانے والے کے لیے اس کی بیوی سے شادی کرنے کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جہاں اس جاہلانہ قانون کو ختم کرنا ضروری تھا، وہیں یہ بھی ضروری تھا کہ اس قانون کو ختم کرنے کی ذمہ داری خود رسول اللہ ﷺ اپنے کندھوں پر اٹھائیں، نیز دو نکاحوں کے ذریعے جاہلیت کے دو اہم قوانین کو کالعدم قرار دینے میں حصہ ڈالنے کی سعادت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نصیب میں آئی۔

بعض تفاسیر میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ابھی حضرت زید رضی

اللہ عنہ کے عقد میں تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ان پر نظر پڑی اور آپ کو ان کا حسن اچھا لگا، جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبحانک یامقلب القلوب!'' جسے ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے سن لیا... اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعض تفاسیر میں کس قدر افسوس ناک حد تک اسرائیلیات داخل ہو چکی ہیں حتی کہ ایک مفسر لکھتے ہیں: ''زید گھر لوٹے تو انہیں معاملے کی اطلاع ہوئی...'' میری رائے میں دشمنانِ اسلام ہی ایسا سوچ سکتے ہیں۔ کسی مسلمان عالم کو ایسی بات کہنا زیب نہیں دیتا۔ اس الزام کا جواب بآسانی دیا جا سکتا ہے:

اول: رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو پہلی مرتبہ نہیں دیکھا تھا، بلکہ آپ انہیں بچپن سے دیکھتے آرہے تھے اور وہ آپ کے سامنے ہی جوان ہوئی تھیں، لہٰذا آپ نے انہیں بارہا دیکھا ہوا تھا اور اس من گھڑت قصے کے مطابق آپ کی ان پر اچانک نظر نہیں پڑی تھی۔

دوم: اگر رسول اللہ ﷺ کے دل میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی طرف ذرا سا بھی میلان ہوتا تو آپ ﷺ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا نکاح کیوں کرتے؟

سوم: حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر والے حضرت زینب کا آپ ﷺ کے ساتھ نکاح کرنے کے خواہش مند تھے۔ حضرت زینب سے نکاح کر کے ان کی آرزو پوری کرنے سے کیا امر مانع تھا؟ اور آپ ﷺ نے ان کی شادی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کیوں کی؟

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت زینب کے ساتھ نکاح فرمانا حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے تھا اور اس کے سوا ہر توجیہ والٹیر (Volter) اور گولڈزیہر (Goldziher) وغیرہ دشمنانِ اسلام کی پھیلائی ہوئی تحریف وگمراہی ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ مختلف منظرنامے رسول اللہ ﷺ کی شان کے لائق ہیں اور نہ ہی حضرت زید و زینب رضی اللہ عنہما کے مقام کے مناسب، بلکہ اس قسم کے منظرناموں کا ان کی شخصیات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بدقسمتی سے دشمنانِ اسلام کی طرف سے رچائے گئے، اس ڈرامے میں بعض مسلمانوں کا بھی ثانوی کردار رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب کرے۔

ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز اس بات سے کیا تھا کہ تمام انبیائے کرام معصوم ہیں اور رسول اللہ ﷺ تمام معصومین کے سردار ہیں۔ اس کے بعد ہم نے چند مثالوں سے اس کی وضاحت کی۔ ہمیں

اس کا اعتراف ہے کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے مطابق اس کی وضاحت کر سکے ہیں، اب تک ہم نے رسول اللہ ﷺ کی عصمت وعفت اور گناہوں سے دوری پر روشنی ڈالی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم آپ ﷺ کے زہد وتقویٰ، خشیت الٰہیہ، احساسِ بندگی اور ذوقِ عبادت کے پہلو سے گفتگو کر کے قارئین کی توجہ آپ ﷺ کے عالم آخرت اور اپنے پروردگار کے ساتھ تعلق کے مختلف گوشوں کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کریں گے۔

چوتھی فصل

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر عصمت کے اثرات

الف: رسول اللہ ﷺ کا زہد و تقوی

رسول اللہ ﷺ انتہائی زاہدانہ طبیعت کے مالک اور شکوک وشبہات سے دور رہنے والے انسان تھے۔آپ ﷺ کی ہر حرکت وسکون اس معیار کی آئینہ دار تھی۔آپ ﷺ پر خوفِ خدا اور خشیت الٰہیہ کا اس قدر غلبہ تھا کہ خوف وخشیت کی وجہ سے آپ ﷺ کی حرکت قلب بند ہونے لگتی تھی۔آپ ﷺ کا دل اس قدر حساس تھا کہ آنسو ہر وقت آپ ﷺ کے رخساروں پر جاری رہتے تھے۔آپ کے آنسو تھمتے تو سمندر دکھائی دیتے اور جاری ہوتے تو منہ زور سیلاب کا گمان ہوتا۔

لہٰذا اوپر ذکر کردہ آیات کی غلط توجیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ آپ ﷺ کا دنیا کی طرف میلان ہوسکتا تھا اور آپ سے گناہ بھی سرزد ہوسکتا تھا غفلت،عدم احترام اور حقیقت سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس قدر عظیم مقام عطا فرمایا کہ دشمنانِ اسلام جس کیچڑ سے آپ ﷺ کا پاکیزہ لباس آلودہ کرنا چاہتے ہیں،اس کا ایک ذرہ بھی آپ ﷺ کی ذات اقدس تک نہیں پہنچ سکتا،کیونکہ آپ ﷺ کا زہد اور خشیت الٰہیہ کسی بھی گناہ کی طرف معمولی سے میلان کے بھی منافی ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سطور میں ہم آپ ﷺ کی شخصیت کے باطنی پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالیں۔

زہد اسے کہتے ہیں کہ ساری دنیا کا مالک بن کر دل میں عجب پیدا ہوا اور نہ ہی سب کچھ کھونے پر حسرت ہو۔رسول اللہ ﷺ اس زہد کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔اگر آپ ﷺ کو ساری دنیا کے خزانے مل جاتے تو آپ کو ایک جو کے دانے کو پانے کے برابر خوشی ہوتی اور نہ ہی اس سب کچھ کو کھونے پر ایک جو کے دانے کو کھونے جتنی حسرت ہوتی۔آپ ﷺ نے دنیا کو اپنے دل سے نکال دیا تھا،لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ نے کسب معاش کو بھی چھوڑ دیا تھا، کیونکہ آپ ﷺ نے ہی تو ہمیں رزقِ حلال کمانے کے بہترین طریقے سکھائے ہیں،اس لیے آپ ﷺ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ آپ لوگوں کو ترکِ دنیا کی ترغیب دیتے۔ترکِ دنیا قلبی اعتبار سے ہونا چاہیے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ مملکت تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کی مالدارترین

اور مضبوط ترین مملکت بن گئی۔ ایک مصنف کے بقول رسول اللہ ﷺ کی قائم کردہ مملکت سے پچیس عظیم الشان سلطنتیں وجود میں آئیں۔ زہد کی یہی حقیقت ہے۔

نبوت کے نورانی عالم میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر دنیا کے آپ ﷺ کے قدموں میں نچھاور ہونے تک آپ ﷺ کے طرز زندگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، بلکہ آپ کی وفات کے وقت آپ ﷺ کی مالی حیثیت عالم نبوت میں قدم رکھنے کے وقت سے زیادہ کمزور تھی، کیونکہ آپ ﷺ نے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں خرچ کر دیا تھا۔ آپ ﷺ کے ترکے میں چند بکریاں اور کچھ چھوٹے چھوٹے حجرے تھے، جن میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رہائش پذیر تھیں اور ان کی وفات کے بعد یہ حجرے بھی عام مسلمانوں کے تصرف میں آگئے اور انہیں مسجد نبوی میں شامل کر دیا گیا۔ جن حضرات کو مسجد نبوی کی زیارت کی توفیق ملی ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ حجرے اتنے چھوٹے تھے کہ سب کے سب مسجد کے ایک کونے میں سما گئے۔

ا۔ آپ ﷺ کا چٹائی پر سونا

ایک دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، جس کے نشانات آپ کے بدن پر نظر آ رہے تھے۔ حضرت عمر نے آپ ﷺ کی الماری میں دیکھا تو اس میں تقریباً ایک صاع جو تھے۔ اتنے ہی سلم کے پتے کمرے کے ایک کونے میں پڑے تھے اور ایک کھال لٹک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے ابن خطاب! کیوں رو رہے ہو؟'' حضرت عمر نے عرض کی: ''یارسول اللہ! قیصر و کسریٰ تو پھلوں اور نہروں کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ خدا کے رسول اور مصطفیٰ ہو کر بھی اس حالت میں ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ان کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت؟''(319) ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''مجھے دنیا سے کیا لینا۔ دنیا میں میری مثال تو اس سوار کی سی ہے جو کسی درخت کی چھاؤں میں (تھوڑی دیر) بیٹھا اور پھر اسے چھوڑ کر چل پڑا۔''(320)

رسول اللہ ﷺ دنیا میں ایک خاص مقصد لے کر آئے تھے۔ آپ ﷺ کا فکر و احساس لوگوں کو نئی زندگی عطا کرتا تھا اور آپ اپنا فرض منصبی پورا کرتے ہی دنیا سے کوچ کر گئے۔ کیا عقل یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے کہ دنیا سے اس قدر بے رغبت شخص دنیا کی کسی چیز کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ دنیا کی طرف مائل ہوئے اور نہ ہی بال برابر اس کی طرف جھکے۔

۲- صدقہ کے بارے میں آپ ﷺ کا حساس رویہ

مسند احمد میں مروی ہے کہ ایک رات نبی اکرم ﷺ کو اپنے پہلو میں ایک کھجور پڑی ہوئی ملی، جسے آپ ﷺ نے تناول فرمالیا، لیکن اس رات آپ ﷺ سو نہ سکے۔ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ نے آپ ﷺ سے پوچھا: ''یارسول اللہ! آپ رات بھر جاگتے رہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اپنے پہلو میں ایک کھجور پڑی ہوئی ملی، جسے میں نے کھالیا۔ گھر میں صدقہ کی کھجوریں بھی تھیں، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ کھجور ان میں سے نہ ہو۔''(321)

زکوۃ اور صدقے کی چیزیں آپ ﷺ پر حرام تھیں، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ کھجور آپ ﷺ کو ہدیہ کی گئی کھجوروں میں سے ہو اور یہ بات زیادہ قرین قیاس تھی، کیونکہ زکوۃ اور صدقہ کی چیزیں عام طور پر رات تک آپ ﷺ کے گھر میں نہ رہتی تھیں، بلکہ فوراً تقسیم کردی جاتی تھیں۔ کیا معمولی سے شبہے کے بارے میں اس قدر حساسیت کا مظاہرہ کرنے والے شخص سے کسی واضح گناہ کے قریب بھی جانا ممکن ہے؟ آپ ﷺ معمولی سے شبہات کے بارے میں بھی شدید حساسیت کا مظاہرہ فرماتے تھے اور اپنے باطن پر معمولی سا داغ بھی نہیں لگنے دیتے تھے۔ کیا اتنی مضبوط قوتِ ارادی کی مالک شخصیت کا کسی گناہ کے سامنے کمزور پڑ جانے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! آپ ﷺ نے کسی گناہ کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی کسی گناہ کو اپنے باطن کو داغدار کرنے کی اجازت دی۔ آپ ﷺ کی روح اور ارادہ ہمیشہ صاف اور پاکیزہ رہے اور اسی حالت میں آپ ﷺ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

۳- سورت ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔

ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''سورہ ہود، واقعہ، عم یتساء لون اور اذا الشمس کورت جیسی سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔''(322) سورت ہود میں آپ ﷺ سے کہا گیا ہے: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ (ھود:۱۱۲) ''سو (اے پیغمبر) جیسا تم کو حکم ہوتا ہے اس پر قائم رہو۔'' اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ذکر کردہ استقامت کا اپنے رسول سے مطالبہ کیا ہے۔ سورت مرسلات میں جنت اور جہنم کی منظر کشی کر کے اہل جنت و دوزخ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ واقعہ میں بھی ایسے ہی دہشت ناک مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ ان سورتوں میں پیش کردہ ہیبتناک مناظر نے آپ ﷺ کو بوڑھا کر دیا۔

۴- آخرت پر نظر

ایک صحابی بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور جب آیت مبارکہ ﴿إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا () وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا﴾ (المزمّل:۱۲-۱۳) ''کچھ شک نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے اور گلوگیر کھانا ہے اور درد دینے والا عذاب ہے۔'' پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کا ان کے گھر کے پاس سے گزر ہوا اور جب آپ ﷺ نے انہیں یہ آیات تلاوت کرتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ کی چیخ نکل گئی، آپ کا چہرہ مبارک زرد پڑ گیا اور آپ غش کھا کر زمین پر گرنے لگے۔[323]

اگر ان آیات کو پڑھ کر کسی کے لیے فکر مند نہ ہونے کی گنجائش ہوتی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات ہوتی، جس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے تھے۔ آپ ﷺ کا ہر رویہ اور طرز عمل آپ کی امت کے لیے اسوۂ حسنہ تھا۔

۵- رسول اللہ ﷺ خدا کی نظر میں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''مجھے قرآن سناؤ۔'' میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! کیا میں آپ کو قرآن سناؤں حالانکہ یہ آپ پر نازل ہوا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرا دوسروں سے قرآن سننے کا دل چاہ رہا ہے۔'' چنانچہ میں نے آپ ﷺ کو سورت النساء سنانا شروع کی اور جب میں ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلاءِ شَهِيدًا﴾ (النساء:۴۱) ''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔'' پر پہنچا تو میں نے سر اٹھایا (یا کسی نے میرے پہلو کو دبایا، جس پر میں نے اپنا سر اٹھایا) اور کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔[324]

۶- آپ ﷺ کا تفکر

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر رسول اللہ ﷺ کے حالات سناتے ہوئے گریہ طاری ہو جاتا۔ ایک دفعہ وہ کہنے لگیں:

آپ ﷺ کی ہر ادا ہی نرالی تھی ایک رات آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میرے پاس

لیٹ گئے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے چھوڑ کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں۔'' میں نے عرض کی: ''جس طرح مجھے آپ کا قرب پسند ہے، اسی طرح یہ بھی پسند ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی عبادت فرمائیں۔'' چنانچہ آپ ﷺ مشکیزے کے پاس گئے اور وضو فرمایا، لیکن وضو کرتے ہوئے پانی زیادہ نہیں بہایا، اس کے بعد کھڑے ہو کر نماز ادا فرمانے لگے اور اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی پھر آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا اور سجدے میں اتنا روئے کہ زمین بھیگ گئی، پھر آپ پہلو کے بل لیٹ گئے اور روتے رہے یہاں تک کہ جب حضرت بلال آپ کو صبح کی نماز کے لیے بلانے آئے تو انہوں نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! آپ اس قدر کیوں رو رہے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بلال! خدا تیرا ناس کرے، میں کیوں نہ روؤں جبکہ آج رات مجھ پر درج ذیل آیات نازل ہوئی ہیں: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُولِي الأَلْبَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۰) ''بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس شخص کے لیے ہلاکت ہے، جس نے ان آیات کو پڑھا، لیکن ان میں غور و فکر نہ کیا۔'' ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے بلال! تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''(325)

اس سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس خوف سے روتے تھے کہ کہیں وہ شکر کے اس اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے میں ناکام نہ ہو جائیں، جس پر پہنچنا ان سے مطلوب ہے۔ کیا ایسے انسان سے کسی گناہ کی طرف مائل ہونا یا اس کا ارتکاب کرنا ممکن ہے؟

جس طرح رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی منہیات سے اجتناب کے بارے میں شدید حساس تھے، اسی طرح آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے بارے میں بھی شدید حساسیت کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ اگر آپ ﷺ کی عصمت کے صرف اسی پہلو پر غور کیا جائے تو میرے خیال میں کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔

درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ جیسی زندگی گزارنا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اپنی انفرادی عبادت کے بارے میں آپ ﷺ سنجیدہ اور حساس تھے اور اس معاملے میں کبھی سستی نہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی ساری حیاتِ طیبہ عبادت کی بنیاد پر منظّم و استوار تھی۔ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی بھی

لمحہ عبادت سے خالی نہ ہوتا تھا۔ عبادت سے ہماری مراد صرف نماز روزہ ہی نہیں ہے، بلکہ کوئی بھی کام کرتے وقت آپ ﷺ کے دل میں عبادت کا شعور اور احساس موجود ہوتا تھا۔

ہم نے آپ ﷺ کو ''سلطان الزاہدین'' یا ''ازہد الزاہدین'' اس لیے کہا ہے کہ آپ کے تعارف کے لیے کوئی اور تعبیر ہمیں ملتی ہی نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے زبان کے ذخیرہ الفاظ کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔

۷۔ بھلائی کے کاموں میں سبقت

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے آپ ﷺ کے پیچھے عصر کی نماز ادا کی۔ سلام پھیر کر آپ ﷺ جلدی سے اٹھے اور لوگوں کی گردنوں کے اوپر سے پھلانگتے ہوئے اپنی کسی زوجہ محترمہ کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ لوگ آپ ﷺ کی اس عجلت سے پرحیران ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ باہر نکلے اور آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ لوگ آپ کی عجلت پر حیرت زدہ ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے گھر میں پڑے کچھ سونے کا خیال آ گیا تھا۔ مجھے یہ بات ناگوار گزری کہ وہ میرے پاس پڑا رہے، لہٰذا میں نے اسے تقسیم کرنے کا کہہ دیا ہے۔''(326)

آپ ﷺ کے زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ ہر چیز ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیتے اور اپنے گھر میں رات تک مال کو پڑا نہ رہنے دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے دل میں اپنی کشش پیدا کرنے کے لیے دنیا کئی بار آپ ﷺ کے سامنے آئی، لیکن ہر بار آپ ﷺ نے اسے الٹے پاؤں لوٹا دیا۔(327)

۸۔ آپ ﷺ کی کئی کئی دن تک فاقہ کشی

کئی کئی دن گزر جاتے، لیکن آپ ﷺ کے پیٹ میں کھانے کا ایک لقمہ نہ جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے سارے زمانہ نبوت میں جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ بسا اوقات کئی کئی دن، ہفتے اور مہینے گزر جاتے، لیکن آپ ﷺ کے گھر میں کھجوروں کا سادہ سا حلوہ بنانے کے لیے بھی چولہا نہ جلتا تھا۔(328) ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو بیٹھ کر نفل نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو نماز سے فراغت کے بعد آپ ﷺ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی وجہ پوچھی کہ کہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے اس کا جو جواب ارشاد فرمایا، اسے سن کر جسم کانپ اٹھتا ہے۔ آپ ﷺ کئی دن سے فاقے کی حالت میں تھے اور اب کمزوری کے باعث کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ بھوک نے آپ ﷺ کو نڈھال کر دیا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا جواب سن کر رو پڑے۔ انہیں روتا دیکھ کر آپ ﷺ اپنی بھوک بھول گئے اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے فرمایا: ”رومت، کیونکہ اگر بھوکا شخص ثواب کی نیت سے بھوک برداشت کرے تو وہ قیامت کی ہولنا کی سے محفوظ رہے گا۔“[329] رسول اللہ ﷺ ایک راہنما تھے اور آپ کی رعیت میں ایسے لوگ بھی تھے، جو خالی پیٹ سوتے تھے، اس لیے آپ ﷺ اپنی زندگی اپنی رعایا کے معیار زندگی کے مطابق ڈھالتے اور اپنے پیروکاروں میں سے سب سے غریب شخص کے معیار زندگی کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔ آپ ﷺ نے یہ طرز زندگی اپنی مرضی اور خوشی سے اختیار فرمایا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو آسودہ اور پرتعیش زندگی گزارنا آپ کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اگر آپ ﷺ اپنی خدمت میں پیش ہونے والے ہدایا ہی اپنے پاس رکھ لیتے اور انہیں تقسیم نہ فرماتے تو آسودہ و پرتعیش زندگی گزارنے کے لیے وہ کافی ہوتے، لیکن آپ ﷺ نے ایسا کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ یا آپ کی امت نے دنیا کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ اسلام کا مقصد صرف ایک لقمے اور پھٹے پرانے کپڑوں پر اکتفا کرنے کی دعوت دینا نہیں ہے۔ اسلام کسب حلال اور تونگری سے نہیں روکتا۔ مالدار شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زکوۃ اور صدقہ دیتا ہے۔ اسلام میں کسب حلال کی ممانعت نہیں، بلکہ اسلام اس کی ترغیب دیتا ہے، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مقرب صحابہ کرام کے لیے ضروری تھا کہ وہ مکہ اور مدینہ کی حدود سے باہر وسعت پذیر امت کے لیے اسوہ حسنہ پیش کریں، تاکہ یہ امت اپنی ابتدا کی طرح ہمیشہ پاکیزہ رہے۔ اس امت کا تعلق صرف پیٹ اور جسمانی ضروریات کے ساتھ ہی نہیں ہے، بلکہ یہ دل، روح، ارادے اور وجدان کی مالک امت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کی قوت کی اسی ڈائنامک بنیاد پر حفاظت کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ سے کسی قربانی کا مطالبہ کرنے سے پہلے خود قربانی پیش کرتے، تاکہ ان کے لئے اسوہ حسنہ پیش کرسکیں۔ اس کی ایک بہترین مثال حسب ذیل ہے:

ایک دن رسول اللہ ﷺ کو بھوک نے اس قدر ستایا کہ گھر میں بیٹھنا ممکن نہ رہا۔ آپ ﷺ باہر نکلے تو حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ان سے اس وقت گھر سے باہر نکلنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کی: ”یارسول اللہ! بھوک کی وجہ سے ہم باہر نکلے ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میرے گھر سے نکلنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اٹھو (کہیں چلتے ہیں۔)

چنانچہ وہ ابوالہیثم بن تیہان انصاری کے گھر کی طرف چل پڑے۔ ان کی بہت سی بکریاں اور کھجور کے درخت تھے، لیکن ان کے پاس نوکر نہ تھے۔ جب یہ حضرات ان کے گھر پہنچے تو وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ ان کی اہلیہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لینے گئے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ابوالہیثم مشکیزہ اٹھائے آپہنچے اور جب انہوں نے اپنے مہمانوں کو دیکھا تو مشکیزہ رکھ کر نبی اکرم ﷺ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے: ''میرے ماں باپ آپ پر فدا! تمام تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں۔ آج میرے گھر آنے والے مہمانوں سے زیادہ معزز مہمان کسی کے گھر نہ آئے ہوں گے۔'' اس کے بعد وہ کھجوروں کا ایک ایسا خوشہ لے آئے، جس میں کچی، پکی اور تازہ کھجوریں تھی اور اس میں سے کھانے کے لئے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے چھری اٹھائی تو آپ ﷺ نے انہیں کہا کہ دودھ والی بکری کو ذبح نہ کرنا، چنانچہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی اور ان حضرات نے بکری کا گوشت اور کھجوریں کھائیں اور پانی پیا۔ جب وہ شکم سیر اور سیراب ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! قیامت کے دن تم سے اس نعمت کے بارے میں بھی ضرور سوال ہوگا۔ تمہیں بھوک نے گھر سے نکالا، لیکن تمہارے گھر لوٹنے سے پہلے اللہ تعالی نے تمہیں یہ نعمت عطا فرمادی۔'' پھر آپ ﷺ نے درج ذیل آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: ﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ (التکاثر: ۸) [330] ''پھر اس دن تم سے شکرِ نعمت کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔'' آپ ﷺ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے حساس معیارات کو فراموش نہیں فرماتے تھے، اسی لئے آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں کسی قسم کی کجی یا حق سے انحراف کا پایا جانا ممکن نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے مقرب ترین ساتھی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن رسول اللہ ﷺ کو بھوک سے کروٹیں لیتے ہوئے دیکھا، لیکن آپ ﷺ کے پاس بھوک مٹانے کے لئے دَقَل (331) نامی کھجوریں بھی نہ تھیں۔ (332)

اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ پرتعیش اور آسودہ زندگی بسر کر سکتے تھے اور اس کے لیے آپ کی خدمت میں روزانہ پیش کیے جانے والے تحائف کافی تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے پاس جو کچھ آتا اسے تقسیم فرمادیتے اور اپنے گھر کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑتے۔ [333] اور جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں کیسے آسودہ حال رہوں، جبکہ صور پھونکنے پر معمور فرشتے نے صور منہ سے لگا رکھا ہے اور صور پھونکنے کے حکم کے انتظار میں ہے کہ کب اسے حکم ملے اور وہ صور پھونکے۔'' [334]

ب: نبی اکرم ﷺ کی تواضع

رسول اللہ ﷺ پیکرِ تواضع تھے۔ بڑے لوگوں میں تواضع عظمت کی علامت ہے، جبکہ چھوٹے لوگوں میں غرور چھوٹے پن کی دلیل ہے۔(335) آپ ﷺ جس قدر تواضع فرماتے آپ کی شان اتنی ہی بلند ہوتی۔ چونکہ آپ ﷺ عظیم انسان تھے، اس لیے آپ متواضع تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتے ہیں اور جو تکبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرتے ہیں۔(336) آپ ﷺ اپنی حیاتِ طیبہ کو زندہ اور عملی نمونے کے طور پر پیش فرماتے تھے۔ جو کوئی آپ ﷺ کی بے مثال تواضع کا مشاہدہ کرتا آپ ﷺ کی عظمت و رفعت کا معترف ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے قارون، ثعلبہ اور فرعون جیسے مغرور اور متکبر لوگوں کو زمین میں دھنسا دیا اور حضرت موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کو اعلیٰ علیین تک بلندیاں عطا کیں۔

آپ ﷺ تواضع کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول تھے۔ آپ رات دن فریضہ عبادت میں مصروف رہتے۔ آپ ﷺ نے فریضہ عبادت کی ادائیگی میں میانہ روی اختیار کرنے کا درس دیا ہے، آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''سدّدوا و قاربوا.'' (337) ''میانہ روی اختیار کرو اور درستگی سے قریب قریب رہو۔'' کسی بھی معاملے میں خواہ وہ عبادت ہی کیوں نہ ہو افراط و تفریط پیکرِ استقامت و اعتدال رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں۔ اہلِ ایمان پنج وقتہ نمازوں میں استقامت کی دعا کرتے ہیں۔ یہ انبیاء، صدیقین اور شہداء کا راستہ ہے۔ جو شخص قیامت کے دن ان کی معیت حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ دنیا میں ان کے نقشِ قدم پر چلے۔

آسانی دین کی روح ہے۔ جو شخص دین کو ناقابلِ برداشت حد تک مشکل بناتا ہے، وہ اس کے بوجھ تلے پس جاتا ہے۔ استقامت کے دائرے میں رہتے ہوئے دین بہت آسان ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ''دین تو آسانی کا نام ہے۔ جو کوئی بھی اس دین کے ساتھ شدت اختیار کرے گا، اس سے مغلوب ہو جائے گا۔''(338)

وہی دین قابلِ قبول ہے، جو انسان کی استطاعت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے طریقے اور منشا کے مطابق ہو۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''درستگی کے قریب قریب رہو اور میانہ روی اختیار کرو اور یقین رکھو کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کے ذریعے نجات نہیں پا سکتا۔'' اگر کوئی شخص رات دن عبادت

میں مشغول رہے یا عبادت گزاری میں اسود بن یزید نخعی، مسروق اور طاؤس کا مقام حاصل کر لے پھر بھی وہ قیامت کے دن اپنے عمل اور عبادت کی بدولت نجات نہ پائے گا، کیونکہ اس کی عبادت کبھی بھی نجات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

یہ حدیث مبارک سنتے ہی صحابہ کرام کا ذہن رسول اللہ ﷺ کے خصوصی مقام کی وجہ سے آپ ﷺ کی طرف منتقل ہو گیا اور انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا: ''یارسول اللہ! کیا آپ بھی اپنے عمل سے نجات نہیں پائیں گے؟'' آپ ﷺ نے عبدیت کے مقام پر فائز ایک رسول کو خدا کے حضور جس تواضع کا اظہار کرنا چاہیے تھا، اس کے مطابق جواب ارشاد فرمایا: ''میں بھی اپنے عمل سے نجات نہیں پا سکتا، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھانپ لیں۔''(339) بلاشبہ آپ ﷺ تواضع کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی صفت تواضع کے بعد اب آپ ﷺ کی عبادت گزاری پر گفتگو کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کے لیے ہوگی۔''(340) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے نبی ﷺ کو شفاعت کا اعزاز بخشیں گے۔ ہم اس شفاعت کی امید کیوں نہ رکھیں؟ ہمیں اپنے گناہوں کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی امید ہے۔ ہم گنہگار ضرور ہیں، لیکن ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ ہم صرف اسی کے بندے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کہتے ہیں:

من بندہ شدم بندہ شدم بندہ شدم — من بندہ بخدمت سر افگندہ شدم
ہر بندہ کہ آزاد شود شاد شود — من شاد از آنم کہ ترا بندہ شدم

''میں غلام ہوں، غلام ہوں، غلام ہوں اور میں آپ کی خدمت میں سرِ تسلیم خم کیے کھڑا ہوں۔ ہر غلام آزادی پا کر خوش ہوتا ہے، لیکن میں آپ کی غلامی میں آ کر خوش ہوں۔''

ہمارا ایمان ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں اور التجاؤں کو سنتے ہیں، اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا وقت قریب آئے گا تو وہ بھی ہماری درخواست کو قبول کر کے ہمارے حق میں شفاعت فرمائیں گے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی درخواست کرتے ہوئے آپ ﷺ کی شفاعت کا در کھٹکھٹائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کے حق میں شفاعت فرمائیں گے۔ ہمیں بھی آپ ﷺ کی شفاعت کی امید ہے اور میرا نہیں خیال کہ قارئین

میں سے کسی کو اس کی امید نہ ہوگی۔ ہم سب کو آپ ﷺ سے اس شفاعت کی درخواست کرنی چاہیے اور کسی کو آپ ﷺ تک ہماری التجا کے پہنچنے میں شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ہم تشہد میں "السلام علیك أیھا النبی ورحمة الله وبرکاته" پڑھتے ہیں۔ اگر آپ ﷺ تک ہماری بات نہ پہنچتی تو ہم آپ ﷺ سے براہ راست خطاب کیسے کرتے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ تک ہماری بات پہنچتی ہے، تبھی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں نماز میں آپ ﷺ کو براہ راست مخاطب کرنے کا حکم دیا ہے۔

تاہم ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ شفاعت کا دائرہ اس قدر پھیلاتے ہیں، لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴) ''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنادو۔'' نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے دور کے رشتہ داروں سے لے کر قریب ترین اعزہ سے فرمایا: اے قبیلہ قریش! اپنی جانوں کو بچالو۔ میں خدا کے حضور تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے بنو عبد مناف! میں خدا کے حضور تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب! میں خدا کے حضور تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے رسولِ خدا کی پھوپھی صفیہ! میں خدا کے حضور تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔ اے فاطمہؓ بنت محمد! میرے مال میں سے جو چاہو مانگ لو، لیکن میں خدا کے حضور تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔''(341)

اس دور میں قبائل اپنے ہاں کسی شاعر کے پیدا ہونے پر فخر کرتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی اس گفتگو سے آپ ﷺ کی تواضع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ محض شاعر یا ماہر جنگ نہ تھے، بلکہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء اور سید الانام تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے خاندان اور قوم کے لوگوں سے فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔ دراصل اس سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد اپنی قوم اور خاندان کے لوگوں کو اس بنیاد پر دوسروں پر تفاخر کرنے اور اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھنے سے روکنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے خاندان سے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی توجہ ان کی ذمہ داریوں کی طرف دلائی، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے پہلے دور کے رشتہ داروں سے خطاب کیا یہاں تک اپنی پھوپھی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے رسول خدا کی پھوپھی صفیہ! میں اللہ کے حضور تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔''

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ جب حضرت حمزہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو ان کی بہن نے انہیں دیکھنا چاہا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس خیال سے کہ وہ حضرت حمزہؓ کی حالت دیکھ کر صبر نہ کر سکیں گی، انہیں روکنا چاہا، لیکن یہ بہادر خاتون اپنے شہید بھائی،

جس کی روح اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکی تھی، کو دیکھنا چاہتی تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پاکیزہ جسم کو دیکھا۔ وہ مضبوط عزم اور فولادی ارادے کی مالکہ تھیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے حواری کا لقب پانے والے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ،(342) ظالم حجاج سے کعبہ کی حفاظت کرتے ہوئے شہادت پا کر سولی پر چڑھنے والے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی دادی(343) اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھیں، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان سے مذکورہ بالا بات ارشاد فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ انتہائی محتاط، صاحب تدبر اور متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ﷺ نے بعض غیر محتاط لوگوں کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ میں قیامت کے دن سب کی دستگیری کروں گا۔ آپ ﷺ نے یہ بات اپنی سب سے عزیز اور جگر گوشہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی نہیں فرمائی، بلکہ دوسروں کی طرح ان سے بھی یہی فرمایا: ''اے فاطمہ بنت محمد! میں خدا کے حضور تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔''(344)

آپ ﷺ نے یہ بات اس فاطمہ سے فرمائی جو آپ کی بیٹی تھیں، جن کی شادی کم سنی میں ہی حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے ہوگئی تھی اور وفات کے وقت ان کی عمر صرف پچیس برس تھی، جن کی نسل سے تمام اولیاء و اصفیاء پیدا ہوئے، جنہوں نے وحی کے مہبط میں پرورش پائی اور جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔''(345) اور ''وہ جنت کی عورتوں کی سردار ہے۔''(346)

لہٰذا ایسا انسان جس نے اپنے پروردگار کے حضور ادب، خضوع اور بندگی کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں برتی اور جو اس درجہ متواضع ہو کہ اس نے زہد و تقویٰ کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز اور آخرت کی حقیقت سے سب سے زیادہ باخبر ہونے کے باوجود اپنے عمل پر بھروسا کیا اور نہ اس سے کوئی امید وابستہ رکھی، بھلا اس سے خط مستقیم سے تھوڑا سا بھی منحرف ہو کر کسی گناہ کا مرتکب ہونا کیسے ممکن تھا؟ ایسا سوچنا بھی بہت بڑا بہتان ہے، جس سے آپ ﷺ کی ذات بالکل بری ہے۔

ج: رسول اللہ ﷺ کی عبادت گزاری

رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے کیا کہنے! جو شخص بھی آپ ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوچتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ آپ ﷺ نے ساری زندگی عبادت کے لیے وقف کر رکھی تھی اور عبادت کے سوا آپ ﷺ کا کوئی اور کام نہ تھا۔ آپ ﷺ کی عبادت کا مقام اس قدر بلند تھا، لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ آپ ﷺ خیر اور بھلائی کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ بھلائی کے کاموں میں کوئی آپ ﷺ کے پاؤں کی خاکِ کو بھی نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی یہ کسی کے بس کی بات تھی۔

نماز کے دوران آپ ﷺ کے خشوع وخضوع کا یہ عالم ہوتا کہ کوئی نماز ایسی نہ ہوگی، جس میں آپ ﷺ پر گریہ طاری نہ ہوا ہو۔ صحابہ کرام کہتے تھے کہ نماز پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کے سینے سے ہنڈیا کے ابلنے کی سی آواز آتی تھی، چنانچہ مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور رونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے ہنڈیا کے ابلنے کی سی آواز آ رہی تھی۔" (347)

بندہ ہونے کی حیثیت سے احساسِ ذمہ داری نے آپ ﷺ کے سینہ مبارک کو ابلتی ہوئی ہنڈیا کی مانند بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نماز کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کو نماز سے زیادہ کسی چیز میں لذت محسوس نہ ہوتی، یہی وجہ تھی کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دنیا میں مجھے بیویاں اور خوشبو پسند ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔" (348)

انسان کے لیے عورت سے بڑھ کر کوئی چیز پرکشش نہیں۔ یہ خواہش اور میلان تخلیق آدم کے وقت سے ان میں ودیعت کر دیا گیا تھا۔ یہ خواہش نسل انسانی کی بقا کا معاوضہ ہے۔ اگر یہ خواہش نہ ہوتی تو کوئی بھی انسان اپنی نسل کی بقا کے بارے میں نہ سوچتا، کیونکہ مرد و زن کے تعلقات کے دیگر تمام نتائج بھاری ذمہ داریوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، نیز محض اولاد کی محبت بھی نسل کی بقا کے لیے کافی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کو ایک دوسرے کی طرف مائل کرنے کے لیے ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا کی ہے۔ اس خواہش کو دبانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اگر یہ کسی کے بس میں ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام کے بس میں ہوتا، اسی لئے اس فطری جذبے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے آپ ﷺ نے جن چیزوں کو پسندیدہ قرار دیا ہے، ان میں بیویوں کو بھی شامل فرمایا۔

آپ ﷺ نبی ہونے کے باوجود جانتے تھے کہ وہ فطرت کے اصولوں کے تابع ہیں۔ آپ ﷺ کے دین میں رہبانیت نام کی کوئی چیز نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ایک صحابی نے کہا کہ وہ رات کو ہمیشہ نماز پڑھتا رہے گا، دوسرے نے کہا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا اور کبھی ناغہ نہ کرے گا اور تیسرے نے کہا کہ وہ عورتوں سے ہمیشہ دور رہے گا اور کبھی شادی نہیں کرے گا تو آپ ﷺ نے یہ سن کر ان سے ارشاد فرمایا: ''کیا تم نے ایسے ایسے کہا ہے؟ بخدا میں تم سے بڑھ کر خدا کا خوف وخشیت رکھنے والا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغے بھی کرتا ہوں۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، نیز میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔''(349)

رسول اللہ ﷺ بہت معتدل شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ﷺ نے واضح اور حقیقت پر مبنی اصول ومبادی متعارف کرائے۔ آپ ﷺ سیدھی اور آسان شریعت لے کر آئے، جس پر ہر ایک عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ کسی خاص گروہ یا جماعت کے لیے مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ آپ ﷺ سب کے لیے مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کا پیغام سب کے لیے ہے۔

نفس صافیہ کا مقام صرف انبیائے کرام کو حاصل ہو سکتا ہے اور آپ ﷺ اس درجے کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، چنانچہ معراج کی رات آپ ﷺ کے جسم اور روح میں مسابقت جاری رہی جہاں آپ ﷺ کی روح مبارکہ پہنچی، وہاں آپ ﷺ کا جسم مبارک بھی پہنچ جاتا۔

میں اس مقام پر آپ ﷺ کی معراج کی کیفیت کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، تاہم یہ بتانا مناسب خیال کرتا ہوں کہ اکثر اہل علم کے نزدیک آپ ﷺ کی معراج روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے تھی۔ آپ ﷺ کے جسم مبارک میں اس قدر نورانیت اور روحانیت تھی کہ جہاں تک آپ ﷺ کی روح کی رسائی تھی، وہاں تک بدن کی بھی رسائی تھی۔ آپ ﷺ کے سوا دوسرے لوگوں کو حالت خواب میں روحانی لحاظ سے تو معراج ہو سکتی ہے، لیکن روحانی اور بدنی دونوں لحاظ سے معراج کا حاصل ہونا صرف رسول اللہ ﷺ کا امتیاز ہے۔ صرف آپ ﷺ ہی اس میدان کے شہسوار اور اس راستے کے راہی ہیں۔

خوشبو فرشتوں اور روحانی مخلوقات کی غذا ہے، چونکہ رسول اللہ ﷺ کا عالم روحانی سے مضبوط تعلق تھا، اس لیے آپ ﷺ خوشبو کو بہت پسند فرماتے تھے۔ بیویوں اور خوشبو کو اپنی پسندیدہ چیزیں قرار دے

کر جہاں آپ ﷺ نے ایک ہی جملے میں روح اور بدن دونوں کی غذا کی وضاحت فرمائی، وہیں اپنی بعض صفات کا تذکرہ بھی فرمایا۔

تاہم چونکہ ان دونوں امور کا تعلق انسان کی فطری ضروریات اور تقاضوں سے ہے، اس لیے بیویوں اور خوشبو کی محبت صرف آپ ﷺ کی خصوصیت نہیں، بلکہ دوسرے لوگ بھی اس میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک ہیں اور اکثر لوگوں میں یہ بات پائی جاتی ہے، تاہم تیسری بات "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔" قدرے تفصیل کی متقاضی ہے۔

جس طرح ہم اپنی پسندیدہ ترین شخصیت کی آمد پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ خوشی کی کیفیت رسول اللہ ﷺ کی نماز کے دوران ہوتی تھی، مثلاً بالفرض رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے دور ہوتے اور پھر آپ ﷺ کو ان کی آمد کی اطلاع کی جاتی تو آپ ﷺ کو کس قدر خوشی ہوتی، لیکن آپ ﷺ کو اذان کی آواز سن کر اس سے کہیں زیادہ خوشی و مسرت ہوتی تھی، کیونکہ نماز سے آپ ﷺ کو محبت تھی اور اس میں آپ ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔

ایک اور حدیث "اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی لذت عطا فرمائی ہے اور میری لذت رات کی نماز میں ہے۔" (350) سے بھی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم مختلف قسم کی جسمانی لذتوں کے پیچھے چلتے ہو اور ان کی کشش کی وجہ سے ان کی طرف کھچے چلے جاتے ہو، لیکن میں جونہی اپنے وجدان کی یہ آواز سنتا ہوں کہ اٹھ نماز کا وقت قریب آ گیا ہے تو خوشی سے مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا اور نماز میں کھڑے ہونے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔ رات کو میرے سب سے پرمسرت لمحات وہ ہوتے ہیں، جن میں میں نماز میں مصروف ہوتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ عبادت گزاری، تعلق مع اللہ اور خدائی وحدت کے اعتراف کے اتنے اعلیٰ مقام پر فائز تھے کہ بہت سے لوگوں کے لیے اس کا ادراک بھی مشکل ہے۔ اوپر ذکر کردہ حدیث اس کی صرف ایک مثال ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو بستر پر نہ پایا۔ میں نے آپ ﷺ کو تلاش کرنا چاہا تو میرا ہاتھ آپ ﷺ کے قدم مبارک کے تلوے سے لگا۔ آپ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے آپ کے پاؤں مبارک کھڑے تھے اور آپ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: "اللھم أعوذ برضاك من سخطك وبمعافاتك من عقوبتك، وأعوذ بك منك،

لاأحصی ثناء أعلیك أنت کما أثنت علی نفسك "(351) "اے اللہ! میں آپ کی ناراضی سے آپ کی خوشنودی، آپ کی سزا سے آپ کی درگزر اور آپ کی ذات سے آپ ہی کی پناہ میں آتا ہوں۔ اے اللہ! میں آپ کی اتنی ثنا خوانی نہیں کر سکتا جتنی کہ خود آپ نے اپنی ثنا بیان کی ہے۔"

ایک اور روایت میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "ایک شب میں نے نبی اکرم ﷺ کو غائب پایا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں آپ ﷺ اپنی کسی دوسری بیوی کے پاس نہ چلے گئے ہوں، چنانچہ میں آپ تلاش میں نکلی، لیکن جب میں واپس لوٹی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپ ﷺ رکوع یا سجدے میں ہیں اور یہ تسبیح پڑھ رہے ہیں: "سبحانك وبحمدك لااله الا أنت" میں نے کہا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں آپ کے بارے کیا سوچ رہی تھی اور آپ کس حال میں ہیں!"(352)

رسول اللہ ﷺ نماز میں ایسے مشغول ہوتے جیسے، دوسرے لوگ اپنی خواہشات میں منہمک ہوتے ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے ایک رات نماز پڑھی اور اس کے رکوع اور سجدوں میں صبح تک یہ آیت ﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (المائدة: ۱۱۸) (353) "اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے)۔ بے شک تو غالب (اور) حکمت والا ہے۔"

آپ ﷺ کا نماز سے کبھی جی بھرتا اور نہ ہی آپ کے ہاں نماز کی ضرورت کی کوئی حد مقرر تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا شمار بڑے صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ آپ کے کوفہ شہر اور حنفی فقہ پر بہت احسانات ہیں، کیونکہ بہت سے علماء مثلاً علقمہ، ابراہیم نخعی اور امام ابوحنیفہ کے استاذ محترم حماد بن ابی سلیمان نے آپ رضی اللہ عنہ سے تلمذ حاصل کیا۔ آپ کی اور آپ کی والدہ کی رسول اللہ ﷺ کے گھر کثرت سے آمد و رفت کو دیکھ کر بعض لوگ آپ کو اہل بیت میں سے سمجھتے تھے۔(354) رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا: "قرآن چار لوگوں ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود)، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور ابوحذیفہ کے مولی سالم سے سیکھو۔"(355)

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا: "ذات وحدہ لاشریک کی قسم! میں تمہیں اپنے اوپر ترجیح دے کر انہیں تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، لہٰذا ان سے خوب علمی استفادہ کرو۔"(356) آپ کا جسم نحیف اور پنڈلیاں کمزور تھیں، لیکن آپ علم کا سمندر تھے۔(357)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابن وائل رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں فرماتے ہیں: ''ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اتنی دیر نماز میں کھڑا رہا کہ مجھے ایک براخیال آنے لگا۔'' ہم نے پوچھا: ''آپ کو کیا خیال آیا تھا؟'' انہوں نے فرمایا: ''مجھے خیال ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر بیٹھ جاؤں۔''(358)

یہ جاننے کے لیے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیٹھنے کا ارادہ کیوں کیا تھا، ہم ایک اور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شب میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز شروع کی۔ آپ ﷺ نے سورت بقرہ شروع فرمائی۔ میں نے سوچا آپ ﷺ سو آیات پر رکوع فرمائیں گے، لیکن آپ نے تلاوت جاری رکھی پھر میں نے خیال کیا کہ آپ ﷺ اگلی سو آیات پر رکوع کریں گے، لیکن آپ اس سے بھی آگے چلے گئے پھر میں نے سوچا آپ اس سورت کے اختتام پر رکوع فرمائیں گے، لیکن آپ نے سورت النساء شروع فرمادی اور اسے ختم فرما کر سورت آل عمران شروع فرمائی یہاں تک کہ اسے بھی مکمل فرمایا۔ آپ ﷺ ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے۔ جب کوئی تسبیح والی آیت پڑھتے تو تسبیح فرماتے، جب کسی آیت میں لائقِ سوال بات ہوتی تو اسے اللہ سے مانگتے اور جب کسی آیت میں کوئی قابل پناہ بات ہوتی تو اس سے پناہ مانگتے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے رکوع فرمایا اور اس میں ''سبحان ربی العظیم'' پڑھنے لگے۔ آپ کا رکوع بھی قیام کے قریب قریب تھا۔ پھر آپ ''سمع الله لمن حمده'' کہہ کر کھڑے ہوئے اور تقریباً رکوع کی مقدار کھڑے رہے، پھر آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا اور اس میں ''سبحان ربی الأعلی'' پڑھتے رہے۔ آپ ﷺ کا سجدہ قیام کے قریب قریب تھا۔(359)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ارشاد خداوندی: ﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي﴾ (ابراهيم:٣٦)'' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ کی تلاوت فرمائی اور پھر ہاتھ بلند فرما کر روتے ہوئے التجا کی: ''اے اللہ! میری امت!'' اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے باخبر ہونے کے باوجود حضرت جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا: ''محمد کے پاس جاؤ اور ان سے رونے کا سبب پوچھو، چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر رونے کا سبب پوچھا۔ نبی اکرم ﷺ نے جو بات کہی تھی وہ انہیں بتادی، (جسے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ تک

پہنچادیا) حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بخوبی واقف تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اے جبرائیل! محمد کے پاس جا کر ان سے کہو: ہم آپ کو رنج نہ پہنچائیں گے، بلکہ آپ کی امت کے بارے میں آپ کو خوش کر دیں گے۔"(360)

آپ ﷺ نے ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزاری۔ نماز آپ ﷺ کو ہر چیز سے زیادہ پسند تھی اور اس میں آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جس حالت میں انسان کی موت واقع ہوتی ہے، اسی حالت میں اسے اٹھایا جائے گا۔" ہر فانی انسان کی طرح آپ ﷺ کا وفات پانا طے تھا، لیکن آپ ﷺ نے رفیق اعلیٰ سے ملاقات تک تمام عمر نماز پڑھتے ہوئے گزاری۔(361)

اپنی زندگی کے آخری ایام میں آپ ﷺ کی بیماری اتنی شدت پکڑ گئی کہ سر پر پانی ڈالنے کے بعد بھی بڑی مشکل سے آپ ﷺ اپنی آنکھیں کھول پاتے، لیکن آپ ﷺ جونہی ہوش میں آتے اور آنکھیں کھولتے فوراً پوچھتے: "کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟" آپ ﷺ کی ساری فکر نماز پر مرکوز تھی۔ یہ صورت حال بار بار پیش آئی۔ ذیل میں کتب حدیث سے اس واقعہ کو نقل کیا جاتا ہے:

حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: "کیا آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کی بیماری سے متعلق بتائیں گی؟" انہوں نے فرمایا: "کیوں نہیں، نبی اکرم ﷺ کی طبیعت بوجھل ہوگئی۔ آپ نے پوچھا: "کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟" ہم نے کہا: "نہیں، بلکہ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "میرے لئے ٹب میں پانی ڈالو۔" ہم نے حکم کی بجا آوری کی۔ آپ غسل فرما کر اٹھنے لگے تو آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ کو افاقہ ہوا تو آپ ﷺ نے پھر پوچھا: "کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟" ہم نے جواب دیا: "اے اللہ کے رسول! نہیں، وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: "میرے لئے ٹب میں پانی رکھو۔" آپ اس میں بیٹھے، غسل فرمایا اور جب اٹھنے لگے تو پھر آپ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد آپ کو افاقہ ہوا آپ نے پھر استفسار فرمایا: "کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟" ہم نے کہا: "یا رسول اللہ! نہیں، بلکہ وہ آپ کے انتظار میں ہیں۔" لوگ مسجد میں عشاء کی نماز کے لئے نبی اکرم ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، چنانچہ قاصد نے ان سے جا کر کہا: "رسول اللہ ﷺ آپ کو نماز میں لوگوں کی امامت کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔" چونکہ حضرت ابوبکر رقیق القلب انسان تھے، اس لئے انہوں نے حضرت عمر سے لوگوں کو نماز پڑھانے کا کہا، لیکن حضرت عمر نے فرمایا: "آپ اس

کے زیادہ حقدار ہیں۔'' چنانچہ ان ایام میں حضرت ابوبکر نے نمازیں پڑھائیں، پھر ایک دن نبی کریم ﷺ کو کچھ افاقہ محسوس ہوا تو آپ ﷺ دو آدمیوں جن میں سے ایک حضرت عباس تھے، کا سہارا لے کر ظہر کی نماز کے لئے نکلے۔ اس وقت حضرت ابوبکر امامت کر رہے تھے۔ جب حضرت ابوبکر نے آپ ﷺ کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے، لیکن آپ ﷺ نے انہیں پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ کیا اور فرمایا: ''مجھے اس کے پہلو میں بیٹھا دو، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کو حضرت ابوبکر کے پہلو میں بٹھا دیا۔ حضرت ابوبکر کھڑے ہونے کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کی نماز کی اقتدا کرنے لگے، لوگ حضرت ابوبکر کی اقتدا کر رہے تھے اور نبی اکرم ﷺ بیٹھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آخری بیماری میں مسجد میں صرف دو نمازیں ادا فرمائیں۔ ان میں سے ایک یہ نماز تھی اور دوسری نماز آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر کے پیچھے پڑھی تھی۔''(362)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز اور جماعت کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ چلنے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود حضرت عباس اور علی رضی اللہ عنہما کے سہارے گھسٹتے ہوئے مسجد میں تشریف لے گئے۔

ارشادِ خداوندی ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (البقرہ:۴۳) ''اور (خدا کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔'' کی بنیاد پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نماز باجماعت کو فرض عین قرار دیتے ہیں۔(363) بعض علماء جماعت کو نماز کا رکن قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں بغیر جماعت کے نماز نماز ہی نہیں کہلاتی۔(364) امام شافعی نے باجماعت نماز کو فرض کفایہ قرار دیا ہے۔(365) فقہ حنفی کے مطابق اس کی حیثیت سنت مؤکدہ کی ہے،(366) جبکہ بعض علماء اسے واجب بھی کہتے ہیں۔(367)

ہمارا مقصود اس موضوع کی فقہی حیثیت بیان کرنا نہیں ہے۔ یہ بات تو ہم نے صرف یاددہانی کے طور پر کہی ہے۔ ہمارا اصل مقصود رسول اللہ ﷺ کے جذبۂ بندگی، نماز کے ساتھ آپ ﷺ کے قلبی لگاؤ اور آپ ﷺ کی شخصیت پر نماز کے گہرے اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ جب ایک عام نمازی شخص کو نماز برائی اور گناہ سے روکتی اور دور رکھتی ہے تو رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیا شان ہو گی؟ کیا آپ ﷺ کی نماز آپ کو ہر برائی اور گناہ سے دور نہ رکھتی ہو گی؟ یقیناً رکھتی ہو گی۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی نماز کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''آپ ﷺ چار رکعات نماز پڑھتے۔ وہ اتنی طویل اور دلکش ہوتی تھیں کہ کچھ نہ پوچھئے، اس کے بعد آپ ﷺ مزید چار رکعات نماز پڑھتے وہ بھی اس قدر طویل اور دلکش ہوتی تھیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔''(368)

اگر اللہ تعالیٰ کے وجود پر کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو آپ ﷺ کی نماز ہی اس کی کافی دلیل تھی، یوں لگتا جیسے آپ ﷺ کی نمازوں میں اللہ تعالیٰ کی تجلی جلوہ گر ہوتی تھی۔ کیا ایسی نمازیں پڑھنے والے شخص سے کسی گناہ یا برائی کا ارتکاب ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔

آپ ﷺ کی عبادات کا ایک مکمل نظام تھا۔ آپ ﷺ نماز کو بہترین طریقے سے ادا کرنے کے باوجود دیگر عبادات مثلاً روزوں وغیرہ میں ذرہ برابر کوتاہی نہ فرماتے۔ آپ ﷺ کے روزے اتنے لمبے ہوتے کہ صحابہ کرام یہ سمجھنے لگتے کہ آپ ﷺ کبھی روزے کا ناغہ نہ فرمائیں گے۔ بسا اوقات آپ ﷺ دوسروں کی طرح روزے چھوڑنے لگتے، تاہم آپ ﷺ کے روزے آپ کے ناغوں سے زیادہ ہوتے تھے۔(369)

بسا اوقات آپ ﷺ "صوم وصال" بھی رکھتے تھے، یعنی کئی کئی دن افطار کیے بغیر روزے سے رہتے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرام کے دل میں آپ ﷺ کی تقلید کا شوق پیدا ہوتا، لیکن جلد ہی انہیں اس کی صعوبت کا اندازہ ہو جاتا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے آخری ایام میں صوم وصال کی نیت فرمائی۔ آپ ﷺ کی تقلید میں بعض صحابہ کرام نے بھی اس کی نیت کر لی، لیکن چند ہی دنوں میں بھوک نے انہیں نڈھال کر دیا اور ان کی ہمت جواب دینے لگی، تاہم عید کی آمد نے ان کی مشکل کو حل کر دیا۔ اگر روزے دو ایک دن مزید جاری رہتے تو ان میں سے کسی کے لیے بھی انہیں جاری رکھنا ممکن نہ رہتا۔ رسول اللہ ﷺ یہ صورتحال دیکھ مسکرائے اور شفقت کے پیش نظر انہیں صوم وصال سے منع فرما دیا۔ صحابہ نے عرض کی: "آپ بھی تو صوم وصال رکھتے ہیں؟" اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "میں تمہاری طرح نہیں ہوں، مجھے تو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔"(370)

ماہ رمضان میں آپ ﷺ کی عبادات کی خاص شان ہوتی تھی۔ رمضان میں آپ ﷺ زیادہ عبادت فرماتے، دن بھی عبادت میں گزارتے (371) اور رات کو بھی کم ہی سوتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ شدید گرمی کے دنوں میں بھی روزہ رکھتے تھے۔ بہت سی جنگوں میں آپ ﷺ نے روزے کی حالت میں شرکت فرمائی۔ بعض اوقات تو جنگ اتنی شدت اختیار کر جاتی کہ ایک خونریز معرکے میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے سوا آپ کے ہمراہ کوئی اور روزے دار نہ رہا۔(372) اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: "روزہ ڈھال ہے۔"(373) یعنی یہ گناہوں اور معاصی میں مبتلا ہونے سے انسان کی حفاظت کرتا ہے۔

د: ادعیہ مسنونہ

ا- دعا: عبادت کا مغز

دعا نہ صرف عبادت ہے،(374) بلکہ عبادت کا مغز ہے۔(375) دعا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع سے عبارت ہے۔ دعا پر گفتگو کیے بغیر عبادت کے موضوع کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ﴾ (الفرقان: ۷۷) "کہہ دو کہ اگر تم (خدا کو) نہیں پکارتے تو میرا پروردگار بھی تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرتا۔" ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن: ٦٠) "تم مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری (دعا) قبول کروں گا۔"

دعا بندے اور خدا کے درمیان مضبوط رابطے کا ذریعہ ہے، دوسرے لفظوں میں یہ خدا کے حضور بندے کی التجا پیش کرنے کی ایک صورت ہے۔ ہر ایسی چیز جو بندہ حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن اپنے وسائل کے ذریعے اسے نہیں پا سکتا، وہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا ہے۔ قادر مطلق ذات کے حضور یہ التجا دعا کہلاتی ہے۔

آج ہماری زندگی میں دعاؤں کا دائرہ پنج وقتہ نمازوں اور بعض دیگر عبادات کی اختتامی دعاؤں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ دنیوی اور اخروی زندگی کی بہت سے ضروریات دعا کے دائرے سے خارج ہو چکی ہیں، حالانکہ دعا کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ زندگی آغاز سے اختتام تک دعا سے عبارت ہے۔ دعا رضائے الٰہی کا پروانہ اور جنت کے دروازے کی کنجی ہے۔ یہ بندے کی طرف سے اپنے پروردگار کے حضور پیش کئے جانے والے نذرانۂ بندگی کی نشانی اور پروردگار کی طرف سے اپنے بندے پر رحمت کا اظہار ہے۔(376) دوسرے لفظوں میں یہ بندے اور خدا کے درمیان تعلق کا نقطہ اتصال ہے۔ یہ عبادت کے ساتھ ساتھ ایسی معراج ہے، جس کے ذریعے دنیا کا ماورائے دنیا کے ساتھ ربطہ قائم ہوتا ہے۔ یہ درجہ بدرجہ انسان کو قربِ خداوندی کی طرف لے جانے والا مقدس زینہ ہے۔

دعا ہم پر رحمت خداوندی کا باعث ہے۔ یہ قہر خداوندی کی بجلیوں کو ہم پر گرنے سے روکتی ہے۔ دعا رحمت الٰہیہ کے حصول اور غضب خداوندی کو دور کرنے کا مؤثر ذریعے ہے۔ عام طور پر انسان کو دعا کا خیال اس وقت آتا ہے، جب معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلنے لگتا ہے، حالانکہ ہر آن اور ابتدا سے ہی دعا کا اہتمام ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعا کے نقطہ آغاز یا اختتام کا تعین نہیں کیا جا سکتا،

کیونکہ انسان کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں، جس میں اسے دعا کی ضرورت نہ ہو۔ جو انسان کسی بھی لمحے تجلیاتِ الٰہیہ اور رحمت خداوندی سے دور نہیں ہوتا، اس کے لیے دعا سے دور ہونا ممکن نہیں، کیونکہ دعا کے ذریعے انسان اپنے پروردگار کا در کھٹکھٹاتا ہے، اسی کے ذریعے اس سے ہم کلام ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے رحمت الٰہیہ کی برسات کو سمیٹتا ہے۔

دعا ہماری طرف سے درخواست ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنی تمام مادی اور روحانی ضروریات مانگتے ہیں، تاہم اکثر اوقات ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم کیا اور کیسے مانگ رہے ہیں، جس کی وجہ سے دعا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دعا کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے سوال کردہ معاملات قادر مطلق کے منشا کے بجائے اس کے ارادے اور خواہش کے مطابق حل ہوں، یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو جلد اور اپنی مرضی کے مطابق پورا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں اور جب ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو ہم مایوس ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوئیں، دوسرے لفظوں میں ہم خدا کی مشیت مطلقہ کو اپنے جزوی ارادے کے تابع کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ بات دعا کے آداب کے منافی ہے اور ایسی دعائیں خدا اور اس کے بندے کے درمیان رابطے کا کام نہیں دیتیں۔ دعا کے آداب و شرائط کی رعایت دعا کی قبولیت کا اہم ترین وسیلہ ہے۔

بسا اوقات دعا شدید خواہش اور شوق کی صورت میں دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے، ایسی کیفیت میں بندہ زبان سے کچھ نہیں کہتا، لیکن وہ جانتا ہے کہ علام الغیب ذات اس کے حال سے واقف ہے۔ وہ اعتماد اور بھروسے کی اس کیفیت کو بالکل اسی طرح زیادہ سے زیادہ دیر برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں پھینکے جانے کے وقت اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی اور جب تمام راستے مسدود اور تمام امکانات ختم ہو گئے تو بالکل غیر متوقع طور پر امر الٰہی ﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ﴾ (الأنبيا: ٦٩) ''ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی (بن جا)۔'' ان کی مدد و نصرت کے لیے آ پہنچا۔

دعا کی ایک صورت اپنے دلی احساسات کو الفاظ کی صورت میں رب العالمین کے حضور پیش کرنے کی ہے۔ اس صورت میں کبھی تو بندہ صرف اپنا عرضِ حال پیش کرتا ہے اور کبھی سوال بھی کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں انبیائے کرام کی زبانی دونوں قسم کی دعاؤں کی مثالیں موجود ہیں، پہلی قسم کی مثال حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا ﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ (الأنبياء: ٨٣) ''اور ایوب (کو یاد کرو) جب انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ

مجھے ایذا ہورہی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔'' اور حضرت یونس علیہ السلام کی دعا ﴿لَا إِلَـٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (الأنبياء: ٨٧) ''تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے (اور) بے شک میں قصوروار ہوں۔'' ہے۔ دوسری قسم کی مثال حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ﴾ (آلِ عمران: ٣٨) ''پروردگار مجھے اپنے جناب سے اولادِ صالح عطا فرما۔ تو بے شک دعا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔'' ہے۔

قرآنِ کریم کا دعا کا اہتمام کرنا اور نبی کریم ﷺ کو دعاؤں کی تعلیم دینا اس موضوع کی اہمیت کی دلیل ہے۔ اگر اس کی اتنی اہمیت نہ ہوتی تو قرآن کریم سینکڑوں آیات میں دعاؤں کے موضوع پر کیوں زور دیتا، مزید برآں بہت سی احادیث مبارکہ دعا کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے امت مسلمہ کو زندگی کے مختلف مواقع پر دعاؤں کی تعلیم دیتی ہیں۔ انسان کو دعا کے دوران اپنے احساسات، افکار اور خواہشات کو بہترین اسلوب اور جامع الفاظ میں تعبیر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضرورت کو سب سے پہلے قرآن کریم اور پھر احادیث مبارکہ احسن طریقے سے پورا کرتے ہیں۔

یہ بالکل فطری بات ہے کہ جس خدا نے ہمیں دعا مانگنے کا کہا ہے، وہی ہمیں دعا کرنے کا طریقہ بھی سکھائے، نیز چونکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ معرفت حاصل تھی اور آپ نے اپنے مولا کے درِ رحمت کو سب سے زیادہ کھٹکھٹایا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اپنی امت کو دعاؤں کی سب سے بہتر، دلکش، مؤثر اور بابرکت تعبیرات سکھائی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ صاحبِ استقامت انسان تھے۔ بندگی استقامت کا دوسرا نام ہے۔ ارشاد خداوندی ﴿وَأَنِ اعْبُدُونِي هَـٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾ (یس: ٦١) ''اور یہ کہ میری عبادت کرنا یہی سیدھا رستہ ہے۔'' اسی حقیقت کی طرف مشیر ہے۔ آپ ﷺ کی تمام حرکات وسکنات سے توازن جھلکتا تھا۔ دنیا کی فتح کے لیے فوجیں بھیجتے وقت آپ ﷺ ایک چونٹی کو بھی بلاوجہ تکلیف نہ پہنچانے کے اصول پر کاربند رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اسباب کو اختیار فرمایا، لیکن دعا سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوئے۔

جو شخص رات دن دعا اور مناجات سے بھرپور زندگی، دعا کے اسرار وآداب اور اس کے مادی وروحانی ثمرات دیکھنے کا خواہش مند ہو اسے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔

سینکڑوں مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے مروی دعاؤں کو کتابی شکل میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ''مجموعہ ادعیہ ماثورہ'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔[377] اس کتاب کی تالیف میں اختصار اور عملی پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ دعاؤں کے سلسلے میں کوئی انسان رسول اللہ ﷺ کے قدموں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ خدا کے حضور دعا کرتے ہوئے گزارا ہو۔ اگر کوئی انسان ساری زندگی صرف دعا میں ہی مشغول رہے پھر بھی اس کی دعاؤں کی تعداد رسول اللہ ﷺ سے مروی دعاؤں سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر گوشے میں دعاؤں کا عنصر شامل تھا، جسے آپ ﷺ کی زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ﷺ کے دل میں اور زبان پر ہر لمحہ کوئی نہ کوئی دعا رہتی تھی۔ آپ ﷺ نے اس آبِ کوثر سے کبھی استغناء نہیں برتا۔ جہاں آپ ﷺ فعال اور متحرک انسان تھے، وہیں آپ ﷺ صاحب دعا اور عبادت گزار انسان بھی تھے۔

صحابہ کرام بھی عبادت کا خصوصی ذوق رکھتے تھے، لیکن جب وہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے تو تھک ہار کر پیچھے رہ جاتے، لیکن آپ ﷺ بغیر کسی تھکاوٹ واکتاہٹ کے سفر عبادت جاری رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تخلیق ہی ہمیشہ آگے آگے چلنے کے لیے کی تھی حتیٰ کہ معراج کے موقع پر جب جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کی تو ایک مقام پر پہنچ کر وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ مزید چلنے سے عاجز آگئے۔ بلاشبہ آپ ﷺ سیر الی اللہ میں فرشتوں پر بھی سبقت لے جانے والے انسان تھے۔

رسول اللہ ﷺ دعا اور اس کے شعور کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، جہاں سے آپ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال و جمال کا مشاہدہ کرتے، لیکن کبھی سیر نہ ہوتے، بلکہ یوں فرماتے: ''اے اللہ! ہم نے آپ کی معرفت کا حق ادا نہیں کیا۔'' درحقیقت معرفت خداوندی کا احاطہ نہ کرسکنے کا اعتراف ہی معرفت ہے، یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''ادراک سے عاجز آجانا ہی ادراک ہے۔'' کیونکہ وہ ہمیشہ ''ہل من مزید؟'' کے آفاق میں محو پرواز رہتے تھے۔

۲- گلدستۂ ادعیہ مسنونہ

چونکہ اس موضوع پر ہم صرف رسول اللہ ﷺ کی عظمت کی حیثیت سے گفتگو کررہے ہیں، اس

لیے یہاں ہم آپ ﷺ کی تمام دعاؤں کا تذکرہ نہیں کریں گے، بلکہ بطور نمونے کے صرف چند ایک کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

الف: سونے سے پہلے کی دعائیں

سونے کے لیے لیٹنے والے شخص کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ نیند موت کی بہن ہے،[378] کیونکہ بسا اوقات انسان سوتا ہے، لیکن اسے اٹھنا نصیب نہیں ہوتا، لہٰذا انسان کو غفلت کی حالت میں بستر پر دراز نہیں ہونا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ سونے سے پہلے سورت بقرہ کی ابتدائی آیات، اس کی آخری تین آیات،[379] آیت الکرسی،[380] سورت یس،[381] سورت سجدہ،[382] اور سورت ملک[383] کی تلاوت فرماتے، نیز سورت اخلاص اور معوذتین تین تین بار اور سورت کافرون ایک بار پڑھ کر[384] اپنے ہاتھوں پر پھونکتے اور جہاں تک ہاتھ پہنچتے انہیں بدن پر پھیرتے۔[385] ان کے علاوہ آپ ﷺ اور بھی دعائیں پڑھتے تھے، لیکن ہم طوالت کے خوف سے انہیں یہاں ذکر نہیں کر رہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کے ذریعے اپنی زندگی کو منور کرنے کے لیے اوپر ذکر کردہ کتاب اور مسنون دعاؤں کے دیگر مجموعوں کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں۔

ب: بستر میں داخل ہونے کی دعائیں

بستر میں داخل ہو کر آپ ﷺ تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمد للہ اور تینتیس یا چونتیس بار اللہ اکبر پڑھتے اور بہت سی دعائیں مانگتے۔[386] جن میں سے ایک دعا حسب ذیل ہے:

"اللهم أسلمت نفسي اليك ووجّهت وجهي اليك وفوضّت أمري اليك وألجأت ظهري اليك رغبة ورهبة اليك، لا ملجأ ولا منجا منك الا اليك، آمنت بكتابك الذي أنزلت ونبيك الذي أرسلت."[387] "اے اللہ میں نے اپنی ذات آپ کے سپرد کی، اپنا رخ آپ کی طرف پھیرا، اپنا معاملہ آپ کے حوالے کیا، خوشی اور خوف کی حالت میں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا اور میں آپ کی نازل کردہ کتاب اور آپ کے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان لایا۔" "اللهم قني عذابك يوم تبعث عبادك، باسمك أموت و أحيا." "اے اللہ! جس دن آپ اپنے بندوں کو اٹھائیں گے، اس دن مجھے اپنے عذاب سے بچانا۔ میں آپ کے نام پر مرتا اور جیتا ہوں۔"[388]

اس کے بعد آپ ﷺ اپنا دائیاں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے، اپنے گھٹنوں کو تھوڑا سا موڑتے اور قیام اللیل کے لیے اٹھنے کی نیت کر کے بائیں کروٹ پر سو جاتے۔[389] آپ ﷺ عمر بھر رات کے آخری پہر میں اپنے خالق کے سامنے کھڑے ہونے کی لذت اٹھانے کے لیے قیام اللیل کے شوق و اشتیاق کے جذبے سے سرشار رہے۔

ج: تہجد کے وقت کی دعا

نماز تہجد کے لیے اٹھتے وقت آپ ﷺ درج ذیل دعا پڑھا کرتے تھے: "اللھم لك الحمد أنت قيّم السموات والأرض ومن فيهنّ، ولك الحمد لك ملك السموات و الأرض ومن فيهن، ولك الحمد لك نور السموات والأرض."[390] "اے اللہ! آپ ہی کو سب تعریفیں سزاوار ہیں۔ آپ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے کو سنبھالنے والے ہیں۔ آپ ہی کو سب تعریفیں سزاوار ہیں۔ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے پر آپ ہی کی بادشاہت ہے۔ آپ ہی کو سب تعریفیں سزاوار ہیں۔ زمین و آسمان کی روشنی آپ ہی سے ہے۔" رات کی تاریک گھڑیوں میں اس دعا کے الفاظ بڑے معنی خیز ہوتے ہیں۔ رات کے وقت آسمان اپنی عظمت اور خوبصورتی کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے، ستارے پوری آب و تاب سے جگمگا رہے ہوتے ہیں، ذکر خدا سے معمور دل پر معانی کا الہام ہو رہا ہوتا ہے، زمین آسمان سے سرگوشیوں میں مصروف ہوتی ہے اور زمین و آسمان کے خالق کی حمد و ثنا بلند ہو رہی ہوتی ہے۔

بہت سے علماء کی رائے میں لفظ "القیوم" اسم اعظم ہے۔ نبی کریم ﷺ اس کی تجلیات سے مستفیض ہونے کے لیے اکثر اوقات اسی نام سے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے۔ چونکہ ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور ملکیت ہے، اس لیے وہ مَلِک اور مالک ہے۔

آپ ﷺ کے صدق اور وفائے عہد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نیند سے اٹھتے ہی چند گھنٹے پہلے کیے گئے عہد کی تجدید کرنے لگتے ہیں، چونکہ آپ ﷺ نیند کے عالم سے عالم شہود کی طرف آ رہے ہوتے ہیں، اس لیے آپ تجدید عہد کو ضروری خیال کرتے ہیں، پھر آپ ﷺ اپنی سابقہ دعا کو درج ذیل الفاظ سے مکمل فرماتے ہیں:

"ولك الحمد أنت الحق ووعدك الحق و لقائك حق وقولك حق والجنة حق و النار حق والنبيون حق محمد ﷺ حق والساعة حق. اللهم لك أسلمت وبك آمنت

عليك توكلت اليك أنبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفرلى ماقدمت وماأخرت وماأسررت وماأعلنت ، أنت المقدم و أنت المؤخر لااله الا أنت - أو - لااله غيرك . "(391)

"اور آپ ہی کو سب تعریفیں سزاوار ہیں۔آپ حق ہیں۔آپ کا وعدہ حق ہے۔آپ کی ملاقات حق ہے۔آپ کی بات حق ہے۔ جنت حق ہے۔دوزخ حق ہے۔ تمام انبیاء برحق ہیں۔محمد ﷺ برحق ہیں اور قیامت حق ہے۔اے اللہ! میں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا۔آپ پر ہی میں ایمان لایا۔آپ پر ہی میں نے بھروسا کیا۔آپ ہی کی طرف میں نے رجوع کیا۔آپ ہی کی مدد سے میں نے مخاصمت کی اور آپ ہی کے پاس میں اپنا مقدمہ لے کر آیا۔آپ میرے اگلے پچھلے اور ظاہری و باطنی گناہ معاف فرمادے۔آپ ہی سب سے پہلے ہیں اور آپ ہی سب کے بعد ہیں۔آپ کے سوا کوئی معبود نہیں یا یوں فرمایا آپ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔"

جب آپ ﷺ "الحق" کہتے ہیں تو حسب قاعدہ اس کا فرد کامل مراد ہوتا ہے، جو حق تعالیٰ کی ذات ہے۔اس سے دراصل رسول اللہ ﷺ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جو چیز بھی حق تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے وہ "حق" ہوتی ہے۔

سونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ اپنا ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے تھے، نیند سے بیدار ہوتے ہی اس کی تجدید فرماتے اور اپنے نئے دن کا آغاز اللہ تعالیٰ کے حضور مکمل تسلیم و رضا کے اظہار سے کرتے۔آپ ﷺ اپنی اس دعا کا اختتام اس حقیقت "لاحول ولاقوۃ الاباللہ" کے اظہار پر فرماتے، کیونکہ اگر انسان اللہ تعالیٰ سے مدد نہ مانگے تو اپنے کندھوں پر پڑنے والی ذمہ داریوں کو کبھی نہیں اٹھا سکتا۔ایمان، توکل اور تسلیم و رضا کی توفیق صرف مشیت ایزدی سے مل سکتی ہے، لہٰذا ہر انسان اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج ہے۔

اس قسم کے روحانی ماحول میں رسول اللہ ﷺ تاریک رات کے پردوں کو اپنے آنسوؤں سے نمناک کرنے کے لیے نماز میں مصروف ہو جاتے۔جب رسول اللہ ﷺ تنہائی میں نفل نماز پڑھتے تو لمبی لمبی رکعات پڑھتے اور ان میں خوب دعائیں مانگتے۔(392) نماز کے آغاز میں سورت فاتحہ سے پہلے آپ ﷺ درج ذیل دعا مانگتے اور بعض اوقات کچھ اور اضافے بھی فرماتے: "اللھم لامانع لما أعطيت ولا معطى لما منعت،ولا ينفع ذاالجدمنك الجد."(393) "اے اللہ! آپ جو چیز عطا کرنا چاہیں اسے کوئی روک نہیں سکتا اور آپ جسے روکنا چاہیں اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی مالدار کو اس کا مال آپ کے مقابلے میں فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔" بعض اوقات یہ دعا مانگتے: "اللھم

باعد بيني وبين خطاياى كما باعدت بين المشرق والمغرب، اللهم نقّني من خطاياى كما ينقّى الثوب الأبيض من الدنس." (394) "اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان ایسے ہی دوری پیدا کر دیجئے جیسے آپ نے مشرق اور مغرب کے درمیان دوری پیدا کی ہے اور مجھے میری خطاؤں سے ایسے پاک فرما دیجئے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیا جاتا ہے۔" اس کے بعد ثنا پڑھتے اور پھر اس ساری تسبیح و تقدیس کے بعد سورت فاتحہ شروع فرماتے۔

درحقیقت اس وقت کی نماز میں آپ ﷺ اور دعائیں بھی مانگتے تھے، لیکن اختصار کے پیش نظر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قارئین کو "مجموعہ ادعیہ ماثورہ" کی طرف مراجعت کا مشورہ دیتے ہیں۔

د: صبح کے وقت بیداری کی دعائیں

صبح کے وقت آپ ﷺ کی زبان پر درج ذیل دعا جاری ہوتی: "اللهم انى أصبحت أشهدك أشهد حملة عرشك وملائكتك وجميع خلقك أنك أنت الله لااله الاأنت و أن محمدا عبدك ورسولك." (395) "اے اللہ! صبح ہوگئی۔ میں آپ کو، آپ کے عرش کو اٹھانے والوں کو، آپ کے فرشتوں کو اور آپ کی ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ آپ کے بندے اور رسول ہیں۔"

آپ ﷺ ساری مخلوقِ خدا، درختوں، پتوں اور ان کی سرسراہٹ، دریاؤں، ندی نالوں، آبشاروں اور ان کے پانی کے گرنے کی آواز کو گواہ بناتے تھے اور پھر اس گواہی کے ساتھ اپنی رسالت کی گواہی کو بھی شامل فرما کر ان ساری گواہیوں کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش فرماتے۔

رسول اللہ ﷺ کی اس دعا سے آپ ﷺ کے شعوری افق کی وسعت، ادراک کی گہرائی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ ﷺ کے تعلق کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر آپ ﷺ کے سوا کوئی اور ان الفاظ کو دہرائے تو اسے آپ ﷺ کی طرح ان الفاظ کی گہرائی کا ادراک نہیں ہوگا۔

آپ ﷺ نے ساری کائنات، خصوصاً مقرب فرشتوں اور کائنات پر نظر رکھنے والے آسمان کے مکینوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور حمد و ثنا پر گواہ بنایا۔ رسول اللہ ﷺ کے فرشتوں کو گواہ بنانے سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی بڑے در کو کھٹکھٹانے کے لیے کسی ایسے ہاتھ کی تلاش بھی ضروری ہے، جس کے ذریعے اسے کھٹکھٹایا جائے، یہی وجہ ہے کہ ہم حضرت عمر بن خطاب جیسے صاحب فراست انسان کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مدینے میں قحط سالی کے سال حضرت عباس بن عبدالمطلب کے وسیلے سے بارش کی

دعا کرتے ہوئے فرمایا: "اللھمّ ھذا عمّ نبیك ﷺ نتوجّه الیك به فاسقنا" "اے اللہ! یہ آپ کے نبی ﷺ کے چچا ہیں، ہم ان کے وسیلے سے آپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں بارش عطا فرما۔" ابھی وہ اپنی جگہ سے اٹھے نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔(396)

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کے دعا کے دوران فرشتوں کو گواہ بنانے سے اخذ کی تھی۔ اسی شعور کے تحت دور حاضر کے عظیم داعی دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"الٰہی! گناہوں نے میری زبان گنگ کردی، معاصی کی کثرت نے مجھے شرمندہ کردیا اور غفلت کی شدت نے میری آواز کو پست کردیا ہے۔ میں آپ کی رحمت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں اور آپ کے درمغفرت پر سیدی وسندی شیخ عبدالقادر جیلانی کی آپ کے ہاں مقبول ومانوس آواز کے ذریعے صدا لگاتا ہوں: "اے وہ ذات! جس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے، جسے کوئی چیز نفع پہنچاسکتی ہے اور نہ نقصان، جس پر کوئی چیز غالب آسکتی ہے اور نہ مخفی رہ سکتی ہے، جسے کوئی چیز تھکا سکتی ہے اور نہ وہ کسی چیز کی مدد کی خواہاں ہے۔"(397)

رسول اللہ ﷺ کی صبح کی دعاؤں میں درج ذیل دعا بھی شامل ہے: "اللھمّ فاطر السموٰت والأرض عالم الغیب والشھادۃ ذاالجلال والاکرام، انی أعھد الیك فی ھذہ الحیاۃ الدنیا أنی أشھد أن لاالٰہ الاأنت وحدہ لاشریك لك" "اے زمین وآسمان کو پیدا کرنے والے! اے غیب وشہادت کے جاننے والے! اور اے عزت وبزرگی والے! میں آپ سے اس دنیا کی زندگی میں عہد کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ یکتا ہیں اور آپ کا کوئی شریک نہیں۔"(398)

اس دعا میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دیگر اسمائے حسنیٰ مثلاً باری، خالق اور جاعل وغیرہ کی بجائے "فاطر" کا لفظ استعمال فرمایا، جس سے درج ذیل معانی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے: "آپ نے زمین وآسمان کو قوانین فطرت کے مطابق پیدا کیا، آپ نے نظام کو وجود بخشا اور ان قوانین کو صاف ستھری اور روشن صورت عطا فرمائی۔"

ہ: شام کے وقت کی آپ ﷺ کی دعائیں

طلوع شمس کے بعد اور صبح کے آغاز میں آپ ﷺ مذکورہ بالا دعا اور اس کے علاوہ دسیوں دوسری دعائیں مانگتے تھے۔ غروبِ آفتاب اور تاریکی چھانے کے فوراً بعد آپ ﷺ روشنی اور نور کا باعث بننے

والی درج ذیل دعا فرماتے۔آپ ﷺ کی شامیں آپ کی صبحوں کی طرح منور ہوتی تھیں اور آپ کی دعائیں مثل قنادیل تھیں، جنہیں جلانا آپ کبھی نہ بھولتے:"اللهم انی أمسيت أشهدك أشهد حملة عرشك وملائكتك وجميع خلقك أنك أنت الله لااله الاأنت وأن محمدا عبدك ورسولك." (399) "اے اللہ! شام ہوگئی۔میں آپ کو، آپ کے عرش کو اٹھانے والوں کو، آپ کے فرشتوں کو اور آپ کی ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ آپ کے بندے اور رسول ہیں۔" آپ ﷺ کی نماز کا ایک ایک رکن عرش کی طرف جانے والی نورانی سیڑھی کی مانند تھا اور آپ کی دعائیں اس سیڑھی کے زینے تھے۔

نماز کی تیاری کے ماحول اور نماز کے نورانی ماحول کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا تھا۔آپ ﷺ بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت، نکلتے وقت، وضو کے آغاز میں، وضو کے دوران اعضاء کو دھوتے ہوئے، وضو کے بعد، اذان کے بعد، نماز کے آغاز میں، مسجد کی طرف جاتے ہوئے، مسجد سے نکلتے ہوئے، تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع میں، قیام میں، سجدے میں، دوسجدوں کے درمیان، تشہد میں اور نماز پڑھنے کے بعد دعائیں مانگتے تھے۔

و: نماز کے دوران مانگی جانے والی دعائیں

تکبیر تحریمہ کے بعد آپ ﷺ حسب ذیل دعا فرماتے:"وجهت وجهى للذى فطر السموٰت والارض حنيفاً وما أنا من المشر كين،ان صلاتى ونسكى ومحياى ومماتى لله رب العالمين،لاشريك له وبذلك أمرت وأنامن المسلمين، اللهم أنت الملك لااله الاأنت،أنت ربى وأناعبدك،ظلمت نفسى واعترفت بذنبى فاغفرلى ذنوبى جميعاً، انه لايغفرالذنوب الاأنت." (400) "میں نے سب سے یکسو ہوکر اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا، جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں میری نماز، قربانی اور میرا جینا مرنا سب اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔اے اللہ! آپ بادشاہ ہیں۔آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔آپ میرے پروردگار ہیں اور میں آپ کا بندہ ہوں۔میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔آپ میرے سارے گناہوں کو معاف فرمادیجئے۔آپ کے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخش سکتا۔"

رکوع میں آپ ﷺ ایک دعا یہ بھی مانگتے:"اللهم لك ركعت وبك آمنت ولك

أسلمت، خشع لك سمعي وبصري ومخّي وعظمي وعصبي وما استقلت به قدمي لله رب العالمين. (401) ''اے اللہ! میں آپ کے لیے جھکا ہوں، آپ پر ایمان لایا ہوں، اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا۔ میرے کان، آنکھ، ذہن اور گوشت و پوست سب آپ کی طرف متوجہ ہیں اور جس زمین پر میں کھڑا ہوں وہ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

اور رکوع سے اٹھتے وقت آپ ﷺ یہ دعا فرماتے: ''اللهم لك الحمد ملأ السموٰت وملأ الأرض وملأ ما بينهما وملأ ما شئت من شيء بعد.'' (402) ''اے اللہ! آپ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ آپ چاہیں اس کے برابر تعریف کے سزاوار ہیں۔''

اور سجدے میں آپ ﷺ یہ دعا فرماتے: ''اللهم لك سجدت وبك آمنت ولك أسلمت، سجد وجهي للذي خلقه وصوّره وشقّ سمعه وبصره تبارك الله أحسن الخالقين، اللهم اغفرلي ذنبي كلّه دقّه وجلّه وأوّله وآخره وعلانيته وسرّه.'' (403) ''اے اللہ! میں نے آپ کو سجدہ کیا، میں آپ پر ایمان لایا اور میں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا۔ میرا سر اس ذات کے سامنے سجدہ ریز ہوا، جس نے اسے پیدا کیا، اسے صورت بخشی اور پھر اسے قوتِ سماعت و بینائی سے نوازا۔ اے اللہ! میرے چھوٹے بڑے، نئے پرانے اور ظاہری و باطنی گناہوں کو معاف فرما دے۔''

نماز اور عبادت کے علاوہ انسان اور کیا کرتا ہے؟ کھاتا پیتا ہے، اٹھتا بیٹھتا ہے، ہنستا روتا ہے، خوش اور غمزدہ ہوتا ہے، شادی کرتا ہے، صاحب اولاد بنتا ہے، نیا لباس پہنتا ہے، سفر کے لئے نکلتا ہے اور واپس لوٹتا ہے، جہاد و قتال کرتا ہے اور پھر واپس لوٹتا ہے، کسی سے کوئی اچھی یا بری خبر سنتا ہے، کسی محبوب دوست سے ملتا ہے، بیمار اور صحت یاب ہوتا ہے، سوتا ہے اور اچھا یا برا خواب دیکھتا ہے۔ غرض انسان سینکڑوں کام کرتا ہے۔ ان میں سے ہر کام کے لیے رسول اللہ ﷺ مخصوص دعا مانگتے اور اپنے ہر کام اور اقدام پر دعا مانگ کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اظہار فرماتے۔

پھر کچھ حوادث انسان کے دائرہ اختیار سے خارج ہوتے ہیں اور براہ راست اس کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً قحط و خشک سالی، بارش کا نہ ہونا، آگ لگنا، سیلاب آنا، لُو کا چلنا یا کسی وبا کا پھیلنا وغیرہ تمام حوادث اگرچہ براہ راست فرد سے متعلق نہیں ہوتے، لیکن بالواسطہ طور پر اس پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ایسے واقعات اور حوادث پیش آنے کی صورت میں بھی دعا کے ذریعے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

جیسا کہ ہم نے اس فصل کے آغاز میں ذکر کیا، ہم نے یہ موضوع رسول اللہ ﷺ کی دعائیں نقل کرنے کے لیے نہیں چھیڑا، بلکہ ہمارا مقصود اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ کوئی شخص دعاؤں کے سلسلے میں آپ ﷺ کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دعا میں گزارا۔ بلاشبہ اس نتیجے پر آپ ﷺ کی تمام دعاؤں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ ہم نے موضوع کا خاکہ پیش کرنے کے لیے یہاں صرف چند مثالیں ذکر کی ہیں، جو اصل دعاؤں کا فی ہزارواں حصہ بھی نہیں ہیں، دوسرے لفظوں میں ان چند مثالوں کی وہی حیثیت ہے، جو پانی کے چند رسنے والے قطروں کی کسی منہ زور چشمے پر دلالت کی ہوتی ہے۔ ہمارا ایمان اور یقین ہے کہ آپ ﷺ فضیلت کی ہر بات میں اتنی دور تک سبقت لے گئے ہیں کہ کسی کے لیے آپ کے قریب پہنچنا بھی ممکن نہیں۔ آپ ﷺ ہمیشہ اعلیٰ ترین مقام پر رہتے۔ اس کتاب کے آغاز سے ہی ہم نے اس بات کو دلائل سے ثابت کرنے کوشش کی ہے۔ اگر اس سلسلے میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہے تو اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔ آپ ﷺ کی شخصیت ہر عیب و نقصان سے پاک ہے، کیونکہ آپ ﷺ رسول اور مصطفیٰ تھے۔ چونکہ آپ ﷺ نے یادِ الٰہی کے ذریعے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ منور کر لیا تھا، اس لیے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کسی تاریک گوشے کا پایا جانا ممکن نہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی دعا، آہ وزاری اور یادِ الٰہی سے معمور تھی، اسی دعا اور گڑگڑاہٹ کے وسیلے آپ ﷺ قیامت کے دن: ''امتی! امتی!'' پکاریں گے۔ (404)

درحقیقت رسول اللہ ﷺ سے متعلق یہ موضوع ختم کرنے کا میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا۔ آپ ﷺ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میں یوں محسوس کرتا ہوں گویا میں آپ ﷺ کی صحبت و معیت میں ہوں۔ اس ماحول کو ختم کرنا آسان نہیں، لیکن چونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، اس لیے میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بیسویں صدی کے عظیم داعی کے الفاظ پر اس موضوع کو ختم کرتا ہوں:

''یہ منہ بولتی دلیل ایک عظیم روحانی شخصیت کی مالک ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی روحانی عظمت کی وجہ سے ساری روئے زمین مسجد بنا دی گئی۔ مکہ اس کا محراب ہے تو مدینہ اس کا منبر۔ وہ امام ہے اور تمام اہلِ ایمان اس کے پیچھے صف باندھے اس کے مقتدی۔ آپ ﷺ ساری انسانیت کے خطیب ہیں اور سعادت کے حصول کے لیے انہیں دستورِ حیات بتاتے ہیں۔ آپ ﷺ تمام انبیائے کرام کے سردار ہیں اور آپ کے دین کے ان کے ادیان کی بنیادی باتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے آپ ان کی تصدیق فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ تمام اولیائے کرام کے سردار ہیں اور نورِ رسالت کے

ذریعے انہیں ہدایات وتربیت دیتے ہیں۔ آپ ﷺ اپنے کلمے پر متفق اوراس کی گواہی دینے والے انبیاء، اخیاراورصدیقین وابرارپر مشتمل حلقہ ذکر کے دائرے کے مرکزی قطب ہیں۔ آپ ﷺ ایک ایسانورانی درخت ہیں، جس کی مضبوط جڑیں آسمانی الہامات کے حامل انبیائے کرام اوراس کی تروتازہ شاخیں اورپھل الہامی علوم کے حامل اولیائے کرام ہیں۔ آپ ﷺ کی ہربات کی تمام انبیائے کرام اپنے معجزات اورتمام اولیائے کرام اپنی کرامات کی بنیاد پر گواہی دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کے ہردعوے پرتمام کاملین کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ جب آپ ﷺ نے ''لاالہ الااللہ'' ارشادفرمایااورتوحید کا دعوی کیاتوماضی ومستقبل کے چنیدہ اورنورانی حضرات یعنی حلقہ ذکر کی صورت میں بیٹھے ہوئے انسانیت کے آفتاب وماہتاب، مسلک ومشرب کے تمام تراختلافات کے باوجودمتفقہ طورپر یہ بات کہنےاوردہرانے لگے، گویاوہ بیک زبان کہہ رہے ہوں: ''آپ نے سچ اورحق بات کہی ہے۔'' جس دعوے کی تائید معجزات وکرامات کی بنیادپرقابل اعتماد سمجھے جانے والے بے شمارگواہوں کی گواہی سے ہوچکی ہو، اس کی صداقت میں معمولی سے بھی شک کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟

توحید کااثبات اوراس کی طرف انسانیت کی راہنمائی کرنے والی اس نورانی حجت کی، جس طرح نبوت وولایت کی صورت میں اجماع وتواتر سے تائید ہوتی ہے، اسی طرح تورات، انجیل اورزبورجیسی آسمانی کتابوں کی سینکڑوں بشارتیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ ہزاروں تصدیق شدہ ارہاصات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، مزید برآں شقِ قمر، آبِ کوثر کی مانندآپ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، آپ کے بلانے پردرخت کا چل کرآنا، آپ کی دعاپرفوراًبارش کا ہونا، آپ کے تھوڑے سے کھانے سے خلقِ کثیر کاسیرہونااورگوہ، بھیڑیئے، ہرن، اونٹ اورپتھروں کا آپ ﷺ سے ہم کلام ہوناوغیرہ جیسے ہزاروں معجزات، جنہیں محقق راویوں اورمحدثین نے روایت کیاہے، اس کی تصدیق کرتے ہیں اور سعادتِ دارین کی ضامن شریعت مطہرہ بھی اس کی صداقت کی دلیل ہے۔

جس طرح آفاقی دلائل سے آپ کی تصدیق ہوتی ہے، اسی طرح مثل آفتاب آپ کی ذات خودآپ کی صداقت کی دلیل ہے، دوسرے لفظوں میں انفسی دلائل بھی آپ کی تصدیق کرتے ہیں۔ تمام اعلیٰ درجے کے اخلاقِ حمیدہ کابالاتفاق آپ ﷺ کی شخصیت میں پایاجانا، آپ کی روحانی شخصیت کااپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں تمام اعلیٰ صلاحیتوں اورپاکیزہ خصائل سے کام لینا، آپ کے سیرالی اللہ، کمال درجے کی سنجیدگی ومتانت، قوتِ ایمانی اورقوتِ اطمینان کی شہادت کی بنیادپرآپ کی حرکات کی قوتِ فکرمثل آفتاب آپ ﷺ کے حق پرقائم رہنےاورحقیقت پرچلنے کی تصدیق کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ زمانی و مکانی حدود عقل کے فیصلوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو آیئے چشم تصور سے نبی اکرم ﷺ کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے دیکھنے کے لیے خیر القرون اور نبوی سعادت کے زمانے کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ جب ہم اپنی آنکھیں کھولتے ہیں تو اس مملکت کی سب سے پہلی چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ صورت و سیرت میں حسن بے مثال کا آئینہ دار انسان ہے، جس کے ہاتھ میں ایک معجزہ نما قابل احترام کتاب ہے، وہ اپنے جامع اور پر حکمت خطاب کے ذریعے ازلی پیغام لوگوں تک پہنچا رہا ہے اور اسے نہ صرف جن و انس، بلکہ ساری کائنات کے سامنے پڑھ رہا ہے۔

آپ ﷺ کی گفتگو اور جستجو ایک بہت ہی اہم معاملے کے بارے میں ہے، کیونکہ آپ ﷺ تخلیق عالم کے راز کی وضاحت کرتے ہیں، کائنات کی حکمت کے راز میں پنہاں طلسم کو دریافت کرتے ہیں اور ان تین مشکل ترین سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں، جنہوں نے بڑے بڑے ذہنوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ ہر کوئی ان تین سوالات کا جواب پانا چاہتا ہے، وہ تین سوالات حسب ذیل ہیں: ''تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟''

جزیرہ نمائے عرب کے طول و عرض میں اٹھائے جانے والے آپ کے اقدامات اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ کو ایک قدسی طاقت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ آپ ﷺ نے مختصر سے عرصے میں صحرائے عرب کی غیر مہذب، اپنی عادات کے بارے میں متعصب اور عصبیت و لڑائی جھگڑے میں ضدی قوم کو تمام غیر مہذب اور برے اخلاق سے پاک کر کے اعلیٰ درجے کے اخلاق حسنہ سے مزین کیا اور دنیا بھر کی متمدن اقوام کا معلم بنا دیا۔ آپ ﷺ کی حکمرانی صرف ظاہر پر نہ تھی، بلکہ آپ نے دلوں اور ذہنوں کو فتح اور روحوں اور نفوس کو مسخر کیا، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ ہر دل عزیز، علمی و روحانی معلم اور دلوں کے حکمران بن گئے۔ (405)

اے ہماری جانوں کے آقا! ہمارے دلوں پر آپ کی حکمرانی ہے۔ ہم آپ کی خدمت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اسے قبول فرمایئے۔

ملحق

اسلامی شریعت میں سنت
کی حیثیت اور مقام

مقدمہ

الحمدلله رب العالمين والصلاة و السلام على سيّدنا محمد وعلى آله و صحبه وسلم.

علم حدیث کے ذریعے ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، افعال اور حالات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ بہت سے علمائے کرام نے رسول اللہ ﷺ کے کسی کام کو ہوتا دیکھ کر سکوت فرمانے کو بھی آپ ﷺ کے افعال میں شامل کیا ہے، تاہم ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے، کیونکہ یہ ہمارے موضوع سے براہ راست متعلق نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے آپ کا وحی متلو کے دائرے سے خارج کلام مراد ہے۔ آپ ﷺ کے افعال سے آپ کے جسم سے صادر ہونے والے اعمال مراد ہیں، جن کے ایک بڑے حصے پر عمل درآمد کرنے کے ہم پابند ہیں، تاہم آپ ﷺ کی ذاتی عادات سے متعلق اعمال پر شرعی اعتبار سے عمل کرنا ضروری نہیں، لیکن اگر کوئی ان پر خلوصِ نیت سے عمل کرے تو یہ اس کی عادات کو عبادات میں بدل دے گا اور اس کے لیے باعث برکت و ثواب ہوگا۔

اگرچہ مؤخر الذکر افعال علم فقہ کے دائرے میں نہیں آتے لیکن علم حدیث ان سے بھی بحث کرتا ہے۔ علم حدیث رسول اللہ ﷺ کے ہر قسم کے احوال سے بحث کرتا ہے، لیکن علم فقہ کی رو سے رسول اللہ ﷺ کے صرف اختیاری اعمال افعالِ نبویہ میں داخل ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کے شمائل و اخلاق، زمانہ ولادت وبعثت اور جائے سکونت وغیرہ جن کا تذکرہ کتب سیرت میں تو ملتا ہے، لیکن وہ شرعی احکام کے لئے کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتے، فقہائے کرام کے دائرہ تحقیق میں شامل ہیں اور نہ ہی اسلامی قانون سازی کی اساس ہیں، لیکن علم حدیث اور محدثین رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے متعلق ہر بات سے بحث کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہر قول، فعل اور تقریر (یعنی آپ کے سامنے کیے جانے والے کسی کام پر آپ کا سکوت) سنت کہلاتی ہے۔ علمائے اصول فقہ کے نزدیک سنت حدیث کے مترادف ہے۔

ہم اس وسیع موضوع کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے، بلکہ انہیں اہل اختصاص کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔ یہاں ہم سنت سے متعلق بعض اہم مسائل پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ سنت شریعت کا دوسرا الہامی ماخذ ہے، جسے مسلمانوں نے دورِ نبوت سے محفوظ رکھا، کتاب اللہ کی طرح اس کی حفاظت کی اور بڑے بڑے علماء نے ہر دور میں اس کی ہر پہلو سے خدمت کی۔

بہت سی قرآنی آیات مبارکہ نبی اکرم ﷺ اور سنت نبوی کی پیروی کا حکم دیتی ہیں، نیز متعدد صحیح احادیث میں اس پیروی اور اسلامی قانون سازی میں سنت کی اہمیت پر خصوصی زور دیا گیا ہے، لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سوائے چند بھٹکے ہوئے لوگوں کے جن سے کوئی دور خالی نہیں ہوتا، دین اور دینی زندگی میں سنت کو قرآن کے پہلو بہ پہلو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ سنت کا قرآن کے ساتھ اس قدر گہرا تعلق ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

سنت قرآن کریم کے مبہم مقامات کی تفسیر، مجمل آیات کی تفصیل، مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص کرتی ہے۔ اس کے قرآن کریم کے ساتھ تعلق اور اس سے جدا نہ ہو سکنے کا یہی سبب ہے۔

مثلاً سنت نماز کے ارکان، شرائط، صحت وفساد اور سنن و آداب کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ حج کی اقسام اور عمرہ کی تفصیلات بیان کرتی ہے۔ زکوۃ کے نصاب کی مقدار، اس کی اقسام اور اس کی ادائیگی کا طریقہ ہمیں سنت کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ ان تمام امور کا تذکرہ قرآن کریم میں بالکل اجمال کے ساتھ آیا تھا، لیکن سنت نے ہمیں ان کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اگرچہ میراث کے احکام قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود سنت نے ان کی مزید وضاحت کی کہ انبیائے کرام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی اور یہ کہ قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوتا ہے، نیز جہاں سنت نے قرآن کریم کے بہت سے مطلق احکام کی تقیید کی ہے، وہیں امت کو بہت سے ایسے احکام بھی دیئے ہیں، جن کا قرآن کریم میں بالکل ذکر نہیں، مثلاً پالتو گدھوں اور درندوں کے گوشت اور اپنی بیوی کی خالہ یا پھوپھی سے نکاح کی حرمت وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے ہی قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کو بھی خصوصی مقام حاصل رہا ہے، اس کی حفاظت کی گئی، درس و تدریس ہوئی اور یہ کتابوں کی صورت میں اسلاف سے اخلاف کی طرف منتقل ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ اپنی اور اپنی سنت کی اطاعت کو دین کا اہم حصہ سمجھتے تھے۔ آپ حاضرین سے اپنی سنت کو غائبین اور آئندہ آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے خواہاں تھے۔ آپ اپنے صحابہ کرام کو دور دراز علاقوں سے احادیث نبویہ سننے کے لیے آنے والے حضرات سے نرم برتاؤ کرنے کی وصیت کرتے تھے، نیز آپ اپنی احادیث کا گہرا فہم حاصل کرنے پر صحابہ کی حوصلہ افزائی فرماتے، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ اپنی احادیث کے فہم وحفظ میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اپنی بات کو بعض اوقات بار بار دہراتے تھے۔

صحابہ کرام جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، اسی لیے وہ نہ صرف دین کے اصول و مبادی سے متعلق آپ ﷺ کی احادیث کو سننے کا اہتمام کرتے، بلکہ

آپ کی تمام حرکات وسکنات حتیٰ کہ ذاتی امور کے بارے میں بھی چھوٹی چھوٹی تفصیلات جاننے کا اہتمام کرتے تھے پھر جب تک وہ احادیث ان کی یادداشت میں اچھی طرح محفوظ نہ ہو جاتیں یا وہ انہیں لکھ نہ لیتے اس وقت تک وہ ان احادیث کا آپس میں مذاکرہ کرتے رہتے تھے۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ایک ایک بات کو انتہائی بابرکت نصیحت اور مقدس امانت سمجھتے تھے اور پوری کوشش کرتے کہ آپ ﷺ کی کوئی پرحکمت بات ضائع نہ ہونے پائے۔ اس مبارک جماعت نے اس مقدس امانت کو قابل بھروسا اور اطمینان کی فضا میں آگے پہنچایا۔

صحابہ کرام آپ ﷺ کے کسی بھی ارشاد، ملاحظے یا ہدایت کو ضائع کرنے کے لئے تیار نہ تھے، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان نورانی خدائی ہدایات میں کسی قسم کی کوتاہی ممکن نہیں۔ وہ سرچشمہ حیات ہیں اور ان میں راز کائنات پوشیدہ ہے۔ دل صاف تھے اور لمحہ بہ لمحہ آنے والی ہدایات اور پیغامات تروتازہ تھے۔ دل شوق واشتیاق کے جذبات سے لبریز تھے اور ان احادیث میں ذکر کردہ امور ابدی سعادت سے متعلق تھے۔ ابدی سعادت کے حصول کے لیے کنجی کی حیثیت رکھنے والی ان احادیث کے بارے میں بھلا کیسے سستی برتی جا سکتی تھی یا کیسے انہیں بھلایا یا کسی اور کے کلام کے ساتھ خلط ملط کیا جا سکتا تھا؟ عمر بھر سچائی کا اہتمام کرنے اور ہر قسم کے جھوٹ اور دھوکا دہی سے کوسوں دور رہنے والے صحابہ کرام کے دل سچائی کے ایک ذرے کو بھی ضائع ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان دلوں میں حق وصداقت سے متصادم ہر چیز کا داخلہ بند تھا اور اگر بفرض المحال ان میں سے کوئی جھوٹ بولنے کا ارادہ بھی کرتا تو اس کے خلاف سینکڑوں آوازیں بلند ہو کر اسے نہ صرف خاموش ہونے پر مجبور کر دیتیں، بلکہ اسے دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیتیں۔ بعض بے باک قسم کے لوگوں کے ساتھ اس قسم کے واقعات بسا اوقات عملاً پیش بھی آئے۔

صحابہ کرام نے سنت کو سمجھنے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری کو اٹھایا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے عقلی جانچ پرکھ اور تحقیق کے مختلف طریقے ایجاد کیے اور ہر حدیث کو تنقید کے قواعد پر پرکھا۔ وہ راویوں سے پوچھ گچھ کرتے، روایت پر گواہ طلب کرتے اور حدیث کو اچھی طرح جانچ پرکھ کر ضبط تحریر میں لاتے۔

رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث کو ضبط تحریر میں لانے والے صحابہ کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ قرآن کریم کی طرح احادیث کو بھی لکھا جاتا تھا، لیکن یہ ایک غیر رسمی کاوش تھی اور لوگ اپنے ذاتی صحیفوں میں لکھتے تھے۔ یہ کہنا کہ حدیث کی تدوین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں شروع

ہوئی نصف سچ ہے، کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں حکومتی سطح پر تدوین حدیث کا آغاز ہوا تھا اور اس کی حیثیت وہی تھی، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حفاظ کے سینوں میں محفوظ اور کھال اور کھجور کی شاخوں وغیرہ پر لکھے ہوئے قرآن کو جمع کر کے قرآن کی تمام سورتوں کو سرکاری طور پر ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کرنے کی تھی۔

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زبان سے نکلنے والی ہر بات دورِ نبوی میں ہی لکھی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کا ''صحیفۂ صادقہ'' جسے بعد میں کافی شہرت ملی، صحیفۂ ہمام بن منبہ اور مجموع زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ اس کی چند ایک مثالیں ہیں۔ احادیث کی سرکاری طور پر تدوین کے وقت ان صحیفوں کی حیثیت اہم ماخذ کی تھی۔

جس طرح صحابہ کرم نے احادیث کے ضبط وتحریر کا اہتمام کیا، اسی طرح انہوں نے ان کی اصالت کو برقرار رکھنے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا احادیث کے ایک ایک لفظ کی تحقیق فرماتیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس بات کا اہتمام فرماتے کہ حدیث کی روایت میں ایک حرف کی تبدیلی بھی نہ ہونے پائے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہما جیسے کبارِ صحابہ کرام تو احادیث کی روایت میں اس قدر حساس مزاج تھے کہ حدیث کے الفاظ میں ردوبدل کے اندیشے سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ تابعین نے بھی حدیث کے بارے میں ایسے ہی اہتمام اور احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں سعید بن مسیّب، شعبی، علقمہ اور ثوری رحمہم اللہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد سند ومتن کی جانچ پرکھ کے لیے مستقل علم وجود میں آ گیا، نیز علم الرجال کی تدوین ہوئی، جس کے نتیجے میں حدیث کے الفاظ کے ساتھ کسی دوسرے لفظ کے خلط ملط ہونے کا امکان بہت کم رہ گیا۔ میرا نہیں خیال کہ امت مسلمہ کی طرح کسی اور امت نے بھی اپنی دینی نصوص کے بارے میں اس قدر احتیاط برتی ہوگی۔

چودہ صدیوں سے ہم اپنے آپ کو سید الانام ﷺ کے نقش پا پر دیکھ رہے ہیں۔ ہم انہیں اپنے وجدان کی گہرائی اور دل کی دھڑکن میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ شعور اس قدر شدید ہے کہ بعض اوقات ہم آپ ﷺ کے حیات افروز انفاسِ طیبہ کو اپنے سینے میں محسوس کرتے ہیں اور ہمیں یوں لگتا ہے، جیسے اگر ہم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو آپ کو اپنے سامنے موجود پائیں گے۔

دنیا ہر لحظہ تغیر پذیر دور میں داخل ہو چکی ہے۔ انسانی فطرت سے متصادم تمام نظام شکست و ریخت کا شکار ہو کر تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور انسانیت ہوش میں آ کر از سر نو دین کی طرف نہ صرف لوٹ رہی ہے، بلکہ دوڑ رہی ہے۔ قدامت پسند عیسائی اپنے گرجا گھروں، بدھ مت کے پیروکار اپنی عبادت گاہوں اور برہمن اپنے عقائد کی طرف لوٹ آئے ہیں، لہٰذا یہ بالکل فطری بات ہے کہ امت محمدیہ سالہا سال تک دیار غیر میں ادھر ادھر بھٹکتے رہنے کے بعد اپنے نبی ﷺ کی طرف لوٹ آئے۔

یوں لگتا ہے جیسے دست قدرت نے بیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف کے اختتام تک ہمارے خلاف پیش آنے والے واقعات کو روک کر ایک نئے رخ پر ڈال دیا ہے اور امت مسلمہ کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیر دیا ہے۔ ہر طرف رحمت کی بارش ہونے اور رحمت کی بادِ نسیم چلنے لگی ہے۔ باقی ماندہ برف میں سے نئے خوشے اور شگوفے کھلنے لگے ہیں اور تاریکی کی دبیز تہوں میں سے روشنی کا ظہور ہونے لگا ہے، جس نے تاریکی کو مار بھگایا ہے۔

دنیا کے کونے کونے میں روشنی اور نور پہنچانے والی محمدی فوج جو تقریباً دو نسلوں سے اپنے منصب سے معزول ہو چکی تھی، اپنے چھوڑے ہوئے عبادت خانوں کی طرف پورے اعتماد اور فخر کے ساتھ لوٹ رہی ہے۔ اسے ان دشمنوں کے واویلے کی کوئی پرواہ نہیں، جو شور و غل مچا کر اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔

ان دنوں شدید پروپیگنڈے کے ذریعے وجود میں لائے جانے والے روایتی اداروں خصوصاً سوشلزم کے لعنتی نظام کے متبادل پیش کرنے کے لیے سنجیدگی سے کوششیں ہو رہی ہیں، کیونکہ جس طرح ایک زمانے میں انہوں نے روحانی زندگی کے نام پر حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم الصلاۃ والتسلیم کے متبادل کے طور پر پاسکل اور برگساں کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی، اسی طرح آج وہ روح حاضر کرنے کے طریقے (Spiritualism) اور تناسخ ارواح (Reincarnation) کے مفاہیم کے ذریعے دین کا متبادل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سلطان الشعراء کے بقول انسانی تاریخ کے ہر دور میں دو سرچشمے موجود رہے ہیں، روشنی کا سرچشمہ اور گندگی کا سرچشمہ۔ یہ صورت حال آج بھی برقرار ہے۔ جو لوگ دین کی جگہ غلط عقائد کی ترویج چاہتے ہیں، وہ آج بھی اس مقصد کے لیے کوشاں ہیں اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں، کیونکہ یہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے، تاہم قابل تعجب اور قابل نفرت بات یہ ہے کہ ہم میں سے بعض لوگوں نے

مستشرقین کا آلہ کار بن کر سنت کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ وہ حضرت ابوہریرہ، حضرت انس اور حضرت عبداللہ عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے صحابہ کرام سے متعلق شکوک وشبہات پھیلا رہے ہیں۔ اس قسم کی کوششوں سے در پردہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو داغدار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مستقبل میں یہ کوششیں جو صورتحال اختیار کرنے والی ہیں، اس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں اور اگر ان کوششوں کا دائرہ رسول اللہ ﷺ تک وسیع ہوسکتا ہے تو سیدنا جبرائیل علیہ السلام تک کیوں نہیں پھیل سکتا؟ ایک باطل مذہب میں تو اس کی عملی مثال بھی موجود ہے۔

سنت ہماری زندگی کے لیے روشنی اور ضیا ہے۔ یہ رضائے الٰہی کے راستے کا چراغ اور سنگ میل ہے۔ اس کے بغیر بڑے سے بڑا ولی بھی اس طویل راستے کی طرف راہنمائی کرنے میں ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ کے ولی امام ربانی اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں نے راہِ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھا کہ سنت نبویہ کا نور دیگر تمام روشنیوں سے مختلف ہے۔ تمام اولیائے کرام کی فضا میں بکھری ہوئی روشنیاں درخشاں سنت نبویہ کے چھوٹے سے مسئلے کی روشنی کے سامنے ہیچ تھیں۔'' کیونکہ تمام اولیائے کرام آفتابِ نبوت کے گرد گھومنے والے ستارے ہیں۔ ان کے نور کی نورِ نبوت کے ساتھ وہی نسبت ہے، جو نسبت ستاروں کی روشنی کی آفتاب کی روشنی کے ساتھ ہوتی ہے۔ قصیدہ بردہ کے شاعر نے درست کہا ہے:

فانه شمس فضل هم كو اكبها   يظهرن أنوارها للناس فى الظلم

''آپ ﷺ کی ذات آفتابِ فضیلت ہے اور صحابہ اس کے ستارے ہیں، جو انسانیت کے لئے تاریکی میں روشنی فراہم کرتے ہیں۔''

جو لوگ آپ ﷺ کے مقام کو گھٹانا اور آپ کے نور کو چھپانا چاہتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے، کیونکہ آفتاب کو چھلنی کے ذریعے نہیں چھپایا جا سکتا۔ انسانیت کی ہدایت کے لیے سنت نبویہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

پہلا باب

سنت اور اس کا کردار

الف: سنت کیا ہے؟

لغوی مفہوم کے اعتبار سے سنت اچھے یا برے راستے اور طریقے کو کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: ”جو شخص اسلام میں اچھی سنت جاری کرے گا اسے اس سنت کا ثواب ملے گا اور جو لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں گے ان کا ثواب بھی ملے گا اور ان لوگوں کے ثواب میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص اسلام میں کوئی بری سنت جاری کرے گا اسے اس کا گناہ ملے گا اور جو لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی ملے گا اور ان لوگوں کے گناہ میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔(406)

محدثین، علمائے اصول فقہ اور فقہا کی رائے میں سنت کا درج ذیل مفہوم ہے:

محدثین کی اصطلاح میں سنت رسول اللہ ﷺ کے ہم تک پہنچنے والے ہر قول، فعل (خواہ اس پر عمل کا مدار ہو یا نہ ہو) اور نہی کو کہتے ہیں۔ حنفی مسلک کی رو سے اس کی حیثیت فرض، واجب، سنت، مستحب یا آپ ﷺ کی عادت مبارکہ اور طرز زندگی کی ہوتی ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے سنت حدیث کے مترادف ہے۔

علمائے اصول فقہ کے ہاں سنت کا مفہوم قدرے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک سنت رسول اللہ ﷺ کے ہر ارشاد، عمل اور تقریر (یعنی آپ ﷺ کے اپنے سامنے ہونے والے کسی کام پر سکوت فرمانے) کو کہتے ہیں۔

فقہائے کرام کے نزدیک سنت فقہ کی اصطلاح بدعت کی متضاد ہے، گویا وہ اسے کسی فرض، واجب یا حرام کی اساس کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔

حدیث فعل ”حدث“، بمعنی خبر دینا سے ماخوذ ہے۔ اس کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے ہر ارشاد، عمل اور تقریر پر ہوتا ہے۔ ابن حجر کی رائے میں شریعت کی رو سے حدیث رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہر بات کو کہتے ہیں۔(407)

بعض ممتاز علمائے کرام نے حدیث کے لفظ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ حدیث خدا کی صفت نہیں ہوتی،

یعنی اس میں قدم اور اعجاز نہیں پایا جاتا۔ یہ نکتہ اس پہلو سے بڑا اہم ہے کہ اس سے قرآن کریم اور سنت نبویہ کے درمیان فرق کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اس کی تائید سنن ابن ماجہ میں مروی ایک حدیث نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''یہ دو چیزیں ہیں: کلام اور ہدایت۔ بہترین کلام اللہ کا کلام ہے اور بہترین ہدایت محمد (ﷺ) کی ہدایت ہے۔''(408)

۱- سنت کی اقسام

سنت کی تعریف ذکر کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اقسام کا تذکرہ بھی کیا جائے۔

الف: قولی سنت

قولی سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والی احادیث مبارکہ ہیں۔ نورانی احادیث نبویہ سنت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہ وہ ارشادات ہیں، جو اگرچہ قرآنِ کریم میں مذکور نہیں، لیکن فقہ کی کتابوں میں انہیں بہت سے احکامات کی بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱- رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''وارث کے لیے وصیت درست نہیں۔''(409)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ورثاء کے لیے مال چھوڑ کر مرنے والا شخص اپنی جائیداد کی تقسیم کے طریقِ کار کی وصیت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے مال کا ایک مخصوص حصہ خیراتی اداروں کے لیے عطیہ تو کر سکتا ہے، لیکن اسے اپنی میراث میں اپنے ورثاء کے حصوں کی مقدار کے تعین کا اختیار حاصل نہیں۔

۲- اصول فقہ کی کتابوں میں ایک حدیث کا حوالہ اکثر ملتا ہے: ''لاضرر و لا ضرار''(410) یعنی کسی کو ابتداءً نقصان پہنچانا جائز ہے اور نہ ہی نقصان کے بدلے نقصان پہنچانا درست ہے۔''

۳- کھیتی کی زکوۃ کی مقدار کے بارے میں ایک حدیث مبارک ہے: ''جس کھیتی کو بارش یا چشموں کا پانی سیراب کرے اس میں عشر اور حیوانات کی مدد سے سیراب کی جانے والی زمین میں نصف عشر واجب ہے۔''(411)

۴- جب رسول اللہ ﷺ سے سمندر کے پانی سے وضو کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے۔''(412) آپ ﷺ کا یہ ارشاد سینکڑوں فتاوی کی بنیاد بنا۔

ب: فعلی سنت

یہ سنت رسول اللہ ﷺ کے افعال اور سیرت سے ماخوذ ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم میں اس کا صراحتہً ذکر نہیں ہوتا، مثلاً قرآن کریم میں نماز کی ادائیگی کا حکم موجود ہے۔ بعض آیات میں رکوع اور سجدہ کرنے کے حکم کا بھی ذکر ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں نماز کے بعض اوقات کا عمومی الفاظ میں تذکرہ ملتا ہے، لیکن نمازوں کے اوقات، نمازوں اور رکعات کی تعداد، ان کی ادائیگی کا طریقِ کار، ان میں سے فرض، واجب اور نفل نمازوں کی تفصیلات اور نماز کو فاسد کرنے والے امور کا تفصیل سے ذکر نہیں ملتا۔ ان تمام امور کی وضاحت نبی کریم ﷺ کے طرز عمل سے ہوتی ہے، جن کا ارشاد گرامی ہے: ''ایسے نماز پڑھو، جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو۔''(413) اس حدیث مبارک میں سنت کی خاص قانونی حیثیت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بات مناسک حج پر بھی صادق آتی ہے۔ بہت سے علمائے کرام کو اس بارے میں غلطی ہوئی ہے، یہاں تک کہ مناسکِ حج کے موضوع پر مستقل کتابیں لکھنے والے حضرات بھی سنت نبویہ سے راہنمائی حاصل کیے بغیر مناسکِ حج کو صحیح طریقے سے ادا نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں علامہ ابن ہمام کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ حاصل یہ کہ نماز کی طرح حج کے بعض مسائل میں بھی قدرے پیچیدگی ہے، جس کی وضاحت صرف سنت نبویہ سے ہوتی ہے۔

ج: تقریری سنت

جب رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے کسی ناپسندیدہ کام کو ہوتا دیکھتے تو ان کی پردہ دری نہ فرماتے، بلکہ کسی کا نام لیے بغیر انہیں تنبیہ فرماتے، جس کا طریقِ کار یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ منبر پر تشریف لے جا کر ارشاد فرماتے: ''لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ وہ ایسے ایسے کام کرتے ہیں۔''(414) اگرچہ آپ ﷺ کسی غیر مناسب کام کو ہوتا ہوا دیکھ کر بہت مسامحت فرماتے اور اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیتے، لیکن اگر معاملہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں میں سے کسی چیز سے متعلق ہوتا تو آپ ﷺ ہرگز خاموش نہ رہتے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی اس عادت مبارکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''جب بھی آپ ﷺ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں سے آسان تر کو اختیار فرماتے، بشرطیکہ وہ گناہ کی بات نہ ہوتی، لیکن اگر وہ گناہ کی بات ہوتی تو وہ آپ ﷺ سے بعید تر ہوتی۔ بخدا! آپ ﷺ نے اپنے دائرہ اختیار میں اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا جاتا تو آپ ﷺ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔''(415)

بعض اوقات آپ ﷺ کسی کام کو ہوتا دیکھ کر اس سے منع نہ فرماتے، بلکہ اس پر سکوت فرما کر اپنی رضامندی کا اظہار فرماتے۔اسے آپ ﷺ کی تقریری سنت کہتے ہیں۔ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱- دو صحابہ ایک سفر پر نکلے۔پانی نہ ملنے پر انہوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھی، لیکن ابھی نماز کا وقت نہیں گزرا تھا کہ انہیں پانی مل گیا۔ان میں سے ایک نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کیا اور دوسرے نے نہیں کیا۔پھر وہ دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کی رائے پوچھی۔آپ ﷺ نے نماز کا اعادہ نہ کرنے والے سے فرمایا: ''تم نے سنت پر عمل کیا۔'' اور نماز کا اعادہ کرنے والے سے فرمایا: ''تمہیں دہرا اجر ملے گا۔''(416)

۲- جب رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنوقریظہ کی سرزنش کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ نے بعض صحابہ سے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک عصر کی نماز بنوقریظہ کے علاقے میں جا کر ہی پڑھے۔'' جب عصر کی نماز کا وقت راستے میں ہی ہو گیا تو بعض صحابہ نے کہا کہ وہ منزل پر جا کر نماز پڑھیں گے، جبکہ دوسرے بعض صحابہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ مقصد نہ تھا، لہذا وہ یہیں نماز پڑھیں گے۔جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس واقعے کا ذکر ہوا تو آپ نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں ڈانٹا۔(417)

۲- قرآن کریم کی روشنی میں سنت کی اہمیت

سنت ہماری زندگی کی روح رواں ہے۔قرآن کریم نہ صرف سنت کی تائید کرتا ہے اور اس کی اہمیت پر زور دیتا ہے، بلکہ اسے اسلام کی ناگزیر اساس قرار دیتا ہے۔ذیل میں اس سلسلے کی چند آیات پیش کی جاتی ہیں:

الف: درج ذیل آیت مبارکہ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر وارد ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (الجمعة: ۲) ''وہی تو ہے، جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجے، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔''

اکثر مفسرین نے ''الحكمة'' کے لفظ کی تفسیر ''السنة'' سے کی ہے، کیونکہ قرآن کریم کوئی ایسی

کتاب نہیں، جس میں الل ٹپ الفاظ جمع کردیئے گئے ہوں یا بلا مقصد الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو، نیز حکمت کے لفظ سے کتاب یا اس کے بعض اجزاء بھی مراد نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو حکمت کا کتاب پر عطف کرنا درست نہ ہوتا۔ قرآن کریم کے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح یہاں بھی ''الکتاب'' سے قرآن کریم مراد ہے، جبکہ حکمت سے نبی اکرم ﷺ کی سنت مراد ہے، جو کتاب اللہ کے مجمل کی تفصیل، مبہم کی تفسیر، عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کرتی ہے۔

ب: ایک دوسری آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے رسول صرف اس لیے بھیجے ہیں کہ انسانیت ان کی اطاعت کرے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّهِ﴾ (النساء: ٦٤) ''اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو اس لیے بھیجا ہے کہ انسانیت ان کی پیروی کرے۔ کسی نبی کی پیروی کا حکم اس کی اپنی شخصیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ فرد اور معاشرے کی مادی و روحانی ہدایت کا وسیلہ بننے اور اللہ تعالیٰ کے پیغامات انسانیت تک پہنچانے کی وجہ سے ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (الأنفال: ٢٠) ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور اس کی روگردانی نہ کرو۔'' اور ﴿أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ﴾ (النساء: ٥٩؛ النور: ٥٤) ''اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو۔''

اوپر ذکر کردہ آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مراد اس کے احکامات کی پیروی اور اس کی منہیات سے اجتناب ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے مراد آپ کی سنت یعنی آپ کے احکامات و منہیات، افعال اور تقریر کی پیروی ہے۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے پہنچنے والے خدائی احکامات کی پیروی اور منہیات سے اجتناب کے علاوہ سنت نبویہ میں کچھ مستقل احکامات بھی موجود ہیں، نیز ان میں ترغیب و ترہیب اور نصیحتوں کا ایک بڑا حصہ بھی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''غور سے سنو! مجھے کتاب اور اس جیسی کچھ اور چیزیں دی گئی ہیں۔''(418)

اوپر ذکر کردہ آیات مبارکہ میں اطاعت کا حکم دو مرتبہ دیا گیا ہے، ایک دفعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور دوسری مرتبہ نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد ﴿وَلاَ تَوَلَّوْا عَنْهُ﴾ کا حکم ہے۔ یہ نہ صرف سنت کی اتباع کا حکم ہے، بلکہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سنت کی اہانت ارتداد کی ایک صورت ہے۔

ج: قرآن کریم میں اس موضوع سے متعلق اور بھی بہت سی آیات مبارکہ موجود ہیں، مثلاً

۱: ﴿یاأیہا الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم﴾ (النساء: ۵۹) ''مؤمنو! اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی۔''

جب اس آیت مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کے بعد آنے والے اولوالامر کی اطاعت کا حکم ہے تو خود فخر کائنات ﷺ کی اطاعت نہ کرنے کا کوئی کیسے سوچ سکتا ہے؟ آپ ﷺ کے ارشادات، احادیث اور اعمال سے کیسے لاپرواہی برتی جا سکتی ہے؟ اور آپ ﷺ میں کسی بات کا حکم دینے یا کسی کام سے روکنے کی اہلیت کے نہ ہونے کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟

۲: ﴿یَا أَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَطِیعُواْ اللّٰہَ وَأَطِیعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِی الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (الأنفال: ۴۶) ''اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ ایسا کرو گے تو بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو۔''

یہ آیت مبارکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو نصرت، وحدت اور طاقت کا سرچشمہ اور ریاست کا بنیادی ستون قرار دیتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ یا مسلمانوں کے امام کی اطاعت سے دوری اختیار کی جاتی ہے تو گمراہی پھیلتی ہے، جس کے نتیجے میں کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے، لہٰذا نزاع وخلفشار سے بچنے کا واحد راستہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت وپیروی ہے، اسی لیے ارشاد ربانی ہے: ﴿فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوہُ إِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُولِ﴾ (النساء: ۵۹) ''پھر اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔''

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی سنت ہی ہماری وحدت اور طاقت کی حفاظت کی ضامن ہے، لہٰذا سنت کے خلاف محاذ آرائی کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ سنت کے انکار اور نافرمانی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

۳: ﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی یُحْبِبْكُمُ اللّٰہُ﴾ (آلِ عمران: ۳۱) ''(اے پیغمبر ﷺ) لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔''

اللہ اور اس کے رسول کی محبت لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ کے نبی کی محبت اور اس کی سنت کی پیروی کے بغیر اللہ کی محبت کا حصول ناممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کے رسول کی محبت کے بغیر اللہ کی محبت کا دعویٰ بے معنی ہے۔

۴: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الأحزاب: ۲۱) ''مسلمانو! تم کو اللہ کے رسول کی پیروی کرنی بہتر ہے، یعنی ہر اس شخص کو جسے اللہ سے ملنے اور روزِ قیامت کے آنے کی اُمید ہو اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔''

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف راستوں اور رجحانات میں سے صراط مستقیم کو پانے کا واحد طریقہ استقامت کی نمائندگی کرنے والی ہستی کی سنت کی اتباع ہے۔

۵: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (النساء: ٦٥) ''پس تمہارے پروردگار کی قسم کہ یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں... تب تک مؤمن نہیں ہوں گے۔''

ایک روایت میں ہے کہ ام یعقوب نامی ایک عورت جو قرآن پڑھتی تھی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم جسم گودنے والی، گودوانے والی، پیشانی سے بال اکھیڑنے والی، خوبصورتی کے لیے دانتوں میں خلا پیدا کرنے والی اور اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی کرنے والی عورتوں پر لعنت کرتے ہو؟'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں ان عورتوں پر کیوں نہ لعنت کروں جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے اور یہ بات کتاب اللہ میں بھی موجود ہے۔'' اس پر اس عورت نے کہا: میں نے مصحف کے تمام صفحات پڑھے ہیں، لیکن مجھے تو یہ بات نہیں ملی۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تم اسے دھیان سے پڑھتی تو تمہیں یہ بات مل جاتی۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾ (الحشر: ۷) ''اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں باز رہو۔'' کیونکہ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے۔(419)

۳- احادیث کی روشنی میں سنت کا مقام

احادیث مبارکہ میں بھی سنت کی خصوصی اہمیت اور مقام بیان کیا گیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے درحقیقت اللہ کی نافرمانی کی۔''(420)

نبوت کا راستہ اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہے اور نبی کے نقش قدم پر چلنا اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے روشن راستے پر چلنے کے مترادف ہے، اسی لیے سنت کا انکار، اس کی مخالفت اور اسے اپنی زندگی سے خارج کرنا اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسی صاف روح کے حامل انسان کا انتخاب کرتے ہیں، جو اللہ کی طرف سے موصول ہونے والے ہر حکم کو بغیر غلطی اور کمی کے آگے منعکس کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ساری انسانیت تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے چنتے ہیں۔ وہ معزز رسول نہ صرف یہ پیغام ہم تک پہنچاتا ہے، بلکہ اس کی تشریح وتوضیح بھی کرتا ہے، لیکن بعض غیر معتدل لوگ اس رسول کے بارے میں معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اس قسم کا رویہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی وسرکشی کے مترادف ہے، جس کی وجہ سے ایسا شخص جہنم میں جانے کا مستحق ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری ساری امت جنت میں جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔'' صحابہ نے پوچھا: ''یارسول اللہ! انکار کرنے والا کون ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔''(421)

سنن ابی داؤد اور ترمذی میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی لازم ہے، اسے خوب مضبوطی سے تھامے رکھو۔''(422) اس حدیث مبارک کے اختتامی الفاظ بھی سنت کی خصوصی اہمیت پر زور دیتے ہیں: ''نئے نئے امور سے بچو، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔'' ایک زبانِ زدِ خاص وعام حدیث ہے: ''میری امت کے بگاڑ کے دور میں میری سنت کو مضبوطی سے تھامنے والے کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔''(423) ہم سنت کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے تلاش کرنے والوں سے وہی سوال پوچھتے ہیں جو قرآن میں پوچھا گیا ہے: ﴿فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ﴾ ''پھر تم لوگ کدھر جارہے ہو؟''

ب: سنت کے فرائض

قرآن کریم کی طرح سنت نبوی بھی قانون سازی کا ایک اہم ماخذ ہے۔ یہ قرآن مجید کی طرح بعض اشیاء کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتی ہے۔ یہ فرض، واجب، سنت، مستحب مباح اور مکروہ کے معیارات قائم کرتی ہے، مزید برآں یہ قرآن کے مجمل کی تفصیل، مبہم کی تفسیر، عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کرتی ہے۔ ذیل میں ہم ان امور کی قدرے وضاحت کریں گے۔

ا۔ قرآن کریم کی تفسیر

ہم روزانہ نماز میں سورت فاتحہ پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے یعنی ان لوگوں کے راستے کی جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا اور نہ ان گمراہوں کے راستے کی، اگرچہ "المغضوب علیھم" اور "الضالین" کی صفات میں عموم ہے، لیکن ایک حدیث شریف میں ان کی وضاحت یوں کی گئی ہے: "یہود پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور نصاریٰ گمراہ ہیں۔"(424) یہ حدیث کے قرآن کریم کی تفسیر کرنے کی ایک مثال ہے۔ یہودی اپنی ساری تاریک تاریخ میں غضب الٰہی کے مستحق بنے رہے اور دورِ نبوی میں بھی ان کی یہی حالت تھی۔ "مطلق ذکر کمال پر محمول ہوتا ہے۔" کے قاعدے کے تحت بھی اس سلسلے میں سب سے پہلے یہودیوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، کیونکہ انبیائے کرام کو قتل کرنے، گھٹیا اخلاق، بری عادات، مال و دولت کی پرستش اور ہر دور میں مادہ پرستی کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے ان سے بڑھ کر غضب الٰہی کا کوئی مستحق نہیں۔ انسان اس نبوی تفسیر کی تائید کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلاشبہ اس غضب الٰہی کے وہ تمام لوگ مستحق ہیں، جن میں یہودیوں والے اوپر ذکر کردہ اخلاق پائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف وہ نصاریٰ ہیں، جو آغاز میں ہدایت کے راستے اور صراط مستقیم پر چلے تھے اور انہوں نے اپنے دین، جو دین اسلام حنیف ہی تھا، کو بڑی بہادری سے تھاما تھا، لیکن بعد میں وہ بہت سے اسباب کی بنا پر گمراہی کا شکار ہو کر "الضالین" کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ انہی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "نصاریٰ گمراہ ہیں۔" کیونکہ انہوں نے توحید کو تثلیث میں بدلا اور اللہ کی کتاب میں تحریف و تبدیلی کی، جس کے نتیجے میں ان پر "الضالین" کا وصف پوری طرح صادق آتا ہے۔ خواہ اس سے رسول اللہ ﷺ کا مقصود مخصوص اقوام ہوں یا مخصوص طرزِ عمل، اگر آپ ﷺ یہ تفسیر نہ فرماتے تو ہم اس مبہم حقیقت کو نہیں جان سکتے تھے، اس طرح جہاں رسول اللہ ﷺ نے بعض

اقوام اور منحرفانہ نفسیاتی کیفیات کی طرف توجہ دلائی، وہیں اس بات کی بھی وضاحت فرمائی کہ کون گمراہ ہوا، کیوں گمراہ ہوا اور کن اعمال کی وجہ سے غضب اور گمراہی کا مستحق ٹھہرا۔

جب آیت مبارکہ: ﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴾ (الأنعام: ٨٢) ''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ظلم سے ملوث نہیں کیا، ان کے لیے امن و بے خوفی ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔'' نازل ہوئی تو صحابہ کرام جو ظلم کے معنی سے واقف تھے کہ یہ حق اور حقیقت کے دائرے سے خروج سے عبارت ہے، نے عرض کی: ''ہم میں سے کون ہوگا، جس نے ظلم کا ارتکاب نہ کیا ہوگا؟'' اس پر آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ معاملہ ایسے نہیں جیسے وہ خیال کر رہے ہیں اور انہیں حضرت لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو کی جانے والی نصیحت ﴿ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ (لقمان: ١٣)[425] ''اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔'' یاد دلائی۔

ہمیں اس آیت مبارکہ کی نبوی تفسیر کے ذریعے معلوم ہوا کہ یہاں ظلم سے ہر قسم کا ظلم، حد سے تجاوز یا تعدی مراد نہیں بلکہ شرک مراد ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ یہ تفسیر نہ فرماتے تو ہم ہمیشہ ابہام میں رہتے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آیت مبارکہ ﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى ﴾ (البقرة: ٢٣٨) ''مسلمانو! سب نمازیں خصوصاً بیچ کی نماز (یعنی نماز عصر) پورے اہتمام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔'' میں وارد ''الصَّلَاةِ الْوُسْطَى'' سے مراد نماز عصر ہے، حتی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس آیت مبارکہ کو یوں پڑھا کرتی تھیں: ''﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى ﴾ وصلاة العصر ﴿ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴾'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام ابو یونس کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے اپنے لیے ایک مصحف لکھنے کا کہا اور فرمایا جب تم اس آیت ﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى ﴾ پر پہنچو تو مجھے بتانا، چنانچہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو میں نے انہیں اطلاع دی۔ انہوں نے مجھے یہ آیت یوں املاء کرائی: ﴿ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى ﴾ وصلاة العصر ﴿ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴾ اور فرمایا: ''میں نے اسے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔''[426]

۲: سنت: قرآن کے مجمل مقامات کی تفسیر

قرآن کریم کے مبہم مقامات کی تفسیر کے ساتھ ساتھ سنت قرآن کریم کی مجمل آیات کی تفصیل بھی

بیان کرتی ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلاَةَ﴾، لیکن قرآن کریم میں اقامت صلاۃ کی وضاحت ملتی ہے اور نہ ہی اوقاتِ نماز کی تفصیل۔ اگرچہ بعض مفسرین نے آیت مبارکہ ﴿وَأَقِمِ الصَّلاَةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾(ھود: ۱۱٤) ''اور دن کے دونوں سروں یعنی صبح اور شام کے اوقات میں اور رات کی ساعتوں میں نماز پڑھا کرو۔ کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کردیتی ہیں۔'' سے پنج وقتہ نمازوں کا استنباط کیا ہے، لیکن درحقیقت یہ سنت ہی ہے، جس نے نمازوں کے ان اوقات کی تحدید کی ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے متعین اوقات کے ساتھ مربوط قرار دیا ہے: ﴿إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَاباً مَّوْقُوتاً﴾(النساء:۱۰۳) ''بے شک نماز کا مومنوں پر اوقاتِ مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے۔''

بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نمازوں کے اوقات کی تحدید حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمائی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ سنت کا ماخذ آسمانی اور الہامی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بیت اللہ کے قریب دو مرتبہ نماز میں میری امامت کی۔ انہوں نے مجھے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب نعل کی بقدر زوالِ آفتاب ہو گیا تھا۔ عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ ایک مثل ہو گیا تھا۔ روزہ افطار کرنے کے وقت مجھے (مغرب کی) نماز پڑھائی۔ شفق کے غائب ہونے پر مجھے نماز عشاء پڑھائی اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے نماز ظہر اس وقت پڑھائی جب سایہ ایک مثل ہو گیا تھا، نماز عصر دو مثل پر پڑھائی، نماز مغرب روزہ دار کے روزہ افطار کرنے کے وقت پڑھائی، نماز عشاء رات کے تیسرے حصے میں پڑھائی اور فجر کی نماز صبح کی روشنی میں پڑھائی۔ اس کے بعد انہوں نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا: ''اے محمد! یہ آپ سے پہلے انبیائے کرام (کی نمازوں) کے اوقات ہیں۔ (آپ کی نمازوں کے) اوقات بھی ان دو وقتوں کے درمیان ہیں۔ (427)

نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو نمازوں کے اوقات کی تعلیم دی۔ نماز سے متعلق بہت سے احکام مثلاً فرض، واجب، مستحب، مکروہ، مفسداتِ صلاۃ، رکوع و سجود، التحیات اور سلام کے ساتھ نماز سے نکلنے کی تفصیلات وغیرہ کے بارے میں آپ ﷺ واحد مرجع ہیں۔ آپ ﷺ قرآن کریم میں مجمل طور پر وارد حکم ﴿أَقِيمُوا الصَّلاَةَ﴾ کے واحد شارح ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''ایسے نماز پڑھو، جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔'' (428) اگر قرآن کریم نماز کی تمام تفصیلات بتاتا تو اس کا حجم موجودہ حجم سے دگنا ہو جاتا، اسی لیے اس نے تفصیلات کو اعلیٰ فراست کی مالک اس ہستی پر چھوڑ دیا، جس نے

اپنے رب کو سب سے بہتر طور پر سمجھا، وحی غیر متلو کو مطلوبہ تفصیل کے ساتھ ہم تک پہنچایا، اس کام کو محیر العقول فراست سے سرانجام دیا اور جن مواقع پر عقل بے بس نظر آتی ہے، وہاں الہام سے مدد لی۔

سنت نے مناسک حج کی وضاحت بھی کی ہے۔ اگرچہ قرآن کریم نے دو ایک مواقع پر حج کے موضوع کو چھیڑا ہے اور بعض مفید تفصیلات بھی بیان کی ہیں، لیکن یہ تفصیلات صرف بعض مناسکِ حج سے متعلق ہیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مناسکِ حج کی وضاحت و تفصیل کی ذمہ داری سنت نے ادا کی ہے اور یہ تفصیلات قرآنِ کریم کی ذکر کردہ معلومات سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی حج ادا فرمایا، جسے "حجة الوداع" کہتے ہیں، کیونکہ اس میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو الوداع کیا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے خچر پر سوار ہو کر مناسکِ حج ادا فرمائے، جہاں سے ہر کوئی آپ کو دیکھ سکتا تھا۔ آپ ﷺ نے ہر بات کی پہلے زبان سے اور پھر عمل سے وضاحت فرمائی حتیٰ کہ یہ بھی بتایا کہ میں روزہ سے ہوں یا بغیر روزہ کے اور یہ سب کچھ بتانے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنے مناسک سیکھ لو۔"(429) اس میں شریعت کی نظر میں آپ ﷺ کے ارشادات و افعال کی حیثیت کی طرف اشارہ تھا۔ بلاشبہ قرآنِ کریم میں کوئی نقص نہیں، لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی صورت میں اس کا مبلغ، شارح اور مفسر بھی آیا ہے۔

۳: سنت: بعض احکام میں تخصیص

قرآن کریم نے میراث کے احکام کو عمومی الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ (النساء: ۱۱) "اور اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔" یہ حکم عام ہے، جس میں انبیائے کرام، اولیاء و اصفیاء، مقربین خدا اور عام لوگ سب شامل ہیں، لیکن جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی میراث کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رجوع کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے والد نبی کریم ﷺ سے سنی ہوئی ایک حدیث انہیں سنائی: "ہم انبیاء میراث نہیں چھوڑتے، ہم جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔"(430)

اسی طرح حدیث مبارک "قاتل وارث نہیں بن سکتا۔"(431) قاتل کو میراث سے محروم قرار دیتی ہے، لہٰذا جو کوئی اپنے والد، چچا، ماموں یا بھائی وغیرہ کو قتل کرے گا وہ اس کی میراث سے محروم قرار پائے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنت نے میراث کے موضوع پر قرآن کریم کے عمومی حکم میں تخصیص کی ہے۔

۴: سنت: بعض احکام کی تقیید

سنت بعض اوقات قرآن کریم میں ذکر کردہ بعض مطلق احکام کی تقیید بھی کرتی ہے، مثلاً ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ﴾ (المائدة: ۳۸) ''اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ان کا ایک ایک ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کرتوتوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت کے طور پر ہے۔'' یہ حکم مطلق ہے۔ اس میں اس سزا کے اجراء کے لیے پائی جانے والی شرائط اور حالات کا ذکر ہے اور نہ ہی چوری کے نصاب اور ہاتھ کے کاٹنے کی مقدار کا تذکرہ ہے، کیونکہ وضو کی تفصیلات پر مشتمل آیت کی رو سے ''یـــد'' کا اطلاق کہنی تک ہوتا ہے،(432) لیکن سنت مطہرہ نے ہاتھ کے کاٹے جانے والے حصے کی تقیید کی ہے، یعنی قرآن کے ایک مطلق حکم کو مقید بنایا ہے، لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ نے ایک چور کے ہاتھ کو گٹے سے کاٹنے کا حکم ارشاد فرمایا تو دراصل آپ نے اس بارے میں قرآن کریم کے ایک عام حکم کو مقید کیا ہے۔

اس کی ایک دوسری مثال حسب ذیل ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ (النساء: ۲۹) ''مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے۔''

سنت نے اس آیت کو ایک خاص پہلو سے مقید کیا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''بدوِّ صلاح سے پہلے پھلوں کی خرید و فروخت مت کرو۔(433)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا قانون سازی میں سنت کو مستقل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ یہ ایسے احکام کی بنیاد فراہم کرتی ہے، جن کا قرآن میں ذکر نہیں ملتا، مثلاً پالتو گدھوں اور درندوں کے گوشت اور اپنی بیوی کی خالہ یا پھوپھی سے نکاح کی حرمت وغیرہ۔

سنت کو قانون سازی میں مستقل ماخذ کی حیثیت آغاز وحی سے حاصل ہے اور وہ اس حیثیت سے قرآن کے پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔ علمائے کرام اور امت کی اکثریت سنت کو اسی نظر سے دیکھتی ہے، لیکن نظّام جیسے یونانی فلسفے سے متاثر معتزلہ اور اسلام سے بغض رکھنے والے اور اس کے چشمہ صافی کو گدلا کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنے والے مستشرقین کی طرف سے اسے حملوں کا سامنا کرنا پڑا،

نیز پچھلی دو صدیوں سے بعض مسلم اہل علم بھی ان مستشرقین سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے آلہ کار بن کر سنت پر اعتراضات کرنے اور اس کے مقام کو گھٹانے کی کوشش کرنے لگے ہیں، تاہم سلف صالح کی مساعی جمیلہ اور ان کی لکھی ہوئی قابل قدر تالیفات نے ان حملوں کے سامنے بند باندھ کر سنت نبویہ مطہرہ کے صاف و شفاف چشمے کی پاکیزگی کی حفاظت کی ہے۔

دوسرا باب

سنت کی تدوین

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن کا درجہ رکھنے والی سنت مطہرہ اس آیت مبارکہ: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر:٩) ''بے شک یہ کتابِ نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور یقیناً ہم اس کے نگہبان ہیں۔'' میں کیے گئے حفاظت کے خدائی وعدے میں داخل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی طرح سنت کی تدوین ہوئی، اسے زبانی یاد کیا گیا اور اسے بغیر کسی ردوبدل کے ہم تک پہنچایا گیا۔ ذیل میں ہم اس بابرکت کام کے اسباب، ارتقائی مراحل اور خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

الف: سنت کی تدوین کی ضرورت

سنت رسول اللہ ﷺ کا طرز زندگی، اسلامی اسلوبِ حیات اور اللہ اور اس کے رسول کے اخلاق جیسے اخلاق اپنانے کا اسوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو لوگوں کے لیے اسوہ حسنہ، مینارۂ ہدایت اور حق کا معلم بنایا تھا۔ آپ ﷺ نے یہ ذمہ داری اپنی ہدایات، ارشادات، اعمال اور تقریر یا دوسرے لفظوں میں سنت کے ذریعے سرانجام دی۔

سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف کھلنے والی کھڑکی اور اسلام کی برکات حاصل کرنے کا مبارک راستہ ہے۔ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ ہدایت کا خواستگار ہوتا ہے، سنت نبویہ اس کی مدد کو فوراً آ پہنچتی ہے اور روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کر کے اسے اس کے ہدف تک پہنچاتی ہے۔

ب: سنت کی تدوین کے محرکات

صحابہ کرام سنت کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ قرآن کریم نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتا تھا اور آپ ﷺ نہ صرف اسے صحابہ تک پہنچاتے، بلکہ اس کے مطابق زندگی گزار کر اس کی تفسیر وتشریح بھی فرماتے۔ آپ ﷺ کی شخصیت میں قرآن کریم کے فہم وادراک کے تمام عوامل موجود تھے۔

ا: قرآن کریم میں سنت کا اہتمام کرنے کی ترغیب

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ (الحشر: ۷) ''اور جو چیز تم کو پیغمبر ﷺ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔'' اس آیت مبارکہ میں موجود "مـــا" موصولہ میں وحی متلو یعنی قرآن کریم اور وحی غیر متلو یعنی احادیث قدسیہ اور احادیث نبویہ سب شامل ہیں، مزید برآں حرف ''ف'' اتباع و اطاعت کے وجوب کی طرف مشیر ہے، نیز اس سے نبی کریم ﷺ کے منع کردہ امور سے باز اور دور رہنے کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس اطاعت کا تعلق تقوی کے ساتھ ہے، لہٰذا پوری احتیاط اور حساسیت کے ساتھ اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔

صحابہ کرام اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور انہیں علم تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک حدیث، عمل اور تقریر پر عمل کر کے ہی تقوی کے مقام کو حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ آیت کریمہ ﴿إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴾ پر ختم ہو رہی ہے، اس لیے ان میں سے کسی کے لئے اس تہدید کو سنجیدگی سے نہ لینا ممکن نہ تھا، کیونکہ وہ رضائے الٰہی اور قربِ خداوندی کی طرف لپکنے والی افضل ترین جماعت تھی۔

قرآن کریم ایک اور مقام پر کہتا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴾ (الأحزاب: ۲۱) ''مسلمانو! تم کو اللہ کے رسول کی پیروی کرنا بہتر ہے، یعنی ہر اس شخص کو جسے اللہ سے ملنے اور روز قیامت کے آنے کی امید ہو اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔''

قرآن کریم اس آیت مبارکہ میں اعلان کر رہا ہے کہ سنت نبویہ امن و سلامتی کے ساحل تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے، نیز یہ بے شمار ٹیڑھے میڑھے راستوں میں سے واحد سیدھا راستہ ہے۔ صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ نجات رسول اللہ ﷺ کے قافلے میں شامل اور آپ کے سفینے پر سوار ہونے میں ہے، جس کے نتیجے میں وہ قیامت کے دن آپ ﷺ کی شفاعت کے مستحق قرار پائیں گے۔ جب آپ ﷺ سجدہ ریز ہو کر ''امتی! امتی!'' پکاریں گے تو آپ سے کہا جائے گا: ''اے محمد! سر اٹھائیے اور مانگئے آپ کو آپ کی مراد عطا کی جائے گی اور شفاعت کیجیے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''(434)

وہ جانتے تھے کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ برزخ، محشر اور قیامت کے دن پل صراط پر نہیں پہچانیں گے، وہ برباد ہو جائے گا، یہی وجہ تھی کہ وہ آپ ﷺ کی تمام حرکات و سکنات، آپ کے چہرے کے تاثرات، آنکھوں کے اشارات اور ہونٹوں کی مسکراہٹوں کا بغور مشاہدہ کرتے، انہیں سمجھتے اور

پھرانہیں اگلی نسلوں کی طرف منتقل کردیتے، کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کی مبارک زبان سے یہ حدیث سنی تھی: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کوتروتازہ رکھے، جس نے میری حدیث سنی، اسے حفظ کیااور پھراسے کسی دوسرے تک پہنچایا۔'' ایک دوسری روایت کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں: ''اللہ تعالیٰ اس بندے کوتروتازہ رکھے، جس نے میری بات سنی، اسے یادکیااور پھراسے میری طرف سے آگے پہنچایا۔''(435)

۲- احادیث رسول ﷺ میں سنت کے اہتمام کی ترغیب

جیساکہ اوپرحدیث میں گزرارسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث کوسمجھنے، یادکرنے اور آگے پہنچانے کی ترغیب دی اور ایساکرنے والوں کوتروتازہ رکھنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کی رسالت اورآپ کے لائے ہوئے دین کی بقاودوام اور انسانیت کی نجات اسی طریقِ کارسے مشروط تھی۔

فتح مکہ کے بعد قبیلہ عبدقیس کے وفدنے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضرہوکرعرض کی: ''یارسول اللہ! ہم آپ کی خدمت میں صرف اشہرحرام میں ہی حاضرہوسکتے ہیں، کیونکہ ہمارے اورآپ کے درمیان قبیلہ مضرکے کفارحائل ہیں، لہٰذاہمیں کسی ایسی فیصلہ کن بات کاحکم دیجئے، جس سے ہم اپنے پیچھے موجودلوگوں کوباخبرکریں اوراس کے ذریعے جنت میں داخل ہوجائیں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بعض کاموں کے کرنے اوربعض سے بازرہنے کاحکم دیااور پھرارشادفرمایا: ''اسے یادرکھواوراپنے پیچھے موجودلوگوں کوبتاؤ۔''(436) اس حدیث میں آپ ﷺ نے اپنی حدیث یادکرنے کا حکم دیاہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پرآپ ﷺ نے صحابہ کرام سے الوداعی خطبہ ارشادفرمایااوراس کے اختتام پرفرمایا: ''حاضرکوچاہیے کہ وہ یہ باتیں غائب تک پہنچادے، کیونکہ ہوسکتاہے کہ حاضرکسی ایسے شخص تک بات پہنچادے، جواس سے زیادہ یادرکھنے والاہو۔''(437)

ایک اورحدیث مبارک میں آپ ﷺ نے کتمانِ علم پروعید سناتے ہوئے ارشادفرمایا: ''جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی، لیکن اس نے اسے چھپایاتوقیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔(438)

جس طرح صحابہ کرام سنت کی ضرورت واہمیت سے واقف تھے، اسی طرح انہیں اسے آگے پہنچانے کی ضرورت کابھی ادراک تھا۔جس طرح وہ رسول اللہ ﷺ کی ترغیب سن کرشادہوجاتے، اسی

طرح وہ آپ ﷺ سے وعید و ترھیب سن کر کانپ اٹھتے۔ کتمانِ علم پر درج ذیل قرآنی وعید بھی ان کے سامنے تھی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً أُولَئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ﴾ (البقرة: ١٧٤) ''جو لوگ اللہ کی کتاب سے ان آیتوں کو اور ہدایتوں کو جو اس نے نازل فرمائی ہیں، چھپاتے اور ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت یعنی دنیاوی منفعت حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھرتے ہیں۔'' اس قسم کی آیات سن کر ان پر خوف طاری ہو جاتا اور وہ کتاب و سنت کو سمجھنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے میں مصروف ہو جاتے۔

رسول اللہ ﷺ جس طرح صحابہ کرام کو قرآن کریم سکھاتے، اسی طرح انہیں سنت کی تعلیم بھی دیتے، چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر مجھے تشہد ایسے ہی سکھایا، جیسے آپ مجھے قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔''[439] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں اپنے کاموں کے لیے استخارہ کرنا ایسے ہی سکھاتے تھے، جیسے آپ ہمیں قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔''[440]

رسول اللہ ﷺ سامعین کو اپنی بات اچھی طرح سمجھانے کے لیے ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے اور بعض اوقات اپنی بات کو تین تین بار دہراتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسے انداز سے گفتگو فرماتے کہ اگر کوئی اس کے الفاظ کو شمار کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔[441] ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ تمہاری طرح جلدی جلدی گفتگو نہ فرماتے تھے۔[442]

رسول اللہ ﷺ نے صرف اسی پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ مل بیٹھ کر اللہ کی کتاب اور دین کی باتوں کا مذاکرہ کرنے پر اپنے صحابہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ایک حدیث مبارک میں آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے کسی گھر میں کتاب اللہ کی تلاوت اور آپس میں اس کے مذاکرے کے لیے جمع ہوتے ہیں، ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، انہیں رحمت خدوندی ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے پاس موجود فرشتوں کے ہاں ان کا تذکرہ فرماتے ہیں۔[443] رسول اللہ ﷺ اس انداز سے صحابہ کرام کو کتاب اللہ کے پڑھنے پڑھانے، اس کے معانی سے آگاہی حاصل کرنے اور کتاب اللہ کی تفسیر کی حیثیت رکھنے والی سنت کے پڑھنے پڑھانے کی ترغیب دیتے تھے۔

۳- صحابہ کرام کا ذوق و شوق

صحابہ کرام قرآن کریم اور سنت نبویہ کے معانی جاننے اور اس بارے میں اپنے علم کو آگے پہنچانے

کے شوق سے لبریز تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ تباہی و بربادی کے کنارے کھڑے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے محترم رسول کو ان کی طرف بھیج کر انہیں تباہی کا شکار ہونے سے بچایا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آپ ﷺ کی بیش قیمت احادیث، افعال اور اوامر و نواہی پر خصوصی توجہ دی اور ان کا آپس میں مذاکرہ جاری رکھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آپ سے کوئی حدیث سنتے اور وہاں سے اٹھنے کے بعد جب تک اسے زبانی یاد نہ کر لیتے اس وقت تک اس کا آپس میں مذاکرہ کرتے رہتے۔(444) خاص طور پر اصحاب صفہ ساری ساری رات نماز، تلاوتِ قرآن پاک اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں گزار دیتے، حتیٰ کہ بعض اوقات ایک ایک استاذ کے گرد شاگردوں کے حلقے کی تعداد ستر افراد تک پہنچ جاتی اور بسا اوقات درس کا یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا۔

وہ رسول اللہ ﷺ سے اس درس و تدریس کی ترغیب سنتے رہتے تھے، مثلاً آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص میری اس مسجد میں صرف علم سیکھنے یا سکھانے کے لیے آئے گا وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔''(445) یہی وجہ تھی کہ ہر صحابی آپ ﷺ سے کوئی بات سیکھنے کے بعد دوسروں کے استفادے کے لیے اسے بڑے ذوق و شوق سے آگے پہنچاتا۔ یہ صرف مردوں کی ہی خصوصیت نہ تھی، بلکہ اس میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ شریک ہوتیں اور کسی سے پیچھے نہ رہتیں۔

عورتیں مسجد میں مردوں اور بچوں کی صف کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتی تھیں، جس کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو صحیح طرح سے نہ سن پاتیں۔ بعض اوقات مسجد مردوں سے بھر جاتی اور خواتین کے لیے اس میں جگہ ہی نہ رہتی۔ اس پر خواتین نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کرتے ہوئے عرض کی: ''مرد حضرات آپ کے بارے میں ہم پر غالب آگئے ہیں۔ آپ ہمارے لیے کوئی علیحدہ دن مقرر فرمائیے۔''(446) چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے ان سے ایسا کرنے کا وعدہ فرمایا اور ان کے لئے خصوصی اجتماع کا انتظام کیا، جس میں آپ ﷺ انہیں وعظ و نصیحت فرماتے اور ان کے سوالات کے جوابات دیتے۔

رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات عورتوں کی معلمات تھیں، چونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتی تھیں، اس لیے وہ قرآن و سنت کے اپنے فہم کو دوسری خواتین کی طرف منتقل کرتیں۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنی ازواجِ مطہرات کی تعلیم کا اہتمام فرماتے، تاکہ وہ دوسری خواتین اور آئندہ آنے والی

نسلوں تک آپ کا پیغام پہنچائیں۔ جو کچھ آپ ﷺ ارشاد فرماتے اور جو کچھ وہ آپ کو کرتے ہوئے دیکھتیں وہ ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے واسطے سے خیبر کے باشندوں، ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے سے بنو عامر بن صعصعہ، ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے بنومخزوم، ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے سے بنوامیہ اور ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے واسطے سے بنو مصطلق کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ازواجِ مطہرات نے رسول اللہ ﷺ کے پیغام رسالت کو اپنے قبیلوں اور اعزہ واقارب تک پہنچانے کے فریضے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتی۔ یہ قبائل بجا طور پر رسول اللہ ﷺ کے سسرال ہونے پر فخر کرتے تھے۔

۴- پراثر الفاظ اور یادگار واقعات

بسا اوقات رسول اللہ ﷺ اہم اور حیات بخش مواقع پر کوئی ایسی بات ارشاد فرماتے، جو ذہنوں پر نقش ہو جاتی اور اسے بھلانا ممکن نہ ہوتا، کیونکہ جن مواقع پر یہ بات کہی گئی ہوتی تھی وہ ناقابل فراموش ہوتے تھے اور ان کا خیال آتے ہی ذہن آپ ﷺ کے ان ارشادات کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

الف: جب جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ بہت غمزدہ ہوئے اور روئے۔ آپ ﷺ عام طور پر میت پر نہیں روتے تھے، لیکن آپ حضرت حمزہ اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہما پر روئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر رسول اللہ ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کی بیوی ام العلاء نے کہا: ''اے ابوالسائب! تم پر خدا کی رحمت ہو۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عزت بخشی ہے۔'' یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: ''تمہیں کس نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت بخشی ہے۔'' اس پر اس نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔'' رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ عثمان کی موت واقع ہو چکی ہے اور مجھے ان کے بارے میں بھلائی کی امید ہے۔ بخدا! رسولِ خدا ہونے کے باوجود مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔'' حضرت عثمان بن مظعون کی بیوی نے کہا: ''بخدا! آئندہ میں کسی کے اچھے ہونے کی گواہی نہ دوں گی اور مجھے اپنی بات پر افسوس ہے۔'' اس کے بعد وہ سوئیں تو خواب میں انہیں حضرت عثمان کا ایک بہتا ہوا چشمہ نظر آیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں اس بارے میں بتایا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ ان کے اعمال ہیں۔''[447] اس واقعے کا مشاہدہ کرنے والوں کے لیے اسے اور اس کے دوران ہونے والی گفتگو کو فراموش کرنا ممکن نہ تھا۔

ب: قزمان نامی شخص نے غزوہ احد میں خوب لڑائی کی اور بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ جب زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جنگ کے دوران اس کی موت واقع ہوئی تو لوگ اسے شہید سمجھ کر اس پر رشک کرنے لگے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا کہ وہ دوزخی ہے۔ اس پر صحابہ کرام کو حیرت ہوئی پھر اچانک انہیں خبر ملی کہ اگرچہ وہ شدید زخمی ہے، لیکن اس کی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ جب رات ہوئی تو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے خودکشی کر لی، نیز لوگوں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ رضائے الٰہی کی بجائے قومی حمیت کے جذبے سے لڑا ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال سے ارشاد فرمایا: ''اے بلال! کھڑے ہو کر اعلان کرو: ''جنت میں اہل ایمان کے سوا کوئی نہیں جائے گا، گو اللہ تعالیٰ فاجر شخص سے بھی اس دین کی خدمت لے لیتے ہیں۔''(448) کیا جنگ احد کے تذکرے میں اس حدیث کو فراموش کرنا ممکن ہے؟

ج: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر بعض صحابہ کرام شہدا کو شمار کر رہے تھے کہ فلاں شہید ہے، فلاں شہید ہے، یہاں تک کہ جب انہوں نے ایک شخص کے بارے میں کہا کہ وہ شہید ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہرگز نہیں، میں نے اسے ایک چادر (یا عباء) کی خیانت کرنے کی وجہ سے جہنم میں دیکھا ہے۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابن خطاب! جاؤ اور لوگوں میں اعلان کرو کہ جنت میں صرف اہل ایمان داخل ہوں گے۔''(449) اس لیے جب بھی غزوہ خیبر، شہداء، مالِ غنیمت اور اہل جنت کے اوصاف کا تذکرہ ہوتا، صحابہ کرام کو اس معرکے کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی ارشاد فرمائی ہوئی یہ بات یاد آ جاتی، کیونکہ اس واقعے کو فراموش کرنا یا اس موقع پر آپ ﷺ کے اس ارشاد کو بھلانا ممکن نہ تھا۔

بابرکت سنت نبویہ میں ذکر کردہ مقدس حقائق دلوں اور ذہنوں میں واقعات کے ساتھ ایسے مربوط ہو جاتے کہ وہ مرورِ زمانہ سے فراموش نہ ہوتے۔ صحابہ کرام نے ان احادیث کو فراموش نہ کیا، بلکہ انہیں اپنے ذہنوں میں نقش اور دلوں میں محفوظ کیا اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزاری اور پھر انہیں مکمل اور محفوظ صورت میں آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کیا۔

د: صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی بہت زیادہ عزت و توقیر کرتے اور آپ ﷺ کے ساتھ انتہائی ادب و احترام سے پیش آتے تھے۔ جس قدر ان کے علم اور مرتبے میں اضافہ ہوتا، اسی قدر آپ ﷺ کے بارے میں ان کے احترام، عزت اور ادب میں زیادتی ہوتی، حتیٰ کہ بعض اوقات وہ آپ ﷺ سے کوئی بات پوچھنے میں جھجک محسوس کرتے اور سوال کرنے کی ہمت رکھنے والے شخص کے

آنے کے منتظر رہتے۔ ایک دن ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر آیا۔ اس نے اونٹ کو مسجد میں بٹھایا، اس کے پاؤں میں رسی باندھی اور پھر سخت و درشت لہجے میں پوچھا: ''تم میں سے محمد کون ہے؟'' نبی کریم ﷺ صحابہ کے درمیان ٹیک لگائے بیٹھے تھے، چنانچہ صحابہ کرام نے کہا: ''یہ ٹیک لگائے گوری رنگت والا شخص (محمد) ہے۔'' آپ ﷺ سے اس شخص نے کہا: ''کیا عبدالمطلب کا بیٹا؟'' اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔'' اس شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا: ''میں سخت لہجے میں تم سے کچھ سوالات کروں گا، لہٰذا برا نہ منانا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو تمہارا جی چاہے پوچھو۔'' اس نے کہا: ''میں آپ کے رب اور آپ سے پہلے لوگوں کے رب کا واسطہ دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو ساری انسانیت کی طرف بھیجا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں واقعی۔'' اس نے کہا: ''میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں واقعی۔'' اس نے کہا: ''میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو سال کے اس ماہ (رمضان) میں روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں واقعی۔'' اس نے کہا: ''میں اللہ کا واسطہ دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو ہمارے مالداروں سے صدقہ لے کر ہمارے فقراء میں تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے؟'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہاں واقعی۔'' اس پر اس نے کہا: ''آپ جو دین لائے ہیں، میں اس پر ایمان لایا۔ درحقیقت مجھے میری قوم نے بھیجا ہے۔ میں ضمام بن ثعلبہ ہوں اور میرا تعلق بنوسعد بن بکر سے ہے۔ [450]

کیا ضمام بن ثعلبہ، اس کی قوم یا صحابہ کرام، جنہوں نے آغاز میں اس کے عدم احترام اور اختتام پر خلوص ایمان کا مشاہدہ کیا تھا، کے لیے اس واقعے یا اس دوران آپ علیہ السلام کے ارشادات کو فراموش کرنا ممکن تھا؟ ہرگز نہیں۔ دل و دماغ پر اتنے گہرے اثرات چھوڑنے والے واقعے کو بھلانا کسی طرح ممکن نہیں۔

۵- ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہیں ﴿لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ (البینۃ: ۱) سنانے کے لیے کہا ہے۔'' حضرت ابی نے پوچھا: ''کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔'' یہ سن کر وہ رونے لگے۔ [451] اس واقعے کے بعد حضرت ابی کے بیٹے فخر سے کہہ سکتے تھے کہ میں اس شخص کا بیٹا ہوں، جسے رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم پر سورۃ البیّنۃ سنائی تھی۔ یہ واقعہ حضرت ابی بن کعب، ان کی اولاد اور ان کے پوتوں کے ذہنوں پر نقش ہو گیا تھا۔

۵- صحابہ کرام کی احتیاط اور سنجیدگی

یوں لگتا ہے جیسے صحابہ کرام کی تخلیق ہی قرآن وسنت کے ایک ایک لفظ کی حفاظت اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لیے ہوئی تھی۔ وہ قرآن وسنت کے ضیاع کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ بھی ایسا ہی اہتمام فرماتے تھے۔ نزولِ وحی کے وقت آپ ﷺ بھولنے کے اندیشے سے آیات کو پڑھنے اوران کا اعادہ کرنے میں جلدی کرتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ وہ خود قرآن کی حفاظت کریں گے، اس لیے آپ ﷺ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ () إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ (القیامۃ: ۱۶-۱۷) ”(اور اے پیغمبر ﷺ!) وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو تیز تیز حرکت نہ دیا کرو کہ اس کو جلد سیکھ لو۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔“

رسول اللہ ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کی حفاظت کے بارے میں بہت زیادہ اہتمام، شوق اور احتیاط کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ صحابہ کرام بھی رسول اللہ ﷺ کے ہونٹوں سے نکلنے والے ایک ایک لفظ اور حرف کے بارے میں شدید اشتیاق اور اہتمام کا اظہار کرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آج انہیں جو موقع میسر ہے وہ بار بار نہیں ملتا۔ رسول اللہ ﷺ انہیں دین کی تعلیم دیتے، اس کی وضاحت فرماتے، ان کے سامنے قرآن کی تفسیر فرماتے اور ابدی زندگی کی کامیابی کے اصول بیان فرماتے، یہی وجہ تھی کہ کسی چیز کے بارے میں ذہنوں میں پیچیدگی یا ابہام کا رہ جانا انہیں پسند نہ تھا۔

اموی خلافت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان مجاہدین استنبول کی دہلیز پر برسرِ پیکار تھے۔ ذیل میں ہم ابوعمران اسلم تجیبی سے اس وقت لڑے جانے والے معرکوں میں سے ایک معرکے کے بارے میں ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رومیوں کے شہر کے پاس تھے کہ ہماری طرف رومیوں کی ایک بہت بڑی صف بڑھی، جس کے مقابلے کے لیے مسلمانوں میں سے اتنے ہی یا اس سے زیادہ لوگ نکلے۔ اہلِ مصر کی قیادت عقبہ بن عامر کے پاس تھی اور مسلمان فوج کی قیادت فضالہ بن عبید کررہے تھے۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رومیوں کی صف پر حملہ کیا اور اس میں گھس گیا۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر چیخ اٹھے: ”سبحان اللہ! وہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔“ یہ سن کر حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: ”اے لوگو! تم اس آیت کا یہ مطلب مراد لیتے ہو، حالانکہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے حامیوں کی

تعداد بہت ہو گئی تو ہم میں سے بعض نے آپس میں رسول اللہ ﷺ سے پوشیدہ رکھ کر کہا کہ ہماری مال و دولت ضائع ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے حامی بہت ہو گئے ہیں۔ اگر ہم اپنی مال و دولت کے پاس رہیں اور اپنے ضائع شدہ مال و متاع کی اصلاح کریں تو بہتر ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ہماری بات کے جواب میں اپنے نبی ﷺ پر درج ذیل آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ: ۱۹۵) ''اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' ہلاکت سے مراد مال و دولت کی دیکھ بھال اور اصلاح اور جہاد کو چھوڑنا ہے۔''(452)
حضرت ایوب مسلسل راہِ خدا میں چلتے رہے یہاں تک کہ سرزمین روم میں ہی مدفون ہوئے۔

۶۔ قرآن وسنت کی برکت سے قائم ہونے والی نئی فضا

اس دور میں قرآنِ کریم کی ہر آیت اس غیر متمدن معاشرے کے لیے نئی بات تھی۔ اس دور کے انسان کو قرآن وسنت کی ہر بات دلکش لگتی تھی۔ تغیر و تبدل کے محیر العقول دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ خیموں میں رہنے والے بدو دنیا کے استاذ و راہنما بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ روزانہ ان پر ایک نیا آسمانی دستر خواں اترتا تھا، ہر روز اس جماعت کا نئی چیزوں سے سامنا ہوتا اور اسے نئے امور سے متعلق مخاطب کیا جاتا۔ وہ فطرتاً ذہین اور قوی قوتِ یاداشت کے مالک تھے۔ وہ کوئی بات ایک دفعہ سن لیتے تو وہ ان کے ذہنوں پر ایسے نقش ہو جاتی کہ انہیں کبھی نہ بھولتی۔ اگرچہ دورِ حاضر میں کمپیوٹر اور تحریر کے دیگر آلات پر اعتماد کرنے کی وجہ سے یاداشتیں کمزور ہو چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود اب بھی حیرت انگیز قوتِ یاداشت کے مالک ایسے لوگ موجود ہیں، جو دو تین ماہ کے مختصر عرصے میں قرآن کریم حفظ کر سکتے ہیں۔ اس دور میں تو ہر بدو کی یاداشت اتنی قوی تھی کہ وہ جو بات بھی سنتا وہ اسے یاد رہتی۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قبائلی سرداروں اور سربراہانِ ممالک کی طرف اپنے قاصد بھیجے۔ آپ ﷺ ان قاصدوں کے ہمراہ معلمین بھی بھیجتے تاکہ وہ جہاں بھی جائیں لوگوں کو قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔ ان حضرات نے صلح کی فضا سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور قبائل میں پھیل گئے یہاں تک کہ جزیرہ عرب کے کونے کونے میں قرآن وسنت کی تعلیم کے مدارس قائم ہو گئے، اسی کا نتیجہ تھا کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ کی آواز پر لبیک کہنے والے عربوں کی تعداد دس ہزار سے متجاوز تھی۔ اس تعلیمی مہم میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین خاص طور پر ازواجِ مطہرات نے اہم کردار ادا کیا۔ اس مہم کی وسعت اور اثرات کی تیز رفتاری کا نتیجہ تھا کہ دو سال بعد جب رسول اللہ ﷺ نے حج ادا فرمایا تو آپ ﷺ کے خطبۃ الوداع کو سننے کے لیے ایک لاکھ کے قریب مسلمان موجود تھے۔

اس حج کے دوران سنت کی بھرپور تبلیغ اور متعدد فتاویٰ کے صادر ہونے کا مشاہدہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے میراث، خونی انتقام کو کالعدم قرار دینے، عورتوں کے حقوق اور سود کی حرمت کے موضوعات پر گفتگو فرمائی، امت کو مستقبل میں کام آنے والی بہت سے نصیحتیں فرمائیں اور حاضرین کو اپنی باتیں غائبین تک پہنچانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے دین اسلام کو پسند فرمالیا تھا۔ یہ ساری باتیں بہت خوش کن تھیں، لیکن ایک بات صحابہ کرام کے دلوں میں کھٹک رہی تھیں وہ یہ کہ پیغام رسالت مکمل ہو چکا ہے اور رسول اللہ ﷺ اپنے فریضے کی تکمیل اور اپنی رسالت کی ادائیگی کے بعد انہیں داغِ مفارقت دے جائیں گے، یہی وجہ تھی کہ وہ اشکبار آنکھوں سے آپ ﷺ کے ارشادات کو غور سے سن رہے تھے۔ (453) کچھ ہی عرصہ بعد قرآن کریم کی آخری آیت مبارکہ: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (البقرة: ۲۸۱) ''اور اس دن سے ڈرو جبکہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کو کچھ نقصان نہ ہوگا۔'' نازل ہوئی۔ یہ آیت کریمہ دین کو مضبوطی سے تھامنے کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے اور صحابہ کرام کو آخری مرتبہ دین اور اس نبی کے ساتھ وفاداری کی اہمیت یاد دلاتی ہے، جس نے اپنی زندگی کے تیئیس برس اس دین کی تبلیغ میں خرچ کئے۔ چونکہ صحابہ کرام کو اس کا ادراک تھا، اس لئے انہوں نے آپ ﷺ کی باتوں کو سنا، سمجھا، ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالا اور پھر جو کچھ حاصل کیا اور سنا اسے آگے منتقل کر دیا، چنانچہ قرآن کی طرح سنت بھی ان پاکیزہ اور صاف ندیوں کے ذریعے ہم تک پہنچی اور قیامت تک آئندہ نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہے گی۔

ج: اتباع سنت کے بارے میں صحابہ کرام کا حساس رویہ

جس طرح قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اہتمام کیا، اسی طرح صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے صادر ہونے والے ہر عمل کی حفاظت کا اہتمام کیا۔ آپ ﷺ جو کچھ بھی لائے صحابہ کرام نے اسے قبول کیا، اس کی پابندی اور نشر و اشاعت کی۔ ان کے دل میں کسی بھی معاملے میں آپ ﷺ کی نافرمانی کرنے کا کبھی خیال تک نہیں گزرا، بلکہ انہوں نے آپ ﷺ کی ہر بات کو قبول کیا اور آپ ﷺ کی تعلیمات کی محبت ان کی روحوں میں ایسے سرایت کر گئی جیسے بنی اسرائیل کے دلوں میں گوسالے کی محبت بس گئی تھی۔ صحابہ کرام حق اور روئے زمین پر حق کے نمائندے رسول اللہ ﷺ کی محبت سے سرشار تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ سنت کے بارے میں بہت زیادہ حساس تھے اور کیوں نہ ہوتے جبکہ قرآن کریم ان سے کہتا ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء: ٦٥) "پس تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ بھی نہ ہوں، بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مؤمن نہیں ہوں گے۔"

انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس احساس اور اطاعت کے ساتھ گزارا اور ان کے بعد آنے والے جن لوگوں نے اسی احساس اور اطاعت کے ساتھ زندگی گزاری، ان کے لیے سنت نبویہ کے بارے میں اس اہتمام کے اظہار کے سوا کوئی اور طرز عمل اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں:

۱- جیش اسامہ

آپ ﷺ نے جو سب سے آخری جنگی مہم بھیجی، وہ جیش اسامہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں رسول اللہ ﷺ نے رومیوں کے خلاف فوج کشی کا سوچا اور اس جنگی مہم کی قیادت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ حضرت اسامہ رسول اللہ ﷺ کی گود میں پلے تھے، کیونکہ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ جو جنگ موتہ کے ہیرو اور اس میں شہید ہوئے تھے، آپ ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ کو اپنے پاس بلایا اور ان سے فرمایا: "اپنے باپ کی قتل گاہ کی طرف جاؤ اور انہیں گھوڑوں تلے روند دو۔ میں نے تمہیں اس فوج کی قیادت سونپی ہے۔"[454]

اس لشکر میں حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم جیسے بڑے بڑے صحابہ کرام شریک تھے، لیکن لشکر کی روانگی سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ بیمار پڑ گئے اور پھر بیماری شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ حضرت اسامہ آئے اور سر جھکا کر آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بوسہ دیا۔ آپ ﷺ بات نہیں کر پا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک آسمان کی طرف بلند کر کے انہیں حضرت اسامہ پر رکھ دیا۔ حضرت اسامہ کہتے ہیں: ''مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ میرے لیے دعا فرما رہے ہیں۔'' سوموار کے دن آپ ﷺ کی صحت میں بہتری کے آثار دکھائی دیئے۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ کو بلا کر ان سے فرمایا: ''اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔'' چنانچہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو الوداع کر کے لشکر گاہ میں آئے اور لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ سوار ہونا ہی چاہتے تھے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی حالت نزع کی خبر ملی، جسے سن کر وہ لوٹے۔ ان کے ہمراہ حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما بھی خانۂ رسول کی طرف آئے، جہاں انہیں آپ ﷺ کی وفات کی اطلاع ملی۔ (456) حضرت اسامہ کو موتہ کی طرف روانہ کرنے والا کوچ کر چکا تھا، لیکن اس کے پیچھے اس کی دعوت، پیغام اور ورثے کو کماحقہ جاری رکھنے والے حضرات موجود تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت ہونے کے بعد انہوں نے جیش اسامہ کی روانگی کا اہتمام کیا، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر کے عربوں میں پھیلنے کی وجہ سے ارتداد کے واقعات پیش آنا شروع ہو گئے تھے، مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی اپنی نبوت کا اعلان کر دیا تھا اور جونہی انہیں آپ ﷺ کی وفات کی خبر پہنچی انہوں نے جزیرۃ العرب میں فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑکا دی، لیکن اس کے باوجود مدینہ منورہ پر ممکنہ طور پر حملہ آور ہونے والے بازنطینی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے جیش اسامہ کو روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا، کیونکہ اس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے تیار فرمایا تھا اور آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''جیش اسامہ کی روانگی کو یقینی بناؤ۔'' صحابہ کرام خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بال برابر بھی عدول ممکن نہ تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس موقع پر فرمایا تھا: ''بخدا! جس گرہ کو رسول اللہ نے باندھا ہے، میں اسے نہیں کھولوں گا، خواہ مدینے کے گرد و نواح میں پرندے اور درندے ہمیں اٹھا کر کیوں نہ لے جائیں۔ (456) آپ رضی اللہ عنہ جیش اسامہ کے پاس آئے اور انہیں روانہ ہونے کا حکم دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ لشکر کے ہمراہ پیدل چل رہے تھے، جبکہ حضرت اسامہ سوار تھے۔ حضرت اسامہ نے عرض کی: ''اے خلیفہ رسولِ خدا! یا آپ سوار ہو جائیں یا میں بھی اتر جاؤں۔'' اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بخدا! تم اترو گے

اور نہ میں سوار ہوں گا۔(457-a) اس سے رسول اللہ ﷺ کے احکامات پر عملدرآمد کرانے کے بارے میں صحابہ کرام کی حساس مزاجی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۲- سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ارضِ فدک

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ کا معاشرہ شدید صدمے سے دوچار تھا۔ دکھوں سے صحابہ کرام خصوصاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آزردہ خاطر تھے۔ ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک میں اپنے والد کی میراث مانگنے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کیا کرتے اور انہیں کیا جواب دیتے، حالانکہ آپ رضی اللہ عنہ ان سے محبت کرتے تھے اور کبھی بھی انہیں تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرسکتے تھے؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی نشانی تھیں۔ وہ آپ ﷺ کی بیٹی تھیں، جن سے آپ ﷺ کو شدید محبت تھی اور جنہیں آپ ﷺ اپنے جسم کا ٹکڑا قرار دیتے تھے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ کسی بھی دوسرے رشتے سے بڑھ کر تعلق تھا، اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ سے فرمایا: ''بخدا! میں بھی وہی طرزِ عمل اختیار کروں گا، جو میں نے رسول اللہ ﷺ کو اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔(457-b) اور انہیں پیغام بھجوایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہم میراث نہیں چھوڑتے، ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔''(458) لہٰذا آپ ﷺ نے جو کچھ چھوڑا ہے، اسے انہی مصارف میں خرچ کرنا ضروری ہے، جن میں آپ ﷺ انہیں صرف کیا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشکل ترین لمحات میں بھی سنت سے انحراف نہیں کیا گیا۔

۳- مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں موقف

انہی دنوں میں بعض لوگ نماز کے بارے میں سستی اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں لیت ولعل کرنے لگے۔ جب فتنۂ ارتداد سنگین صورتحال اختیار کرگیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوۃ سے اس وقت تک تسامح برتنے کی رائے دی، جب تک ہر طرف پھیلے ہوئے فتنے کو دبا کر اسلام کی شوکت کو بحال نہ کردیا جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے استدلال کیا: ''مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم ملا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو سوائے اسلام کے حق کے مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ بنالیں گے اور ان کا حساب وکتاب اللہ کے سپرد ہے۔''(459)

لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس تجویز کو قبول نہ کیا اور اپنا مشہور زمانہ مقولہ ارشاد فرمایا:
''بخدا! میں نماز اور زکوۃ کے درمیان فرق کرنے والوں سے ضرور لڑوں گا، کیونکہ زکوۃ مال کا حق ہے۔ بخدا! اگر انہوں نے مجھ سے بکری کا ایک بچہ بھی روکا، جو وہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں اسے روکنے پر ان سے جنگ کروں گا۔''(460) رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے بارے میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حساس مزاجی کا یہ عالم تھا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی اس معاملے میں ان سے کم حساس نہ تھے۔ تقریر، گفتگو یا تعلیم کے دوران انہیں کسی آیت مبارکہ یا حدیث نبوی کا حوالہ دیا جاتا تو وہ فوراً ٹھہر جاتے اور اسے غور سے سنتے، یہی وجہ ہے کہ انہیں ''الوقاف عند الحق'' ''حق کی بہت زیادہ پاسداری کرنے والا۔'' کہا جاتا تھا۔(461) حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں روایات ملتی ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے سے اختلاف رکھنے والی عورت کے موقف کو درست قرار دیا اور فرمایا: ''اے اللہ! مجھے معاف فرما۔ سارے لوگ عمر سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں۔''(462) اس قسم کے اعتراف نے اس عظیم ہستی کی قدر و منزلت کو مزید بڑھا دیا، اس قسم کی اور بھی بہت سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عظیم شخصیت نے حق بات کے اعتراف میں کبھی پس و پیش کی اور نہ ہی حق بات پر کبھی اعتراض کیا، بلکہ ایسا کرنے کا کبھی خیال بھی ان کے دل میں نہیں گزرا۔

۴- اتباع سنت کے بارے میں حساس مزاجی

الف: حضرت عمر رضی اللہ عنہ صاحب فراست، صاحب عقل و دانش اور عبقری شخصیت تھے۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے ہاتھ کی انگلیوں کی دیت کا مسئلہ پیش ہوا۔ انہوں نے اجتہاد کرتے ہوئے چھوٹی انگلی میں چھ، اس کی ساتھ والی انگلی میں نو، درمیانی انگلی میں دس، شہادت کی انگلی میں بارہ اور انگوٹھے میں تیرہ اونٹ مقرر فرمائے، لیکن جونہی انہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث: ''ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے۔ ہر انگلی کے بدلے دس اونٹ ہیں۔'' پہنچی وہ اتباع سنت میں اپنی رائے سے دست بردار ہو گئے۔(463)

ب: عبداللہ بن سعدی سے مروی ہے کہ وہ حضرت عمر کے دور خلافت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمر نے ان سے فرمایا: ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم عوام کے بعض کام سرانجام دیتے

ہو، لیکن جب تمہیں ان کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے تو تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ میں نے کہا: ''حقیقت ایسے ہی ہے۔'' حضرت عمر نے پوچھا: ''تمہاری اس سے کیا غرض ہوتی ہے؟'' میں نے عرض کی: ''میرے پاس گھوڑے اور غلام ہیں اور مجھ پر اللہ کا بڑا اکرم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا معاوضہ مسلمانوں پر صدقہ کر دیا جائے۔'' حضرت عمر نے فرمایا: ''ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ تمہاری طرح میں نے بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ مجھے مال عطا کرتے اور میں عرض کرتا: ''یہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند شخص کو دے دیجئے۔'' ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مجھے کچھ مال عطا کیا۔ میں نے عرض کی: ''یہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند شخص کو دے دیجئے۔'' اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یہ لے لو، اسے کاروبار میں لگاؤ اور پھر اسے صدقہ کرو۔ جو مال نفس کی طمع اور سوال کے بغیر تمہیں ملے اسے لے لو، بصورتِ دیگر اپنی جان کو اس کے پیچھے نہ کھپاؤ۔''(464)

ج: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک دن زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کو نماز عصر کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو انہیں درے سے مارا، کیونکہ اگرچہ نماز مؤمن کی معراج ہے، لیکن اس کے اوقات مقرر ہیں۔ اگر اسے صحیح اوقات میں ادا کیا جائے تو یہ عبادت ہے ورنہ بدعت کہلاتی ہے، لیکن زید بن خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے امیر المؤمنین بخدا! میں انہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو انہیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' یہ سن کر حضرت عمر ان کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا: ''اے زید بن خالد! اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ اسے رات تک نماز میں مشغول رہنے کا ذریعہ بنالیں گے تو میں اس پر انہیں نہ مارتا۔''(465)

اس موضوع پر ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایک روایت ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز عصر کے بعد دو رکعتیں ادا فرمائیں اور پھر ارشاد فرمایا: ''مجھے عبد قیس کے لوگوں نے ظہر کے بعد کی دو رکعتوں کی ادائیگی سے مشغول رکھا۔''(466) ممکن ہے حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو کسی ایسے ہی موقع پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہو، تاہم ان فقہی مسائل کا منشا کچھ بھی ہو، یہاں ہمارے پیش نظر صحابہ کرام کے ہاں اتباع سنت کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

سنت پر مضبوطی سے عمل پیرا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جب نماز کی حالت میں زخمی کیا گیا اور بستر مرگ پر ان سے خلیفہ نامزد کرنے کا کہا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''اگر میں خلیفہ نامزد کردوں تو ابو بکر جو مجھ سے بہتر تھے، نے خلیفہ نامزد کیا تھا اور اگر نامزد نہ کروں تو بھی رسول اللہ ﷺ جو مجھ سے بہتر تھے، نے خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا۔(467) ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ خلیفہ نامزد کریں یا نہ کریں دونوں

صورتوں میں سنت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، لیکن چونکہ معاملہ دو راستوں میں سے ایک راستے کو اختیار کرنے کا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا راستہ اختیار کرنا بہتر تھا، تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حالات اور امت کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک درمیانہ راستہ اختیار فرمایا اور خلیفہ کے چناؤ کا اختیار اس وقت باحیات عشرہ مبشرہ صحابہ میں سے ان چھ صحابہ کے سپرد کیا، جن سے رسول اللہ ﷺ وفات کے وقت راضی تھے، نیز حضرت عمر نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کو حَکَم اور حضرت قعقاع کو نگران مقرر فرمایا، مزید برآں آپ نے انہیں خلیفہ کے تقرر میں جلدی کرنے کی وصیت کی تاکہ امت بغیر قیادت کے نہ رہے۔(468)

د: اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ طوافِ کعبہ کے دوران حجرِ اسود کہ جسے بہت سے انبیائے کرام نے بوسہ دیا ہے، کے قریب آتے اور فرماتے: "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، جو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔"(469) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر صرف اتباعِ سنت کے جذبے سے حجرِ اسود کو بوسہ دیتے تھے۔

ہ: صحابہ کرام اچھی طرح جانتے تھے کہ سنتِ نبویہ ان کے پاس ایک مقدس امانت ہے، وہ جس قدر سنت سے قریب ہوں گے اسی قدر انہیں قربِ خداوندی حاصل ہوگا اور اگر خدانخواستہ انہوں نے سنت سے دوری اختیار کی تو آخرت میں ان کے ساتھ امانت میں خیانت کرنے والوں جیسا برتاؤ ہوگا۔

حضرت میسرہ بن یعقوب سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر پانی پیا اور پھر فرمایا: "اگر میں کھڑے ہوکر پانی پیوؤں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہوکر پانی پیتے دیکھا ہے اور اگر میں بیٹھ کر پانی پیوؤں تو اس کی وجہ بھی یہ ہوتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیٹھ کر پانی پیتے ہوئے دیکھا ہے۔"(470)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی حدود سمجھنا، ہر معاملے میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کو جاننا اور آپ کی سنتِ مطہرہ کو بعینہٖ اگلی نسلوں تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھ کر پینے پر زور دیا ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھڑے ہوکر پینا جائز نہیں۔ ایسے مسائل میں شدت مناسب نہیں۔

و: عبد بن خیر نے حضرت علی سے روایت کی ہے کہ اگر دین کا مدار رائے پر ہوتا تو موزے

کے نیچے مسح کرنا اس کے اوپر مسح کرنے سے بہتر ہوتا، لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے موزوں کے اوپر مسح کرتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔(471) حضرت علی کے اس ارشاد میں سنت کی غیر مشروط اطاعت اور سنت کے ہوتے ہوئے اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل نہ کرنے کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ ان کا یہ ارشاد صحابہ کی زندگیوں میں سنت کے مقام کی طرف مشیر ہے۔

ز: تمام صحابہ کرام کو بشمول حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے جب رسول اللہ ﷺ کی کوئی ایسی حدیث پہنچتی جو کسی بھی معاملے میں ان کی ذاتی رائے اور اجتہاد کے مخالف ہوتی تو وہ فوراً اپنی رائے سے رجوع کر کے سنت کی پیروی کرتے، مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ قتل خطا میں مقتول کی دیت قاتل پر نہیں ہوگی، بلکہ "بحسب المغرم المغنم" ''نقصان کی بقدر نفع ہوتا ہے۔'' کے قاعدے کے مطابق اس کے ورثاء یعنی عاقلہ کے ذمے ہوگی، نیز یہ دیت مقتول کے عاقلہ کو ملے گی اور اس کی بیوی کو اس کی دیت میں سے بطور میراث کے حصہ نہیں دیا جائے گا، لیکن جب ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف خط لکھا کہ وہ اشیم ضبابی کی دیت میں سے اس کی بیوی کو بطور میراث کے حصہ دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔(472)

ح: اس امت کے امین حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر قلبی تعلق تھا کہ آپ نے بستر مرگ پر فرمایا تھا: ''اگر ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلافت سونپ دیتا۔''(473) جب محرومی و مشقت کے طویل دور کے بعد مسلمانوں پر دنیا کی فراوانی ہوئی تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں پھر بھی کوئی تبدیلی آئی اور نہ ہی دنیا ان کے دل میں اپنا شوق پیدا کر سکی۔ جب حضرت ابو عبیدہ اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے، ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے خیمے میں داخل ہوئے اور خیمے کی سادگی دیکھ کر انہیں رونا آ گیا اور ان سے کہنے لگے: ''اے ابو عبیدہ! تمہارے سوا دنیا نے ہم سب کو بدل دیا۔''(474)

حضرت عمر ان سے بہت محبت کرتے تھے، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوج کا جائزہ لینے کے لیے شام کی طرف روانہ ہوئے اور مقام ''سرغ'' پر پہنچے تو فوج کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان سے ملاقات کے لیے آئے اور انہیں شام کے علاقے میں وبا کے پھیلنے کی اطلاع دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں جانے یا نہ جانے کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ساتھیوں کی طرف سے متضاد آراء آئیں۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ

عنہ کی رائے سفر جاری رکھنے کی تھی، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ''اے ابوعبیدہ! کاش تمہارے سوا کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی! ہم اللہ تعالیٰ کی ایک تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ مجھے بتایئے اگر آپ کے پاس اونٹ ہوں اور آپ انہیں ایک ایسی وادی میں لے جائیں جس کے دو حصے ہوں، ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا خشک اور بنجر۔ اگر آپ سرسبز حصے میں اپنے اونٹ چرائیں یا خشک اور بنجر حصے میں کیا دونوں صورتوں میں آپ یہ کام تقدیر الٰہی سے نہ کریں گے؟'' حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ جو اپنے کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے، اسی دوران تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اس بارے میں مجھے علم ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اگر تمہیں کسی علاقے میں طاعون کے پھیلنے کی خبر ملے تو وہاں مت جاؤ اور اگر جس علاقے میں تم ہو وہاں طاعون پھیل جائے تو وہاں سے بھاگ کر مت نکلو۔'' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شکر خداوندی ادا کیا اور واپس لوٹ گئے۔(475)

سنت نبویہ زندگی کے ناقابل فراموش واقعات اور انقلابات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ان حساس مزاج ہستیوں کے دلوں میں اتری اور پھر محققین اور محدثین کی کتابوں میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچی۔

د: حدیث کی روایت میں صحابہ کرام کی احتیاط

صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین ہر سنی سنائی بات کو قبول کر کے اس کے پیچھے چل پڑنے والے لوگ نہ تھے۔ اگرچہ ان کے دل پاکیزہ اور صاف ستھرے تھے، لیکن وہ بہت محتاط تھے اور ہر بات خصوصاً سنت نبویہ کو اچھی طرح جانچ پرکھ کر قبول کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سنت مطہرہ کو بڑی احتیاط سے محفوظ کیا، اسے کتابوں میں تحریر کیا، روایات کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کی اور پھر انہیں اسی احتیاط سے آگے منتقل کیا۔ اس بارے میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

۱- نبی کریم ﷺ کی وعید

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس نے میری طرف جھوٹی بات منسوب کی اسے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالینا چاہیے۔'' ایک دوسری روایت میں ہے۔ ''جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی اسے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالینا چاہیے۔''(476) اس دور میں جب سچائی اور جھوٹ کے درمیان اتنا واضح فرق تھا، جتنا فرق رسول اللہ ﷺ اور مسیلمہ کذاب کے درمیان تھا یا جتنا فرق آسمان اور زمین کے درمیان ہوتا ہے اور جس کی اہم ترین خوبی اور خصوصیت سچائی تھی، کسی مؤمن خصوصاً صحابی یا تابعی کے لیے کسی عام سے معاملے میں بھی جھوٹ بولنا ممکن نہ تھا، بھلا وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا؟ اس دور میں کسی کے لیے بھی اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی بات گھڑنا ممکن نہ تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں تو بخدا آسمان سے زمین پر پٹخ دیا جانا مجھے آپ ﷺ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے سے زیادہ پسند ہوتا ہے۔''(477) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شخص نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ بات جھوٹی ہے، میری طرف سے اسے بیان کیا وہ دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔''(478)

کیا ان وعیدوں اور تہدیدوں کے ہوتے ہوئے ہدایت وحق پرستی کے ان پیشواؤں کے لیے، جنہوں نے دنیا کو صداقت، حق پرستی اور روشنی کا راستہ دکھایا، بھٹک کر اسی وعید وتہدید کے دائرے میں داخل ہونا ممکن تھا؟ ہرگز نہیں۔

۲- صحابہ کرام اور تابعین عظام کی احتیاط

چونکہ یہ معاملہ اس قدر حساس تھا، اس لئے صحابہ کرام نے اس پر بھرپور توجہ دی اور اس بارے میں شدید احتیاط کا مظاہرہ کیا، یہی وجہ تھی کہ بہت سے صحابہ کرام حدیث کی روایت کرنے سے اجتناب کرتے تھے حتیٰ کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی، جنہیں بعض صحابہ ان کی اور ان کی والدہ کی رسول اللہ ﷺ کے گھر کثرت سے آمد و رفت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت میں سے سمجھتے تھے اور جنہیں کوفہ بھیجتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ سے فرمایا تھا: ''ذات وحدہ لاشریک کی قسم! ان کے بارے میں تمہیں اپنے اوپر ترجیح دے رہا ہوں، لہٰذا ان سے خوب علمی استفادہ کرو۔''(479) کو جب رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث روایت کرنی پڑتی تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ حضرت عمرو بن میمون کہتے ہیں: ''میں نے جمعرات کی شام حضرت ابن مسعود کی خدمت میں حاضری کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔ میں نے انہیں کبھی بھی ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' کہتے ہوئے نہیں سنا۔ ایک شام ان کی زبان سے ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' نکل گیا، یہ کہتے ہی ان کا سر جھک گیا، میں نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کھڑے ہیں، ان کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں نمناک اور رگیں پھولی ہوئی ہیں پھر انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے اس سے کم یا اس سے زیادہ یا اس کے قریب قریب یا اس سے ملتی جلتی بات ارشاد فرمائی۔''(480)

حواری رسول حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی بہادر پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ سے بہت کم احادیث روایت کرتے تھے۔ ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ان سے اس کی وجہ پوچھی کہ میں آپ کو فلاں فلاں شخص کی طرح رسول اللہ ﷺ سے احادیث روایت کرتے ہوئے نہیں سنتا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: ''میں رسول اللہ ﷺ سے کبھی جدا نہیں ہوا، لیکن میں نے انہیں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے میری طرف جھوٹ کی نسبت کی اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے۔''(481)

رسول اللہ ﷺ کی دس سال تک خدمت کرنے والے صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر مجھے غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی ساری باتیں تمہیں بتا دیتا۔''(482)

پانچ سو صحابہ کرام سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے والے جلیل القدر تابعی حضرت عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: ''میں نے اس مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ایک سو بیس انصار صحابہ

کو دیکھا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی حدیث بیان کرتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ کاش اس کا کوئی دوسرا بھائی یہ فتویٰ دے دیتا۔"(483)

حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ نے ظہورِ اسلام کے ابتدائی دور میں ہی رسول اللہ ﷺ کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ان کے بیٹے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دورِ خلافت پایا۔ وہ مسلمانوں کے بیت المال کے ذمہ دار تھے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیت المال میں بطورِ ودیعت رکھے ہوئے اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے بعض اعزہ و اقارب میں تقسیم کر رہے ہیں تو انہوں نے بیت المال کی چابیاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیں اور یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ لوگ ان کے بارے میں بدگمانی کریں گے۔ جب تابعی عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ نے ان سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث سنانے کی درخواست کی تو وہ اچھل پڑے اور معذرت کر دی۔ حضرت عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: ہم نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے عرض کی: "ہمیں رسول اللہ ﷺ کی احادیث سنایئے۔" انہوں نے فرمایا: "ہم بوڑھے ہو گئے ہیں اور بھول بھال گئے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی روایت بڑا نازک معاملہ ہے۔"(484)

الف: روایتِ حدیث میں احتیاط

حدیث کے راوی کو عربی زبان سے اچھی واقفیت ہونی چاہیے، تاکہ حدیث بیان کرتے ہوئے کوئی اجنبی لفظ اس میں شامل نہ ہو جائے۔ اگرچہ روایت باللفظ کے مشکل ہونے کی صورت میں روایت بالمعنی جائز ہے، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام احادیث روایت کرتے وقت نہ صرف ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف کے بارے میں شدید احتیاط فرماتے تھے، مثلاً ایک دفعہ حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث یوں روایت کی: "مثل المنافق کمثل الشاة الرابضة بين الغنمين" اسی مجلس میں صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انہیں یہ سن کر غصہ آیا اور فرمایا: "آپ ﷺ نے ایسی بات ہرگز نہیں ارشاد فرمائی تھی۔" اس پر حضرت عمیر نے ان سے پوچھا: "پھر آپ ﷺ نے کیا بات ارشاد فرمائی تھی؟" انہوں نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "مثل المنافق كمثل الشاة العائرة بين الغنمين." حالانکہ دونوں روایتوں کے درمیان صرف "الرابضة" اور "العائرة" کا فرق تھا۔

تاہم مسند میں عبید اللہ بن عمیر کی حدیث درج ذیل الفاظ سے مروی ہے: "ان مثل المنافق یوم القیامة کشاة بین الربیضین من الغنم، ان أتت هؤلا نطحتها، ان أتت هؤلا نطحتها" جبکہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس حدیث کے حصے "کشاة بین الربیضین" کی جگہ "کشاة بین الغنمین" کے الفاظ روایت کرتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے رسول اللہ ﷺ سے ایسے ہی سنا تھا۔(485)

صحابہ کرام کی یہ احتیاط تابعین اور تبع تابعین کی طرف بھی منتقل ہوئی، چنانچہ مشہور عالم حضرت سفیان بن عیینہ نے درج ذیل حدیث روایت کی: "نهى رسول الله ﷺ عن الدباء و المزفت أن ینتبذ فیه." "رسول اللہ ﷺ نے (دبا) کدو کے بنے ہوئے اور تارکول لگے ہوئے برتن (مزفت) میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے۔" لیکن جب انہوں نے اپنی ایک مجلس میں اسے "نهى رسول الله ﷺ عن الدباء والمزفت أن ینبذ فیه." "رسول اللہ ﷺ نے کدو کے بنے ہوئے (دبا) اور تارکول لگے ہوئے برتن (مزفت) میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے۔" کے الفاظ سے روایت کیا تو فرمایا: "میں نے اسے زہری سے ان الفاظ کے ساتھ نہیں سنا۔"(486) اگرچہ ان دونوں لفظوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ان میں سے ایک میں "ینتبذ" ثلاثی مزید فیہ ہے اور دوسرا "ینبذ" ثلاثی مجرد ہے اور معنی میں کوئی خاص فرق نہیں، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین رسول اللہ ﷺ سے بعینہ احادیث روایت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

روایت حدیث میں اس قدر احتیاط اور حساس رویے کی صورت میں کیا بعض لوگوں کے اس دعوے کو سنجیدگی سے لیا جاسکتا ہے کہ چونکہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی گفتگو کو اپنے الفاظ اور تعبیرات میں نقل کرتے تھے، اس لیے احادیث کو قانون سازی کا ماخذ قرار دینا درست نہیں؟ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب تم خواب گاہ میں آنے لگو تو ایسے وضو کرو جیسے نماز کے لیے وضو کرتے ہو پھر اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر یہ دعا پڑھو: "اللهم أسلمت نفسی الیك ووجّهت وجهی الیك وفوضت أمری الیك وألجأت ظهری الیك رغبة ورهبة الیك، لاملجأولا منجا منك الاالیك، آمنت بكتابك الذی أنزلت وبنبیك الذی أرسلت." "(487) اے اللہ! میں نے اپنی ذات آپ کے سپرد کی، اپنا رخ آپ کی طرف پھیرا، اپنا معاملہ آپ کے حوالے کیا، خوشی اور خوف کی حالت میں اپنے آپ کو آپ کے سپرد کیا اور میں آپ کی نازل کردہ کتاب اور آپ کے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لایا۔" اگر تمہاری موت واقع ہوئی تو (دین) فطرت پر ہوگی اور اس کے بعد کوئی اور بات نہ کرو۔" میں نے عرض کی: "کیا میں "ورسولك الذی

أرسلت" کے الفاظ یاد کرلوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، بلکہ " و نبیك الذی أرسلت" ہی کہو۔"

"رسولك" کی جگہ "نبیك" کے لفظ کو ضروری قرار دینے سے رسول اللہ ﷺ کا جو مقصود تھا، وہ ہمیں سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ہم اس دعا کو انہی الفاظ کے ساتھ پڑھنے کے پابند ہیں۔

انسان جب آنکھیں بند کر کے سوتا ہے تو وہ خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے، جنہیں نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ نیند اور خواب کا نبوت کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے، جبکہ رسالت دل اور آنکھ کی بیداری کا تقاضا کرتی ہے۔ اس بارے میں جس قدر رسول اللہ ﷺ نے احتیاط اور حساس مزاجی کا مظاہرہ فرمایا، اسی قدر صحابہ کرام نے احادیث کی روایت میں احتیاط فرمائی۔

ب: مذاکرہ

صحابہ کرام نے صرف احادیث کی روایت و نقل پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ وہ ان کے معانی سمجھنے کے لیے ان کا آپس میں مذاکرہ بھی کرتے تھے، نیز جس طرح وہ خود ان کا مذاکرہ کرتے تھے اسی طرح اپنے شاگردوں سے بھی ان کا مذاکرہ کرنے کا کہتے تھے، مثلاً جلیل القدر صحابی رسول حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے: "حدیث کا آپس میں مذاکرہ کیا کرو، کیونکہ حدیث حدیث کا شوق دلاتی ہے۔"[488]

نیز جلیل القدر صحابی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "احادیث کو بار بار دہراؤ اور انہیں یاد کرو، کیونکہ اگر تم انہیں یاد نہ کرو گے تو بھول جاؤ گے۔ اگر کوئی شخص کوئی حدیث بیان کر چکا ہو تو یہ نہ کہے کہ میں اسے ایک مرتبہ بیان کر چکا ہوں (بلکہ اسے پھر بھی بیان کرتا رہے) کیونکہ جس نے اسے پہلے سن رکھا ہے، اس کے علم میں اضافہ ہوگا اور جس نے نہیں سنا وہ سن لے گا۔"[489] صحابہ کرام سنت اور حدیث کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی روشنی میں جانتے تھے کہ طالب علم سے خوش ہو کر فرشتے بھی اس کے لیے پر بچھاتے ہیں۔[490] یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام نے حدیث نبوی کی حفاظت، مذاکرے اور اسے آگے منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ ایسے ماحول میں حدیث کی حفاظت اور اسے ہم تک پہنچانے کا انتظام ہوا۔

۳- صحابہ کرام اور تابعین عظام کا ذوقِ تحقیق

آپس میں احادیث کے مذاکرے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام ہر نئے پیش آمدہ مسئلے کے بارے

میں احادیث تلاش کرتے تھے۔ وہ سنت اور حدیث کی تشریعی اہمیت کا ادراک رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ صدق واستقامت کے پیکر تھے، لیکن یہ بات ان کے اصحابِ تحقیق بننے سے مانع نہ تھی۔ وہ سنی سنائی باتوں کو کبھی قبول نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک عورت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنے پوتے کی میراث سے حصہ مانگنے کے لیے آئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''میں کتاب اللہ میں دادی کا (پوتے کی میراث میں) حق نہیں پاتا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے کوئی ایسا فیصلہ فرمایا ہے۔ میں لوگوں سے اس بارے میں پوچھوں گا۔'' چنانچہ انہوں نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ نے دادی کو چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تمہارے علاوہ اور کس نے یہ حدیث سنی ہے؟'' انہوں نے بتایا کہ محمد بن مسلمہ نے، چنانچہ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے اس عورت کو چھٹا حصہ دے دیا۔[491] ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہ جن کے بارے میں ایک ضعیف حدیث میں آتا ہے: ''اپنے دین کا نصف (علم) اس "حمیراء" (سفید رنگت والی خاتون) سے حاصل کرو۔''[491] بہت ذہین و فطین تھیں اور ہر چیز کے بارے میں سوالات اور تحقیق کرتی تھیں۔ حضرت ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اگر کسی ایسی چیز کے بارے میں سنتیں، جس کا انہیں علم نہ ہوتا تو اس وقت تک اس کی جستجو میں لگی رہتیں، جب تک اسے جان نہ لیتیں۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس سے حساب لیا گا وہ عذاب میں مبتلا ہو گیا۔'' اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: ''پھر ارشاد خداوندی ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَسِيرًا﴾ (الانشقاق: ۸) ''اس سے حساب آسان لیا جائیگا۔'' کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''یہ تو (حساب کا) صرف پیش ہونا ہے، لیکن جس سے حساب کے وقت پوچھ گچھ کی گئی وہ ہلاک ہو جائے گا۔''[493]

روایات کے بارے میں صحابہ کرام کے تحقیقی ذوق کا اندازہ ''سبعۃ احرف'' کے موضوع سے بھی ہوتا ہے۔ اس بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ذیل میں صحیح بخاری میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ذکر کی جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سورت فرقان اس سے مختلف انداز میں پڑھتے ہوئے سنا، جس کے مطابق میں پڑھتا تھا۔ یہ سورت خود رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکھائی تھی۔ قریب تھا کہ میں جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھتا، لیکن پھر میں نے انہیں (نماز سے) فارغ ہونے کی مہلت دی اور پھر ان کی چادر کو گریبان کے پاس سے

پکڑ کرانہیں رسول اللہﷺ کی خدمت میں لے گیا۔ میں نے عرض کی: ''میں نے انہیں اس سے مختلف طریقے کے مطابق تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے، جس کے مطابق آپ نے مجھے پڑھایا ہے۔'' رسول اللہﷺ نے مجھ سے کہا: ''اسے چھوڑ دو۔'' اور پھر ان سے کہا: ''پڑھو۔'' چنانچہ اس نے (وہ سورت) پڑھی۔ آپﷺ نے فرمایا: ''یہ (سورت) ایسے ہی نازل ہوئی ہے۔'' پھر آپﷺ نے مجھ سے پڑھنے کے لیے کہا، چنانچہ میں نے بھی (وہ سورت) پڑھی، جسے سن کر آپﷺ نے فرمایا: ''یہ (سورت) اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا ہے، لہٰذا ان میں سے جو آسان لگے اسے پڑھو۔''(494)

ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمایئے: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا کہ حضرت ابوموسیٰ گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے: ''میں نے حضرت عمر کے پاس حاضر ہونے کی تین مرتبہ اجازت طلب کی، لیکن انہوں نے اجازت نہ دی، جس کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔ بعد میں انہوں نے لوٹنے کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے تین مرتبہ اجازت طلب کی تھی، لیکن مجھے اجازت نہیں دی گئی، اس لئے میں لوٹ آیا۔ رسول اللہﷺ کا ارشاد ہے: ''جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے، لیکن اسے اجازت نہ ملے تو اسے لوٹ جانا چاہیے۔'' اس پر انہوں نے مجھ سے کہا: ''تمہیں اس حدیث پر گواہ پیش کرنا ہوگا۔'' کیا تم میں سے کسی نے یہ روایت سنی ہے؟'' ابی بن کعب نے فرمایا: یہاں موجود لوگوں میں سے سب سے کم عمر شخص تمہارے ساتھ جائے گا۔'' بخدا! سب سے کم سن میں ہی تھا، چنانچہ میں ان کے ہمراہ گیا اور حضرت عمر کو بتایا کہ نبی اکرمﷺ نے ایسے ہی ارشاد فرمایا تھا۔(495)

الف: تحقیق کی غرض سے سفر

صحابہ کرام حدیث مبارک کے بارے میں تحقیق کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق یا اسے سننے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے اور کئی کئی ایام کی طویل مسافتیں طے کرتے تھے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح جن کے سامنے بڑے بڑے علمائے کرام نے زانوئے تلمذ طے کیے، فرماتے ہیں کہ صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی حدیث کی تحقیق کرنی چاہی، جو انہوں نے نبی کریمﷺ سے سنی تھی اور ان کے علاوہ یہ حدیث سننے والوں میں سے صرف عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بقید حیات تھے، جو اس وقت مصر میں قیام پذیر تھے، چنانچہ انہوں نے پہلے سے معلوم حدیث کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے مصر کا سفر کیا۔

جب وہ مصر پہنچے تو مصر کے گورنر مسلمہ بن مخلد انصاری کے گھر آئے۔ جب انہیں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ جلدی سے باہر نکلے، ان سے بغل گیر ہوئے اور پوچھا: ''اے ابوایوب! آپ مصر کیسے تشریف لائے؟'' انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کی ایک ایسی حدیث ہے، جسے سننے والوں میں سے میرے اور عقبہ کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہیں رہا، لہٰذا ان کے گھر کا پتا بتانے کے لیے کسی کو میرے ساتھ بھیجئے۔'' چنانچہ انہوں نے عقبہ کے گھر کا پتا بتانے کے لیے ان کے ساتھ ایک آدمی بھیجا۔ جب حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ جلدی سے باہر نکلے ان سے معانقہ کیا اور مصر تشریف لانے کی غرض دریافت کی۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مومن کی پردہ پوشی کرنے کے بارے میں میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سنی تھی، جسے سننے والوں میں سے میرے اور تمہارے علاوہ کوئی زندہ نہیں رہا۔'' حضرت عقبہ نے فرمایا: ''ہاں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے دنیا میں کسی رسوائی کی بات میں کسی مؤمن کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔''[(496)] حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے ان کی تصدیق فرمائی اور پھر اپنی سواری کی طرف پلٹ کر اس پر سوار ہوئے اور مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت ابن مخلد کا بھیجا ہوا ہدیہ انہیں عریش مصر کے پاس ملا۔''[(497)]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے ایک صحابی رسول سے ایک حدیث پہنچی، جو اس نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی، لیکن میں نے نہیں سنی تھی، چنانچہ میں ایک ماہ کی مسافت طے کر کے شام آیا، یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ صحابی عبداللہ بن انیس ہیں۔ میں نے ان کی طرف پیغام بھیجا کہ جابر دروازے پر حاضر ہے۔ قاصد نے واپس آ کر پوچھا: ''کیا جابر بن عبداللہ؟'' میں نے کہا: ''ہاں۔'' یہ جان کر وہ باہر نکلے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے پھر میں نے کہا: ''مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے مظالم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے ایک ایسی حدیث سنی ہے، جو میں نے نہیں سنی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں (اسے سننے سے پہلے) میری یا آپ کی وفات نہ ہو جائے۔'' اس پر انہوں نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''لوگ (یا فرمایا بندے) ننگے، گونگے اور غیر مختون حالت میں (میدانِ محشر میں) جمع کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں پکاریں گے، جسے دور اور قریب والے ایک جیسا سنیں گے: ''میں بادشاہ اور حساب لینے والا ہوں۔ کوئی جنتی اس وقت تک جنت میں نہیں جائے گا، جب تک ایک دوزخی بھی اس پر کسی ظلم کا دعویدار ہو گا اور کوئی جہنمی اس وقت تک جہنم میں نہیں جائے گا، جب تک ایک جنتی بھی اس پر کسی ظلم حتی کہ ایک

تھپڑ کا دعویدار ہوگا اور اس سے بدلہ نہ لے لے۔'' میں نے عرض کی: ''یہ کیسے (ممکن) ہوگا، جبکہ ہم ننگے اور غیر مختون ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نیکیوں اور بدیوں کے ذریعے۔''(498)

ب: تابعین کرام کے علمی اسفار

تحصیل حدیث کے لیے اسفار کا سلسلہ صرف صحابہ کرام کے دور تک محدود نہ رہا، بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا، چنانچہ حضرت سعید بن مسیب ایک ایک حدیث کی خاطر کئی کئی دن کا سفر کرتے۔(499) مسروق بن اجدع ایک حرف (کی تحقیق) کے لیے بھی سفر کرتے۔(500) حضرت کثیر بن قیس سے مروی ہے: ''میں دمشق کی مسجد میں حضرت ابوالدرداء کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر ان سے کہا: ''اے ابوالدرداء! میں مدینہ یعنی شہر رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث کی خاطر آیا ہوں، جس کے بارے میں مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اسے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔'' حضرت ابوالدارداء نے پوچھا: ''تم تجارت کی غرض سے تو نہیں آئے؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔'' آپ نے پھر پوچھا: ''اس کے سوا کوئی اور غرض بھی نہیں؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔''(500)

صحابہ کرام نے احادیث کی روایت میں جس احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا، وہ تابعین کی طرف منتقل ہوگئی، جیسا کہ ہم عنقریب تفصیل سے بتائیں گے۔ حضرت اعمش کے الفاظ میں اس علم کو ایسے رجالِ کار نصیب ہوئے، جنہیں حدیث میں ایک واو، الف یا دال کا اضافہ کرنے کی بہ نسبت آسمان سے زمین پر پٹخ دیا جانا زیادہ پسند تھا۔(502) وہ اس بارے میں اس قدر حساس اور محتاط تھے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ میں ایک واو یا فاء کی تبدیلی بھی گوارہ نہ تھی۔

اگرچہ سارے صحابہ کرام عدول تھے اور ان میں سے کوئی بھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود تابعین حضرات جو احادیث سنتے، دوسرے صحابہ کرام کی طرف مراجعت کر کے ان کی تحقیق کرتے، مثلاً ابوالعالیہ جن کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے، کہتے ہیں: ''ہم بصرہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی طرف منسوب کوئی روایت سنتے، لیکن اس وقت تک راضی نہ ہوتے جب تک مدینے میں آکر خود ان کی زبان سے اسے نہ سن لیتے۔''(503)

امام مسلم ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں: ''پہلے محدثین سند کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، لیکن جب فتنہ برپا ہوا تو انہوں نے کہا: ''ہمارے سامنے راویوں کے نام لو، تاکہ دیکھا جائے کہ کون اہل السنّت میں سے ہے کہ اس کی حدیث لی جائے اور کون اہل بدعت میں سے ہے کہ اس کی حدیث

نہ لی جائے۔"(504) اس سے پتا چلتا ہے کہ ابتدائی دور میں محدثین سند یعنی رسول اللہ ﷺ سے حدیث کو روایت کرنے والوں کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، لیکن جب فتنوں کے سامنے سدِ اسکندری ثابت ہونے والے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے قتل اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آنے والے حوادث کے بعد فتنہ برپا ہوا تو ایک محدود دائرے میں وضعِ حدیث کا آغاز ہوا۔ اس دور میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت میں احادیث گھڑی گئیں، جس کے نتیجے میں بعض سادہ لوح لوگوں نے ان کے حق اور دفاع میں احادیث گھڑنا شروع کر دیں، جیسے شاید انہیں اس قسم کے دفاع کی ضرورت ہو۔ دوسری طرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مذمت میں گھڑی گئی احادیث کے جواب میں ان کی تعریف و توصیف میں احادیث گھڑی جانے لگیں، حالانکہ اس عظیم ہستی کو اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

جونہی موضوع احادیث کا ظہور ہوا، ائمہ حدیث نے "سند" کی تفتیش اور احادیث کی تحقیق شروع کر دی۔ شعبہ، شعبی اور ثوری رحمہم اللہ جیسے علماء احادیث کو قبول کرتے وقت بڑی باریک بینی سے تحقیق کرنے لگے۔ اس قسم کا ایک واقعہ ہمیں مجاہد بن جبر کی زبانی صحیح مسلم میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "بشیر عدوی حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور: "قال رسول اللہ ﷺ، قال رسول اللہ ﷺ" کہہ کہہ کر احادیث بیان کرنے لگا، لیکن حضرت ابن عباس نے اس کی احادیث کی طرف توجہ دی اور نہ اس کی طرف دیکھا، اس پر اس نے کہا: "اے ابن عباس! کیا وجہ ہے کہ آپ میری احادیث نہیں سن رہے؟ میں آپ کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث سنا رہا ہوں اور آپ انہیں سنتے ہی نہیں؟" حضرت ابن عباس نے جواب میں فرمایا: "ایک دور وہ تھا کہ جب ہم کسی شخص کو "قال رسول اللہ ﷺ" کہتے ہوئے سنتے تو اس کی طرف ہماری آنکھیں فوراً اٹھ جاتیں اور ہم اس کی بات غور سے سنتے، لیکن جب سے لوگ ہر اچھے اور برے راستے پر چل نکلے ہیں، ہم ان سے صرف وہی حدیث لیتے ہیں، جس کا ہمیں علم ہوتا ہے۔"(505)

اندلس کے عظیم عالم ابن عبد البر نے کبار تابعین میں سے حضرت شعبی کے واسطے سے ربیع بن خثیم سے درج ذیل حدیث روایت کی: "جس شخص نے "لاالہ الااللہ وحدہ لاشریك لہ لہ الملك ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو علی کل شیء قدیر" دس مرتبہ پڑھا، یہ اس کے لیے متعدد یا ایک غلام آزاد کرنے کی طرح ہے۔" شعبی کہتے ہیں کہ میں نے ربیع بن خثیم سے پوچھا: "آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے؟" انہوں نے کہا: "عمرو بن میمون نے۔" پھر میں عمر بن میمون سے ملا اور ان

سے پوچھا کہ انہیں یہ حدیث کس نے سنائی ہے۔انہوں نے کہا: ''عبدالرحمان بن ابی لیلی نے۔'' پھر میں ابن ابی لیلی سے ملا اور ان سے پوچھا کہ آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے۔انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کے صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے۔''(506) اس ساری بحث و تحقیق کے بعد حضرت شعبی کو اس حدیث کی صحت پر اطمینان ہوا۔

۴- وضع حدیث کے خلاف مہم

اسی دور میں وضعِ حدیث کے خلاف مہم اور اعلانِ جنگ کا آغاز ہوا۔ابن شہاب الزہری، ابن سیرین، سفیان الثوری، عامر بن شراحیل الشعبی، ابراہیم بن یزید نخعی، شعبہ، قتادہ بن دعامہ، ہشام دستوائی اور مسعر بن کدام ہلالی نے وضعِ حدیث اور احادیث گھڑنے والوں کے خلاف مہم کا آغاز کر کے صحیح احادیث کو موضوع احادیث سے جدا کرنے کا کام شروع کیا۔

جب ابوہلال، شعبہ اور سعید بن ابی صدقہ قتادہ بن دعامہ سے کوئی حدیث روایت کرتے اور اس کے الفاظ کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا تو وہ اس کا فیصلہ کرانے کے لیے ہشام دستوائی کی طرف مراجعت کرتے تھے،اسی طرح جب شعبہ اور ثوری کے درمیان اختلاف ہوتا تو وہ مسعر بن کدام ہلالی کی طرف رجوع کرتے تھے۔(507)

یہ علمائے کرام مسلکی تعصب رکھنے والوں پر نظر رکھتے اور جب انہیں ان میں سے کسی کی روایت پر شک گزرتا تو کھڑے ہو کر اس کا محاسبہ کرتے اور اس سے پوچھتے کہ اس نے یہ روایت کس سے سنی ہے۔

الف: حفظ احادیث کی ذمہ داری اور کردار

اس دور میں حفظ میں عبقری صلاحیت کی مالک ہستیاں بلاتوقف حفظ احادیث کا اہتمام کرتی رہیں۔ابوزرعہ رازی نے روایت کی ہے کہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو سند و متن اور صحت، حسن اور ضعف کے اعتبار سے دس لاکھ مختلف احادیث یاد تھیں(508) اپنی مشہورِ زمانہ مسند میں انہوں نے تین لاکھ احادیث میں سے چالیس ہزار احادیث کا انتخاب فرمایا۔ان چالیس ہزار احادیث میں مکررات اور وہ احادیث بھی شامل ہیں، جن کا اضافہ ان کے فرزند عبداللہ نے کیا تھا۔

یحیی بن معین نے تو اپنی ساری زندگی رسول اللہ ﷺ کی احادیث یاد کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی حتیٰ کہ انہیں موضوع احادیث بھی یاد تھیں۔ایک مرتبہ احمد بن حنبل نے ان سے معمر کے

''الجامع'' نامی صحیفے، جس میں اس نے ابان کے واسطے سے حضرت انس سے روایت کی ہے، کو اس کے موضوع ہونے کا علم ہونے کے باوجود لکھنے کی وجہ پوچھی، تو انہوں نے جواب میں فرمایا: ''اے ابوعبداللہ، خدا آپ پر رحم کرے! میں اس صحیفے کے موضوع ہونے کے علم کے باوجود اس لیے اسے عن عبدالرزاق عن معمر کی سند سے تحریر اور یاد کر رہا ہوں، تاکہ اس کے بعد کوئی شخص ابان کی جگہ ثابت کا نام لے کر اسے عن معمر عن ثابت عن انس بن مالک کی سند سے روایت نہ کر سکے اور اگر کسی نے ایسا کیا تو میں اسے کہہ سکوں گا کہ تم غلط بیانی کر رہے ہو۔ یہ عن معمر عن ابان کی سند سے مروی ہے نہ کہ عن ثابت کی سند سے۔ (509)

امام زہری سے لے کر یحییٰ بن سعید قطان تک اور امام بخاری و مسلم سے لے کر دارقطنی اور حاکم شہید تک حدیث کے سینکڑوں بڑے بڑے محققین اور حفاظ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ب: جذبۂ حق پرستی

جھوٹ اور دروغ گوئی کے خلاف کھڑے ہو کر اس کا خاتمہ کرنا، حق کی حمایت اور اس کے سوا کسی بات کو برداشت نہ کرنا ان حضرات کا شعار تھا، مثلاً ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبے کے دوران فرمایا: ''عورتوں کے مہروں کو مت بڑھاؤ۔ اگر مجھے پتا چلا کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ کے ادا کردہ مہر سے زیادہ مہر ادا کیا ہے یا کسی کو ادا کیا گیا ہے تو میں زیادتی کو بیت المال میں جمع کرا دوں گا۔'' جب وہ منبر سے اترے تو انہیں ایک قریشی عورت ملی، جس نے ان سے کہا: ''اے امیر المؤمنین! اللہ کی کتاب زیادہ لائقِ اتباع یا آپ کی بات؟'' حضرت عمر نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب، لیکن بات کیا ہے؟ اس عورت نے کہا: '' آپ نے لوگوں کو عورتوں کے مہروں کو بڑھانے سے منع کیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: ﴿وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئاً﴾ (النساء: ۲۰) ''اور پہلی عورت کو ڈھیر سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لینا۔'' یہ سن کر حضرت عمر نے دو یا تین مرتبہ فرمایا: ''ہر کوئی عمر سے زیادہ سمجھدار ہے۔'' آپ دوبارہ منبر کی طرف تشریف لے گئے اور لوگوں سے کہا: ''میں نے تمہیں عورتوں کے مہر بڑھانے سے منع کیا تھا، لیکن اب آدمی اپنے مال میں جیسے چاہے تصرف کرے۔'' (510)

بڑے بڑے تابعین کرام کا بھی یہی طرز عمل رہا ہے، مثلاً زید بن ابی انیسہ کہا کرتے تھے: ''میرے بھائی سے (احادیث) مت لو۔'' (511) ہوسکتا ہے اس کی وجہ ان کے بھائی کی عدم احتیاط،

وہم، مسلکی تعصب ہو یا کوئی اور وجہ ہو، جس کا ہمیں علم نہیں۔ جب امام علی بن مدینی جو امام بخاری و مسلم جیسے بہت سے محدثین کے استاد تھے اور انہوں نے سب سے پہلے صحابہ کرام کے حالات زندگی پر قلم اٹھایا، سے ان کے والد کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''ان کے بارے میں کسی اور سے پوچھو۔'' لیکن جب لوگوں نے دوبارہ پوچھا تو تھوڑی دیر سر جھکانے کے بعد انہوں نے سر اٹھایا اور فرمایا: ''یہ دین کا معاملہ ہے۔ وہ ضعیف (راوی) ہیں۔''(512)

امام وکیع بن جراح نے امام ابوحنیفہ کے مدرسے میں تربیت پائی اور امام شافعی نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی میں کوئی بات سننے کے بعد انہیں نہیں بھولی۔ امام شافعی اپنے قصیدے میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شكوت الى وكيع سوء حفظي فأرشدني الى ترك المعاصي

و أخبرني بأن العلم نور ونور الله لا يهدى لعاصي(513)

''میں نے امام وکیع سے اپنی یادداشت کی کمزوری کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہوں کو چھوڑنے کا مشورہ دیا اور مجھے بتایا کہ علم نور ہے اور اللہ کا نور کسی گنہگار کو نہیں دیا جاتا۔''

اس عظیم امام کے والد بیت المال کے نگران تھے، اس لیے جب وہ اپنے والد سے روایت کرتے تو ان کے ساتھ کسی اور کو بھی ملا لیتے،(514) کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے کہیں ان کے والد حکومت کی خاطر بعض عبارتوں میں تخفیف نہ کر دیں۔

ج: عللِ حدیث کے موضوع پر کتابیں

ان عظیم ہستیوں نے علل کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں احادیث کی سند اور متن کا دقتِ نظر سے تجزیہ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کمزور اور متروک یعنی ان راویوں پر بھی کتابیں لکھیں، جن سے احادیث روایت کرنا درست نہیں، بلکہ انہیں چھوڑنا ضروری ہے۔ انہوں نے عللِ الحدیث کی وضاحت اور اشاعت کی۔ وہ اس بارے میں اس قدر حساس تھے کہ ان میں سے ایک عالم سرکاری خزانے میں ملازمت کرنے والے اپنے باپ پر نظر رکھتے تھے کہ کہیں وہ حدیث کی روایات میں تحریف نہ کر دے۔ ایک دوسرے عالم کہتے ہیں کہ ان کے والد نے عمر کے فلاں حصے تک (ٹھیک ٹھیک) روایت حدیث کی ہے، لیکن بڑھاپے کے بعد چونکہ ان کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے، اس لیے انہوں نے (تحصیل حدیث کی غرض سے) آنے والوں کو ان سے ملنے سے روک دیا۔

ایک بڑے درجے کے محدث امام عبدالرحمان بن مہدی کہتے ہیں: ''میں نے شعبہ، ابن مبارک، ثوری اور مالک بن انس سے متہم بالکذب شخص کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ''اس (کے اس وصف) کی اشاعت کرو، کیونکہ یہ دین (کا معاملہ) ہے۔''(515) یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: ''میں نے سفیان ثوری، شعبہ، مالک اور ابن عیینہ سے حدیث میں ناقابل اعتبار شخص کے بارے میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص مجھ سے اس کے بارے میں پوچھے تو میں کیا کہوں تو انہوں نے کہا کہ تم اسے بتا دو کہ وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔''(516)

حضرت ابوبکر بن خلاد سے مروی ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے کہا: ''کیا آپ کو اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ جن لوگوں کی احادیث کو آپ نے چھوڑا ہے، وہ قیامت کے دن اللہ کے حضور آپ سے جھگڑا کریں گے؟'' انہوں نے جواب میں کہا: ''ان لوگوں کا جھگڑا کرنا مجھے زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے یہ کہہ کر جھگڑا کریں کہ تم نے میری حدیث کی جھوٹ سے حفاظت کیوں نہ کی۔''(517)

ہ: وضعِ حدیث

اگر چہ سنت کی تدوین انتہائی دقت نظر اور احتیاط سے ہوئی، لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جھوٹی احادیث بالکل وضع ہی نہیں ہوئیں۔ جھوٹی احادیث وضع کی گئیں، لیکن وہ صحابہ اور تابعین کی سخت نگرانی سے بچ نہ سکیں اور اگر کوئی بچ بھی نکلی تو مرورِ زمانہ سے اس کا جھوٹ سب پر واضح ہو گیا اور کتب صحاح میں شامل نہ ہو سکی۔ موضوع احادیث کا پتا چلانے کے لیے بہت سے طریقے ایجاد کیے گئے، جن میں بعض حسبِ ذیل ہیں:

ا۔ موضوع احادیث کی چھانٹی

الف: اعتراف

بسا اوقات احادیث وضع کرنے والا شخص اپنی زندگی کے آخر میں وفات سے پہلے یا غلط افکار سے توبہ کر کے اہل السنّت والجماعت کے مذہب کو اختیار کرنے کے بعد، اپنی وضع کردہ حدیث کا اعتراف کر لیتا تھا۔

ب: جھوٹوں کی نگرانی

اوپر ذکر کردہ طریقوں سے جھوٹوں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی، مثلاً اگر کوئی شخص زندگی میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولتا تو اس کی روایت کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ وہم اور نسیان کا شکار شخص خواہ سچا اور ثقہ ہی کیوں نہ ہوتا، اس کی حدیث قبول نہیں کی جاتی تھی۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ذکر کی جاتی ہے:

ابن ابی لہیعہ ایک زاہد اور متقی انسان تھے۔ سنن ابی داؤد (کی احادیث کی اسناد) میں ان کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔ وہ احادیث کی روایت اپنی یادداشت اور حفظ کی بجائے کتابوں سے دیکھ کر کرتے تھے، لیکن جب ان کی کتابیں گم ہو گئیں تو یک دم وہ اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھے اور اہل علم ان سے احادیث کی روایت کرنے سے احتراز کرنے لگے، مثلاً اس کے بعد امام بخاری ان سے صرف فتاوی اور وہ احادیث روایت کرنے لگے، جن کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی تھی۔

ج: اسلوب سے راہنمائی

سب جانتے ہیں کہ ادب میں اسلوب ایک مستقل موضوع ہے، مثلاً اگر کوئی شخص مولیر

(Moliere) کو تیس مرتبہ پڑھے، یا شیکسپیئر (Shakespear)، ٹالسٹائی (Tolstoi)، ڈانٹے (Dante)، نجیب فاضل، نورالدین طوبجو یا سزائی قرہ قوچ وغیرہ کو متعدد بار پڑھے تو وہ ان کے اسلوب کو دیکھ کر کتابوں کے ڈھیر میں سے ان کی کتابوں کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ اس کا تعلق کسی معین اسلوب کے ساتھ انس اور واقفیت پیدا ہونے سے ہے، جس کے لیے عام طور پر تیس مرتبہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، جبکہ دوسری طرف ائمہ حدیث جن میں سے بعض کے نام اوپر گزرے ہیں، نے اپنی ساری زندگی حدیث کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ماہرین لغت اور قوی یادداشت کے مالک بھی تھے، جس کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کے اسلوب سے اچھی طرح واقف تھے، کیونکہ ان کی صبح و شام اسی مشغلے میں گزرتی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو پہچان کر انہیں دوسروں کے کلام سے بآسانی علیحدہ کر سکتے تھے، کسی بھی تحریر کو دو ایک مرتبہ پڑھ کر وہ اس کے حدیث ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔

د: قرآن اور احادیث متواترہ بحیثیت معیار

بہت سے علمائے حدیث کے مطابق حدیث کی دو قسمیں ہیں: حدیث متواتر اور حدیث احاد۔ اگر حدیث کو روایت کرنے والے لوگ اتنے ہوں، جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا ممکن نہ ہو تو اسے ''حدیث متواتر'' کہتے ہیں۔ اہل السنّت کے نزدیک حدیث متواتر کا شمار علم کے تین ارکان میں ہوتا ہے۔ احادیث متواترہ کے سوا دیگر احادیث ''احادیث احاد'' کہلاتی ہیں، یعنی وہ احادیث جنہیں ایک راوی نے روایت کیا ہے۔ اگرچہ بعض احادیث صحابہ کرام کے دور میں احادیث احاد تھیں، لیکن تبع تابعین کے دور میں مشہور ہو گئیں، جس کی بنا پر انہیں ''احادیث مشہورہ'' کہا جانے لگا، تاہم بنیادی تقسیم حدیث متواتر اور حدیث احاد ہی ہے۔ احادیث احاد کو قرآن و سنت پر پرکھا جاتا ہے۔ اگر وہ ان دونوں سے ہم آہنگ ہوں تو انہیں قبول کر لیا جاتا ہے، ورنہ ان کا شمار ان احادیث میں ہوتا ہے، جن کے قابل اشکال ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں مزید بحث و تمحیص کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہ: زمان و مکان سے ماورا ملاقات

اگرچہ آئندہ سطور میں ہم جو کچھ کہنے والے ہیں اس کا تعلق اصولِ حدیث کے ساتھ نہیں ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ بعض ربانی حضرات نے زمان و مکان کی حدود کو پار کر کے رسول اللہ ﷺ سے بعض احادیث براہ راست حاصل کی ہیں، مثلاً محی الدین بن عربی کہتے ہیں کہ انہیں نے درج ذیل حدیث قدسی رسول اللہ ﷺ سے براہ راست حاصل کی ہے: ''میں نامعلوم خزانہ تھا۔ میں نے پہچانے

جانے کو پسند کیا، جس کے لئے میں نے مخلوق کو پیدا کر کے انہوں اپنی معرفت عطا کی، جس کے نتیجے میں انہوں نے مجھے پہچانا۔ (518) ہم اسے صحیح حدیث شمار کر سکتے ہیں اور نہ ہی یہ کتب صحاح میں سے کسی کتاب میں پائی جاتی ہے۔

عظیم امام جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالت بیداری میں کئی بار ملاقات کی ہے۔ امام بخاری بحث و تمحیص کے بعد اپنے تک پہنچنے والی احادیث میں سے کسی حدیث کو لکھنے سے پہلے وضو کر کے دو رکعات نماز پڑھتے اور دل سے رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر درخواست کرتے: ''یارسول اللہ! کیا یہ حدیث آپ ہی کی ہے؟'' اور پھر قلبی اشارے کے مطابق عمل کرتے۔ (519)

روح کے بعض پہلو زمان و مکان سے ماوراء ہیں۔ زمان و مکان سے متعلق ہمیں بہت کم علم ہے اور جن باتوں کا علم ہے وہ یقینی نہیں ہیں، مثلاً آئن اسٹائن (Einstein) مکان کے تین ابعاد کے علاوہ ایک چوتھے بعد کا بھی قائل تھا، لیکن علم طبیعات کے قوانین کی رو سے اس بات کو ابھی تک ثابت نہیں کیا جا سکا۔ بہت سے اولیائے کرام نے بھی اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ان کے زمان و مکان سے ماوراء احوال نظام کائنات کی باطنی تجلیات کی طرف مشیر ہوتے تھے۔

و: اسماء الرجال کے موضوع کی کتابیں

صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے حدیث کے راویوں کے حالات پر مفصل کتابیں لکھی گئیں، مثلاً وہ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں ہجرت کی؟ کہاں قیام پذیر ہوئے؟ کہاں زندگی کے ایام گزارے؟ کہاں ان کی وفات ہوئی؟ کہاں کہاں انہوں نے علوم کی اشاعت کی؟ کن کن لوگوں سے ملے؟ اور کن کن لوگوں سے علوم حاصل کیے وغیرہ تمام تفصیلات ان کتابوں میں موجود ہیں۔

علی بن مدینی نے سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "کتاب معرفة الصحابة" میں مکہ یا مدینہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں، مثلاً صحابہ کرام میں سے کون طائف اور شام گیا؟ کون کوفہ، بصرہ اور ماوراء النہر کے علاقے میں گیا؟ کون کہاں ٹھہرا؟ کن کن سے ملا اور کن کن لوگوں نے اس سے علم حاصل کیا وغیرہ۔ ذیل میں اس موضوع کی چند اہم کتابوں کے نام ذکر کیے جاتے ہیں:

= کتاب "الاستیعاب" ابن عبدالبر

= کتاب "الاصابة فی تمییز معرفة الصحابة"، ابن حجر

= کتاب " أسد الغابة فی معرفة الصحابة"، ابن الاثیر

= کتاب "الطبقات" ، ابن سعد

= کتاب " التاریخ" ابن عساکر

= کتاب "التاریخ"، البخاری

= کتاب " التاریخ الکبیر"، یحیی بن معین

ان میں سے بعض کتابوں میں تین ہزار، بعض میں پانچ ہزار اور بعض میں دس ہزار صحابہ کرام کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ علامہ ذہبی نے اپنی کتاب "الکاشف" میں جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بتایا ہے کہ اس نے کن کن لوگوں سے احادیث روایت کی ہیں اور اس سے کن کن لوگوں نے احادیث کی روایت کی ہے، لہٰذا ہم سلسلہ احادیث، احادیث روایت کرنے والوں اور جن سے احادیث روایت کی گئی ہیں، کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے سند کے پہلو سے احادیث کی درجہ بندی کر سکتے ہیں۔

ز: کتب حدیث کے بارے میں بحث وتمحیص

تاہم چونکہ تمام تر تحقیق وتمحیص اور احتیاط کے باوجود بعض موضوع احادیث کتب صحاح میں شامل ہو گئیں، اس لیے احادیث کو ایک مرتبہ پھر پرکھنے اور حقیقی جواہرات کو نقلی جواہرات سے جدا کرنے کے لیے متعدد کتابیں تحریر کی گئیں۔ سب سے پہلے مقدسی نے موضوع احادیث کو اپنی کتاب "التذکرة الکبری" میں جمع کیا۔ مقدسی اور اس موضوع پر لکھنے والے دیگر مؤلفین کا معیار اتنا سخت اور کڑا تھا کہ ابن الجوزی نے چالیس ہزار احادیث پر مشتمل مسند الامام احمد کی بعض احادیث پر وضع، ضعف اور ترک کا حکم لگایا اور ان کی درجہ بندی کی، حالانکہ امام احمد ان کے مسلک کے امام تھے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب "القول المسدد فی الذب عن مسند أحمد" میں جن احادیث پر ابن الجوزی نے وضع، ضعف یا ترک کا حکم لگایا تھا، ان کی از سر نو جانچ پرکھ کی اور اس تحقیق کے نتیجے میں انہوں نے مسند کی تیرہ احادیث جو کسی مضبوط سند سے ثابت نہ تھیں، کے سوا دوسری احادیث کی صحت دیگر طرق سے ثابت کی۔ میں یہاں قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ بہت سے محدثین ابن الجوزی پر تساہل اور غیر محتاط رویہ اختیار کرنے کا الزام لگاتے ہیں، کیونکہ انہوں نے بہت سی صحیح احادیث کو موضوع یا متروک قرار دیا ہے، اسی لیے خاتمة الحفاظ ابن حجر اور امام جلال الدین

سیوطی نے ابن الجوزی کی موضوع قراردی گئی احادیث کے بارے میں نئے سرے سے تحقیق کی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے ان احادیث میں کوئی بھی موضوع حدیث نہیں ملی، بلکہ ان میں صرف ضعیف احادیث ہیں۔ (520)علامہ سیوطی نے اپنی کتاب "الألیء المصنوعة" میں ابن الجوزی کی کتاب "الموضوعات الکبری" اوران کی موضوع قراردی گئی احادیث کی جانچ پرکھ کی اور بتایا کہ ان احادیث میں سے کون سی احادیث موضوع، کون سی متروک اور کون سی صحیح ہیں۔

ان کے علاوہ بعض مستدرکات بھی لکھی گئی ہیں، جن میں ایسی احادیث جمع کی گئی ہیں، جو امام بخاری ومسلم کے قائم کردہ معیار اور شرائط کے مطابق صحیح قرار پاتی ہیں، لیکن انہوں نے انہیں اپنی صحیحین میں ذکر نہیں کیا، بلکہ یہ دوسری کتابوں کے ضمن میں پائی جاتی ہیں۔ اس نوع کی سب سے مشہور کتاب حاکم نیشاپوری کی "المستدرك" ہے۔ اس کے بعد امام ذہبی کی مستدرک وجود میں آئی۔ امام ذہبی کے بارے میں ابن حجر لکھتے ہیں: ''میں عمر بھر ان کی شخصیت سے متاثر رہا۔ میں اپنے حافظے کی بہتری اور حافظ ذہبی جیسا حافظہ پانے کے لیے دعائیں لکھ کر نگل جاتا۔'' حافظ ذہبی نے بڑے اہتمام اور احتیاط کے ساتھ مستدرکِ حاکم کی احادیث کو جانچا اور ہر بات کی نئے سرے سے وضاحت کی۔

اس کے بعد عام لوگوں میں احادیث کی حیثیت سے مشہور اقوال سے متعلق بھی کتابیں لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں علامہ سخاوی نے اپنی مشہور کتاب "المقاصد الحسنة" اور علامہ عجلونی نے "کشف الخفاء" لکھی۔ ان دونوں حضرات نے ایسے اقوال کی تحقیق کی اور بتایا کہ ان میں سے کون کون سے اقوال احادیث ہیں اور کون کون سے اقوال احادیث نہیں ہیں۔ اگرچہ بہت سی احادیث علم کی ترغیب دیتی ہیں، لیکن ان دو حضرات کی تحقیق کے مطابق عوام میں مشہور ہو جانے والے بعض اقوال مثلاً "العلم من المهد الى اللحد" ''(تحصیل) علم گود سے گور تک ہے۔''، "اطلبوا العلم ولو بالصین" (521)''علم حاصل کرو، خواہ وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو۔'' اور "خیر الناس من ینفع الناس" (522)''لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا سب سے بہتر انسان ہے۔'' احادیث نہیں ہیں۔

کیا حدیث کی جمع وتدوین میں اس قدر احتیاط واہتمام اور بحث وتمحیص کے بعد کتب صحاح میں موجود احادیث کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے؟ کیا اب بھی دین اسلام کے دوسرے سرچشمے اور ماخذ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش قرین انصاف کہلائی جاسکتی ہے؟ اس قسم کی کوششوں کا کیا جواز فراہم کیا جاسکتا ہے؟

۲- موضوع احادیث کی چند مثالیں

اوپر ہم نے احادیث کی تدوین اور جانچ پرکھ کے بارے میں بڑے بڑے علمائے حدیث کی عظیم کاوشوں کا تذکرہ کیا ہے۔ان کاوشوں کے نتیجے میں ہمارے سامنے صحیح اور موضوع احادیث کے درمیان فرق واضح ہو چکا ہے۔سنت قرآن کریم کی تفسیر ہے اور حفاظت کے خدائی وعدے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر:۹) ''بے شک یہ کتابِ نصیحت ہم نے اتاری ہے اور یقیناً ہم اس کے نگہبان ہیں۔'' میں شامل ہے، لیکن اس سنت کو مستشرقین اور ان کے بعض پیروکاروں کی طرف سے حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔آئندہ سطور میں پہلے ہم موضوع احادیث کی چند مثالیں ذکر کریں گے اور پھر چند ایسی صحیح احادیث پیش کریں گے، جن کو بعض لوگوں نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ایک روایت "أبو حنيفة سراج أمتي"[523] حدیث کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔اگر چہ ابوحنیفہ بلاشبہ امت محمدیہ کے چراغ ہیں اور صحابہ کے بعد بہت تھوڑے لوگوں نے اسلام کی اتنی خدمت کی ہوگی جتنی انہوں نے کی ہے، لیکن یہ بات سید المرسلین ﷺ کی زبان مبارک سے نہیں نکلی، بلکہ مسلکی تعصب کا نتیجہ ہے۔

ایک دوسری مثال "اتخذوا الديك الأبيض"[524] ''سفید مرغ پالو۔'' ہے۔لوگ سفید مرغ کو پسند کرتے ہیں۔حدیث پرکھنے والوں نے اسے بعض جھوٹے راویوں کی من گھڑت حدیث قرار دیا ہے۔یہ حدیث نبوی نہیں ہے۔ممکن ہے کسی مرغ فروش نے اسے وضع کیا ہو۔

لوگوں میں مشہور ہے: "اتق شرّ من أحسنت اليه"[525] ''جس شخص پر تم نے احسان کیا ہو، اس کے شر سے بچو۔'' یہ قول نہ صرف یہ کہ حدیث نہیں ہے، بلکہ عقل و دانش کے بھی خلاف ہے۔اس قول کا برعکس "أحسن الى من اتقيت شرّه" ''جس کے شر سے تم بچنا چاہتے ہو، اس کے ساتھ احسان کرو۔'' عقل و دانش کے قریب تر ہے، کیونکہ احسان انسان کے دل کو نرم کرتا ہے۔

أحسن الى الناس تستعبد قلوبهم   فطا لما استعبد الانسان احسان

''لوگوں کے ساتھ احسان کرو، ان کے دل تمہارے غلام بن جائیں گے۔کتنی ہی بار احسان نے انسان کو غلام بنایا ہے۔''

ایک حکیمانہ قول بھی ہے:"الانسـان عبيـد الاحسـان" "انسان احسان کا بندہ ہے۔" تاہم پہلا قول تو سراسر جھوٹ ہے۔ اسے رسول اللہ ﷺ سے منسوب کرنا ممکن نہیں۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اوپر ذکر کردہ کلام جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، عقل و دانش سے متصادم ہے۔ اسلام عقل و دانش کا دین ہے۔ تاہم اسلام کا عقل و دانش کے مطابق ہونا اور بات ہے اور اس کا عقل و دانش پر مبنی ہونا اس سے بالکل مختلف بات ہے، کیونکہ اسلام انسانی سطح سے بلند تر حقیقت ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے انسانیت تک پہنچایا ہے۔ انسان کی ذمہ داری اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہے، لیکن محض عقل کے ذریعے اس حقیقت تک کبھی بھی نہیں پہنچا جا سکتا۔

یہ حقیقت ہے، لیکن اس کے باوجود بعض علمی مجالس اس صورت حال کو دوسرے رخ پر ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں، مثلاً وہ درج ذیل بات (یا اس کا مفہوم) رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں: "جب تم مجھ سے کوئی حدیث نقل کرو تو آپس میں مشورہ کرو۔ اگر وہ حق کے موافق ہو تو اس کی تصدیق کر کے اسے اپنے دین کی اساس بنالو۔ یہ بات اہم نہیں کہ میں نے وہ بات کہی ہے یا نہیں۔ اہم یہ ہے کہ وہ بات حق کے موافق ہو۔"

یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد قطعاً نہیں ہو سکتا، کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی حق کو جانتے اور اس کا تعین کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تو محض اس حق کو ہم تک پہنچاتے ہیں۔ حق لوگوں کے قائم کردہ معیاروں کے تابع ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان پیمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے لیے معیار ٹھہرایا جا سکتا ہے، بلکہ لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے افعال کو سنت نبویہ، یعنی آپ ﷺ کے اقوال و اعمال پر پرکھیں۔

ایک اور من گھڑت حدیث "ولـدت فـی زمـن الملك العادل" (526) "میں ایک منصف بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں۔" ہے

یہ حدیث ایرانی بادشاہ "نوشیرواں" کی تعریف میں گھڑی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی دوسرے شخص کی وجہ سے مدح کے محتاج نہیں، کیونکہ آپ کی وجہ سے زمان و مکان کو فخر اور خوشنمائی ملی ہے۔ ایسے مکرم رسول کے مرتبے میں کسی انصاف پسند بادشاہ کے دور میں پیدا ہونے سے اضافہ نہیں ہو سکتا۔

لوگوں میں ایک قول "الـنـظـافة مـن الايمـان" (527) "صفائی ایمان کا حصہ ہے۔" مشہور ہے

اور عام طور پر منبروں پر حدیث نبوی کے طور پر سنایا جاتا ہے، لیکن یہ اگر چہ عقل ودانش کے خلاف نہیں، لیکن حدیث نہیں ہے۔ مفہوم کے صحیح ہونے کے باوجود یہ حدیث نہیں ہے۔ اس کا مفہوم اس لیے صحیح ہے کہ ایک صحیح حدیث میں ہے: ''طہارت نصف ایمان ہے اور ''الحمد للہ'' (کالفظ) میزان کو (ثواب سے) بھر دیتا ہے۔''(528)

غلط فہمی پیدا کرنے والا ایک اور قول ''تختموا بالعقیق''(529) ''عقیق کی انگوٹھی پہنو۔'' اس قسم کی بات رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں نکلی، تاہم ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک دوسری حدیث میں ہے: ''تخيّموا بالعقيق'' یعنی ''عقیق میں خیمے نصب کرو۔'' عقیق مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک وادی ہے۔ ابتدائی دور میں چونکہ تحریر نقطوں سے خالی ہوتی تھی، اس لیے راویوں سے ''تخیموا'' کالفظ ''تختموا'' میں بدل گیا، نیز انہوں نے وادی عقیق کو غلطی سے عقیق پتھر سمجھا اور پھر اس کے آخر میں ایک اور جھوٹ شامل کر دیا: ''فانه ينفي الفقر''(530) ''کیونکہ یہ فقر کو ختم کرتا ہے۔''

ایک من گھڑت حدیث ''النظرة الى وجه جميل عبادة''(531) ''خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔'' یہ قول جھوٹ، گمراہی اور انحراف پر مشتمل ہے۔ ''اطلبوا العلم ولو بالصين'' بھی ارشاد نبوی نہیں ہے، بلکہ من گھڑت حدیث ہے۔ اسے وضع کرنے والوں کی غرض اسلام میں حصول علم کے اہتمام کا اظہار تھی، لیکن قرآن کریم اور سنت مطہرہ میں علم کی اس قدر ترغیب موجود ہے کہ ہمیں کاہنوں کے کلام کی طرح کے مسجع اقوال کی ضرورت نہیں، مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر: ۲۸) ''اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں، جو صاحب علم ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر: ۹) ''بھلا جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں۔'' ایک صحیح حدیث میں ہے: ''فرشتے طالب علم سے خوش ہو کر اس کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں۔''(532) اس قسم کی دسیوں آیات مبارکہ اور احادیث صحیحہ کے ہوتے ہوئے ہمیں اس قسم کے من گھڑت اقوال کی قطعاً ضرورت نہیں۔

و: وضع سے متہم صحیح احادیث

ایک طرف اوپر ذکر کردہ احادیث سمجھے جانے والے زبان زد خاص و عام اقوال کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھتی، بلکہ بعض اوقات انہیں تقریر و تحریر میں موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے تو دوسری طرف بعض لوگ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر صحاحِ ستہ کی کتابوں میں موجود بہت سی احادیث مبارکہ کو وضع سے متہم قرار دیتے ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- تورات کی بشارت

ان احادیث میں سے صحیح بخاری میں وارد درج ذیل حدیث ہے۔''تورات میں ہے:
یاأیهاالنبی اناأرسلناك شاهداً و مبشراً و نذیراً و حرزاللأمیین،أنت عبدی و رسولی،سمّیتك المتوکّل، لیس بفظ و لاغلیظ و لاسخّاب فی الأسواق،و لایدفع بالسیئة السیئة،ولکن یعفو و یغفر و لن یقبضه الله حتیٰ یقیم به الملة العوجاء بأن یقولوا لااله الاالله" (533) ''اے نبی، بے شک ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، (عذاب الٰہی) سے ڈرانے والا اور امی لوگوں کی حفاظت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے۔ وہ نبی نہ تو سخت مزاج اور بداخلاق ہوگا اور نہ ہی بازاروں میں شور و غل کرنے والا۔ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا، بلکہ عفو و درگزر سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک اس کے ذریعے سے ایک بگڑی ہوئی قوم کی زبانوں سے ''لااله الاالله'' کہلوا کر اسے درست نہ فرمادیں۔''

بعض مستشرقین اور عالم اسلام میں ان کے پیرکاروں نے اس حدیث پر تنقید کرتے ہوئے ایسے موضوع قرار دیا ہے۔ اور اس کی سادہ سی وجہ اس کے راویوں میں حضرت عبداللہ عمرو بن عاص، حضرت انس، حضرت ابوہریرہ اور کعب احبار کا ہونا بیان کی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی صفات، کسی تاریخی واقعے یا قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ اوصاف سے متصادم کوئی بات نہیں، پھر ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ موجودہ تورات اور انجیل اپنی تمام تر تحریفات کے باوجود رسول اللہ ﷺ سے متعلق متعدد بشارتوں اور اشارات سے بھری پڑی ہیں۔ قرآن کریم اہل کتاب میں سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے بارے

میں کہتا ہے: ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ﴾ (الأعراف: ۱۵۷) ''وہ لوگ جو اس رسول یعنی نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات وانجیل میں پاتے ہیں۔''

نیز سورت فتح کے آخر میں کہتا ہے: ﴿ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ﴾ (الفتح: ۲۹) ''ان کے یہی اوصاف تورات میں ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم خود ہمیں بتاتا ہے کہ تورات اور انجیل رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، حتیٰ کہ علامہ حسین الجسری نے تورات اور انجیل کے موجودہ نسخوں میں رسول اللہ ﷺ سے متعلق ایک سو چودہ اشارات کی نشاندہی ہے۔ اس قدر تحریف وتبدیلی کے باوجود بشارات کی اتنی کثرت دیکھ کر انسان حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، نیز ان شاء اللہ ایک دن آئے گا، جب تحقیقات سے انجیل برناباس کی صحت کی تائید ہوگی، جس میں ہم اپنے رسول ﷺ کا نام صراحتہً موجود پاتے ہیں۔ بلاشبہ اپنے بعد آنے والے رسول کے نام کی بشارت دینا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اہم ترین فرائض میں شامل تھا۔

نیز دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی اکثریت کا تعلق مشرکین، نصاریٰ اور یہودیوں میں سے کسی نہ کسی سے تھا۔ کعب احبار بھی مسلمان ہونے سے پہلے یہودی تھے۔ ان کے بارے میں دورِ حاضر کے مفکر لکھتے ہیں: ''ان کے اسلام لانے کے بعد ان کی معلومات بھی مسلمان ہوگئی تھیں۔''(534)

وہ بعض ایسے مواقع پر جن کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہوتے، بعض اسرائیلیات روایت کرتے تھے، لیکن وہ قرآن وسنت کے معارض نہیں ہوتی تھیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے وہ اسلام کے خلاف تعصب رکھنے والے دشمن نہ تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت میں ان کے ملوث ہونے کا الزام کئی صدیوں بعد گھڑی جانے والی تہمت ہے۔ ابن عباس، ابو ہریرہ، انس بن مالک اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم جیسے بڑے بڑے صحابہ ان کی روایات سنتے اور وہ انہیں تورات کی بعض خبریں بتاتے تھے، لیکن انہوں نے کبھی جھوٹ بولا اور نہ ہی ان صحابہ کرام سے ایسا ممکن تھا۔ جھوٹ بولنے کا خیال تو انہیں خواب میں بھی نہیں آتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلا جواز اور بغیر سوچے سمجھے سطحی قسم کے ملاحظات کی بنیاد پر صحیح احادیث اور انہیں روایت کرنے والے بڑے بڑے صحابہ کرام پر جھوٹ بولنے کے الزام لگانے، خصوصاً جبکہ اس بارے میں تاریخی واقعات وشواہد

بالکل واضح ہیں، کا مقصد اسلام کے دوسرے رکن سنت نبویہ کے مقام کرگرانے کے سوا کچھ نہیں۔

۲- وسیلہ

اعتراض کا نشانہ بننے والی دوسری صحیح حدیث حضرت انس سے مروی ہے، جس کے مطابق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قحط سالی کے دوران حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے ان کے وسیلے سے بارش کے لئے درج ذیل دعا مانگی: ''اے اللہ! ہم اپنے نبی ﷺ کے وسیلے سے آپ سے دعا مانگتے تھے اور آپ ہمیں بارش عطا کرتے تھے۔ اب ہم اپنے نبی کے چچا کے وسیلے سے دعا مانگتے ہیں۔ ہمیں بارش عطا فرمایئے۔'' جس کے نتیجے میں ان پر بارش ہوئی۔(535)

اس حدیث پر ابن ابی الدنیا کی کتاب اور جاحظ کی کتاب ''البیان والتبیین'' میں اعتراض کیا گیا ہے۔ جاحظ معتزلہ کے امام ''نظّام'' جو بہت سی صحیح احادیث کے انکار اور اپنے مادہ پرستانہ نظریات کی وجہ سے معروف تھا، کا شاگرد تھا۔ جاحظ اپنی اس کتاب میں لکھتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ استسقاء میں کافی اضطراب پایا جاتا ہے، کیونکہ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے منبر پر دعا مانگی اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ نماز کے بعد پیش آیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جاحظ محدث نہ تھا حدیث کے ساتھ اس کا تعلق ایک آدمی سے زیادہ نہ تھا اور ابن ابی الدنیا کے متقی ہونے کے باوجود بہت سے محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کی کتاب بہت سے جھوٹوں اور غلطیوں پر مشتمل ہے، لہٰذا ایسے لوگوں پر اعتماد کرتے ہوئے کسی حدیث پر کیسے کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ امام غزالی نے فلاں حدیث روایت کی ہے تو لوگ اس پر ہنسیں گے، کیونکہ وہ عظیم اور ممتاز اسلامی مفکر ہونے کے باوجود محدث نہ تھے، حتیٰ کہ علم حدیث کے مجدد سمجھے جانے والے زین الدین عراقی نے کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں وارد احادیث پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے صحیح، حسن اور ضعیف احادیث کی نشاندہی کی ہے۔

طبیب سے انجینئرنگ اور کیمیادان سے علم طب کی معلومات نہیں پوچھی جاتیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث پر اعتراض کسی مضبوط یا علمی بنیاد پر قائم نہیں۔

دوسرے وسیلہ کوئی اجنبی یا ناپسندیدہ بات نہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَیْهِ الْوَسِیلَةَ﴾ (المائدة: ۳۵) ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کا قرب تلاش کرتے رہو۔'' صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ سے دعا کی درخواست کرتے تھے، جس

کی بنیاد وسیلہ ہی تھی، مثلاً ایک دن ایک بدو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور قحط کی شکایت کر کے بارش کی دعا کی درخواست کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ بلند کر کے دعا فرمائی: ''اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما۔'' تھوڑی ہی دیر میں بادل جمع ہو کر گرجنے لگے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کئی دن تک جاری رہی یہاں تک کہ لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث بن گئی، چنانچہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور بارش کے تھمنے کی دعا کرنے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تو بارش تھم گئی اور بادل مدینے کے اوپر سے تاج کی مانند چھٹ گئے۔ لوگ سورج کی دھوپ میں اپنے گھروں کو واپس گئے۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور آپ نے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ ارشاد فرمایا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں اور میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔''(536)

صحیح احادیث میں تین شخصوں کے ایک غار میں پھنس جانے اور اس مشکل سے نکلنے کے لیے ان میں سے ہر ایک کے اپنے نیک اعمال کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کا واقعہ مذکور ہے۔ ان میں سے ایک نے اپنے والدین کے ساتھ اپنے حسنِ سلوک کا ذکر کیا، دوسرے نے خوفِ خدا کے باعث اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ بدکاری سے باز رہنے کا تذکرہ کیا اور تیسرے نے ایک ایسے شخص کی اجرت کی سرمایہ کاری کرنے کا تذکرہ کیا، جس سے اس نے کام لیا تھا، لیکن اس کی اجرت اس کے حوالے نہ کر سکا تھا، تاہم اس کے ساتھ دوبارہ ملاقات کے وقت اس نے اس کی اجرت سے حاصل ہونے والا منافع اس کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ان نیک اعمال کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے اس تنگی سے نجات پانے کی دعا کی۔(537) نیز رسول اللہ ﷺ کے دور میں بعض لوگوں نے وسیلے کے ذریعے دعا مانگی اور رسول اللہ ﷺ نے اس عمل پر خاموشی اختیار کر کے اس کی تائید فرمائی، مثلاً ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے نابیناپن کی شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے سکھایا کہ وہ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور پھر اللہ تعالیٰ سے درج ذیل دعا مانگے: ''اے اللہ! میں آپ کے نبی، نبیِ رحمت محمد (ﷺ) کے وسیلے سے آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمد! میں آپ کے وسیلے سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری حاجت برائی کی جائے۔ اے اللہ! میرے حق میں ان کی شفاعت کو قبول فرما۔'' جونہی اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایات پر عملدرآمد کیا اس کا نابیناپن ختم ہو گیا اور وہ دیکھنے لگا۔(538)

جب قرآن ہمیں اللہ کی طرف وسیلہ تلاش کرنے کا کہتا ہے، رسول اللہ ﷺ قرآن کو وسیلہ بنانے کا ہمیں حکم دیتے ہیں اور اپنی ذات اور نیک اعمال کو وسیلہ بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔(539) تو اس

میں کون سا انوکھا پن پایا جاتا ہے؟ اور یہ لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بارش کی دعا کے وقت وسیلہ اختیار کرنے کو کیوں ناپسند کرتے ہیں؟ ایسا طرز عمل سنت کے خلاف سرکشی اور اس کی نافرمانی کے سوا کچھ نہیں۔

۳- کتے کا جوٹھا برتن

بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حنبل کی روایت کردہ ایک دوسری حدیث کو مستشرقین اور ان کے پیروکاروں نے محض اس لیے رد کیا ہے کہ وہ ان کے فہم سے بالاتر ہے یا اس لیے کہ اس کے راوی ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر اور انس رضی اللہ عنہم ہیں۔ وہ حدیث حسبِ ذیل ہے: ''جب برتن کو کتا چاٹ جائے تو اس کی پاکی کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات بار دھویا جائے، جن میں سے پہلی مرتبہ مٹی استعمال کی جائے۔''(540) ایک دوسری روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ''جب تم میں سے کسی کے برتن سے کتا پی جائے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہیے۔''(541)

حدیث میں وارد لفظ ''سبع'' سے سات کا عدد بھی مراد ہوسکتا ہے اور کثرت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ حنفی مسلک کے فقہاء کے نزدیک نظافت کے لیے تین مرتبہ دھونا کافی ہے۔

اس حدیث شریف کے معانی پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہ علامات نبوت میں سے ایک علامت ہے۔ صرف دورِ حاضر میں ہی کتوں کی انسانوں کی طرف منتقل ہونے والی بیماریوں کی دریافت ہوئی ہے۔ صحت کی حفاظت کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں کتے اور انسان دونوں کے جسم میں زندہ رہ سکنے والے بعض جراثیم اور وائرس کی وجہ سے انسانوں اور کتوں کی درمیان پائی جانے والی مشترکہ بیماریوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ حدیث نبوی معجزہ ہے اور اس پر علمی مجلات میں متعدد مضامین لکھے جاچکے ہیں۔

۴- حدیث ذباب (مکھی)

گزشتہ حدیث سے ملتی جلتی ایک دوسری حدیث پر بھی تنقید کی گئی ہے، حتی کہ اس پر تنقید کرنے والوں میں موریس بوکائے (Maurice Bucaille) بھی شامل ہے، جس کی کتابوں کا ہم بڑے اہتمام سے ترجمہ کرارہے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں نے اس حدیث کو غفلت یا جہالت کے سبب قبول کیا ہے۔ درحقیقت اس اعتراض کا سبب اس کی سند میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے راویوں کا ہونا اور مستشرقین اور ان کے پیروکاروں کی ناکامی و نامرادی ہے۔ وہ حدیث حسب ذیل

ہے: ”جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر پڑے تو اسے مکمل طور پر ڈبو کر نکال لو۔“ [542] اس حدیث پر سند کے حوالے سے تنقید کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اسے روایت کرنے والوں میں بخاری، ابوداؤد، نسائی، دارمی اور ابن حنبل جیسے حضرات شامل ہیں۔ صحابہ کرام اور امت کی طرف سے اسے تلقی بالقبول حاصل ہے اور آج تک علمائے حدیث میں سے کسی نے بھی اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔

سب سے پہلے معتزلی ائمہ نے اس پر اس وقت تک کی علمی معلومات کے خلاف ہونے کی بنا پر اعتراض کیا۔ ان کے بعد مستشرقین اور بیسویں صدی کے سائنسدانوں نے بھی اس کو تنقید کا نشانہ بنایا، حالانکہ یہ حدیث بذاتِ خود ایک معجزہ ہے، کیونکہ اس میں نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے مکھی کے جراثیم منتقل کرنے کی صلاحیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ حدیث کا بقیہ حصہ یوں ہے: ”کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا اور دوسرے میں بیماری ہوتی ہے۔“

جب مکھی کسی جگہ بیٹھنے کا ارادہ کرتی ہے تو وہ بڑی احتیاط سے اپنا ایک پر استعمال کرتی ہے، وہ بہت کم ہی کسی ایسی جگہ مثلاً شہد وغیرہ پر بیٹھتی ہے، جہاں سے پھر اڑ نہ سکے۔ اس کے چھوٹے سے دماغ کی ساخت و پرداخت کچھ ایسی ہوتی ہے، جس سے اس کے حیاتیاتی نظام میں آسانی پیدا ہوتی ہے، لیکن یہی مکھی جب کسی انسان کے چہرے یا کھانے پر بیٹھتی ہے تو ٹائی فائیڈ، ہیضہ اور پیچس (Dysntery) جیسی متعدد بیماریوں کے منتقل ہونے کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکھی کے ایک پر میں بیماری اور دوسرے میں شفا ہونے کا انکشاف کر کے سائنس کو بھی کئی صدیاں پیچھے چھوڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جس حقیقت کو چند الفاظ میں تعبیر کیا تھا سائنس نے دورِ حاضر میں اس کا انکشاف کیا ہے۔ امت مسلمہ کی طرف سے چودہ صدیوں سے تلقی بالقبول پانے والی اس حدیث کو محض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے راویوں میں شامل ہونے یا عقل کے اسے پوری طرح نہ سمجھ پانے کی وجہ سے مسترد کرنا ایک ایسا جلد بازی کا فیصلہ ہے، جو سائنس سے میل کھاتا ہے اور نہ حقیقت پسندی سے۔

بیک وقت بیماری اور شفا کے حامل ہونے کا وصف صرف مکھی تک ہی محدود نہیں، بلکہ یہ بات بچھو اور شہد کی مکھی میں بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ اگر کسی شخص کو بچھو ڈنک مار دے تو لوگ بچھو کو مار کر پیستے ہیں اور پھر جہاں اس نے ڈنک مارا ہوتا ہے، اسے رکھ دیتے ہیں، جس سے مریض کو شفا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شہد کی مکھی میں جہاں شہد پیدا ہوتا ہے وہیں زہر بھی بنتا ہے۔

۵- تین مساجد کی طرف رخت سفر باندھنا

ایک اور صحیح حدیث کو اس بنیاد پر ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کہ اس سے سنت کے اصولوں پر زد پڑتی ہے اور اسے صحابہ نے کعب احبار سے روایت کیا ہے، جس نے شاید یہودی ہونے کی وجہ سے مسجد اقصیٰ کو اس قدر مقدس قرار دیا ہے۔ وہ حدیث حسب ذیل ہے: ''تین مساجد یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے سوا کسی طرف رخت سفر نہ باندھا جائے۔''(543) بعض روایات میں مسجد اقصیٰ کا ذکر مسجد نبوی سے پہلے ملتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کی تعریف پر کسی بھی مؤمن کو ناگواری محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ قرآن کریم اس مسجد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿بَارَكْنَا حَوْلَهُ﴾ (الاسراء: ۱) ''جس کے چاروں طرف ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔'' معراج کی رات یہیں سے آپ ﷺ کی معراج کا آغاز ہوا اور یہیں آپ ﷺ نے انبیائے کرام کی ارواح کو امامت کرائی۔ مسجد اقصیٰ یہودیوں کی عبادت گاہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین مبین ''اسلام'' کی بالادستی کی علامت ہے۔ مسجد اقصیٰ جس مبارک خطۂ ارض پر واقع ہے، اسے اولوالعزم رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نوجوان ساتھی یوشع بن نون نے اس وقت فتح کیا، جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی جماعت میں پختگی پیدا ہو چکی ہے اور وہ اس کام کے لیے تیار ہے۔ اس کے بعد اس بابرکت قطعۂ ارض کی فتح کی سعادت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عظیم اسلامی قائد صلاح الدین ایوبی کے حصے میں آئی اور ان شاء اللہ مستقبل قریب میں اس کی آخری فتح ربانیین کے نصیب میں آئے گی۔ مسجد اقصیٰ ایک رمز ہے۔ اسے کھونا روحانی شکست ہے اور اس کی نئے سرے سے فتح اسلام کی بازیافت ہوگی۔ جب مسجد اقصیٰ کو قرآن کریم میں خصوصی اہمیت اور مقام حاصل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس اہمیت اور مقام کو بیان فرمایا ہے تو اس حدیث کو جھٹلانے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ باقی اسے مسجد نبوی پر ترجیح دیئے جانے پر بحث ومناقشہ کیا جاسکتا ہے۔ مسجد اقصیٰ اور اس جیسی دیگر جگہوں کے لیے کوئی خصوصی عبادت مقرر نہیں ہے۔ عبادات کے لیے وقت اور جگہ کے انتخاب کا حق صرف شارع کو حاصل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت نے نذر مانی کی اگر اسے بیماری سے شفا نصیب ہوئی تو وہ مسجد اقصیٰ میں جا کر نماز پڑھے گی، چنانچہ وہ صحت یاب ہوئی تو سفر کی تیار کرنے لگی اور سفر پر روانگی سے تھوڑی دیر پہلے ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ حضرت میمونہ نے اس سے کہا: ''بیٹھو اور جو کھانا میں نے تیار کیا ہے اسے کھاؤ اور پھر مسجد نبوی میں جا کر نماز ادا کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اس میں ادا کی گئی ایک نماز مسجد کعبہ کے سوا دیگر مساجد میں ادا کی گئی ہزار نمازوں سے افضل ہے۔''(544)

جب تک اللہ تعالیٰ عبادت واطاعت کے لیے کسی خاص وقت یا جگہ کی تخصیص نہ کریں، اس وقت تک نماز کسی بھی جگہ ادا کی جاسکتی ہے، لہٰذا اگر کسی نے یہاں قربانی پیش کرنے کی نذر مانی تو وہ کسی اور جگہ بھی قربانی کا جانور ذبح کرسکتا ہے اور اگر اس نے کسی اور جگہ قربانی پیش کرنے کی نذر مانی تو وہ یہاں بھی اپنی منت پوری کرسکتا ہے۔ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مسجد نبوی کی اہمیت اور فضیلت کو بیان کرنا بھی ضروری خیال کیا، تاہم بعض فقہائے کرام نے اس عمومی قاعدے سے مسجد حرام کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، کیونکہ وہ بعض خصوصیات مثلاً اس میں ہمہ وقت نماز پڑھے جانے کے امکان اور نماز کے ساتھ ساتھ اس کے گرد طواف کئے جاسکنے کی حامل ہے، اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی مسجد حرام میں قربانی پیش کرنے کی منت مانے تو وہیں پر منت کو پورا کرنا اس پر ضروری ہوگا، تاہم اس فقہی مسئلے اور ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد سے مسجد اقصیٰ کے مقام میں کمی ہوتی ہے اور نہ اس کی قدر و منزلت میں۔

٦- حق پرست گروہ

ایک اور جھٹلائی جانے والی صحیح حدیث سے اسے جھٹلانے والوں کی گراوٹ کا اندازہ ہوتا ہے، وہ حدیث حسبِ ذیل ہے: ''میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر قائم رہے گا ان کا ساتھ چھوڑنے والوں سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔''(545)

اس حدیث کی مخالفت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ چودہ صدیوں پر محیط اسلامی تاریخ میں کبھی ایسا دور نہیں آیا، جس میں اسلام دنیا اور دلوں سے مٹ گیا ہو اور کوئی اس کی مدد و نصرت کے لیے نہ آیا ہو۔ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا، جس میں کوئی نہ کوئی گروہ اسلام کی خاطر سرگرم عمل نہ رہا ہو۔ ماضی کو چھوڑیئے بیسویں صدی کو ہی لے لیجئے، جس میں دین اور اہل دین پر سب سے زیادہ یلغار ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود دین کو صفحہ ہستی سے مٹایا نہیں جاسکا، لہٰذا اس حدیث کا کون سا پہلو تشفی بخش نہیں ہے؟ سوشلزم نے اپنے ملک سے دین کو دیس نکالا دینے کی کوشش کی اور اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے اس کے خلاف خونریز جنگ کا آغاز کیا، لیکن ان سوشلسٹ ممالک میں بھی دین کے لیے اپنی جانیں وقف کرنے والے ہمیشہ موجود رہے ہیں، بلکہ اتنے سالوں تک کفر کے گندے جوہڑ میں رہنے والی انسانیت اب اس سے نکلنے کے راستے اور کسی نجات دہندہ کی تلاش میں ہے، لیکن اسے دین خصوصاً دین اسلام کے سوا کہیں نجات نہیں ملے گی، کیونکہ دین اسلام ایک ایسی خدائی شمع ہے، جسے پھونکوں سے نہیں بجھایا جاسکتا۔

حدیث میں وارد لفظ ''الجماعۃ'' کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔امام بخاری کہتے ہیں اس سے اہل شام مراد ہیں، (546) کیونکہ ان کے دور میں شام علم کا مرکز تھا۔خلافت کے شام سے بغداد منتقل ہونے کے باوجود شام کی علمی مرکزیت کئی صدیوں تک برقرار رہی۔امام اوزاعی، لیث بن سعد اور امام مالک جیسے اساطینِ علم اپنے طلبہ کو شام بھیجتے، تاکہ وہ وہاں امراء کا قرب حاصل کر کے علم کی اشاعت کریں۔

بعض حضرات کے نزدیک ''الجماعۃ'' سے مراد محدثین ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مفسرین مراد ہیں۔بہرکیف! اگر ہم حدیث میں وارد لفظ ''الجماعۃ'' کو کسی خاص دور یا گروہ تک محدود رکھنے سے گریز کریں تو زیادہ بہتر اور حدیث کے مفہوم سے قریب تر ہوگا۔حاصل یہ کہ یہ جماعت ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے۔کبھی شام میں اور کبھی کہیں اور، کبھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے گرد تو کبھی امام غزالی کے گرد۔کبھی شیخ احمد سرہندی کے ساتھ تو کبھی بغداد میں مولانا خالد بغدادی کے ہمراہ اور کبھی کسی اور کی معیت میں، غرض اہم بات یہ ہے کہ یہ جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ موجود رہے گی۔

۷- نیند سے بیدار ہو کر ہاتھ دھونا

ایک اور حدیث اسے نہ سمجھ سکنے والوں کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنی۔وہ حدیث حسب ذیل ہے: ''جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو جب تک اپنے ہاتھ تین مرتبہ نہ دھو لے اس وقت انہیں برتن میں نہ ڈالے، کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس اس کا ہاتھ رات کو کہاں رہا یا کہاں کہاں پھرتا رہا۔'' (547)

''فجر الاسلام'' اور ''ضحیٰ الاسلام'' کے مصنف احمد امین نے یہ کہتے ہوئے اس حدیث کا مذاق اڑایا ہے: ''کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پھرتا رہا ہے؟'' ابوریہ اور ان سب کے استاذ گولڈزیہر (Goldziher) نے بھی اس کا مذاق اڑایا ہے، لیکن کیا واقعی انسان جانتا ہے کہ رات کے وقت اس کا ہاتھ کہاں کہاں پھرتا رہا ہے؟ میری رائے میں حفظانِ صحت کے اصولوں کے پہلو سے یہ حدیث ایک ایسے معجزے پر مشتمل ہے، جس نے زمانے کو پیچھے چھوڑ کر بہت سے اہم حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔

بعض اوقات انسان الرجی یا کسی جلدی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور رات کے وقت لاعلمی میں اپنے جسم کے بعض حصوں کو کھجاتا ہے۔جدید علم طب کے مطابق ناخنوں کے نیچے لاکھوں جراثیم پائے جاتے ہیں، لہٰذا کیا ایسے انسان کے لیے جس کے آلودہ ناخنوں کے نیچے جراثیم موجود ہوں، صبح ناشتے کے وقت کھانے یا پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنا درست ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا کر کے وہ جراثیم کو اپنے جسم کے قریب لانے کا باعث نہ بنے گا؟

لہٰذا آغاز سے آج تک امت کی طرف سے تلقی بالقبول پانے والی ایک ایسی حدیث جو نہ صرف یہ کہ سائنس سے متصادم نہیں، بلکہ اس کے مطابق اور موافق ہے کو محض اس لیے مسترد کرنا کہ بعض مستشرقین اور عالم اسلامی میں ان کے بعض مغرب زدہ پیروکاروں کو اسے روایت کرنے والے صحابہ کرام پسند نہیں یا ان مستشرقین کے دور میں علمی سطح اس حدیث کے صحیح فہم کے لیے ناکافی تھی، کیسے درست ہو سکتا ہے؟

۸- معراج کی رات نبی کریم ﷺ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ملاقات

جن احادیث کو بعض لوگوں نے مسترد کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے، جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے معراج کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی اور انہوں نے آپ ﷺ کو ابتدا میں دن میں پچاس مرتبہ فرض ہونے والی نماز کے اوقات کو پانچ تک کم کرانے کا مشورہ دیا۔(548) حالانکہ اس حدیث کو صحاحِ ستہ اور دیگر کتب حدیث کے مضبوط ترین راویوں نے روایت کیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے یہ ملاقات تھی مشورہ نہ تھا اور اگر رسول اللہ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشورہ بھی فرماتے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ ہوتی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی یہ پہلی معراج تھی، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک معزز نبی کی حیثیت سے اس عالم میں ایک عرصے سے قیام پذیر تھے پھر رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ادب و احترام کا نمونہ تھے اور ہمیشہ اپنی امت کے لیے آسانی پیدا کرنے کی جستجو میں رہتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آپ ﷺ کی ملاقات کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے، نیز اگر اسے مشورہ بھی سمجھا جائے تو آپ ﷺ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشاورت بنی اسرائیل اور یہودیوں کے ساتھ نفسیاتی اور معاشرتی سطح پر ماحول کو خوشگوار بنانے میں بڑی اہمیت کی حامل تھی، مزید برآں رسول اللہ ﷺ نے تمام انبیائے کرام کی تصدیق فرمائی۔ یہ ملاقات بھی اسی حقیقت کی آئینہ دار تھی۔ آپ ﷺ نے تمام انبیائے کرام کی اتنی عمدہ طریقے سے تصدیق فرمائی کہ آپ نے اپنے آپ کو پہلے انبیائے کرام پر ترجیح دیئے جانے یا ان کے عدم احترام کی اجازت نہیں دی اور جب کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تنقید کی تو آپ ﷺ نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے فرمایا: ''مجھے موسیٰ علیہ السلام پر ترجیح مت دو، کیونکہ لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے۔ جب میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا تو موسیٰ علیہ السلام کو عرش کا کنارہ پکڑے ہوئے دیکھوں گا۔ مجھے نہیں معلوم ہوگا کہ آیا وہ بھی بے ہوش ہوئے تھے اور پھر مجھ سے پہلے ہوش

میں آ گئے یا وہ ان لوگوں میں سے تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔"(549) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دفاع فرمایا ہے۔

مزید برآں چونکہ ہمیں مکان کے تمام ابعاد کا علم نہیں، اس لیے تمام واقعات کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کون سے بعد میں ہوئے ہیں، مثلاً مسند امام احمد حنبل، صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ وغیرہ بہت سی کتب صحاح میں تمیم داری جو اسلام قبول کرنے سے پہلے نصرانی تھے، سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں انہوں نے ایک جزیرے میں جساسہ اور دجال کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔ کیا اس قسم کی حدیث کا محض اس دعوے کی بنیاد پر انکار کیا جا سکتا ہے کہ تمیم داری اسلام قبول کرنے سے پہلے نصرانی تھے اور انہوں نے یہ بات نصرانیت سے لی ہے؟ کیا اسے ناممکن قرار دے کر مسترد کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسے ماورائی کیفیت (Transcendent) میں کسی کو دیکھنے کے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اسے صرف اسی پہلو سے دیکھنا چاہیے، کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ تمیم داری کے ساتھ یہ واقعہ مکان کے کون سے بعد میں پیش آیا تھا۔

نزولِ مسیح علیہ السلام خواہ اس کی حقیقت کچھ بھی ہو، سے متعلق بہت سی احادیث ہیں۔(550) کیا ہمیں ایسی تمام احادیث کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ یہ عیسائیوں کی وضع کردہ ہیں؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسولوں میں سے نہ تھے، جن کی نبوت پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی آمد کی بشارت سنائی تھی۔ حضرت ابراہیم، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی طرح وہ بھی ہمارے نبی ہیں۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ٹیلی پیتھی (Telepathy)، تحضیر ارواح، ہپناٹزم اور ٹیلی فون کے ذریعے تو دور دراز اور زیر آب مخاطبت کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اوپر ذکر کردہ واقعات جن کے بعد کا ہمیں علم بھی نہیں کو ناقابل قبول سمجھا جاتا ہے نیز قاضی عیاض کی "الشفاء"، ابو نعیم اصفہانی کی "الدلائل" اور ابن کثیر کی 'الشمائل' جیسی معتبر کتابوں میں "شق صدر" سے متعلق وارد حدیث کو محض بنیاد پر ناقابل قبول تصور کیا جاتا ہے کہ عقل اور تجربی علوم کی روشنی میں اس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں اس قسم کی صحیح احادیث کا انکار کر کے سنت کو پامال کرنے کی کوششیں کرنے والے فنا ہو جائیں گے، لیکن سنت ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ز: احادیث کی تعداد کے بڑھنے کے عوامل

بعض مستشرقین اور عالم اسلام میں ان کے پیروکاروں نے احادیث کی کثرت اور بعض صحابہ کرام کے زیادہ احادیث روایت کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ ان تمام احادیث کے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے صادر ہونے کو ناممکن سمجھتے ہیں، جس سے ان کا مقصد صحیح احادیث اور سنت نبویہ سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنا ہوتا ہے۔

۱- حدیث کی اہمیت

اس قسم کے خیالات کا کسی مضبوط اساس پر مبنی نہ ہونا بالکل واضح ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، دین اسلام اور مسلمان کی زندگی میں حدیث نبوی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام کو ہمہ وقت اس بات کا احساس رہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ جواہرات کا مالک اپنے جواہرات کی اس قدر حفاظت نہیں کرتا، جس قدر حفاظت صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہونٹوں سے نکلنے والے ایک ایک لفظ اور آپ ﷺ کے ایک ایک عمل اور حرکت کی کرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان میں دنیا وآخرت کی سعادت کا راز مضمر ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے رسول اللہ ﷺ کے ایک ایک لفظ، طرز عمل اور تقریر کا مذاکرہ کرتے اور اسے اپنی یادداشت میں محفوظ کر کے اپنا دستور حیات بناتے۔

تئیس سال تک انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تمام حرکات وسکنات کا قریب سے مشاہدہ کیا اور اپنی زندگی کے ایک ایک مرحلے اور موڑ پر ان کی پیروی کی۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے ان کی دنیوی واخروی زندگی کے ہر ایک معاملے کی قابل فہم انداز میں وضاحت فرماتے تھے۔ ابوزید عمرو بن اخطب کہتے ہیں: ''(ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور نماز ظہر تک ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا، پھر آپ ﷺ اترے نماز ظہر پڑھی اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور نماز عصر تک خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر آپ اترے نماز پڑھی اور پھر منبر پر تشریف لے جا کر غروب آفتاب تک خطبہ ارشا فرمایا۔ اس دوران آپ ﷺ نے ماضی ومستقبل کی بہت سے باتیں ہمیں بتائیں۔ جس نے جتنی باتیں یاد رکھیں وہ اتنا زیادہ صاحب علم کہلایا۔''(551)

صحابہ کرام تئیس سال تک آپ ﷺ کی باتوں کو یاد کرتے رہے۔ وہ آپ ﷺ کے ارشادات کے مطابق آپ کی سنت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔(552) آپ ﷺ صحابہ کے سامنے نماز

ادا کر کے فرماتے "جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو، ویسے نماز پڑھو۔"(553) آپ ﷺ نے صحابہ کے ہمراہ حج کیا اور ان سے فرمایا: "مجھ سے حج کے احکامات سیکھو۔"(554) لہٰذا صحابہ کرام کا آپ ﷺ کے ایک ایک لفظ اور حرکت کی پوری احتیاط سے پیروی کرنا، انہیں یاد کر کے اپنا دستور حیات بنانا اور پھر انہیں آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرنا بالکل فطری بات تھی۔

صحابہ کرام نے نہ صرف احادیث کو یاد کیا، بلکہ انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا کر آگے منتقل کیا، کیونکہ ان کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ آپ ﷺ کا ہر ہر لفظ اور طرز عمل جنت کا راستہ ہے۔ ہمارا بھی یہی ایمان ہے۔ وہ آپ ﷺ کے ساتھ دل کی گہرائی سے محبت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف آپ ﷺ کی احادیث یاد کرتے، بلکہ آپ ﷺ کے ایک ایک بال کی بھی حفاظت کرتے اور اس سلسلے میں ان کے درمیان مسابقت ہوتی، کیونکہ وہ آپ ﷺ کی ایک ایک چیز سے برکت حاصل کرتے اور اسے اپنی عزیز ترین یادگار سمجھتے۔ یوں لگتا جیسے وہ غیب یا عالم لامحدود سے آئی ہو۔ ذاتی طور پر میرا یہ تجربہ ہے کہ جن بعض ہستیوں کی میں تعظیم کرتا تھا ان کی کوئی تعریفی یا تنبیہی، ترغیبی یا ترھیبی بات تمام تر حوادث زمانہ کے باوجود میں نہیں بھولا اور میں سمجھتا ہوں شاید ہر مسلمان کی یہی کیفیت ہے۔

۲- ذہنوں پر نقوش چھوڑنے والی یادیں

جب کوئی مسلمان اپنے بعض قابل احترام علماء کے ارشادات کو نہیں بھول سکتا اور انہیں اپنی زندگی کی عزیز ترین یادگار کے طور پر محفوظ رکھتا ہے، حالانکہ یہ علماء رسول اللہ ﷺ کے در پر غلام کی حیثیت سے کھڑے ہونے کی تمنا کرتے ہیں، تو بھلا صحابہ کرام جو اخلاق کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، سے کیسے ممکن تھا کہ وہ حضرت مصطفیٰ ﷺ کی گفتگو کے جواہرات کو فراموش کر دیتے، حالانکہ آپ ﷺ نے انہیں تاریکی سے روشنی اور جہالت و وحشی پن سے علم کی طرف لا کر زمانے بھر کا استاد و مربی بنا دیا تھا۔ یہ محال تھا، انہوں نے آپ ﷺ کی باتوں کو فراموش نہیں کیا۔ جب آپ لوگ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک کے بالوں کو دیکھنے کے لیے مسابقت اور بھیڑ کرتے ہو تو صحابہ کرام آپ ﷺ کے اتنے مقرب ہو کر آپ ﷺ کی یادوں کو کیسے حقیر سمجھ سکتے تھے؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا موزہ مبارک اس اندیشے سے کہ کوئی ان سے چھین نہ لے اپنے سینے کے ساتھ مضبوطی سے لگا کر رکھتے۔ جب امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سنا کہ شام میں ایک شخص کے پاس رسول اللہ ﷺ کا جبہ مبارک محفوظ ہے تو انہوں نے اس کے وزن

کے برابر سونا دے کر اسے حاصل کیا۔لوگوں نے کئی سال تک آپ ﷺ کے مشکیزے کو محفوظ رکھا۔ آپ ﷺ کی کمان، تیر اور بعض دوسری اشیاء تو آج بھی توپ کاپے کے محل میں محفوظ ہیں اور ہمارے دلوں کے سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہیں۔جب سلطان سلیم اول نے یہ مقدس امانتیں منگوائیں تو انہیں توپ کاپے میں رکھا اور قراء کو مقرر کیا، جو ان تبرکات کے پاس بلاتوقف صبح وشام قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔یہ معمول کچھ سال پہلے تک جاری رہا۔[555] ہمارے ہاں بہت سے عمر رسیدہ حضرات اس معمول سے واقف ہیں۔تین براعظموں پر پھیلی ہوئی سلطنت عثمانیہ کے حکمران سلطان احمد کی یہ تمنا تھی کہ کاش ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کے مٹی میں محفوظ نقش پا کو اپنے سر پر تاج کے طور پر سجانا ممکن ہوتا، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے: ''میری یہ دلی آرزو ہے کہ میں آپ ﷺ کے مبارک قدموں کے نقش کو اپنے سر پر سجاؤں۔''

جب صدیوں بعد آنے والے لوگ آپ ﷺ کی یادگاروں کی اس قدر تعظیم کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے والے صحابہ کرام سے آپ کی یادگاروں کے بارے میں غفلت برتنا کیسے ممکن ہوسکتا تھا؟ پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ مؤمن کی زندگی میں آپ ﷺ کی یادگار سمجھی جانے والی چیزوں کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی، جتنی کہ سنت کی ہوتی ہے۔جب آپ ﷺ کے مبارک تبرکات کی اس قدر حفاظت کی جاتی ہے تو آپ ﷺ کی احادیث اور سنتوں کی کس قدر حفاظت کی جاتی ہوگی؟

امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے راستے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کا پرنالہ گرتا تھا۔(ایک روز) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن اپنے کپڑے پہنے۔اس روز حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لیے دو چوزے ذبح کیے گئے تھے۔جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پرنالے کے پاس پہنچے تو چوزوں کے خون والا پانی پرنالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر گرا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پرنالے کو اکھیڑنے کا حکم دیا اور واپس جا کر وہ کپڑے اتارے اور دوسرے کپڑے پہن کر مسجد آئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔بعد میں حضرت عباس نے ان سے کہا: ''بخدا! اسے اس جگہ پر نبی کریم ﷺ نے نصب کیا تھا، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ تم میری پشت پر کھڑے ہو کر اسے اسی جگہ پر لگاؤ، جہاں رسول اللہ ﷺ نے اسے نصب کیا تھا۔'' چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا۔[556]

لہٰذا وہ جماعت جو رسول اللہ ﷺ کی معمولی سی یادگار کے ساتھ اس قدر احترام اور تعظیم کا برتاؤ کرتی تھی، اس سے آپ ﷺ کی احادیث کے بارے میں تھوڑی سی بھی غفلت کا مظاہرہ کیسے

ہوسکتا تھا؟ حدیث دین کا دوسرا نام ہے۔اسی سے زندگی ہے۔صوفیائے کرام کے الفاظ میں یہی ''حقیقت احمدیہ'' ہے اور ہمارے لیے دنیوی و اخروی زندگی کے درمیان پل ہے۔

۳- نبی اکرم ﷺ کی تحصیل علم کی ترغیب

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا نبی اکرم ﷺ نے حصول علم کا شوق اور رغبت دلائی ہے، مثلاً آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شخص حصول علم کے لیے کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلا دیتے ہیں۔فرشتے طالب علم سے خوش ہو کر اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔عالم کے لیے زمین و آسمان کی مخلوقات حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی استغفار کرتی ہیں۔عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے، جیسی چودھویں رات کے چاند کو ستاروں پر حاصل ہوتی ہے۔علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے، بلکہ علم چھوڑتے ہیں، لہٰذا جس نے علم حاصل کیا اس نے بہت بڑا حصہ حاصل کیا۔''(557) رسول اللہ ﷺ اپنے پیروکاروں میں بلند اہداف و آفاق تک پہنچنے کا ذوق و شوق پیدا فرماتے تھے۔آج سوائے چند استثناءات کے علم مناصب کے حصول اور کسب معاش کے لیے حاصل کیا جاتا ہے، لیکن اس دور میں اس کے حصول کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہوتا تھا۔ اس دور میں علمی زندگی اس قدر فعال اور متحرک تھی کہ سفیان بن عیینہ نے چار سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا، سات سال کی عمر میں حدیث لکھنا شروع کی اور بالکل نوجوان تھے کہ افتاء و اجتہاد کے مقام پر پہنچ گئے۔(558) نیز جیسے کہ ہم نے پہلے وضاحت کی احادیث کے مذاکرے کا بہت زیادہ شوق اور ترغیب دی جاتی تھی۔دارمی کی روایت کے مطابق حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے: ''حدیث کا آپس میں مذاکرہ کیا کرو، کیونکہ حدیث حدیث کا شوق دلاتی ہے۔''(559) 'احادیث کو بار بار دہراؤ اور انہیں یاد کرو، کیونکہ اگر تم انہیں یاد نہ کرو گے تو بھول جاؤ گے۔اگر کوئی شخص کوئی حدیث بیان کر چکا ہو تو یہ نہ کہے کہ میں اسے ایک مرتبہ بیان کر چکا ہوں (بلکہ اسے پھر بھی بیان کرتا رہے) کیونکہ جس نے اسے پہلے سن رکھا ہے، اس کے علم میں اضافہ ہوگا اور جس نے نہیں سنا وہ سن لے گا۔''(560)

یہ علمی سرگرمیاں نہ صرف تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جاری رہیں، بلکہ پہلی پانچ صدیوں میں ان کا سلسلہ اس زور و شور سے جاری رہا کہ آج سے تقریباً پانچ صدیاں پہلے گزرنے والے حافظ ابن حجر جنہیں خاتمۃ الحفاظ سمجھا جاتا ہے، کہا کرتے تھے کہ انہوں نے صحیح مسلم کو چند مجلسوں میں پڑھا، یعنی امام مسلم کی ''الجامع الصحیح'' کو چند مجلسوں میں زبانی یاد کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان

کے دل قرآن وسنت کے علوم کی محبت سے لبریز تھے وہ انہیں عبادت کے جذبے اور لذت سے حاصل کرتے تھے۔ یہ علمی مزاج چار پانچ صدیوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ امام نووی علم میں ایسے مشغول ہوئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو علم کے لیے وقف کر دیا اور اس اندیشے سے کہ معاش اور خاندان کی ضروریات انہیں علم کی تحصیل سے غافل نہ کر دیں، انہوں نے شادی ہی نہیں کی۔(561) عظیم عالم علامہ سرخسی نے تیس جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب "المبسوط" کنویں میں بیٹھ کر اپنے طلبہ کو یاداشت سے املاء کرائی۔ ان کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ ان کے ایک شاگرد نے ایک دن ان سے کہا کہ امام شافعی کو تین سو کتابیں یاد تھیں۔ یہ سن کر اس عظیم عالم نے کہا: "اس کا مطلب ہے انہیں میری یاداشت کی صرف زکوۃ (چالیسواں حصہ) یاد تھی۔"(562) اگر میں ابن حجر، ابن جریر، سیوطی اور فخر الدین رازی وغیرہ جیسے علمائے کرام کی تحریروں کے صفحات گننے لگوں تو ایک پورے ہفتے میں بھی انہیں نہ گن سکوں گا۔

اوپر ہم نے جن حضرات کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق کسی قدر بعد کے ادوار سے تھا، لیکن اگر ہم صحابہ کرام اور تابعین کے دور کا جائزہ لیں تو درج ذیل منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

۴۔ ہماری فکر کے آفاق سے ماوراء شوقِ علم

محمد بن سیرین رسول اللہ ﷺ کی دس سال تک خدمت کرنے والے معزز صحابی حضرت انس بن مالک کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کا شمار کبار تابعین میں ہوتا تھا۔ ان کا ایک بیٹا تھا، جس کا نام انہوں نے اپنے آقا کے نام پر انس بن سیرین رکھا تھا۔ انس بن سیرین کہتے ہیں کہ جب وہ کوفہ پہنچے تو انہوں نے اس کی جامع مساجد میں چار ہزار طلبہ کو علم حدیث کی تحصیل میں مشغول پایا۔(563) ذرا تصور کیجئے کہ صرف ایک شہر میں علم حدیث کے چار ہزار طلبہ موجود تھے۔ شام میں صرف حضرت ابوالدرداء کے حلقے میں پندرہ سو طالب علم شریک تھے۔ اوپر انس بن سیرین نے جن چار ہزار طلبہ کا ذکر کیا ہے، ان میں چار سو فقہاء بھی تھے۔(564) چار سو فقہاء کا پایا جانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آج عالم اسلامی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ارب ہے، لیکن ان میں چار سو فقہاء بھی موجود نہیں ہیں۔ فقیہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کتاب وسنت اور اجماع کے ذریعے دینی احکام کا استنباط کر سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی اور امام مالک میں سے ہر ایک فقیہ تھا، لیکن امام احمد حنبل جنہیں دس لاکھ احادیث یاد تھیں(565) پر فقیہ کا اطلاق دشوار ہے۔ جب ابوجعفر طبری نے کہا تھا کہ احمد بن حنبل فقیہ نہیں ہیں تو حنابلہ نے ان کے گھر پر سنگ باری کی تھی۔ ممکن ہے احمد بن حنبل فقیہ ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ

نہ ہوں، لیکن علامہ طبری کی یہ بات اس طرف ضرور مشیر ہے کہ کسی پر فقیہ کا اطلاق کرنا کس قدر دشوار ہے، لہٰذا تابعین کے دور میں کوفہ کی جامع مساجد میں علم حدیث کے چار ہزار طلبہ میں سے چار سو کا فقیہ ہونا اس پہلو سے بڑی فکر انگیز بات ہے۔

اس دور میں شوقِ علم عروج پر تھا۔ وہ ایک ایک حدیث کی خاطر ایک شہر سے دوسرے شہر تک سفر کرتے تھے۔ ائمہ حدیث کا ایک ایک حدیث کی خاطر رختِ سفر باندھنا ان کے ہاں حدیث کی اہمیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی ذوق وشوق اور حدیث کے بارے میں ان کے اہتمام نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اس علم پر غیر معمولی دسترس پیدا کردی تھی۔ یہ دسترس صرف حدیث کے متون تک ہی نہ محدود تھی، بلکہ سند پر بھی محیط تھی۔ کسی بھی حدیث کا درجہ صحت معلوم کرنے کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

اس بارے میں مثال کے طور پر ہم امام بخاری کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ جب وہ بغداد آئے تو حدیث کا شغف رکھنے والے دس حضرات نے عوام کے جم غفیر کے سامنے علم حدیث میں امام بخاری کے مقام کو جانچنا اور ان کی قوت یاداشت کو معلوم کرنا چاہا۔ ان میں سے ہر ایک نے امام بخاری کے سامنے دس احادیث پڑھیں، لیکن انہوں نے اسناد کو بالکل بدل دیا، راویوں کی جگہوں میں تبدیلی کی یعنی ایک حدیث کے راویوں کو دوسری حدیث کے راویوں کی جگہ رکھ دیا اور اس طرح ایک سو احادیث کے راویوں کو خلط ملط کردیا۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ نیت سے متعلق مشہور حدیث کے راوی الحمیدی عن سفیان بن عیینة عن یحییٰ بن سعید الأنصاری عن محمد بن ابراهیم التیمی عن علقمة بن وقاص اللیثی عن عمر بن الخطاب ہیں، لیکن انہوں نے جب یہ حدیث امام بخاری کے سامنے پڑھی تو یحییٰ بن سعید کی جگہ کسی اور راوی کا نام رکھ دیا، علقمہ کی جگہ کسی دوسرے راوی کا نام ذکر کردیا اور التیمی کے نام کو کسی اور راوی کے نام سے بدل دیا۔ غرض انہوں نے راویوں کے نام بدل کر سو احادیث امام بخاری کے سامنے پیش کیں۔ امام بخاری نے انہیں بتایا کہ پہلی حدیث میں راوی کا نام یہ نہیں ہے، بلکہ فلاں ہے اور اس کی صحیح سند یوں ہے یہاں تک انہوں نے ساری سو کی سو احادیث کی صحیح اسناد پڑھ کر سنادیں۔ یہ دیکھ کر تمام علماء اور حاضرین نے ان کی قوت یاداشت اور علم حدیث میں رسوخ کا اعتراف کر لیا۔[566] ابن خزیمہ تو امام بخاری کے حدیث کے بارے میں علم سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ لکھتے ہیں: ''آسمان کی چھت کے نیچے حدیث کے بارے میں بخاری سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہیں۔[567]

امام بخاری جلیل القدر عالم تھے۔ انہوں نے اپنے علم کو دنیا کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ جب امیر بخاری نے ان سے چاہا کہ وہ اس کے محل میں آکر اس کے بیٹوں کو علم حدیث کی تعلیم دیں تو اس

جلیل القدر عالم نے اس سے کہا: ''علم حاکم کے پاس نہیں جاتا، بلکہ اگر حاکم یا اس کے بچے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس کے لیے علم کے پاس آئیں۔'' اور جب گورنر نے ان سے کم از کم ایک دن اپنے بیٹوں کے لیے مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ سبق پڑھاتے ہوئے گورنر اور امت مسلمہ کے بچوں میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اسی جواب کے نتیجے میں انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام تنہائی میں گزارنے پڑے اور ان کی وفات حالت مسافرت میں ہوئی۔ (568)

ایک دفعہ امام بخاری نے کسی شخص سے حدیث حاصل کرنے کے لیے سفر کیا، لیکن جب وہ اس شخص کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گھوڑے کو پکڑنے کے لیے اپنی جھولی کی طرف اشارہ کر رہا ہے، لیکن جب امام بخاری نے دیکھا کہ اس کی جھولی خالی ہے اور اس میں جو وغیرہ قسم کی کوئی چیز نہیں ہے تو انہوں نے کہا: ''جو شخص گھوڑے سے جھوٹ بولتا ہے اور سے دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے، وہ لوگوں سے بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔'' لہٰذا وہ اس سے حدیث لیے بغیر واپس لوٹ آئے۔

اس دقت نظر اور احتیاط سے حدیث کی تدوین ہوئی۔ جو لوگ صحیح احادیث اور سنت کی کتابوں پر اعتراض کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ چونکہ احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے ضرور موضوع احادیث کتب صحاح میں شامل ہوئی ہیں، دراصل وہ احادیث کو جمع کرنے والوں کے علمی عشق، ان کے نزدیک سنت کے مقام اور سنت کی تدوین کرنے والے علماء کی نوعیت سے ناواقف ہیں اور جن حالات میں اور جن شرائط کے تحت حدیث کی تدوین ہوئی انہیں فراموش کر دیتے ہیں۔ بظاہر وہ اس صورتحال کو اپنی نفسیاتی، روحانی اور معنوی حالت پر قیاس کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

۵- ماحول کی مناسبت

صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں حفاظت حدیث کا ایک اور اہم محرک فضا کا حفظ حدیث کے لیے انتہائی سازگار ہونا ہے۔ وہ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف تھے۔ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن سب سے پہلے لغت کے اعتبار سے معجزہ تھا۔ زبان کی فصاحت بہت اہم سمجھی جاتی تھی اور اس دور کے عرب اس کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ ''سبع معلقات'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب کے کیسے شہسوار تھے، لیکن اس کے باوجود یا شاید اسی کے باعث قرآن کریم کے سامنے وہ مبہوت ہو گئے اور ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں، مثلاً مشہور شاعرہ خنساء دور جاہلیت میں اپنے بھائی صخر کی

موت کے غم میں اشعار کہا کرتی تھیں۔ چونکہ یہ اشعار دل کی آواز تھے، اس لیے آج بھی ہمیں رلا دیتے ہیں، لیکن اسلام لانے کے بعد ان کا ''سلطان البیان'' رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس قدر گہرا تعلق قائم ہوا کہ جب جنگ قادسیہ کے موقع پر ان کے چار بیٹے یکے بعد دیگرے شہید ہوئے تو اگرچہ انسان اور ماں ہونے کی وجہ سے شدت غم نے ان کی کمر توڑ دی، لیکن قرآن، اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے زبان سے کہا: ''تمام تعریفیں اس اللہ کو سزاوار ہیں، جس نے انہیں شہادت دے کر مجھے عزت بخشی۔ مجھے اپنے پروردگار سے امید ہے کہ ہم سب کو جنت میں اکٹھا کرے گا۔''(569)

حضرت خنساء بلیغ شاعرہ تھیں اور شعر و ادب کے رموز سے اس قدر واقف تھیں کہ انہوں نے شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اپنے اشعار سے اسلام کا دفاع کرتے وقت روح الامین کے ذریعے ان کی مدد کریں، کے چار اشعار میں آٹھ غلطیوں کی نشاندہی کی۔(570) اس سے ان کا شعر و ادب کی باریکیوں سے واقف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس شاعرہ نے رسول اللہ ﷺ کے نور کو پھیلانے والی احادیث کے سامنے شعر کہنا چھوڑ دیئے۔ اس معاملے میں وہ تنہا نہ تھیں، بلکہ اکثر صحابہ کرام فصیح اور شاعر تھے، لیکن قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کے سامنے انہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیئے اور قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کو ترنم کے ساتھ پڑھنے پر اکتفا کیا، چنانچہ وہ اور ان کے بعد والے لوگ نبی کریم ﷺ کے اسلوب سے مانوس ہو گئے، جس کے نتیجے میں وہ آپ ﷺ کے کلام، حدیث اور اسلوب کو دوسرے کی باتوں اور اسالیب سے ممتاز کر سکتے تھے۔

۶- جولانی طبع اور قوت یادداشت

ایک اور عامل یہ تھا کہ اس مبارک دور کے لوگ یادداشت کی عبقری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آج ہم چار ماہ میں قرآن کریم حفظ کرنے والے کو عبقری سمجھتے ہیں اور چھ ماہ میں فرانسیسی زبان سیکھنے والے 'المالیلی حمدی' جیسے عالم کو نوادرِ زمانہ میں سے شمار کرتے ہیں، لیکن اس میدان میں اس دور کے لوگوں کی صلاحیتیں اس سے کہیں بڑھ کر تھیں، مثلاً حضرت ابو ہریرہ جو مستشرقین کی تنقید کا نشانہ بنے، جس سے ان کا مقصود سنت کے ایک اہم ستون کو گرانا تھا، جو بات ایک مرتبہ سن لیتے اسے بھولتے اور نہ ہی انہیں اسے دوبارہ سننے کی ضرورت پیش آتی۔(571) جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا(572) تو انہوں نے صرف پندرہ سے بیس دنوں میں اتنی عبرانی سیکھ لی کہ وہ عبرانی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ کر ان کا ترجمہ کرنے لگے۔

ایک اور عبقری شخصیت حبر الامت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تھی، اسی طرح ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی عبقری صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ یہ حضرات زبانی یاد کرنے کے شہسوار تھے اور جو بات ایک دفعہ سن لیتے وہ انہیں کبھی نہ بھولتی۔ صحابہ میں ایسے حضرات کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔

اس میدان میں تابعین بھی صحابہ سے پیچھے نہ تھے، مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور کے ابن شہاب زہری نے سب سے پہلے احادیث کی تصنیف کی۔ (572) مستشرقین نے انہیں بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے، اسی طرح قتادہ بن دعامہ نے امام ابوحنیفہ سے ملاقات کے وقت انہیں بتایا تھا کہ کوئی بات ایسی نہیں جو انہیں سننے کے بعد بھولی ہو۔ امام شافعی سے بھی ایسی ہی بات منقول ہے۔ شعبی اور ابراہیم بن یزید نخعی بھی اس بارے میں مشہور تھے۔ بلاشبہ ان میں سے ہر ایک قوت یادداشت میں نابغۂ روزگار تھا۔

ح: حدیث کی روایت بالمعنیٰ کے جواز کے لئے شرائط

علمائے کرام نے بعض شرائط کے ساتھ حدیث کی روایت بالمعنی کی اجازت دی ہے۔

الف: ضروری ہے کہ راوی کو زبان سے پوری واقفیت حاصل ہو۔ زبان کی باریکیوں سے نابلد شخص کے لئے احادیث نبویہ کی روایت بالمعنی کرنا درست نہیں، کیونکہ راوی کے لیے معانی سے پوری آگاہی ضروری ہے۔

ب: حدیث کے الفاظ کی جگہ استعمال ہونے والے الفاظ حدیث کے الفاظ کے مکمل طور پر مترادف ہوں، وہ کسی اور معنی کا احتمال نہ رکھتے ہوں اور سیاق وسباق کے موافق ہوں۔

ج: حدیث کی روایت بالمعنیٰ صرف الفاظ حدیث کے بھولنے کی صورت میں کی جائے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کی کسی بھی حدیث کا کوئی معنی اور مغز چھوٹنے نہ پائے۔ قاعدہ ہے: ''جو چیز مکمل طور پر حاصل نہ ہو سکے اسے مکمل طور پر چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔'' اس لیے ہم سنت کے زیادہ سے زیادہ جواہر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ا- حدیث کے الفاظ میں فرق

بعض احادیث اگر چہ مختلف الفاظ سے مروی ہوتی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ روایت بالمعنی کے دائرے میں نہیں آتیں۔ روزانہ پنج وقتہ نمازوں میں پڑھی جانے والی ''التحیات'' اسی قسم کی احادیث میں شمار ہوتی ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ''التحیات'' جسے حنفیہ، امام اوزاعی اور سفیان ثوری پڑھتے ہیں، کے علاوہ اس کے دوسرے الفاظ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، جنہیں امام شافعی پڑھتے ہیں، مثلاً اس میں ''التحیات'' کے بعد ''المبارکات'' کا اضافہ ہے اور الفاظ کے درمیان سے حرف عطف ''وٴ'' محذوف ہے۔ بعض ضعیف روایات میں ''التحیات'' کے تیسری قسم کے الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، جنہیں انہوں نے منبر کے پر کھڑے ہو کر پڑھا تھا۔ الفاظ کے اس اختلاف کو بنیاد بنا کر بعض لوگ دعوی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ سے سنی ہوئی ہر بات کو اچھی طرف یاد نہیں رکھتے تھے، بلکہ بعض الفاظ بھول جاتے تھے اور ان کی جگہ اپنے پاس سے مناسب الفاظ کا اضافہ کر دیتے تھے، لیکن حقیقت ایسے نہیں ہے، کیونکہ نماز ہجرت سے تین یا پانچ سال پہلے فرض ہوئی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب اور ابن مسعود

رضی اللہ عنہما جیسے اولین صحابہ کرام نے دس سال سے زیادہ عرصہ تک دن میں پانچ مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نمازیں ادا کیں۔ اس قسم کے دعوی سے غیر معمولی قوتِ یاداشت کی مالک ان ہستیوں کو احمق قرار دینا لازم آتا ہے۔ اس قسم کا دعوی پاگل خانے کے احمق ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ یہ صحابہ برسہا برس تک نبی کریم ﷺ کے پیچھے نمازیں ادا کرنے اور آپ ﷺ کی معیت میں تئیس برس گزارنے کے باوجود ایک ایسی بات بھی یاد نہ رکھ سکے، جو پانچ سال کا بچہ یاد کر لیتا ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب قرآن کریم کی تدوین ہوئی تو صحابہ کرام کی یاداشت کی طرف مراجعت کی گئی اور تحریر کردہ اور زبانی طور پر محفوظ قرآن کریم کا موازنہ کیا گیا، جس کا نتیجہ مکمل ہم آہنگی اور کسی بھی قسم کے عدم فرق کی صورت میں نکلا۔ روایت حدیث کے بارے میں اس قسم کے دعوے کو تسلیم کرنے سے قرآن کریم کے بارے میں بھی شکوک شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اصل بات یہ ہے کہ صحیح احادیث میں مروی ہے: ''قرآن کریم سات حروف کے مطابق نازل ہوا ہے، لہٰذا ان میں سے جو آسان لگے اس کے مطابق پڑھو۔''(574) یہاں ہم اس موضوع کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے، تاہم اتنی بات ضرور کہیں گے کہ اس ''امّی'' قوم پر رحمت کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن کریم اسی طرح نازل ہو، تاکہ ان کے لئے اس کی تلاوت کرنے میں آسانی پیدا ہو۔

یہی بات حدیث نبوی پر بھی صادق آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والے قرآن کو کبھی ایک انداز سے پڑھتے اور کبھی دوسرے انداز سے۔ ''التحیات'' کے بارے میں بھی آپ ﷺ کا یہی طرز عمل تھا، مثلاً آپ ﷺ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ''التحیات'' ایک طریقے سے سکھائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی دوسرے انداز سے تعلیم دی۔ جس طرح قرآن کریم کو سات انداز سے پڑھنا جائز ہے، اسی طرح حدیث مبارک کو بھی مختلف طریقوں سے روایت کرنا درست ہے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''التحیات'' کے تمام صیغے رسول اللہ ﷺ سے ہی مروی ہیں۔

۲- جوامع الکلم

اس اہم مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ''جوامع الکلم'' عطا کیے گئے تھے، یعنی آپ ﷺ مختصر الفاظ میں اتنے زیادہ اور اتنی گہرائی کے حامل معانی کا ابلاغ فرماتے کہ ان کی وضاحت کے لیے مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ عربی زبان کے قواعد و ضوابط اور علم بیان و بدیع کے اسالیب

پر غور کرنے سے ہم پر ایسے ایسے معانی کا انکشاف ہوتا ہے، جن کی طرف اس سے پہلے ہمارا ذہن نہیں گیا ہوتا، لہٰذا احادیث نبویہ کو پڑھنے والا یہ کہ اٹھتا ہے ''اس جیسا کلام کہنا تو کسی بھی عبقری شخصیت کے لیے ممکن نہیں، چہ جائیکہ صحابہ کرام سے اس کی توقع رکھی جاتی، جنہوں نے امی ماحول میں پرورش پائی اور سب کچھ آپ ﷺ سے ہی حاصل کیا۔'' یہ احادیث ایسے جواہرات کی مانند ہیں، جن کی قدر و منزلت اور صداقت قیامت تک برقرار رہے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں وحی الٰہی کی تائید حاصل ہے، لہٰذا ان کے بارے میں لاپروائی برتنا ممکن نہیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بعض لوگ احادیث کی تعداد کو کتنا ہی زیادہ کیوں نہ خیال کریں، وہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہونٹوں سے نکلی ہیں۔ ہم انہیں اسی پہلو سے دیکھتے ہیں۔

ط: عہد رسالت اور بعد کے ادوار میں تدوین حدیث

یہ رائے کہ سنت کی تدوین کا آغاز حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دور سے ہوا آدھا سچ ہے، کیونکہ اس میں اس اہم حقیقت کو نظر انداز کیا گیا ہے کہ عہد رسالت میں جس طرح بعض صحابہ قرآن کریم لکھا کرتے تھے، اسی طرح احادیث بھی لکھا کرتے تھے۔

۱- قرآن کریم کے سبب لکھنے پڑھنے کا رواج

عہد رسالت میں عربوں کی اکثریت لکھائی پڑھائی سے عاری تھی، تاہم مکہ مکرمہ میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی، کیونکہ اہل مکہ گردونواح کے قبائل سے مسلسل رابطے میں تھے۔ نزولِ قرآن کے بعد تو لکھنے پڑھنے کا رجحان اور بھی بڑھ گیا، کیونکہ دینی ضرورت کی وجہ سے ہر مسلمان کو قرآنی احکام ومعانی سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم پڑھنے کی ضرورت تھی۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کریم کا نزول علم وثقافت کی نفیر عام کا اعلان تھا۔ طبقات ابن سعد کے مطابق (مختلف اوقات میں) رسول اللہ ﷺ کو میسر کاتبین وحی کی تعداد چالیس کے قریب تھی۔(575) یہ لوگ محض لکھنے پڑھنے سے ہی آشنا نہ تھے، بلکہ کاتب وحی اس شخص کو کہتے ہیں، جس نے اپنے آپ کو کتابت قرآن کے لیے وقف کر رکھا ہو۔ دور حاضر کی تعبیر کے مطابق اسے رسول اللہ ﷺ کا سیکریٹری کہا جا سکتا ہے۔

اس دور میں لکھنے پڑھنے کی خوب ترغیب دی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، حتی کہ غزوہ بدر کے بعض قیدیوں کا فدیہ اسے قرار دیا گیا تھا کہ ہر قیدی دس افراد کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔(576)

یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا واقعہ تھا اور اس دور کے اعتبار سے کافی ترقی پسندانہ فیصلہ تھا، جس کے نتیجے میں لوگ لکھائی پڑھائی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے، کیونکہ ان کے پیش نظر ایک نئی اور انوکھی چیز تھی، وہ چیز دین، قرآن اور دنیا تھی۔ وہ اپنی زندگی میں نئی معنویت پیدا کرنے کے لیے اسے تمام پہلوؤں سے سمجھنے کے لیے بے تاب تھے۔ اسی لیے شہری اور دیہاتی سب قرآن کریم کے نازل شدہ حصے کی تدوین کے منتظر رہتے۔ یہ ایک منفرد بات تھی اور کسی الہامی اور مقدس کتاب کو یہ حیثیت پہلی دفعہ حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے قیامت تک محفوظ رہنا تھا۔ قرآن کریم کی طرح اس کی تشریح وتوضیح کرنے والی سنت کی تدوین بھی عمل میں آئی۔ سنت نے قرآن کے مجمل کی تفصیل، مبہم کی توضیح، مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص کی۔ چونکہ سنت اسلامی قانون سازی کا دوسرا ماخذ ہے، اس لئے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا، جس کے نتیجے میں اس کی عمومی اور سرکاری سطح پر تدوین ممکن ہو سکی۔

۲- تدوین حدیث کی مخالفت میں دلائل

ذیل میں ہم ان احادیث کا جائزہ لیں گے جنہیں مستشرقین اوران کی سوچ سے متاثر مسلمان تدوین حدیث کے عہد رسالت کے بعد عمل میں آنے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

"تقیید العلم" میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "ہم نے نبی اکرم ﷺ سے کتابت (حدیث) کی اجازت مانگی، لیکن آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔"(577) گولڈزیہر (Goldziher) اوراس کے پیروکاروں کی طرف سے پیش کی جانے والی یہ حدیث علم حدیث کے ماہرین کے ہاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، تاہم اس میں شک نہیں کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک اورروایت بھی مروی ہے: "میری باتیں مت لکھواور جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہے وہ اسے مٹادے۔"(578)

"تقیید العلم" میں جلیل القدراور مضبوط یاداشت کے مالک صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جواحادیث کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے اورانہیں بڑے شوق سے مدون کرتے، حالانکہ مضبوط قوتِ یاداشت کے مالک ہونے کی وجہ سے انہیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی، سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے اورانہیں کچھ لکھتے ہوئے پایاتوان سے پوچھا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے عرض کی کہ وہ آپ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث لکھ رہے ہیں۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: "کیاتم جانتے نہیں کہ تم سے پہلی امتیں اسی لیے گمراہ ہوئیں کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ ساتھ اور کتابیں بھی گھڑ لی تھیں۔"(579)

یہ احادیث تمام خدائی کتابوں قرآن، تورات اورانجیل کوکسی بھی دوسرے کلام یاتحریر سے خلط ملط ہونے سے بچانے کوواضح طور پرضروری قراردیتی ہیں۔اگرچہ ان کتابوں کے ساتھ کسی بھی بات کوخواہ وہ انبیائے کرام کاارشادہی کیوں نہ ہو،لکھنا درست نہ تھا،لیکن اس حکم پر پوری طرح سے عمل نہ ہوسکا،جس کے نتیجے میں تورات میں اورتحریروں کی آمیزش ہوگئی اورایک انجیل کے نزول کے کافی عرصہ بعد اس کی تعداد میں اضافہ ہوااوروہ کئی جلدوں پرپھیل گئی،اس طرح یہ دونوں گروہ صراط مستقیم سے بھٹک کرگمراہی کے راستے پرچل پڑے اور یہ حقیقت اس وقت اوربھی واضح ہوجاتی ہے، جب نہ صرف کتابت حدیث کی اجازت، بلکہ اس کے حکم والی صحیح احادیث کوپیش نظر رکھا جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد ممانعت والی احادیث سے بھی زیادہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ جن سے ہم نے کتابت حدیث سے ممانعت والی حدیث ابھی نقل کی ہے، کہتے ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عمرو کے سوا اصحابِ رسول اللہ ﷺ میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ احادیث روایت نہیں کرتا، کیونکہ وہ (احادیث) لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔''(580)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رسول اللہ ﷺ سے جو بات بھی سنتے، اسے لکھ لیتے یہاں تک کہ ان سے کہا گیا: ''آپ رسول ﷺ کی ہر بات لکھ لیتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ انسان ہیں، جنہیں غصہ بھی آتا ہے اور خوشی بھی ہوتی ہے۔''(581) اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو نے کتابت حدیث چھوڑ دی اور یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''لکھا کرو! کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔''(582)

یہ درست ہے کہ آپ ﷺ بشر تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نبی بھی تھے، اس لیے آپ ﷺ کی خوشی اور غصہ صرف اللہ کی خاطر ہوتا تھا۔ آپ ﷺ ہمیشہ حق بات فرماتے اور ہوائے نفس سے کوئی بات نہ کہتے ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ () إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۳-٤) ''اور نہ یہ خواہش نفس سے کچھ بولتے ہیں۔ یہ قرآن تو ایک وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے۔'' آپ ﷺ کی طبیعت کا آپ کی ذمہ داری کے ساتھ ایسا امتزاج ہو چکا تھا کہ نبوت دونوں کا وصف بن چکی تھی، جس کے نتیجے میں آپ ﷺ کا شرحِ صدر ہو گیا تھا، لہٰذا نبوت کی ذمہ داریوں میں آپ کی بشری طبیعت کے حائل ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ آپ جو کچھ بھی فرماتے وہ دین ہوتا، اسی لیے آپ ﷺ نے ان صحابی کو لکھنے کی ہدایت فرمائی۔

۳- تدوین حدیث کے دلائل

جب ہم کتابت حدیث سے متعلق مآخذ کو کھنگالتے ہیں تو ہمیں درج ذیل روایات ملتی ہیں:

ایک انصاری صحابی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کی احادیث سنتے۔ انہیں آپ ﷺ کی احادیث اچھی لگتیں، لیکن یاد نہ رہتیں۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کی شکایت کی: ''یارسول اللہ ﷺ! میں آپ کی باتیں سنتا ہوں، جو مجھے اچھی لگتی ہیں، لیکن وہ مجھے یاد نہیں رہتیں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۔''(583)

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ سے کوئی بات سنتے ہیں تو کیا اسے لکھ لیا کریں؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''بغیر کسی حرج کے لکھا کرو۔''(584)

سنن نسائی اور سنن دارمی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قصاص، دیت اور بعض دیگر امور سے متعلق احکام لکھوا کر عمرو بن حزم کی طرف یمن بھیجے۔(585) اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت وائل بن حجر کے لیے حضرموت میں ان کی قوم کے نام خط لکھا، جس میں اسلام کے اہم خدوخال، زکوٰۃ کے نصاب، حد زنا، حرمت خمر اور نشہ آور اشیاء کی حرمت کے بعض مسائل مذکور تھے۔(586) مزید برآں امام دارمی اپنے مقدمے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ''تحریر کے ذریعے علم کو محفوظ کرو۔''(587)

کتب صحاح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی ملتی ہے کہ ابوشاہ نامی ایک یمنی شخص نے فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا خطبہ سنا تو کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ سے اپنے لیے خطبے کو لکھوانے کی درخواست کی، جس پر آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''ابوشاہ کے لیے لکھو۔''(588)

وفات سے چند دن پہلے جب نبی اکرم کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''میرے پاس کوئی کتاب لے آؤ تاکہ میں تمہیں ایک ایسی تحریر لکھوا دوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔'' اس موقع پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نبی کریم ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر چکی ہے، جبکہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، جو ہمارے لیے کافی ہے۔''

یہ ان صحابی کا اجتہاد تھا، تاہم ابن عباس رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''رسول اللہ ﷺ اور تحریر کے درمیان حائل ہونا بہت بڑا المیہ تھا۔(589) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو عمر بھر اس کا دکھ رہا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کینے کے جذبات نہیں رکھے، بلکہ ہمیشہ ان کی طرفداری کی اور جب بھی سنتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ ارشاد فرمانے والے ہیں تو مکہ یا بصرہ میں سے جس شہر میں بھی ہوتے ان کا خطبہ سننے کے لیے آتے۔(590)

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اس واقعے کی بنیاد پر کسی نے بھی اپنے دل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ناپسندیدگی یا کینے کے جذبات نہیں رکھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات دوبارہ ارشاد نہیں فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کو گمراہی میں گرفتار ہونے سے بچانے کے لیے اپنے خلیفہ کے

بارے میں تحریر لکھوانا چاہتے تھے یا کسی اور بارے میں ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، تاہم اتنی بات ہم جانتے ہیں کہ سوائے ایک شخص کے باقی تمام لوگوں نے پہلے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اسی طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مقام پر پہنچے تو اگرچہ آغاز میں بعض لوگوں کو ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں تردد ہوا، لیکن پھر سب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی، تاہم حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دور میں اختلافات پیدا ہوئے۔ کیا جو بات رسول اللہ ﷺ تحریر کروانا چاہتے تھے، اس سے وہ علم مراد تھا، جس کے بارے میں حضرت ابوہریرہ نے فرمایا تھا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے (علم کے) دو برتن محفوظ کیے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تو میں نے اشاعت کی دی ہے، لیکن اگر میں دوسرے کی اشاعت کرتا تو یہ گلا کاٹ دیا جاتا۔''(591) یا آپ ﷺ اپنے صحابی حضرت حذیفہ کے پاس ودیعت رازوں کو افشا کرنا چاہتے تھے؟ یہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ جو بات لکھوانا چاہتے تھے وہ راز ہی رہی، لیکن یہ واقعہ اس بات کی دلیل ضرور ہے کہ عہد نبوی میں احادیث لکھی جاتی تھیں اور بعض اوقات آپ ﷺ انہیں لکھنے کا حکم بھی فرماتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام بھی احادیث لکھا کرتے تھے، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کے کنارے بعض احادیث پر مشتمل ایک صحیفہ لٹکتا رہتا تھا، چنانچہ ایک موقع پر ابوجحیفہ نے ان سے پوچھا: ''کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟'' انہوں نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ صرف اللہ کی کتاب، مردِ مومن کو عطا کردہ فہم اور اس صحیفے میں موجود احکام ہیں۔'' انہوں نے پوچھا: ''اس صحیفے میں کیا ہے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''دیت اور قیدیوں کو چھوڑانے کے احکام اور یہ کہ کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔''(592)

اسی طرح سائمہ جانوروں کی زکوۃ کے احکام پر مشتمل ایک صحیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بھی تھا، جسے وہ اپنی تلوار کے ساتھ لٹکا کر رکھتے تھے۔(593) طبقات ابن سعد کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت ایک اونٹ کے بوجھ کی بقدر کتابیں میراث میں چھوڑیں، جن میں سے اکثر احادیث نبویہ اور آثارِ صحابہ پر مشتمل تھیں۔(594)

ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جسے بعض حضرات پہلا اسلامی دستور قرار دیتے ہیں۔ اس معاہدے کا آغاز یوں ہوتا تھا: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ محمد نبی (خدا) ﷺ کی طرف سے قریش و یثرب کے مسلمانوں اور ان کے ساتھ وابستہ ہونے والوں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والوں کے درمیان اس بات کا معاہدہ ہے کہ وہ (دوسرے) لوگوں سے الگ ایک مستقل امت ہیں...''

"...اور یہ اس بات کا معاہدہ ہے کہ یہودی حالت جنگ میں اہل ایمان کے ساتھ مل کر خرچ کریں گے۔ بنوعوف کے یہود اہل ایمان کے ساتھ ایک امت ہیں، یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین ہے۔ اس معاہدے کے پابند لوگوں کے درمیان کوئی بھی ایسا واقعہ یا جھگڑا پیدا ہوا، جس سے فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا تو اسے اللہ اور محمد رسول خدا ﷺ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"(595)

دیتوں اور قصاص سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا عمرو بن حزم کی طرف ارسال کردہ والا نامہ(596) ان کے پڑپوتے ابوبکر بن محمد تک پہنچا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے مولی ابورافع کی تحریروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ فقیہ اور تابعی ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث کی طرف منتقل ہوا،(597) جسے وہ عمر بھر اپنی قیمتی ترین متاع قرار دیتے رہے۔

دورِ نبوی میں یہ احادیث قرآن کریم کی طرح لکڑیوں کے ٹکڑوں، ہڈیوں اور کھالوں پر لکھی گئیں پھر تابعین اور تبع تابعین کی طرف منتقل ہوئیں، جنہوں نے نہ صرف ان کی حفاظت کی، بلکہ انہیں اپنے بعد والوں کی طرف منتقل بھی کیا، اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ تابعین میں بلند مقام رکھنے والے حضرت مجاہد بن جبر کہتے تھے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا وہ "صحیفہ صادقہ" دیکھا ہے، جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث لکھی تھیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے سامنے وہ صحیفہ پڑا ہوا دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن انہوں نے مجھے اسے چھونے کی اجازت نہیں دی۔(598)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنے صحیفے کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت واہتمام کرتے تھے۔ ابن اثیر کے قول کے مطابق یہ صحیفہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھا۔ ان احادیث کی سند عبداللہ بن عمرو، ان کے بیٹے اور ان کے پوتے پر مشتمل تھی، گویا "عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده"۔ کتب صحاح میں اس سند سے پانچ سو احادیث مروی ہیں۔ یہ سند "سلسلة ذهبية" سمجھی جانے والی سند "زین العابدین عن الحسن عن علی بن أبی طالب رضی الله عنه" کے قریب قریب سمجھی جاتی ہے۔

ی: خلاصۂ کلام

تدوین حدیث رسول اللہ ﷺ کی وفات کے سوسال بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے شروع نہیں ہوئی، جیسا کہ مستشرقین کا دعوی ہے، بلکہ احادیث نبویہ کی تدوین عہد نبوی میں ہوئی، انہیں یاد کیا گیا اور پھر تحریر وتقریر دونوں ذرائع سے انہیں آئندہ نسلوں تک پہنچایا گیا۔ صحابی رسول حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے احادیث نبویہ کا ایک بڑا تحریری ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا۔(599) اس کے علاوہ ہم اس دور سے تعلق رکھنے والے حدیث کے ایک بہت ہی اہم ماخذ ہمام بن منبہ کے ''صحیفہ صحیحہ'' سے بھی آگاہ ہیں۔

ہمام بن منبہ ہمیشہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہے۔ یادداشت کی عبقری صلاحیت کے مالک یہ صحابی جو حدیث بھی بیان کرتے ہمام بن منبہ اسے لکھ لیتے حتی کہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے استاد کے سامنے ایک حدیث ذکر کی تو حضرت ابو ہریرہ نے ان سے فرمایا کہ انہیں یہ حدیث یاد نہیں، اس پر ہمام بن منبہ اٹھے اور ان کے پاس وہ صحیفہ لے آئے، جس میں وہ احادیث لکھا کرتے تھے اور اس میں سے وہ حدیث پڑھی،(600) جسے سن کر ان کے استاد قائل ہو گئے۔ پروفیسر محمد حمید اللہ (مرحوم) نے اس صحیفے کو شائع کیا ہے اور اس صحیفے کے کاربنی تجزیئے (Carbonic Analysis)(601) سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تیرہ صدیاں پیشتر لکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ احادیث مسند امام احمد میں بھی موجود ہیں، مزید برآں ان کا ایک بڑا حصہ بخاری و مسلم جیسی کتب صحاح کے اہم اجزاء پر مشتمل ہے۔ یہ جس طرح عہد رسالت مآب ﷺ میں تدوین حدیث کی دلیل ہے اسی طرح ان کے صحابہ کرام، تابعین اور پھر تبع تابعین کے واسطے سے بالکل صحیح اور مکمل صورت میں کتب حدیث میں منتقل ہونے پر بھی شاہد ہے۔

ان تاریخی حقائق اور احادیث کے پیش نظر دورِ حاضر کے عظیم عراقی محدث احمد محمد شاکر لکھتے ہیں کہ کتابت حدیث سے ممانعت والی احادیث یا تو بعد میں منسوخ ہوگئی تھیں یا ممانعت سے مقصود احادیث کو قرآن کے ساتھ لکھنے سے روکنا تھا، تاکہ قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کا امتزاج نہ ہو۔(602) رسول اللہ ﷺ کے ہاں پائی جانے والی یہ احتیاط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں بھی پائی جاتی تھی، کیونکہ قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے اسے من وعن محفوظ کرنا، اچھی طرح سمجھنا اور اس کی قدرومنزلت کے مطابق اس کی اہمیت اور ذمہ داری کا ادراک کرنا ضروری تھا، بصورت دیگر

احادیث مبارکہ کا اس کے ساتھ امتزاج ہو جاتا، جس کے نتیجے میں قرآن کریم اپنی امتیازی حیثیت کھو بیٹھتا اور گزشتہ امتوں کے ساتھ پیش آنے والی صورت دوبارہ پیش آجاتی، اسی لیے رسول اللہ ﷺ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بارے میں بہت اہتمام اور احتیاط فرماتے تھے، لیکن جب ہر چیز واضح ہوگئی اور قرآن وحدیث کا فرق نکھر کر سامنے آگیا تو قرآن کریم کی طرح حدیث کی بھی مستقل بنیادوں پر تدوین کی اجازت دے دی گئی۔

پہلی صدی میں اوپر ذکر کردہ طریقے کے مطابق تدوین حدیث کے بعد "عمر ثانی" حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں احادیث نبویہ کی سرکاری سطح پر تدوین ہوئی۔ اس وقت مختلف مقامات پر حدیث کے مختلف صحیفے موجود تھے اور ان کی احادیث کو زبانی روایت کیا جاتا تھا۔ جس طرح پہلی صدی ہجری میں حضرت عمر، ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری، ابو سعید خدری اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم نے تدوین حدیث کی مخالفت کرتے ہوئے زبانی یاد کرنے کو ترجیح دی، اسی طرح تابعین کے دور میں بھی علم حدیث میں ید طولیٰ رکھنے والے اور حفظ و یادداشت کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک امام شعبی اور امام نخعی ایسے حضرات نے تدوین حدیث کی مخالفت کی، لیکن اس مخالفت کے باوجود حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں اوّلین صحیفوں میں محفوظ اور زبانی طور پر متداول احادیث نبویہ کی سرکاری سطح پر تدوین عمل میں آئی، کیونکہ جس طرح جنگ یمامہ میں حفاظِ قرآن کی بڑی تعداد میں شہادتوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دل میں جمع قرآن کی ضرورت کا داعیہ پیدا کیا، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا تمسّك بالسنة اس کی تدوین کا باعث بنا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز بہت سے لوگوں کی رائے میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت: "دین کا آغاز اجنبی پن سے ہوا اور یہ پھر اجنبی بن جائے گا، لہٰذا ان اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہو، جو میرے بعد میری سنت میں در آنے والے فساد کی اصلاح کریں گے۔"(603) کا مصداق بننے والے پہلے مجدد تھے۔ انہوں نے تیرہ صدیاں پیشتر بنو امیہ کے شاہی محل میں پرورش پائی۔ وہ تفسیر اور نقد رجال میں حجت سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ڈھائی سال کے مختصر عرصے میں اسلامی مملکت کے وسیع وعریض علاقے میں بہت سی اصلاحات متعارف کرائیں، جنہیں دیکھ کر یوں لگتا جیسے مملکت کی باگ ڈور فرشتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا تدوین حدیث کے کام کی سرپرستی کرنا ان کی دیگر اصلاحات میں بیش قدر اضافہ تھا۔ انہوں نے صحابی رسول عمرو بن حزم جن سے رسول اللہ ﷺ نے دیتوں اور قصاص کے احکام سے متعلق صحیفہ لکھوایا تھا، کے پوتے اور مدینہ منورہ کے گورنر ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو اس سلسلے میں حکم

دیا۔ اس گورنر نے یہ ذمہ داری ایک ذی علم اور ذہین و فطین تابعی محمد بن شہاب زہری کے سپرد کی۔ (604)
جنہوں نے اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے فوراً کمر کس لی اور اسے اس لیاقت سے سرانجام
دیا کہ انہیں اسلامی تاریخ میں حدیث کے پہلے ''سرکاری مدون'' کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ
مدینہ کے گورنر ابوبکر بن حزم نے بھی اس کام میں حصہ لیا تھا، لیکن ان کی مدوّن احادیث حضرت عمر بن
عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں ارسال کیے جانے سے پہلے ہی خلیفہ کا انتقال ہو گیا۔

تدوین حدیث کے سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی سرگرمیاں مدینہ منورہ میں صرف
امام زہری کی کاوشوں تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ مکہ مکرمہ میں عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج نے،
عراق میں سعید بن ابی عروبہ نے، شام میں اوزاعی نے، مدینہ میں محمد بن عبدالرحمٰن نے، کوفہ میں زائدہ
بن قدامہ اور سفیان ثوری نے، بصرہ میں حماد بن سلمہ نے اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے اس
سلسلے میں حصہ لیا اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اس موضوع پر قیمتی سرمایہ چھوڑا۔ (605)

تدوین کے اس دور کے بعد تصنیف یعنی احادیث کی موضوعات کے لحاظ سے تالیف کا مرحلہ
شروع ہوا۔ یہ اسلام میں حدیث کی تاریخ کا سنہری دور شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں ہمیں ابوداؤد طیالسی،
مسدد بن مسرہد، حمیدی اور مسند کے مصنف احمد بن حنبل ایسے معروف نام ملتے ہیں۔ دوسری طرف ہمیں
اسی سنہری دور میں عبدالرزاق بن ہمام ''المصنّف''، ابن ابی ذئب اور امام مالک ''الموطأ'' اور یحییٰ بن
سعید قطان اور یحییٰ بن سعید انصاری اپنی قابل قدر کتابیں تصنیف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ائمہ کبار بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور یحییٰ بن معین جیسے بڑے بڑے محدثین کے شیوخ
و اساتذہ تھے۔ آخر کار عظیم مؤلفین کے ہاتھوں کتب ستہ کی تالیف کا وقت آ پہنچا۔ یہ حدیث کی معتبر ترین
کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ یہ تمام بڑے بڑے مؤلفین تقریباً ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں۔ امام بخاری،
امام مسلم کے دوست تھے، امام ترمذی امام بخاری کے شاگرد تھے اور امام نسائی امام ابوداؤد کے
معاصر تھے۔ ان جلیل القدر علماء اور عہد رسالت کے درمیان تین چار نسلوں سے زیادہ بعد نہ تھا اور اس
نورانی سلسلے کی سنہری کڑیاں بننے والے ان علمائے کبار کے دل میں خواب میں بھی جھوٹ بولنے کا
خیال گزرنا ممکن نہ تھا۔

اس طرح نصف دین قرار پانے والی سنت مطہرہ کی حفاظت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ایسے
بڑے بڑے محققین کے ہاتھوں ہوئی، جو ہر چیز کو بڑی احتیاط سے پرکھتے تھے، حفاظت حدیث کا یہ

سلسلہ صحابہ کرام سے شروع ہو کر تابعین اور تبع تابعین تک جاری رہا، پھر اس کی تدوین اور اسے زبانی یاد کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور ایک حرف کی بھی تبدیلی کے بغیر آج تک جاری ہے۔

صحابہ کرام ایک اہم دینی ماخذ، ناگزیر راہنما اور قرآن کریم کے مبارک مفسر کی حیثیت سے سنت کی قدر و منزلت اور اہمیت سے واقف تھے اور پھر یہ اہتمام تابعین اور تبع تابعین کی طرف منتقل ہوا، یہاں تک کہ سنت اسی اہتمام و احتیاط کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی دورِ حاضر تک پہنچی۔

تیسرا باب

صحابہ کرام اور تابعین عظام

الف: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

صحابہ کرام نے نہ صرف سنت نبویہ بلکہ قرآن کریم کو بھی نقل کیا۔ مؤمن ومہیمن خدا نے سب سے بڑی امانت جبرائیل امین کے واسطے سے افضل ترین مخلوق اور سب سے پرامن شخصیت ''محمد'' امین ﷺ کی طرف بھیجی۔ صحابہ کرام نے یہ عظیم امانت ہم تک من وعن پہنچائی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قرآن وسنت ان کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں،(606) بلکہ تورات اور انجیل بھی ان کی مدح سرائی کرتی ہیں۔(608)

صحابہ کرام نے بڑی معتدل زندگی گزاری، وہ نہ صرف بدر، مؤتہ اور یرموک میں بہادری کی مثال بنے، بلکہ ان کی زندگی کا ہر گوشہ لائق تقلید ہے، کیونکہ انہوں نے آخرت کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگیوں کو منظم کیا اور پرکھا تھا۔ ان کا ہر قدم رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اٹھتا تھا۔ پاکدامنی واستقامت کی اعلیٰ مثال قائم کرنے والی ایسی ہستیوں کے ذریعے سنت نبویہ ہم تک پہنچی، اسی لیے صحابہ کرام اور عمدہ طریقے سے ان کی پیروی کرنے والے تابعین عظام کے حالات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔

۱- صحابہ کرام اور ان کے طبقات

حافظ ابن حجر نے صحابی کی تعریف سب سے بہتر الفاظ میں کی ہے: ''صحابی اس شخص کو کہتے ہیں، جس نے حالت ایمان میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ کی صحبت پائی خواہ قلیل وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو، آپ ﷺ کی بات سنی اور ایمان اور عہد (اسلام) پر وفات پائی۔''(608)

اگرچہ بعض حضرات نے صحابیت کے لیے دو ایک سال تک رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہنے کو شرائط قرار دیا ہے، لیکن علماء کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ جس شخص کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی اور اسے آپ ﷺ کی صحبت تھوڑی سی دیر کے لیے بھی میسر آئی، وہ اس روحانی ماحول سے مستفیض ہوا اور ایمان اور عہد (اسلام) پر اس کی وفات ہوئی تو وہ صحابی کہلائے گا۔ اس کے برعکس اگر کافر رسول اللہ ﷺ کو ایک ہزار بار بھی دیکھے صحابی نہیں کہلا سکتا۔

بلاشبہ تمام صحابہ ایک پائے کے نہ تھے، بلکہ ان کے مختلف طبقات ہیں، کیونکہ آپ ﷺ پر آغاز سے ہی ایمان لا کر آپ کی معیت میں جہاد کرنے والے صحابہ کرام اور ہجرت یا فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں کو ایک پلڑے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ قرآن وسنت بھی اس معاملے کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم انصار ومہاجرین میں سے سبقت کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے: ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (التوبۃ: ۱۰۰) ''جن لوگوں نے سبقت کی یعنی سب سے پہلے ایمان لائے مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔'' اور پھر فتح مکہ سے پہلے راہ خدا میں خرچ اور جنگ کرنے والوں اور فتح مکہ کے بعد راہ خدا میں خرچ اور جنگ کرنے والوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے انہیں غیر مساوی قرار دیتا ہے: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا﴾ (الحدید: ۱۰) ''جس شخص نے تم میں سے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ اور جس نے یہ کام بعد میں کیے وہ برابر نہیں۔ ان کا درجہ ان سے کہیں بڑھ کر ہے، جنہوں نے بعد میں مال خرچ کیا اور کفار سے جنگ کی۔''

درجات کا یہ تفاوت رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو پریشان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے غصے میں ارشاد فرمایا: ''میرے صحابہ کو ایذا مت پہنچاؤ۔''(609) اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کوئی ایذا پہنچائی تو رسول اللہ ﷺ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''کیا تم میری خاطر میری صحابی کو (تکلیف پہنچانا) چھوڑو گے نہیں۔ جب میں نے کہا تھا: لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں تو تم نے کہا تھا: ''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' لیکن ابوبکر نے کہا تھا: ''آپ سچ کہتے ہیں۔''(610)

صحابہ کرام کی سب سے بہتر درجہ بندی ''مستدرک'' کے مصنف حاکم نیشاپوری نے کی ہے۔ انہوں نے صحابہ کرام کو درج ذیل بارہ درجات میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ابتدائی دور میں مکہ میں اسلام لانے والے صحابہ کرام مثلاً خلفائے اربعہ
(۲) وہ صحابہ کرام جو اہل مکہ کے دار الندوہ میں مشاورت کرنے سے پہلے اسلام لائے
(۳) حبشہ کی طرف یہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام

(۴) عقبہ اولیٰ کے (موقع پر بیعت کرنے والے) صحابہ کرام
(۵) عقبہ ثانیہ کے (موقع پر بیعت کرنے والے) صحابہ کرام، جن کی اکثریت کا تعلق انصار سے تھا
(۶) وہ مہاجرین جو مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی آپ ﷺ کے قبا میں آ ملے تھے
(۷) اہل بدر
(۸) غزوہ بدر اور صلح حدیبیہ کے دوران ہجرت کرنے والے صحابہ کرام
(۹) صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان کرنے والے صحابہ کرام
(۱۰) صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصہ میں ہجرت کرنے والے صحابہ کرام مثلاً حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن عاص
(۱۱) فتح مکہ کے موقع پر اور اس کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے صحابہ کرام
(۱۲) وہ بچے جنہوں نے فتح مکہ یا حجۃ الوداع وغیرہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ کی زیارت کی (611)

۲- صحابہ کرام کا اعلیٰ مقام

اس پر اتفاق ہے کہ انبیائے کرام کے بعد صحابہ کرام افضل ترین انسان ہیں۔ انبیائے کرام سب سے زیادہ فضائل کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے مقام تک پہنچنا کسی کے بس میں نہیں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض صحابہ کرام کو صرف بعض فضیلتوں میں انبیائے بنی اسرائیل کا مقام حاصل تھا۔ میں یہ بات دوبارہ کہتا ہوں کہ بعض صحابہ کرام کو صرف بعض فضائل میں بعض انبیائے کرام کا مقام حاصل تھا، اسی طرح ''مرجوح کی راجح پر فوقیت'' کے قاعدے کے تحت شیخ عبدالقادر جیلانی، امام ربانی اور محمد بہاؤالدین نقشبندی ایسے بعض اولیاء واصفیاء بعض فضائل میں بعض صحابہ کرام کے مقام کے قریب پہنچ جاتے ہیں، لیکن روشن دل ودماغ رکھنے والے اور دینی معاملات میں حجت سمجھے جانے والے علماء مثلاً امام ابوحنیفہ اور امام شافعی وغیرہ کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ صحابہ کرام کو انبیائے کرام کے بعد علی الاطلاق فضیلت حاصل ہے۔ (612)

امام ربانی شیخ سرہندی لکھتے ہیں: ''صحابہ کرام کو خیر البشر علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والتسلیم کی پہلی صحبت میں ہی انتہا کے ابتدا میں انضمام کے نتیجے میں ایسا مقام حاصل ہو جاتا تھا، جو کامل ترین اولیائے کرام کو اختتام پر بھی کم ہی حاصل ہو پاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل حضرت حبشی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی ایک مرتبہ صحبت پانے کی وجہ سے افضل ترین تابعی حضرت اویس قرنی سے افضل قرار پائے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہ افضل ہیں یا

عمر بن عبدالعزیز؟ انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''بخدا! رسول اللہ ﷺ کی معیت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے نتھنے کا غبار حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے کئی گنا بہتر ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس جماعت کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے، جہاں دوسروں کی انتہا ہوتی ہے، اس کی انتہا کا کیا عالم ہوگا اور دوسرے اسے کیسے پا سکتے ہوں گے۔''(613)

۳۔ صحابہ کرام کی علوشان کے اسباب

صحابہ کرام کی علوشان کے چند اسباب درج ذیل ہیں:

الف: رسالت کے ساتھ تعلق

اس کا پہلا سبب صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت کے درمیان پایا جانے والا تعلق ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، اس لیے آپ ﷺ کے بعد آنے والے اولیائے کرام اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف ولایت کا تعلق ہی باقی رہ گیا ہے۔ جس قدر نبوت کو ولایت پر فوقیت حاصل ہے، اسی قدر صحابہ کرام کو اولیائے عظام پر فضیلت حاصل ہے۔

ب: اثر پذیری

دوسرا سبب اثر پذیری ہے کہ عظیم شخصیت کی صحبت میں چند ساعت بیٹھنا بعض اوقات کئی کئی گھنٹے اس کی تالیفات پڑھنے سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ کسی مجلس خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بذاتِ خود حاضری اور صحبت سے براہِ راست مستفیض ہونے سے کوئی بھی کتاب بے نیاز نہیں کر سکتی، کیونکہ جس شخص کو یہ صحبت میسر تھی وہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں کی حرکت اور آنکھوں کے اشارات دیکھ آپ کی مجلس سے پھوٹنے والی روحانی شعاعوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ کتابیں پڑھ کر کوئی بھی شخص روحانیت کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگرچہ ہر شخص رسول اللہ ﷺ کی نماز کے قیام، رکوع وسجود، اس دوران آپ کی آہوں اور دیکھنے والوں کے لیے حیرت کا باعث بننے والے خشوع کے بارے میں پڑھ سکتا ہے، لیکن کوئی بھی کتاب اس ماحول (کی روحانیت) کو منتقل نہیں کر سکتی۔ اس صحبت کے ماحول میں اثر پذیری کی حقیقت سے ناآشنا شخص صحابہ کرام کے مقام کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی ان کی عظمت کا ادراک کر سکتا ہے۔ صحابہ کے مرتبے تک پہنچنے کے لیے زمان ومکان کو چودہ سو سال پیچھے کی طرف دھکیل کر رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں یہ کہتے ہوئے حاضری دینا ضروری ہے: ''یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان۔''

ج: اتباعِ حق پر مواظبت

تیسرا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی مزاحاً بھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ آج کے دور میں جبکہ سچے ترین انسان کی گفتگو میں بھی کچھ نہ کچھ جھوٹ کی آمیزش ہو جاتی ہے، یہ بات نا قابلِ فہم معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے ابھی نیا نیا اسلام قبول کیا تھا، لیکن اسلام قبول کرتے ہی وہ جھوٹ سے سچائی، بداخلاقی سے خوش اخلاقی اور تاریکی سے روشنی کی طرف آ گئے، لیکن اس ''جمالِ موعود'' تک پہنچنے کے لیے انہوں نے خوشی خوشی اپنی جان و مال کی قربانی دی۔ وہ بہت بھاری قیمت پر حاصل ہونے والی اس قدر و منزلت کو کسی صورت کھونا نہ چاہتے تھے۔ آپ ﷺ کے مقامِ صدق کے گرد حلقہ قائم کرنے والے صحابہ کرام مسیلمہ کذاب کے مقامِ کذب سے کوسوں دور تھے۔ وہ کبھی بھی اس گہری کھائی میں گرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

صحابہ کرام نے بہت جلد جھوٹ کی دنیا سے منہ موڑ کر اس سے اپنا ناطہ توڑ دیا، ہر قسم کے غیر اخلاقی مظاہر سے دوری اختیار کر لی اور کسی بھی قیمت پر اس کی طرف پلٹ کر نہ دیکھنے کا عزمِ مصمم کر لیا۔

میرے خیال میں دورِ حاضر میں کہ جس میں جھوٹ عام ہو کر سیاست میں سرایت کر چکا ہے اور اچھے اور برے اخلاق میں تمیز مشکل ہو چکی ہے، اس حقیقت کا صحیح طریقے سے احساس و ادراک کرنا مشکل ہے، جس کے نتیجے میں صحابہ کرام اور ان کی عظمت کو سمجھنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ اس سے بعض اوقات صحابہ کرام کو اپنے جیسے انسان سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آسمان کے جگمگاتے ستاروں اور زمین کے جگنوؤں کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا۔

د: وحی کا پیدا کردہ جوش و خروش

چوتھا محرک عہدِ نبوی میں صحابہ کے سامنے وحی کے دسترخوان کا مسلسل نزول تھا۔ ہر روز مالکِ ارض و سماء کی طرف سے انہیں ایک نیا پیغام موصول ہوتا اور وہ روزانہ ان سے غسل کر کے پاکیزگی حاصل کرتے۔ کبھی اذان مشروع ہوتی تو کبھی اقامتِ صلاۃ کا حکم نازل ہوتا۔ ایک دن نکاح مشروع ہوتا، اسے چار بیویوں تک محدود کیا جاتا اور (قیامِ عدل کی) شرط کے ساتھ مشروط قرار دیا جاتا تو دوسرے دن شراب کی حرمت نازل ہوتی اور شراب کے جاموں کو زمین پر پھینک دیا جاتا۔ یہ آسمانی پیغامات کی بعض مثالیں ہیں۔ ان پیغامات میں انہیں اپنے متعلق کبھی مبہم اور کبھی واضح اشارات بھی ملتے تھے۔ مثلاً جب قرآن کریم میں ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ﴾ کے بعد ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾

(الفتح: ۲۹) کا ذکر ہوتا تو آنکھیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف اٹھ جاتیں، جب ﴿ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ کی وحی نازل ہوتی تو آنکھیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف اٹھ جاتیں، جب وحی ﴿ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ ﴾ کا ذکر کرتی تو نگاہیں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو تلاش کرتیں اور جب ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ﴾ (الأحزاب ۲۳) ''مومنوں میں کتنے ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انہوں نے اللہ سے کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔'' کا ذکر ہوتا تو چشم تصور میں حضرت انس بن نضر کی جرأت و بسالت کا نقشہ گھوم جاتا اور آنکھیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر کی قبر کی طرف اٹھ جاتیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سورت البینہ جس کا آغاز ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾ (البينة: ۱) ''جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز رہنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آجائے۔'' سے ہوتا ہے، سنانے کا حکم دیا ہے، جس پر حضرت ابی بن کعب نے حیران ہو کر پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں۔''[614] اسی طرح جب آیت مبارکہ ﴿ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَراً ﴾ (الأحزاب: ۳۷) ''پھر جب زید نے اس سے تعلق ختم کر لیا (یعنی اس کو طلاق دے دی)'' نازل ہوئی تو اس میں السابقون الأولون میں سے حضرت زید کا نام ذکر ہوا۔

اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ فرماتے اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کہ جن کا سایہ بھی ہمیں خواب میں نظر آئے تو ہم کئی کئی دن اس کی لذت سے سرشار رہیں، کے واسطے سے اللہ کے ساتھ اس کی عظمت و جلال کے مناسب حال مسلسل رابطے میں رہتے اور اس قسم کے تعلق، فہم و ادراک اور بصیرت کے ماحول میں ان کی زندگی کے شب و روز گزرتے۔ ہم تک سنت کو پہنچانے والوں کا یہ مقام ہے۔ ان میں سے کسی کے دل میں جھوٹ کا خیال گزرنا بھی محال تھا۔ قرآن و سنت کی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں صحابہ کرام نے ایسی مضبوط بنیاد پر استوار کیا ہے کہ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدیل کا امکان باقی نہ رہا۔

ہ: سختیوں اور آسائشوں میں ان کا جذبۂ اخوت

صحابہ کرام نے مشکل ترین دور میں اسلام قبول کر کے اسلام کی دعوت کے فرائض سر انجام دیئے۔ اگرچہ آج بھی اسلام کی حمایت کے لیے کھڑا ہونا مشکل لگتا نظر آتا ہے، لیکن وہ دور زیادہ مشکل

تھا۔اس وقت اسلام تنہا اور اجنبی تھا،لیکن ایسے مشکل حالات میں بھی صحابہ کرام نے اللہ کے دین اور اس کے رسول کا ساتھ دیا۔ابن عربی اپنی کتاب ''محاضرة الأبرار'' میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا درج ذیل پیغام نقل کرتے ہیں،جو اس دور میں ان کی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ان کی بات کا حاصل یہ ہے:''اے علی!جب تم ناسمجھ بچے تھے اس وقت ہم مارے جانے کے امکان کو پیش نظر رکھے بغیر باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرسکتے تھے۔جب ہم باہر نکلتے تو کسی تلوار کے اپنے سر پر پڑنے کے امکان کو خارج ازمکان قرار نہ دے سکتے تھے۔کوئی بھی شخص یہ بات پیش نظر رکھے بغیر ''لا الہ الا اللہ'' کا اقرار نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی تیز خنجر اس کے جسم میں آ گھسے گا۔''(615)

صحابہ کرام اسلام کے اس قدر بلند مقام پر فائز تھے،اسی لیے ایک ہی لمحے میں ان کے دل کی آنکھیں حقائق کی دنیا کو دیکھنے لگتی تھیں۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں داخل ہوئے۔حضرت حارث بن مالک رضی اللہ عنہ سوئے ہوئے تھے۔آپ ﷺ نے انہیں اپنے پاؤں سے حرکت دے کر فرمایا:''اپنا سر اٹھاؤ۔''چنانچہ انہوں نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے عرض کی:''یارسول اللہ!آپ پر میرے ماں باپ قربان۔''آپ ﷺ نے پوچھا:''اے حارث بن مالک!تمہاری صبح کیسی گزری؟''انہوں نے جواب دیا:''یارسول اللہ!میں نے حقیقی ایمان پر صبح کی۔''آپ ﷺ نے پوچھا:''ہر حق کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔تمہارے اس دعوے کی کیا حقیقت ہے؟''انہوں نے عرض کی:''میں نے دنیا سے علیحدگی اختیار کرلی ہے،دن کو پیاسا رہتا ہوں اور راتیں جاگ کر گزارتا ہوں۔مجھے ایسا لگتا ہے،جیسے میں اپنے پروردگار کے عرش کو دیکھ رہا ہوں اور اہل جنت کو جنت میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اور اہل جہنم کو دوزخ میں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔''نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا:''تمہارا دل اللہ تعالیٰ نے منور کردیا ہے اور تم نے (حقیقت کو) پالیا ہے،لہٰذا اس پر ثابت قدم رہنا۔''(616)

ان کے قربِ خداوندی کا یہ عالم تھا۔یہی وجہ تھی کہ ازروئے حدیث قدسی اللہ تعالیٰ ان کی آنکھ بن گئے تھے کہ جس سے وہ دیکھتے تھے،ان کے کان بن گئے تھے کہ جن سے وہ سنتے تھے،ان کی زبان بن گئے تھے کہ جس سے وہ بولتے تھے اور ان کے ہاتھ بن گئے تھے کہ جن سے وہ پکڑتے تھے۔(617)

۴- صحابہ کرام قرآن کی نظر میں

بہت سے ائمہ ومجتہدین کی طرح علامہ ابن حزم بھی لکھتے ہیں کہ تمام صحابہ جنتی ہیں۔(618) صحابہ کرام کے درمیان اسی زندگی میں ہی جنت کی خوشخبری پانے والے دس صحابہ کا وجود جنت کے ایک مخصوص حصے پران کی ملکیت کی دلیل ہے۔ قرآن وسنت کے متعدد دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم میں سورۃ الفتح کی آخری آیات میں ہے۔ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ﴾ ''محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔'' اللہ پر ایمان کے بعد سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ محمد ﷺ اللہ کی طرف سے تمام انسانیت کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً﴾ (الفتح: ۲۹) ''اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل (اے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے کہ اللہ کے آگے جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف تورات میں ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں، جس نے پہلے زمین سے اپنی کونپل نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔ جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان سے اللہ نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔''

وہ کون سا اجر عظیم ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے؟ قرآن کریم نے اس اجر کی ماہیت کی وضاحت نہیں کی، کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ انہیں فردوسِ بریں میں ایسی غیر متوقع صورتحال کا سامنا ہو، جسے کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا۔(619)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگ بدر میں حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نوعمری میں شہید ہوگئے۔ ان کی والدہ نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی: ''یارسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ حارثہ کی میرے نزدیک کیا قدر و منزلت تھی۔ اگر تو وہ جنت میں ہے تو پھر میں ثواب کی

نیت سے صبر کروں اور اگر کوئی دوسری صورت ہے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ میں کیا کرتی ہوں۔"
آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تیرا ناس ہو! کیا پاگل ہوگئی ہے؟ کیا صرف ایک جنت ہے؟ جنتیں تو بہت ساری ہیں اور وہ تو جنت الفردوس میں ہے۔"(620)

یہ ایک عام صحابی تھے، جو کافی عرصہ بعد ایمان لائے۔ جب انہیں اعلیٰ ترین جنت "جنت الفردوس" حاصل ہو سکتی ہے تو آپ کا ان بڑے بڑے صحابہ کرام کے بارے میں کیا خیال ہے، جن کے ذریعے ہم تک سنت نبویہ اور حقیقت احمدیہ پہنچی ہے؟ ان کی طرف جھوٹ کی نسبت یا انہیں دوزخی قرار دینے والوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی؟ اور ایسی رائے انسان کو کس طرف لے جائے گی؟

قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (التوبة: ۱۰۰) "جن لوگوں نے سبقت کی یعنی سب سے پہلے ایمان لائے مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔" اور اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک سے ارشاد فرمائیں گے: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ () ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً () فَادْخُلِي فِي عِبَادِي () وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰) "اے اطمینان والی جان! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی سو تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔" اگرچہ بعض لوگ ان سے خوش نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے لیے ایک بہشت کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بہت سی جنتیں تیار کر رکھی ہیں: ﴿وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (التوبة: ۱۰۰) "اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔"

مہاجرین نے اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ کر ہجرت کی۔ اپنی خواہشاتِ نفس کو تو وہ اس سے پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے معصیت کو چھوڑ کر اطاعت کی طرف، خواہشاتِ نفس کو چھوڑ کر روحانی پاکیزگی کی طرف اور مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسری طرف انصار وہ نیک ہستیاں تھیں، جنہوں نے ان کے لیے اپنے دلوں کے دریچے اور گھروں کے دروازے کھول دیئے۔ ان کے اپنے مہاجر بھائیوں کا خیال رکھنے کا اندازہ درج ذیل واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ربیع اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات قائم کی۔ حضرت سعد کی دو بیویاں تھیں۔ وہ حضرت عبدالرحمٰن کو اپنے گھر لے گئے اور انہیں اپنے اہل اور مال میں سے نصف لینے کی پیشکش کی، لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ان کے اہل اور مال کے لیے برکت کی دعا کی اور فرمایا: ''مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دو۔'' چنانچہ وہ بازار گئے، جہاں انہیں تھوڑا سا پنیر اور گھی منافع میں حاصل ہوا۔(621) یہ ان کے اپنے بھائیوں کا خیال رکھنے کا انداز اور نوعیت تھی۔

اس کی ایک اور مثال صحابی رسول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے۔ وہ قبیلہ دوس سے آئے اور اسلام قبول کر کے ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہنے لگے، تاکہ آپ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث کو امت تک پہنچائیں۔ وہ دن کو روزہ رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے۔(622) وہ اکثر اوقات بھوکے رہتے اور بعض اوقات تو بھوک اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ تکلیف سے لوٹ پوٹ ہونے لگتے اور دیکھنے والے انہیں پاگل سمجھتے، لیکن وہ فرماتے ہیں: ''میں رسول اللہ ﷺ کے منبر اور حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان گر پڑتا۔ لوگ مجھے مجنون سمجھتے، حالانکہ مجھے کوئی جنون نہ تھا، بلکہ بھوک نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔(623) فقر و فاقہ کی یہ صورتحال صرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ہی پیش نہ تھی، بلکہ ایسے اور لوگ بھی تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ میں فاقے میں مبتلا ہوں۔'' آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کی طرف پیغام بھیجا، لیکن ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا کوئی شخص آج رات مہمان نہیں بناتا؟ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائیں گے۔ اس پر انصار میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں (حاضر ہوں)۔'' چنانچہ وہ صحابی اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور اپنی بیوی سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کا مہمان ہے اس سے کوئی چیز بچا کر مت رکھنا۔'' ان کی بیوی نے کہا: ''بخدا! میرے پاس بچوں کے کھانے کے سوا کچھ نہیں۔'' صحابی نے کہا: ''جب بچے رات کا کھانا مانگیں تو انہیں بہلا پھسلا کے سلا دینا اور پھر چراغ گل کر دینا۔ آج رات ہم بھوکے سوئیں گے۔'' چنانچہ ان کی بیوی نے ایسے ہی کیا۔ جب صبح وہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فلاں مرد اور عورت پر تعجب فرمایا (یا فرمایا) تبسم فرمایا۔'' اس کے بعد اللہ عزوجل نے ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر: ۹) ''اور ان کو اپنی جانوں پر مقدم رکھتے ہیں، خواہ وہ خود بھی فاقے سے ہوں۔'' نازل فرمائی۔(624)

بلاشبہ وہ اتنے عظیم مقام پر فائز تھے کہ اِس دور کے انسان کے لیے اُس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ان کے دل صاف اوران کے نفوس ہر قسم کی کجی سے پاک تھے، یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی ان سے اپنی رضامندی کا اعلان فرما دیا تھا۔ وہ حقیقی مؤمن تھے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے محبت کرتے اوران سے خوش ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً﴾ (الفتح: ۱۸) ''(اے پیغمبر) جب مؤمن تم سے اس درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسکین نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔''

صحابہ کرام اللہ اوراس کے رسول کے ساتھ کیے گئے وعدے سے پھرے اور نہ ہی انہوں نے اپنی بیعت توڑی، بلکہ جو وعدہ کیا اسے سچ کر دکھایا اور ہر واقعے اور بات میں اپنی صداقت کو ثابت کیا۔ قرآن کریم ان کی تعریف کرتے اوران کی صداقت کو خلود بخشتے ہوئے کہتا ہے: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلاً﴾ (الأحزاب: ۲۳) ''مؤمنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انہوں نے اللہ سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا پھران میں بعض ایسے ہی جنہوں نے اپنی نذر پوری کردی (یعنی جان دے دی) اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کررہے ہیں اور انہوں نے اپنے قول کو ذرا بھی نہیں بدلا۔''

انہوں نے اپنی جان و مال کو راہِ خدا میں اور جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے لگانے کا عہد کیا تھا جسے انہوں نے پورا کر دکھایا۔ ان میں سے بعض معرکوں میں شہادت سے سرفراز ہوئے، لیکن جنگ سے پیچھے ہٹے اور نہ ہی بھاگے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شہادت پاکر سید الشہداء کے مقام پر سرفراز ہوئے۔ حضرت انس بن نضر بھی غزوہ احد میں شہید ہوکر اپنے پروردگار سے جا ملے۔ عبداللہ بن جحش، مصعب بن عمیر اور درجنوں دیگر صحابہ غزوہ بدر و احد میں شہید ہوئے۔ ان کے سوا باقی صحابہ شہادت کے منتظر رہے۔ انہی میں سے ایک حضرت ابوعقیل بھی تھے، جو غزوہ احد، فتح مکہ اور غزوہ مؤتہ میں شہادت کے متمنی رہے اور بالآخر جنگ یمامہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

انہوں نے اپنی جانوں کے بارے میں اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان میں کوئی تبدیلی کی اور نہ خود بدلے۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک اپنے عہد و پیمان پر پہلے دن کی طرح قائم رہے۔ دنیا انہیں بدل سکی اور نہ فتنے میں مبتلا کرسکی۔ خواہشاتِ نفس نے انہیں غفلت میں مبتلا نہ کیا، بلکہ وہ ثابت قدم رہے اوراس نورانی قافلے کی برکت سے تاریکی کے پردے چاک ہوگئے۔

۵- صحابہ کرام احادیث شریفہ کی روشنی میں

صحابہ کرام ہم تک سنت مطہرہ پہنچانے والی پاکیزہ ندیاں ہیں۔قرآن کریم نے ان کی تعریف کر کے انہیں زندہ وجاوید بنادیا ہے۔آئندہ سطور میں ہم دیکھیں گے کہ احادیث مبارکہ میں صحابہ کرام کی تعریف کس انداز سے کی گئی ہے۔

الف: بخاری ومسلم اور احادیث کی دیگر کتب صحاح میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جو حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی طرح ان نوجوان صحابہ میں سے تھے، جنہوں نے اپنی زندگی احادیث نبویہ یاد کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی، سے مرفوعاً مروی ہے: ''میرے صحابہ کو بُرا بھلا مت کہو۔میرے صحابہ کو برا بھلامت کہو، کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی بقدر سونا صدقہ کرے تو وہ ان کے ایک بلکہ نصف مد کے ثواب کو نہیں پاسکتا۔ (625)

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مشکل اور تاریک ترین دور میں اسلام کا دفاع کیا تھا، لہٰذا ان پر انگلی اٹھانا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ ہم ان کے بارے میں کوئی نازیبا بات نہیں کہہ سکتے۔ماضی میں بعض غلط افکار کے پیروکار، بعض مستشرقین جن کی اسلام دشمنی ان کا مذہب بن چکی تھی اور ان کے مقلد مسلمان جن بیچاروں کو مغرب کی مادی ترقی نے مبہوت کر دیا تھا اور مستشرقین جن کا قبلہ وکعبہ بن گئے تھے، صحابہ کرام کے حق میں نازیبا باتیں کہتے رہے ہیں۔

ب: امام ترمذی حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں: ''میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈور۔میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ میرے بعد انہیں ہدف (تنقید) نہ بنانا۔جو اُن سے محبت کرتا ہے وہ میری وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے۔جس نے انہیں ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی، جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی اللہ تعالیٰ عنقریب اس کی گرفت فرمائیں گے۔'' (626)

ج: امام مسلم سے مروی ہے: ''ستارے آسمان کے محافظ ہیں۔جب ستارے نہ رہیں گے تو آسمان کو اس انجام سے دوچار ہونا پڑے گا، جس کا اسے خدشہ ہے۔میں اپنے صحابہ کا محافظ ہوں۔جب میں چلا جاؤں گا تو انہیں ان حالات کا سامنا کرنا پڑے گا، جن سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اور میرے صحابہ

میری امت کے محافظ ہیں۔ جب وہ چلے جائیں گے تو میری امت پر ایسے حالات آئیں گے، جن کا اسے اندیشہ ہے۔"(627)

جس طرح قیامت کے دن ستارے تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جائیں گے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے لیے اور آپ کے صحابہ آپ کی امت کے لیے تسبیح کے امام کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو یکجا رکھنے کے لیے ناگزیر تھے اور صحابہ کرام اولیاء، اصفیاء اور صلحاء کے ذریعے امت کے نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھے۔

د: بخاری و مسلم اور کتب صحاح میں روایت کردہ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں پھر ان کے بعد والے اور پھر ان کے بعد والے۔ ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے، جن کی گواہی ان کی قسم پر اور ان کی قسم ان کی گواہی پر سبقت کرے گی۔(628) یعنی اس کے بعد جھوٹ اور وعدہ خلافی کا دور آئے گا، جس میں گواہی قسم پر اور قسم گواہی پر سبقت کرتی دکھائی دے گی۔

صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کا دور جھوٹ سے پاک تھا۔ تبع تابعین کے دور کے بعد جھوٹ کا ظہور ہوا، معتزلہ، مرجئہ اور مشبہہ وغیرہ فرقے پیدا ہوئے اور جھوٹ عام ہوگیا۔ آج صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنے والے مستشرقین کے ہاں جھوٹ عام ہے اور مغرب سے مرعوب بعض مسلمان بھی اس بارے میں ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

ہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جن کے حق میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ بھیجتے ہوئے اہل کوفہ سے فرمایا تھا: "میں تمہیں اپنے اوپر ترجیح دے کر انہیں تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔"(629) فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو محمد ﷺ کے قلب اطہر کو سب سے بہتر پایا، چنانچہ اسے اپنے لیے چن لیا اور اسے اپنا پیغام دے کر بھیجا پھر محمد ﷺ کے سوا دیگر بندوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ ﷺ کے صحابہ کے دلوں کو سب سے بہتر پایا، چنانچہ انہیں آپ ﷺ کے وزراء بنایا جو آپ ﷺ کے دین کی خاطر لڑتے ہیں۔"(630) اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، زبیر، طلحہ، عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوعبیدہ بن جراح ایسے صحابہ کرام کا انتخاب فرمایا۔

و: ابونعیم اپنی کتاب "الحلیۃ" میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: "اگر کسی نے کسی کے راستے پر چلنا ہے تو ان لوگوں کے راستے پر چلے جو فوت ہو چکے ہیں، یعنی

محمد ﷺ کے صحابہ کے راستے پر چلے جو امت کے بہترین افراد تھے۔ وہ سب سے زیادہ نیک دل، علمی اعتبار سے سب سے زیادہ گہرائی کے حامل اور سب سے کم تکلف کرنے والے انسان تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مصاحبت اور اپنے دین کی اشاعت کے لیے چنا تھا، لہٰذا ان کے اخلاق اور طرزِ زندگی کی مشابہت اختیار کرو۔ رب کعبہ کی قسم! محمد ﷺ کے صحابہ سیدھی ہدایت پر تھے۔''(631)

ز: ''الــــحِــــلیة'' کے مصنف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں: ''تم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے زیادہ روزے رکھتے، نمازیں پڑھتے اور محنت کرتے ہو، لیکن اس کے باوجود وہ تم سے بہتر ہیں۔'' لوگوں نے پوچھا: ''اے ابو عبدالرحمٰن اس کی کیا وجہ ہے؟'' انہوں نے فرمایا: ''وہ دنیا سے (تمہاری بہ نسبت) زیادہ بے رغبت اور آخرت کے زیادہ مشتاق تھے۔''(632)

۶: زیادہ احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام

زیادہ احادیث روایت کرنے والے صحابہ خصوصاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مستشرقین اور ان کے پیروکاروں کی تنقید کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔

چونکہ دین ہم تک صحابہ کرام کے ذریعے سے پہنچا ہے، اس لیے ان پر تنقید دین پر تنقید کے مترادف ہے۔ یہ دین ہمارے پاس امانت ہے، اس لیے ہر قسم کے حملے اور تنقید سے اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ صحابہ کرام نے اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے سرانجام دی اور ان کی زندگی طعن و تشنیع سے پاک دور میں گزری۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام کو کسی قسم کے دفاع کی ضرورت نہیں، لیکن ہم ان پر کیے جانے والے اعتراضات کا بے بنیاد ہونا اس لیے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان پر اعتراض کرنے کا اصل مقصد ہمارے دین پر اعتراض کرنا ہے۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار بڑے تقدس اور پاکیزگی کے حامل تھے، لیکن جونہی فلسفیانہ رجحانات اور اجنبی افکار مسلمانوں میں داخل ہوئے جبریہ، مرجئہ، معتزلہ اور مشبّہہ ایسے باطل فرقوں کا ظہور ہونے لگا۔ جنہوں نے ایک طرف اپنی خواہشات اور افکار کی تائید میں احادیث گھڑنا شروع کیں تو دوسری طرف اپنے غلط افکار سے متصادم احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام پر تنقید کا آغاز کیا، یہی وجہ ہے کہ ہم بعض معتزلی اور شیعی ائمہ مثلاً نظّام اور ابو اسحاق کو روایت حدیث میں مرکزی حیثیت رکھنے والے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام پر تنقید کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جنہوں نے تمام صحابہ کرام کی طرح عزت و استقامت کے ساتھ قابلِ فخر زندگی گزاری۔ اس موضوع کی

اہمیت کے پیشِ نظر آئندہ سطور میں ہم حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس، ابن عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے آغاز کرتے ہوئے ایسے تمام صحابہ کرام کا مختصر تعارف پیش کریں گے۔

الف: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یمن کے قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہجرت کے ساتویں سال کے آغاز میں اسلام قبول کیا، مدینہ منورہ ہجرت کی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چار سال تک رہنے کی سعادت حاصل کی۔ جب قبیلہ دوس کے سردار حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور وہ مشعلِ ہدایت بن کر اپنے قبیلے کی طرف لوٹے تو ان کے ہاتھ پر ان کے قبیلے کے جن بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں حضرت ابو ہریرہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔(633)

جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ خیبر کی دہلیز پر تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تیزی سے خیبر کی طرف بڑھے اور آپ ﷺ کے لشکر سے جا ملے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے اپنا نام عبدالشّمس بتایا جس پر آپ ﷺ نے انہیں سمجھایا کہ انسان شمس وقمر کا بندہ نہیں، بلکہ صرف اللہ کا بندہ ہے۔ آپ ﷺ نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا، لیکن ان کی شہرت ابو ہریرہ کے نام سے ہوئی، کیونکہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلی کے بچے کو گود میں لیے دیکھا تو ان سے فرمایا: "یاأباهريرة!" "اے بلی کے بچے والے!" اس کے بعد وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ وہ لوگوں سے ابو ہریرہ کہلوانا پسند کرتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ فقیر تھے اور کسی چیز کے مالک نہ تھے۔ دوسرے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی خوشی کے لمحات میں انہیں ابو ہریرہ کہہ کر پکارا تھا۔ ان کا اس نام سے پکارے جانے کو پسند کرنا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے تعلق و محبت کو ظاہر کرتا ہے۔(634)

اگرچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن انہیں ایک بہت بڑی مشکل یہ درپیش تھی کہ ان کی والدہ نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی والدہ نے انہیں یتیمی کی حالت میں پالا تھا۔ وہ اپنی والدہ کے احسانات سے گراں بار تھے اور اپنی والدہ کے احسانات کا حقیر سا بدلہ دینے کے لیے ان کے قبولِ اسلام کے متمنی اور اس کے لیے کوشاں رہتے، اسی غرض سے وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اپنی والدہ کی ہدایت اور کلمہ توحید کی گواہی دینے کے لیے اللہ کے حضور دعا کرنے کی درخواست کی۔

ان سے مروی ایک روایت میں ہے: ''میری والدہ مشرکہ تھیں اور میں انہیں قبول اسلام کی دعوت دیتا تھا۔ ایک دن میں نے انہیں دعوت دی تو انہوں نے رسول ﷺ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جو مجھے ناگوار گزری۔ میں روتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتا تھا، لیکن وہ انکار کر دیتیں۔ آج میں نے انہیں دعوت دی تو انہوں نے آپ کے بارے میں ایسی بات کہی تو مجھے ناگوار گزری۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ابوہریرہ کی والدہ کی ہدایت کی دعا فرمایئے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! ابوہریرہ کی والدہ کو ہدایت نصیب فرما۔'' میں رسول اللہ ﷺ کی دعا سن کر خوشی خوشی باہر نکلا اور جب گھر کے دروازے پر پہنچا تو اسے بند پایا۔ میری والدہ نے میرے قدموں کی چاپ سن کر کہا: ''اے ابوہریرہ! (باہر) ٹھہرے رہو۔'' اس دوران میں نے پانی کے گرنے کی آواز سنی۔ میری والدہ نے غسل کیا، چادر پہنی اور جلدی میں دوپٹہ اوڑھے بغیر ہی دروازہ کھولا اور کہا: ''اے ابوہریرہ! میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول اللہ ﷺ ہیں۔'' یہ سن کر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف واپس لوٹا اور خوشی سے روتے ہوئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: ''یا رسول اللہ! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول فرما کر ابوہریرہ کی والدہ کو ہدایت نصیب فرما دی ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان فرمائی پھر میں نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ اپنے مؤمن بندوں کے دلوں میں میری اور میری والدہ کی محبت اور میرے اور میری والدہ کے دل میں اہل ایمان کی محبت ڈال دیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! اپنے بندے (ابوہریرہ) اور اس کی والدہ کو اپنے مؤمن بندوں کے ہاں محبوب بنا دے اور ان کے دل میں اہل ایمان کی محبت ڈال دے۔''(635) یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں۔ جو لوگ ان سے محبت نہیں کرتے ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کا اختیار ہم قارئین کے سپرد کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رات دن نبی کریم ﷺ کے ہمراہ رہتے تھے۔ وہ حیرت انگیز قوتِ یادداشت کے مالک تھے۔ وہ رات کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ایک حصے میں آرام کرتے، ایک حصے میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور آخری حصہ رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث کے تکرار و مذاکرے میں گزارتے۔ وہ بیک وقت عالم، فقیہ اور حافظ الحدیث تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مسجد میں دعا مانگی: ''اے اللہ! میں آپ سے نہ بھولنے والا علم مانگتا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ دعا سن کر ''آمین'' کہا۔(636)

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کے ان کی قوتِ یاداشت پر گہرے اثرات تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''یا رسول اللہ! میں آپ سے بہت سی احادیث سنتا ہوں، لیکن بھول جاتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی چادر بچھاؤ۔'' میں نے چادر بچھائی آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے چلو بھرا (اور اس میں ڈال دیا) اور پھر فرمایا: ''اسے ملا دو۔'' میں نے اسے ملا دیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی بات نہیں بھولی۔[637] جب ان سے کہا گیا کہ وہ احادیث بہت روایت کرتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: ''ہمارے مہاجر بھائیوں کو بازار میں خرید و فروخت مشغول رکھتی اور ہمارے انصار بھائی اپنے مال و متاع میں مشغول رہتے، لیکن ابو ہریرہ پیٹ بھر کھانے پر ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہتا۔ (جس کے نتیجے میں) وہ ان مواقع پر موجود ہوتا جن پر دوسرے لوگ موجود نہ ہوتے اور ایسی باتیں سن لیتا جو دوسرے نہ سن پاتے۔''[638]

یہ حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہے اور کبھی بھی آپ سے جدا نہ ہوئے۔ وہ کئی کئی دن تک بھوکے رہتے اور جب کوئی چیز کھانے کو نہ ملتی تو صوم وصال (روزے پر روزہ) رکھتے۔ بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل روزہ رکھتے۔[639] بعض اوقات بھوک کی شدت سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے، لیکن دیکھنے والے انہیں مرگی کا مریض سمجھتے۔[640] کبھی وہ ملنے یا پاس سے گزرنے والوں کو قرآن سنانے کا کہتے، لیکن عام طور پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے سوا ان کی مراد کوئی نہ سمجھتا، اس لیے بعض لوگ انہیں قرآن کریم کی بعض آیات سنا کر اپنی راہ لیتے، تاہم حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ ان کا مقصد سمجھ جاتے اور انہیں اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاتے۔

جس طرح حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کھانا کھلاتے اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ کے لیے ممکن ہوتا آپ بھی انہیں کھانا کھلاتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے سنی ہوئی کوئی بات کبھی فراموش نہیں کی، بلکہ آپ ﷺ کے ارشادات کو قیامت تک کے لیے خلود بخشنے کے لیے آپ ﷺ کی ہر بات کو نقل کیا۔ وہ کہا کرتے تھے: ''اگر قرآن کریم کی دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔''[641] اس کے بعد وہ درج ذیل آیات مبارکہ تلاوت کرتے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَـٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ () إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَـٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ (البقرۃ: ۱۵۹-۱۶۰)[642] ''جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض فاسد سے) چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسوں پر خدا اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں، ہاں جو توبہ

کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے اور (احکامِ الٰہی کو) صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا (اور) رحم کرنے والا ہوں۔"

اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث بھی روایت نہ کرتے۔ ایسے صاف دل، سلیم الطبع اور رسول اللہ ﷺ ایسی عظیم المرتبت شخصیت کے ساتھ چار سال تک مسلسل رہنے والے انسان کے لیے یہی کافی تھا کہ کسی نے بھی ان کے آپ ﷺ کے قرب پر تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ اعلیٰ کردار کے حامل لوگوں کو پسند فرماتے تھے۔ میرے خیال میں یہ بات حضرت ابوہریرہ کی علوشان کی کافی دلیل ہے۔ اس حقیقت کا ادراک صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جسے کسی عظیم المرتبت شخصیت کے قریب رہنے کا تجربہ ہوا ہو۔ بعض لوگوں کے دعوے کے علی الرغم صحابہ کرام حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی منفی رائے نہ رکھتے تھے۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جنہوں نے بالکل آغاز میں عقبہ کے موقع پر رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے گھر میں آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا اور استنبول کو اپنی مہمانی کا شرف بخشا،(643) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کرتے تھے۔ حضرت ابوالشعثاء کہتے ہیں: "میں مدینے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کی: 'کیا آپ ﷺ کے ہاں (خصوصی) مقام رکھنے کے باوجود آپ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؟' انہوں نے فرمایا: "مجھے ابوہریرہ سے روایت کرنا نبی اکرم ﷺ سے (براہِ راست) روایت کرنے کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔"(644)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صرف حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے ہی احادیث روایت نہیں کیں، بلکہ عبداللہ بن عمر، حبر الامت عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، انس بن مالک اور واثلہ بن اسقع ایسے بہت سے جلیل القدر اور علم حدیث کے اساطین صحابہ کرام نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، نیز حسن بصری، زید بن اسلم، ان کے داماد سعید بن مسیّب، عکرمہ، مجاہد، سعید بن یسار، سلیمان بن یسار، شعبی، ہمام بن منبہ اور محمد بن منکدر جو "البکاء" کے لقب سے معروف تھے، ایسے علم حدیث میں ید طولیٰ رکھنے والے تابعین عظام نے بھی ان سے روایت حدیث کی ہے۔(645)

۱۔ **حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما**

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے شدید محبت تھی، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بحرین کا گورنر مقرر کیا تھا، لیکن پھر انہیں معزول کر کے ان کی جگہ کسی

دوسرے شخص کا تقرر کر دیا۔ شاید ان کی معزولی کا سبب ان کا تجارت کے ذریعے اس قدر سرمایہ اکٹھا کرنا تھا، جس قدر آج کے ایک غریب شخص کے پاس سرمایہ ہوتا ہے۔ اس دور کے گورنروں، منتظمین اور خلفاء کی ملکیت میں کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ بہت سے گورنر جب ان صوبوں میں جاتے جہاں ان کی تقرری ہوئی ہوتی تھی تو ان کے پاس پانی کے ایک مشکیزے کے سوا کوئی چیز نہ ہوتی تھی اور جب واپس آتے تو بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ جو شخص اس اصول کی خلاف ورزی کرتا اسے عام طور پر معزول کر دیا جاتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ معمولی سا سرمایہ رشوت یا اختیارات کے غلط استعمال کے ذریعے حاصل نہیں کیا تھا، چنانچہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر اصل حقیقت کھلی تو انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ گورنر بنانے کے لیے بلایا، لیکن انہوں نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم سے بہتر شخص نے گورنر بنائے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ تو یوسف تھے جو خود بھی اللہ کے نبی تھے اور اللہ کے نبی کے بیٹے تھے، لیکن میں تو ابو ہریرہ بن امیمہ ہوں۔ مجھے بغیر علم کے کوئی بات کہنے یا غلط فیصلہ کرنے کی وجہ سے تین باتوں یعنی اپنی پشت پر (کوڑے) مارے جانے، بے عزتی کیے جانے اور مال چھین لیے جانے کا اندیشہ ہے۔''(646)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے صرف حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کو ہی معزول نہ کیا تھا، بلکہ انہوں نے عشرہ مبشرہ صحابہ کرام میں سے حضرت سعد بن ابی وقاص اور بالکل آغاز میں اسلام قبول کرنے والے صحابہ کرام میں سے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے مناصب سے معزول کیا تھا، حتیٰ کہ اہل کوفہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے شکایت کرتے کہا تھا کہ وہ نماز صحیح نہیں پڑھاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلا کر تحقیق کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اس بات پر دکھ ہوا اور انہوں نے فرمایا: ''بخدا! میں انہیں بلا کم و کاست رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق نماز پڑھاتا تھا۔ عشاء کی نماز میں پہلی دو رکعتیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھاتا اور آخری دو رکعتیں مختصر پڑھاتا۔''(647) پھر انہوں نے اپنے اسلام لانے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا: ''میں راہِ خدا میں تیر چلانے والا پہلا عرب ہوں۔ بخدا! ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ایسی حالت میں جہاد کرتے تھے کہ ہمارے پاس ببول کے پھل کے پتوں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی، جسے کھانے سے ہمارا پاخانہ بکری کی خشک مینگنیوں کی طرح نکلتا تھا، لیکن پھر (افسوس کے ساتھ وہ دن بھی آیا جب) بنو اسد دینی امور میں مجھے ملامت کرنے لگے۔ (اگر وہ واقعی حق بجانب ہیں) تب تو میں نامراد ہوا اور میرے اعمال ضائع ہو گئے۔''(648)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہہ کر دوبارہ کوفہ جانے سے انکار کر دیا۔ (649)
لہٰذا معزول کیے جانے اور دوبارہ گورنری کو قبول نہ کرنے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تنہا نہ تھے۔

۲- حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما

بعض لوگوں کے دعوؤں کے علی الرغم حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ اگرچہ جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہہ کر حدیث روایت کی کہ ''میرے خلیل نے کہا اور میں نے اپنے خلیل سے سنا'' تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یہ کہتے ہوئے ان پر اعتراض کیا کہ آپ ﷺ کب آپ کے خلیل تھے۔ (650)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اعتراض خلوصِ نیت پر مبنی تھا۔ اگرچہ کسی شخص کا اپنے محبوب کو خلیل کہنا قابل تعجب بات نہیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے مناسب نہ سمجھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسا شخص، جس نے آغوشِ نبوت میں پرورش پائی اور بالکل آغاز میں اسلام قبول کیا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بات کہہ سکتا تھا، کیونکہ ہم پلہ اور ہم مرتبہ لوگوں کے درمیان اس قسم کی گفتگو ہوتی رہتی ہے، لیکن ان سے کم مرتبہ لوگوں کو ان کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حق نہیں پہنچتا، مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بات طعنہ دینے کے ارادے سے نہیں کہی تھی۔ اسے طعنے پر محمول کرنا ناواقفیت کی دلیل ہے۔

۳- بنوامیہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

بعض لوگوں کے خیال کے علی الرغم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف تھے اور نہ ہی بنوامیہ کے حلیف و حامی تھے، چنانچہ جب فتنوں کا ظہور ہوا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے درج ذیل حدیث روایت کر کے اسے عالم اسلام میں پھیلا دیا: ''عنقریب فتنوں کا ظہور ہوگا، جن میں بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہوئے شخص سے، کھڑا ہوا شخص چلنے والے شخص سے اور چلنے والا شخص دوڑنے والے شخص سے بہتر ہوگا۔ جو شخص ان پر جھانکے گا وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں گے۔ جس شخص کو اس وقت کوئی ٹھکانہ یا جائے پناہ میسر ہو وہ اس کی پناہ لے لے۔'' (651)

یہ ان کا اجتہاد تھا۔ شاید فتنے کی آگ بجھانے کے لیے ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صف میں شامل ہونا ضروری تھا اور اس حدیث نبوی سے یہ فتنہ مراد نہ تھا، بہرکیف! انہوں نے اس حدیث کا یہی مفہوم سمجھا تھا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آنے والے واقعات

میں شریک ہونے کے بجائے گھر میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ اگر ایمان کی مضبوطی اور خوفِ خدا نہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے اور اگر وہ بنوامیہ کے حامی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پرستار ہوتے تو بنوامیہ کے لشکر میں شامل ہونے سے کوئی امر مانع نہ تھا، (لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔) حقائق کو مسخ کرنے والے گولڈزیہر (Goldziher) احمد امین، ابوریہ اور علی عبدالرزاق ایسے جو لوگ اس کے برعکس دعوی کرتے ہیں وہ "العقد الفرید" ایسی ادب کی کتاب، جس کا علم حدیث سے کوئی تعلق نہیں پر ماخذ کی حیثیت سے بھروسا کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ پہلے تحقیق کے دوران مآخذ سے استفادہ کرنا سیکھیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کا دعوی ہے کہ البدایة و النهایة میں ابن کثیر کے بقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت معاویہ کا ساتھ دیا تھا، حالانکہ ابن کثیر نے اپنی اس کتاب میں اس کے بالکل برعکس موقف اختیار کیا ہے۔ ابن کثیر کے بقول ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بنوامیہ کے حامی نہ تھے، بلکہ ان کے لیے بہت بڑی مشکل کا باعث تھے۔[652] کیونکہ انہوں نے عبدالملک کے باپ مروان کے سامنے کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان کی تھی: ''میری امت کی تباہی قریش کے ناسمجھ لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی۔'' یہ سن کر مروان نے کہا: ''ان لڑکوں پر اللہ کی لعنت!'' اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر میں چاہوں تو بتا سکتا ہوں کہ وہ فلاں فلاں کے لڑکے ہیں۔'' عمرو بن یحییٰ راوی کہتے ہیں کہ جب بنومروان کی شام میں حکومت قائم ہوئی تو میں اپنے دادا کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ نوخیز لڑکے تھے۔ میرے دادا نے ہمیں بتایا: ''شاید یہ بھی انہی میں سے ہیں۔''[653] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راستے میں چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ! میں ٦٠ (ہجری) کا سال نہ دیکھوں۔'' دوسرے لفظوں میں وہ اللہ سے لڑکوں کا دورِ حکومت نہ دیکھنے کی دعا کرتے تھے۔[654] ان کی یہ دعا لوگوں میں اس قدر مشہور ہوئی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملنے والے بہت سے لوگ یہ دعا کرنے لگے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ کی یہ دعا قبول فرمائی اور ٥٩ ہجری میں ان کا انتقال ہو گیا اور ٦٠ ہجری میں حکومت ایک لڑکے کے ہاتھ میں آگئی، کیونکہ اس سال حکومت کی باگ ڈور یزید نے سنبھال لی تھی۔

٤۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ

بعض لوگوں کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حضرت ابو ہریرہ پر تنقید کرنے کا دعوی ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ﴾ (النساء:٤٣) یا ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ﴾ (الماعون:٤) ایسی آیات سے ناقص استدلال

کرنے کے مترادف ہے۔ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرے میں نماز پڑھ رہی تھیں کہ انہوں نے اپنے حجرے سے متصل حصے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہوئے سنا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملنے کے لیے گئیں، لیکن کیونکہ وہ جا چکے تھے، اس لیے ان سے مل نہ سکیں۔ اس پر انہوں نے حضرت عروہ بن زبیر سے فرمایا: ''کیا تمہیں ابو ہریرہ پر تعجب نہیں ہوتا؟ وہ آئے اور میرے حجرے کے پہلو میں بیٹھ کر نبی کریم ﷺ سے احادیث بیان کرنے لگے۔ نماز پڑھتے ہوئے مجھے ان کی آواز سنائی دے رہی تھی، لیکن میرے نماز سے فارغ ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے۔ اگر میں انہیں پا لیتی تو انہیں بتاتی کہ رسول اللہ ﷺ ان کی طرح جلدی جلدی گفتگو نہ فرماتے تھے۔'' (655)

ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ کا اشارہ احادیث کی روایت میں میانہ روی اختیار کرنے اور یکے بعد دیگرے جلدی جلدی احادیث بیان نہ کرنے کے وجوب کی طرف تھا، تاکہ ہر حدیث کا سننے والوں کے ذہنوں پر اثر برقرار رہے اور وہ ان کے دلوں میں نقش ہو جائے۔

۵- امام ابو حنیفہ اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ بشمول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تین صحابہ کرام کی بات کو حجت تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اتنے بڑے امام سے ایسے کلام کا صادر ہونا ممکن ہے اور نہ ہی انہیں ایسی بات زیب دیتی ہے۔ اگر انہوں نے ایسی بات کہی ہوتی تو فتح القدیر کے مصنف اور حنفی مسلک کے بڑے امام علامہ کمال بن ہمام یہ نہ کہتے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا شمار بڑے فقہاء میں ہوتا ہے۔ اگر ابن ہمام ایسے جلیل القدر عالم کے اپنے مسلک کے امام حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بات کو حجت تسلیم نہ کرتے ہوتے تو وہ ان کے بارے میں یہ بات نہ کہتے، مزید برآں کوئی اس کی نشان دہی نہیں کرتا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے یہ بات کس موقع پر کہی تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پانچ ہزار سے زائد احادیث روایت کی ہیں۔ اگر ان احادیث کو ایک کتاب میں جمع کیا جائے تو اس کی ضخامت قرآن کریم سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہوگی۔ ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جنہوں نے چھ ماہ کے عرصے میں قرآن کریم حفظ کیا ہے، لہٰذا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایسے ذہین اور قوی یادداشت کے مالک صحابی پر یہ الزام لگانا کہ وہ دو سال کے عرصے

میں مسلسل رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہتے ہوئے ان تمام احادیث کو یاد نہیں کر سکے ایک ذہین اور عظیم صحابی پر حماقت کا الزام لگانے کے مترادف ہے، مزید برآں انہوں نے صرف رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث ہی روایت نہیں کیں، بلکہ انہوں نے حضرت ابوبکر، عمر، فضل، ابی بن کعب اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے سنی ہوئی احادیث بھی روایت کی ہیں۔

نیز حضرت ابوہریرہ سے ان کی زندگی میں ہی امتحان بھی لیا گیا۔ مروان نے اپنے منشی کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ سینکڑوں احادیث کو خفیہ طور پر تحریر کرنے کا حکم دیا اور مکمل سال گزرنے کے بعد اس نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ احادیث دوبارہ بیان کرنے کی درخواست کی، چنانچہ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر وہ احادیث بیان کر دیں۔ مروان نے ان احادیث کو حرف بحرف پہلی احادیث کے مطابق پایا۔[656] لہٰذا جس طرح ماضی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے والوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا، اسی طرح حال و مستقبل میں بھی شرمندگی ان کا مقدر ہو گا۔

ب: حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہجرت سے چار یا پانچ سال پہلے پیدا ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر چودہ پندرہ سال تھی، گویا رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری چار پانچ سال میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی عمر اتنی تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی احادیث کو سمجھ سکتے تھے۔ ان سالوں میں انہوں نے بہت کچھ سمجھا اور یاد کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے درج ذیل الفاظ میں ان کے لیے دعا فرمائی تھی: ''اللهم فقهه فى الدين وعلّمه التاويل ''اے اللہ! اسے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا فرما۔''[657] اس عمر میں انہیں ایسا علمی مقام حاصل ہوا کہ انہیں حبر الامت، بحر اور ترجمان القرآن کے القاب عطا کیے گئے۔[658]

وہ خوبصورت، ملیح، صاحبِ بلاغت اور سامعین کے دلوں کو موہ لینے والی شخصیت تھے۔ وہ اپنے والد ماجد کی طرح تقریباً دو میٹر قامت کے مالک تھے، نیز خوش خصال اور ہاشمی نسب کے بہترین نمائندہ تھے۔[659] ان کی قوتِ یادداشت اس قدر مضبوط تھی کہ انہیں عمر بن ابی ربیعہ کے ۸۰ اشعار صرف ایک بار سننے سے زبانی یاد ہو گئے تھے۔[660] ان اشعار کا مطلع یوں ہے:

أمن آل نعم أنت غاد فمبكر غداة غد أم رائح فمهجر

''کیا تم نُعم (محبوبہ) کے پاس سے کل صبح سویرے جا رہے ہو یا شام کے وقت؟''

تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ انہیں ادب وسخن خصوصاً جاہلی شاعری پر عبور حاصل تھا۔ ابن جریر اپنی تفسیر میں تقریباً ہر آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے مروی جاہلی شاعری کا کوئی نہ کوئی شعر ذکر کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وہ سب کی نظروں کا مرکز تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کم سنی کے باوجود انہیں بڑے بڑے صحابہ کرام پر مشتمل ''مجلس شوریٰ'' کا رکن منتخب کیا گیا اور جب بعض عمر رسیدہ صحابہ کرام نے ان کی کم سنی کی بنا پر مجلس شوریٰ میں ان کی شرکت پر تعجب کا اظہار کیا، کیونکہ وہ ان کے بچوں کے ہم عمر تھے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ میں سورۃ النصر پڑھ کر حاضرین سے اس کی تفسیر دریافت فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی فتح ونصرت آ پہنچے اور لوگ فوج درفوج دینِ خدا میں داخل ہونے لگیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم حمد وشکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کریں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ تفسیر پسند نہ آئی اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بارے میں ان کو آگاہ کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ (النصر: ۱) ''جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہوگئی۔'' یہ آپ کی وفات کی علامت ہے ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً﴾ (النصر: ۳) ''تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔'' اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرے نزدیک بھی اس سورت کا یہی مفہوم ہے۔''(661)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنی فہم وفراست اور ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کا اور رسول اللہ ﷺ کا شجرہ نسب ایک ہی تھا۔ وہ بجا طور پر اس پر فخر کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''ہم نے گھرانۂ نبوت میں پرورش پائی ہے۔'' آپ بہت باکمال شخصیت تھے۔ جب آپ کسی محفل میں آتے تو حاضرین ان کے احترام واکرام میں کھڑے ہو جاتے، لیکن انہیں اس سے کوفت ہوتی، چنانچہ وہ انصار صحابہ سے ایک جملہ کہا کرتے تھے، جو بعد میں علم نحو کے ایک قاعدے کی مثال بن گیا: ''بالایواء والنصر الاجلستم'' یعنی نبی اکرم ﷺ اور مہاجرین کو ٹھکانہ دینے اور ان کی مدد ونصرت کرنے کا واسطہ دے کر میں آپ ﷺ سے بیٹھے رہنے کا کہتا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود جب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑے پر سوار ہونے لگتے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کے گھوڑے کی رکاب تھام لیتے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس سے کوفت ہوتی اور وہ فرماتے: ''اے رسول خدا کے چچازاد بھائی! ایسے نہ کیجئے۔'' اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے: ''ہمیں اپنے علماء کے ساتھ ایسے ہی پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔'' یہ سن کر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جلدی سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہاتھ چوم لیتے اور فرماتے: ''ہمیں بھی اپنے نبی کے اہل بیت کے ساتھ اس طرح پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔''(662)

معاشرتی زندگی کے دریچے سے ہر چیز دیکھی جا سکتی ہے۔ عظیم انسان متواضع ہوتا ہے اور اپنی عظمت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، جبکہ کوتاہ قد انسان دراز قد اور بڑا دکھائی دینے کی کوشش کرتا ہے اور تکبر سے پیش کرتا ہے۔ بڑے لوگوں میں تواضع عظمت کی نشانی ہوتی ہے، جبکہ چھوٹے لوگوں میں غرور چھوٹے پن کی علامت ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ عظیم انسان تھے اور اپنی عظمت کے شایانِ شاں متواضع تھے۔

علم کے ہر میدان میں ان کے شاگرد موجود تھے۔ سعید بن جبیر، مجاہد بن جبر اور عکرمہ وغیرہ جیسے بڑے بڑے تابعین اپنے علم کو ان کا فیض قرار دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے قرب میں پرورش پانے والے اس صحابی سے مروی احادیث کی تعداد ۱۶۰۰ ہے، لہٰذا کیا ان کی روایت کردہ احادیث کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا اور انہیں کعب احبار سے ماخوذ موضوع احادیث قرار دینا ان کے حق میں رسول خدا ﷺ کی دعا کی تحقیر اور انہیں حبر الامت، بحر اور ترجمان القرآن کا لقب دینے والی امت اور تابعین عظام کی توہین نہیں ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اپنے احترام میں لوگوں کا کھڑا ہونا پسند نہ تھا، لیکن جب انہیں دفن کیا گیا تو عالم غیب کے بہت سے (فرشتے) ان کے اکرام میں کھڑے ہو گئے، کیونکہ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ جب انہیں دفن کیا گیا تو ان کی قبر کے کنارے سے آیت مبارکہ: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ () ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً () فَادْخُلِي فِي عِبَادِي () وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰) ''اے اطمینان والی جان! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی سو تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔'' پڑھنے کی آواز آئی، لیکن کسی کو بھی پتا نہ چلا کہ یہ آیت کس نے تلاوت کی ہے۔(663)

ج: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

مستشرقین کا یہ خیال غلط ہے کہ عبداللہ بن عمر بھی کعب احبار کے شاگرد تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درج ذیل نو بیٹے تھے: عبدالرحمٰن، عبدالرحمٰن الاوسط، عبدالرحمٰن الاصغر، عبداللہ، زید الاکبر، زید الاصغر، عبیداللہ، عاصم اور عیاض، لیکن ابن عمر کا اطلاق صرف حضرت عبداللہ پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کی بہ نسبت اس نام کے زیادہ حق دار تھے، یہی وجہ ہے کہ ابن عمر سن کر ذہن صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

اگرچہ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم صحابہ کرام کے درمیان فضیلت کے اعتبار سے درجہ بندی کریں، لیکن پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید حضرت عبداللہ بن عمر اپنی عبادت کے بعض پہلوؤں، تقویٰ واطاعت اور سنت مطہرہ کی شدید پابندی اور پیروی کے لحاظ سے اپنے والد ماجد پر بھی فوقیت لے گئے تھے۔ سنت نبویہ کی ناقابل تصور حد تک اطاعت کے معاملے میں وہ یکتا تھے۔ حضرت انس بن سیرین کہتے ہیں: ”میدانِ عرفات میں میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھا۔ جب وہ چلے تو میں بھی ان کے ساتھ چلا، یہاں تک کہ وہ امام کے پاس پہنچ گئے اور ظہر اور عصر کی نمازیں اس کے ساتھ ادا کیں۔ اس کے بعد انہوں نے، میں نے اور میرے ساتھیوں نے امام کے ساتھ وقوف کیا، یہاں تک کہ جب امام نکلا تو اس کے ساتھ ہم بھی نکلے۔ جب ہم ”مازمین“ سے پہلے واقع ایک گھاٹی میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا ہم نے بھی یہ سمجھ کر کہ وہ نماز ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اونٹوں کو بٹھا دیا، لیکن انہوں نے اپنی اونٹنی کی نکیل تھامنے والے غلام سے کہا: ”میں نماز نہیں پڑھنا چاہتا ہوں، بلکہ مجھے یاد آیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اس مقام پر پہنچے تھے تو آپ ﷺ نے قضائے حاجت فرمائی تھی، لہٰذا میں بھی یہاں قضائے حاجت کرنا چاہتا ہوں۔“[664]

رسول اللہ ﷺ تین سانسوں میں پانی نوش فرماتے تھے،[665] اسی لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ہمیشہ تین سانسوں میں پانی پیتے دیکھا گیا۔ سنت نبویہ سے انہیں اس قدر تعلق تھا اور اس کے بارے میں وہ اس قدر حساس تھے، بلکہ شاید اُس دور میں بھی بعض لوگ انہیں اِس بارے میں غالی کہتے تھے، لہٰذا ایسے شخص سے رسول اللہ ﷺ سے کوئی خلافِ حقیقت حدیث روایت کرنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

ان کی ولادت ظہورِ اسلام کے ابتدائی سالوں میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے والد ماجد کو پیش آنے والی تکالیف کو دیکھا تھا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”جب میرے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام

لائے تو انہوں نے پوچھا: ''قریش میں بات کو سب سے زیادہ پھیلانے والا شخص کون ہے؟'' انہیں بتایا گیا کہ جمیل بن معمر جمحی ہے، چنانچہ وہ اس کی طرف گئے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کرتے ہیں میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں اس وقت بچہ تھا، لیکن جو کچھ دیکھتا اسے سمجھ سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس پہنچ کر اس سے کہا: ''اے جمیل! کیا تمہیں پتا چلا ہے کہ میں اسلام قبول کر کے محمد کے دین میں داخل ہو چکا ہوں۔'' بخدا! اس نے دوسری بات نہ کی اور اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ حضرت عمر اس کے پیچھے اور میں اپنے والد کے پیچھے چل پڑا۔ جب وہ مسجد کے دروازے پر پہنچا تو اس نے پورے زور سے پکار کر کہا: ''اے قریش! عمر بن خطاب بے دین ہو گیا ہے۔'' قریش اس وقت کعبے کے گرد محفلیں جما کر بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے پیچھے سے کہا: ''یہ جھوٹ کہہ رہا ہے، بلکہ میں نے اسلام قبول کیا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔'' یہ سن کر وہ حضرت عمر پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت عمر ان سے اور وہ حضرت عمر سے لڑتے رہے یہاں تک کہ آفتاب سر پر آ گیا اور حضرت عمر تھک کر بیٹھ گئے۔ قریش ان کے سر پر آ کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر نے ان سے کہا: ''جو تمہارا جی چاہے کرو (میں اسلام سے نہیں پھروں گا)۔'' دریں اثنا عاص بن وائل سہمی نے آگے بڑھ کر حضرت عمر کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ (666)

مدینہ منورہ کی طرف نبی اکرم ﷺ اور مہاجرین کی ہجرت کے وقت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً گیارہ برس تھی۔ جب غزوہ بدر کے موقع پر اپنے ہم عمروں کے ساتھ انہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ بڑا دکھائی دینے کے لیے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اوپر ہونے لگے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی کم سنی کے باعث جنگ میں ان کی شرکت کی منظوری نہ دی، کیونکہ آپ ﷺ صرف درازئ قد کو نہ دیکھتے، بلکہ عمر بھی پوچھتے تھے۔ انہوں نے غزوہ احد کے موقع پر بھی اپنے آپ کو پیش کیا، لیکن اس بار بھی انہیں قبول نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے انہیں اور ان کے ہم عمر ساتھیوں کو اشکبار آنکھوں اور غمزدہ دلوں کے ساتھ واپس لوٹنا پڑا۔ جب ان کی عمر پندرہ سال ہوئی تو انہیں جنگ کا اہل سمجھا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں غزوہ خندق میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (667)

ابن خلکان اپنی کتاب ''وفیات الاعیان'' میں امام شعبی سے درج ذیل واقعہ بیان کرتے ہیں:

ایک بار میں نے بڑی عجیب بات دیکھی۔ میں، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، مصعب بن زبیر

اور عبدالملک بن مروان کعبہ کے صحن میں بیٹھے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے کہا: ''تم میں سے ایک ایک شخص کھڑا ہو اور رکنِ یمانی کو تھام کر اللہ تعالیٰ سے اپنی اپنی حاجت مانگے، اس کی دعا اسی وقت قبول ہوگی۔ اے عبداللہ بن زبیر! تم کھڑے ہو، کیونکہ ہجرت کے بعد سب سے پہلے تمہاری پیدائش ہوئی تھی۔'' چنانچہ وہ کھڑے ہوئے اور رکن یمانی کو تھام کر یہ دعا مانگی: ''اے اللہ آپ عظیم ہیں اور آپ سے ہی ہر عظیم کی امید وابستہ ہے۔ میں آپ سے آپ کے عرش، آپ کی ذات اور آپ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حرمت کے واسطے سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھے اس وقت تک موت نہ دیجئے، جب تک مجھے حجاز کی حکومت نہ مل جائے اور مجھے خلیفہ نہ تسلیم کیا جائے۔'' اس کے بعد وہ آ کر بیٹھ گئے اور کہا: ''اے مصعب! کھڑے ہو۔'' چنانچہ وہ کھڑے ہوئے اور رکن یمانی کو تھام کر یہ دعا مانگی: ''اے اللہ! آپ ہر چیز کے پروردگار ہیں اور ہر چیز نے آپ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میں آپ کی قدرتِ مطلقہ کے واسطے سے آپ سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھے دنیا میں اس وقت تک موت نہ دیجئے جب تک آپ مجھے عراق کی حکومت نہ سونپ دیں اور سکینہ بنت حسین سے میری شادی نہ کرا دیں۔'' اس کے بعد وہ آ کر بیٹھ گئے اور کہا: ''عبدالملک! تم اٹھو۔'' چنانچہ وہ کھڑا ہوا اور رکن یمانی کو تھام کر اس نے یہ دعا کی: ''اے سات آسمانوں اور بے آب و گیاہ زمین کے مالک! میں آپ کے حکم کے فرمانبردار بندوں، آپ کی ذات کی حرمت، آپ کی ساری مخلوق پر آپ کے حق اور آپ کے گھر کے گرد طواف کرنے والوں کے حق کے صدقے آپ سے دعا مانگتا ہوں کہ آپ مجھے اس وقت تک موت نہ دیجئے، جب تک مجھے مشرق و مغرب کی حکومت نہ عطا فرما دیں اور میرے خلاف اٹھنے والے کا سر مجھ تک نہ پہنچا دیں۔'' اس کے بعد وہ آ کر بیٹھ گیا اور کہا: ''اے عبداللہ بن عمر! تم اٹھو۔'' چنانچہ وہ اٹھے اور رکن یمانی کو تھام کر یہ دعا مانگی: ''اے اللہ! آپ رحمٰن و رحیم ہیں۔ میں آپ کے غضب پر سبقت کرنے والی، آپ کی رحمت اور آپ کی تمام مخلوق پر آپ کے حق کے واسطہ سے آپ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے دنیا میں اس وقت تک موت نہ دیجئے جب تک آپ میرے لیے جنت کو واجب نہ کر دیں۔''

شعبی کہتے ہیں: ''دنیا سے اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ان میں سے ہر ایک کی دعا کو قبول ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کو جنت کی بشارت ملی اور انہیں وہ دکھا بھی دی گئی۔''(668)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کسی بھی حال میں کسی بھی وقت اہل بیت کی مخالفت کی اور نہ ہی

بنوامیہ کی حمایت کی۔ خاص طور پر حجاج ان سے خوف کھاتا تھا اوران کے بارے میں اس کے دل میں کھٹک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حجاج نے خطبہ بہت لمبا کر دیا (شاید وہ اپنے ظالمانہ اقدامات کی صفائی اور جواز پیش کرنا چاہتا تھا) یہاں تک کہ ظہر کی نماز فوت ہونے لگی۔ حضرت ابن عمر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا: ''اے فلانے! نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ (اب) بیٹھ (بھی) جا۔ سورج تیرا انتظار نہیں کرے گا۔'' (انہوں نے یہ بات تین بار کہی) چوتھی مرتبہ انہوں نے لوگوں سے کہا: ''مجھے بتاؤ! اگر میں کھڑا ہوا تو کیا تم بھی کھڑے ہو گے؟'' لوگوں نے کہا: ''ہاں'' چنانچہ وہ کھڑے ہوئے اور کہا: ''نماز پڑھاؤ! مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں نماز سے کوئی دلچسپی ہے۔'' اس پر حجاج نیچے اتر آیا اور نماز پڑھائی۔ اس کے بعد اس نے انہیں بلایا اور پوچھا: ''آپ کو اس اقدام پر کس چیز نے مجبور کیا؟'' انہوں نے فرمایا: ''ہم نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں، لہٰذا جب نماز کا وقت ہو جائے تو اسے اپنے وقت پر پڑھایا کرو۔ اس کے بعد جتنی چاہے جھک جھک کیا کرو۔''(669)

یہ سن کر حجاج کو بہت غصہ آیا، لیکن اس نے اپنے غصے کو چھپائے رکھا۔ اس کے بعد حج کے ایک موقع پر جب یہ جلیل القدر صحابی حرم شریف میں حالت احرام میں تھے، حجاج کے ایک آدمی نے ان کی ٹانگ میں زہر آلود نیزہ مارا، جس کے نتیجے میں اس عظیم ہستی کی موت واقع ہو گئی۔(670)

د: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار بھی رسول اللہ ﷺ سے بکثرت احادیث روایت کرنے والے صحابہ میں ہوتا ہے۔ آپ شروع شروع میں اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں۔ آپ عنفوانِ شباب میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔(671) لیکن جب سرورِ کائنات اور مخلوقِ خدا کے نگہبان سے ان کا تعارف ہوا تو ان کے ہو کر رہ گئے اور کبھی بھی ان سے جدا نہ ہوئے، بلکہ بہت سے لوگ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ان کی کثرت سے آمد و رفت دیکھ کر انہیں آپ ﷺ کے آل بیت میں سے سمجھتے تھے۔(672) انہیں ''صاحب النعلین والوسادۃ و المطھرۃ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔(673) کیونکہ سفر میں رسول اللہ ﷺ کے نعلین، تکیے اور پانی کے مشکیزے کو سنبھالنے کی ذمہ داری ان کے پاس ہوتی تھی۔ آپ ﷺ انہیں ''ابن ام عبد'' کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''جو شخص قرآن کریم کو بالکل ایسے پڑھنا چاہتا ہے، جیسے اس کا نزول ہوا ہے اسے چاہیے کہ وہ ابن ام عبد کی قراءت کے مطابق پڑھے۔''(674)

ان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''مجھے (قرآن) سناؤ۔'' میں نے

کہا: ''کیا میں آپ کو (قرآن) سناؤں، حالانکہ یہ آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے دوسروں سے سنوں۔'' چنانچہ میں نے سورت النساء کی تلاوت کی۔ جب میں ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَـٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (النساء: ٤١) ''بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو (اے نبی) ان لوگوں کا حال بتانے کو بطور گواہ طلب کریں گے۔'' پر پہنچا تو آپ ﷺ نے رکنے کے لیے کہا۔ اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''(675)

حضرت ابن مسعود کا جسم نحیف اور کمزور تھا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک درخت پر چڑھ کر اس کا پھل توڑ لانے کے لیے کہا۔ اس موقع پر صحابہ کرام کو ان کی پنڈلیوں کا دبلا پن دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا: ''اے اللہ کے نبی! ہمیں ان کی پنڈلیوں کا دبلا پن دیکھ کر ہنسی آ گئی۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اس کی پنڈلیاں میزان میں احد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہیں۔''(676) جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں معلم و محتسب بنا کر کوفہ روانہ کیا تو اہل کوفہ کو لکھا: ''اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں نے ان کے حق میں تمہیں اپنے اوپر ترجیح دی ہے، لہٰذا ان سے خوب استفادہ کرو۔''(677)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت ابن مسعود کوفہ میں رہے اور ان کے تیار کردہ علمی ماحول میں علقمہ بن قیس، اسود بن یزید نخعی اور ابراہیم بن یزید نخعی ایسے بہت سے جلیل القدر علماء اور تابعین پیدا ہوئے۔ علقمہ بن یزید کے بارے میں امام ابوحنیفہ نے فرمایا تھا: ''فقہی پہلو سے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کم نہیں ہیں۔(678) حضرت علقمہ نے زیادہ تر علمی استفادہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا: ''آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا۔'' انہوں نے جواب دیا: ''عمر، عثمان، علی اور ابن مسعود سے۔'' اس پر سائل بول اٹھا: ''بس بس! کافی ہے۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی کچھ عرصہ کوفہ میں رہے۔ اس کے بعد سازشیوں کی شکایات کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے انہیں مدینے بلایا گیا۔ چونکہ وہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے مدینے میں ہی رہنے کو ترجیح دی اور دوبارہ کوفہ نہیں گئے۔ ایک روز ایک شخص ان کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی

خواب میں زیارت کی ہے۔آپ آپ ﷺ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔آپ ﷺ نے آپ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: تم نے میرے بعد بہت مصیبتیں جھیلی ہیں۔اب وقت آ گیا ہے کہ تم میرے پاس چلے آؤ۔'' اس پر آپ نے کہا: ''یارسول اللہ! '' آج کے بعد میں کبھی مدینے کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

کچھ ہی دنوں بعد آغاز میں ہی اسلام لانے والے اور رسول اللہ ﷺ کے مدرسے کے ممتاز ترین طالب علم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے۔ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہنے والے، آپ ﷺ کے ساتھ دو قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے اور آپ ﷺ کے ہمراہ اکثر غزوات میں شرکت کرنے والے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے ان دونوں حضرات کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا:

عثمان بن عفان: آپ کو کس چیز کی تکلیف ہے؟

ابن مسعود: گناہوں کی۔

عثمان بن عفان: آپ کو کس چیز کی خواہش ہے؟

ابن مسعود: رحمت خداوندی کی۔

عثمان بن عفان: کیا میں آپ کے لیے طبیب کا بندوبست نہ کروں؟

ابن مسعود: طبیب نے ہی تو مجھے بیمار کیا ہے۔

عثمان بن عفان: کیا میں آپ کی تنخواہ کی ادائیگی کا حکم نہ دے دوں؟ (دو سال سے انہوں نے تنخواہ لینا چھوڑ دی تھی۔)

ابن مسعود: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

عثمان بن عفان: وہ آپ کے بعد آپ کی بچیوں کے کام آئے گی۔

ابن مسعود: کیا آپ کو میری بچیوں کے بارے میں فقر کا ڈر ہے؟ میں نے انہیں ہر رات سورت واقعہ پڑھنے کا کہا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو شخص ہر رات سورت الواقعہ پڑھے گا اسے فاقہ کشی کی نوبت نہ آئے گی۔''(679) اس کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابن مسعود تیس سال تک رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہے۔ان سے آٹھ سو احادیثِ نبویہ مروی ہیں۔ہم اس قدر جلیل القدر صحابی کے عیب جوئی کرنے والوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کا اختیار قارئین کے سپرد کرتے ہیں۔

ان چار بڑے صحابہ کرام کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے بعد آئندہ سطور میں ہم اختصار کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ، ابوسعید خدری، جابر بن عبداللہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی کچھ معلومات فراہم کریں گے، کیونکہ ان کا شمار بھی کثرت سے احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ تابعین عظام کی طرف موڑیں گے۔

ہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گھرانہ نبوت میں آنکھ کھولی، کیونکہ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ نبی اکرم ﷺ کے گھر آگئیں اور آپ ﷺ کے ساتھ دس برس گزارے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ ذہانت وفطانت کی اعلیٰ مثال تھیں۔ انہوں نے عورتوں سے متعلق تمام احکام رسول اللہ ﷺ سے سیکھے اور بغیر کسی کوتاہی کے انہیں آگے پہنچایا۔ عورتیں رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے زیر بار احسان ہیں۔ سند کے اعتبار سے ایک ضعیف حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا ہے: ''اپنے دین کا نصف حصہ اس حمیرا (گوری رنگت والی خاتون) سے حاصل کرو۔''(680)

ان کے رسول اللہ ﷺ سے بکثرت احادیث روایت کرنے میں مانع یا قابل تعجب بات نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ وہ ذہین وفطین اور اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ مند تھیں، نیز ان کی طبیعت میں ہر چیز کے بارے میں تحقیق وتفتیش اور پوچھنے کا میلان تھا۔ چونکہ بہت سے اہم محققین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس لیے میں یہاں قارئین کو ان کی تحریروں کی طرف مراجعت کرنے کا مشورہ دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

و: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ

حضرت ابوسعید خدری اپنے زمانے میں مدینے کے سب سے بڑے عالم اور علمی مرجع تھے۔ اس درویش منش صحابی کے والد ابتدائی انصار میں سے تھے۔ غزوہ احد میں والد کے انتقال کے بعد وہ تنہا رہ گئے اور ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہنے لگے۔(681) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح وہ بھی دن بھر صفہ میں رہتے۔ نازل ہونے والی وحی پر نظر رکھتے، اس کا مذاکرہ کرتے اور شب وروز

نبوت احمدیہ سے فیض یاب ہوتے۔ دوسرے صحابہ کی طرح انہوں نے رشد و ہدایت کے ساتھ زندگی گزاری۔ ہماری نظروں میں وہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔

ز: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

آپ جلیل القدر صحابی عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری کے بیٹے تھے۔ آپ کے والد بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے، غزوہ احد میں شہید ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وفات کے بعد ان سے بغیر کسی حجاب کے روبرو ملاقات کی۔ (682) بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد ان کے والد صاحب نے انہیں غزوہ بدر اور غزوہ احد میں شرکت کی اجازت نہیں دی، کیونکہ جب انہوں نے اس بات کا ذکر کیا کہ ان کے والد نے انہیں مدینے میں اپنے بھائیوں کی دیکھ بھال کے لیے ٹھہرنے کا حکم دیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں عدم شرکت کی اجازت دے دی۔ (683) لیکن غزوہ احد کے بعد وہ ہمیشہ سفر و حضر میں ایک مقرب کی حیثیت سے آپ ﷺ کے ہمراہ رہے۔ (684) لہٰذا بہت سی احادیث کا انہیں یاد ہونا اور بہت سی احادیث کا ان سے مروی ہونا بالکل طبعی بات ہے اور اس میں کوئی تعجب والی بات نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب وہ مصر اور شام گئے تو ان سے احادیث نبویہ سننے کے لیے ان کے گرد لوگوں کے حلقے لگتے تھے، نیز مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے اندر بھی ان کا حلقہ درس لگتا تھا۔ ان کے شاگرد عمرو بن دینار، مجاہد اور عطا بن ابی رباح جیسے عظیم الشان علماء بنے۔ (685)

ح: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پورے دس برس رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ (686) چونکہ انہوں نے صرف چھ ماہ کے عرصے میں پورا قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، اس لیے وہ ان سالوں میں قرآن کریم سے بیس گنا زیادہ مقدار حفظ کر سکتے تھے، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان سے مروی تمام احادیث جن کو ''کنز العمال'' میں جمع کیا گیا ہے، کی تعداد صرف ۲۶۲۴ ہے، نیز اسانید ذکر کرنے کی وجہ سے کتب حدیث میں احادیث کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ یہاں ہمارا مقصود ان صحابہ کرام کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالنا یا ان کے فضائل کے گن گانا نہیں ہے، بلکہ ہم ان پر افتراء پردازی اور الزام تراشی کرنے والوں کی عقل کی خرابی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری حقیر سے کاوش ہے، تاہم مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے۔ ہم اپنی اس حقیر سے کاوش کے وسیلے سے ان کی شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی ہر چیز پر حاوی رحمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ب: تابعین عظام

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی طرح تابعین کا بھی قرآن کریم میں ذکر لیا ہے، مثلاً درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمائیے: قرآن کریم کہتا ہے: ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (التوبة: ۱۰۰) ''جن لوگوں نے سبقت کی یعنی سب سے پہلے ایمان لائے مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اس آیت مبارکہ کے ضمن میں صحابہ اور تابعین دونوں شامل ہیں۔ اس آیت کریمہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ اللہ سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفع پہنچے یا نقصان، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر چیز پوری رضا و رغبت سے قبول کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کی بادشاہت عطا کریں یا اسے ان سے چھین لیں۔ ان کے کردار اور طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر انہیں دنیوی نفع پہنچے تو اس پر اتراتے ہیں اور نہ ہی نقصان یا مصیبت آ پہنچنے پر آزردہ ہوتے ہیں، بلکہ ہمیشہ راہِ استقامت پر چلتے ہوئے مصائب و آلام کو الطاف و انعامات کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر بات پر راضی برضا رہتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی ایسے لوگوں سے خوش ہوتے ہیں، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بندے سے راضی ہونے کا معیار اس بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا ہے۔ جس قدر بندہ اللہ سے راضی ہوگا اور اس محبت کرے گا اللہ تعالیٰ اسی قدر بلکہ اس سے بڑھ کر اس سے راضی ہوں گے اور اس سے محبت کریں گے، یہی وجہ تھی کہ تابعین عظام نے محمدی رنگ میں رنگے ہوئے صحابہ کرام سے مشابہت پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ سے ان جتنا گہرا تعلق اور نماز میں ان جیسا خشوع پیدا کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں نماز کے دوران ان کے جسم کانپ اٹھتے اور ان کے چہروں کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''خوشخبری ہے مجھے دیکھنے اور مجھ پر ایمان لانے والوں کے لیے، نیز خوشخبری ہے مجھے دیکھنے والوں کے لیے۔''[687] اوپر ذکر کردہ آیت مبارکہ میں اس بات کا

تذکرہ تھا کہ تابعین نے صحابہ کرام کی احسان کے ساتھ پیروی کی، لہٰذا یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ احسان اور احسان کے ساتھ پیروی کرنے کا کیا مطلب ہے؟

احسان کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ دوسروں کو اپنا جیسا سمجھیں، جس کے نتیجے میں وجدانی طور پر ان کے غم وخوشی میں شریک ہوں۔ آپ کی نیت صاف اور اچھی ہو اور آپ کے دل میں کسی بھی مؤمن کے بارے میں کینہ اور بغض نہ ہو۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَاؤُوا مِن بَعْدِهِم يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُونَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الحشر: ١٠) ''اور ان کے لیے بھی جو ان مہاجرین کے بعد آئے اور دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مؤمنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ وحسد نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے۔''

احسان کا ایک مطلب حسب ذیل ہے: ''أن تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك'' [688] یعنی عبادتِ خداوندی کے فریضے کو ایسے ادا کرو جیسے تم اللہ کو دیکھ رہے پھر تمہاری ذات میں اس بات کا شعور سرایت کر جانا چاہیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے اور تمہارے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔ تابعین کے احسان کے ساتھ صحابہ کرام کی پیروی کرنے کے متعدد مفاہیم ہو سکتے ہیں، کیونکہ اگرچہ فضیلت مطلقہ صحابہ کرام کو حاصل ہے، لیکن ممکن ہے کہ ''رجحان المرجوح على الراجح'' کے قاعدے کے مطابق بعض تابعین کسی خاص فضیلت میں نہ صرف یہ کہ صحابہ کے مقام پر پہنچے ہوں بلکہ ان سے بھی بڑھ گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تابعین کے دور میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بہت سی آزمائشوں کے ذریعے خوب جھنجھوڑا تھا اور فتنے کی آگ تقریباً ہر گھر میں داخل ہوگئی تھی۔ ہر دور کی طرح اس دور میں بھی یہودیوں نے سازشوں کے جال بننے اور فتنوں کی آگ بھڑکانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان فتنوں کے مقابلے میں صاف دل اور روشن ضمیر لوگوں کے لیے خدا کی پناہ میں آنے اور ﴿ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾ (الممتحنة: ٤) ''اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہمارا بھروسا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں ہمیں لوٹنا ہے۔'' کا ورد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ تابعین عظام میں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے، جو ایک دن میں ایک ایک ہزار رکعات نماز ادا کرتے تھے۔ بعض چار دن میں اور بعض دو رکعات میں ایک ہی رات کے دوران پورا قرآن کریم پڑھ لیتے تھے۔ بعض نے ساری زندگی بندگی میں گزاری اور عمر بھر ان کی جماعت کی نماز فوت نہ ہوئی۔

نیز تابعین کے دور میں جہاد بالسیف کی ضرورت کم پڑ گئی تھی اور تلواریں نیاموں میں واپس آ گئی تھی۔ اس دور میں ''جہادِ اکبر'' کا آغاز ہوا۔ جہادِ اکبر نفس کے خلاف جہاد کرنے کو کہتے ہیں، تاکہ وہ نفس امارہ کے درجے سے نکل کر نفس لوامہ، نفس راضیہ، نفس مرضیہ اور نفس مطمئنہ کے مقامات سے گزرتا ہوا نفس صافیہ کے مقام پر فائز ہو کر ارشاد خداوندی ﴿رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (البينة: ٨) ''اللہ ان سے خوش اور وہ اس سے خوش۔'' کا مصداق بن جائے۔

عبادت کے معاملے میں تابعین عظام کی محنت اور تگ و دو کا یہ عالم تھا کہ حضرت مسروق رحمہ اللہ نے جب حج کیا تو واپس لوٹنے تک صرف سجدے کی حالت میں ہی سوئے۔(689) جب وہ بیمار ہوئے تو ان سے عبادت میں کچھ کمی کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: ''بخدا! اگر کوئی آنے والا مجھے یہ خبر دے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہ دیں گے تب بھی میں عبادت میں خوب محنت کروں گا۔''(690) انہوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ان کے سردار رسول اللہ ﷺ نے ایسی ہی بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمائی تھی: ''اے عائشہ! کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں۔''(691)

صحابہ کرام سب سے بڑے تابعی اور یمن کے روحانی بادشاہ حضرت اویس قرنی کو اپنے لیے دعا کرنے کا کہتے تھے، کیونکہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مجلس میں، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے فرمایا تھا: ''بہترین تابعی اویس نامی شخص ہے۔ اس کی والدہ باحیات ہے۔ اسے برص کی بیماری تھی۔ اسے اپنے لیے دعائے مغفرت کرنے کے لیے کہنا۔''(692)

یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں اس قدر بیٹھ گئی تھی کہ جب ان کے پاس یمن کے عسکری دستے آتے تو وہ ان سے پوچھتے: ''کیا تم میں اویس بن عامر ہیں۔'' بالآخر وہ حضرت اویس کے پاس پہنچ گئے اور ان سے پوچھا: کیا آپ اویس بن عامر ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جی ہاں'' آپ نے پوچھا: ''تمہارا تعلق پہلے مراد اور پھر قرن سے ہے؟'' انہوں نے کہا: ''جی ہاں'' آپ نے پوچھا: ''آپ کو برص کی بیماری تھی جس سے آپ صحت یاب ہو گئے ہیں، لیکن ایک درہم کی مقدار اس کا نشان باقی ہے؟'' انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔ آپ نے پوچھا: ''آپ کی والدہ باحیات ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جی ہاں'' اس پر آپ نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اہل یمن کے عسکری دستوں میں تمہارے پاس اویس بن عامر آئے گا، جس کا تعلق مراد اور پھر قرن سے ہوگا۔ اسے برص کی بیماری تھی جس سے وہ صحت یاب ہو گیا ہے، لیکن ایک درہم کی مقدار اس کا اثر باقی ہے۔ اس کی والدہ باحیات ہے، جس کا وہ فرمانبردار ہے۔ اگر وہ کسی کام پر اللہ کی

قسم اٹھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرمائیں گے اگر تم سے ہو سکے تو اس سے اپنے لیے دعائے مغفرت کرانا، لہٰذا آپ میرے لیے دعائے مغفرت کیجئے، چنانچہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: ''آپ کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' انہوں نے بتایا: ''کوفہ کا'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا میں آپ کے لیے کوفہ کے گورنر کو خط لکھ دوں؟'' انہوں نے فرمایا: ''مجھے معمولی درجے کے لوگوں میں رہنا پسند ہے۔''

دیکھئے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی حضرت اویس قرنی سے اپنے لیے دعا کرا رہے ہیں، حالانکہ صحابی ہونے کے ناطے بعض فضائل میں ان کی خاکِ پا تک پہنچنا بھی ممکن نہیں، کیونکہ انبیائے کرام کے بعد صحابہ کرام کا مقام سب سے بلند ہے، لیکن اس کے باوجود وہ یمن اور حج کے لیے جانے والوں کو حضرت اویس قرنی کو تلاش کر کے ان سے دعا کرانے کے لیے کہتے۔(693) حضرت اویس قرنی کو اپنی اس شہرت پر کوفت ہوتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ان کے اور خدا کے درمیان موجود راز کے افشا ہونے کے فوراً بعد وہ نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ کہیں ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔ کسی نے درست کہا ہے ''موت اچانک آلیتی ہے اور قبر اعمال کا صندوق ہے۔''

جھوٹ سے کوسوں دور، پیکر اخلاص اور امانت داری و استقامت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز حضرت اویس قرنی، مسروق، ابن سیرین اور محمد بن منکدر ایسے تابعین عظام نے ہم تک سنت نبویہ کو پہنچایا ہے۔

حضرت محمد بن منکدر جو حدیث کے ہر امام کے مرجع تھے، بہت آہ وزاری اور رجوع الی اللہ کرنے والے تھے۔ خوف خدا کی وجہ سے بکثرت رونے کی وجہ سے اپنے دور اور بعد والے ادوار میں ''البکّاء'' (بہت زیادہ رونے والے) کے لقب سے مشہور تھے۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ایک ایسا شخص جسے کبھی کسی نے گناہ کا ارتکاب کرتے نہیں دیکھا اس قدر کیوں روتا ہے۔

لیکن درحقیقت ان کی نظر میں بہت سے امور مثلاً خوفِ خدا، خشیت الٰہیہ، خالق کے سامنے بندے کا عجز، فقر اور بے مائیگی، آگے بھیجے گئے اعمال پر انسان کے حساب کتاب کا دن، میدانِ محشر میں اعمال ناموں کی تقسیم اور دوزخ کے کانٹوں پر بچھائے گئے پل صراط پر سے ہر حال میں انسان کا گزرنا وغیرہ آہ و بکا کا موجب تھا۔ جب وہ انسانیت کو اپنا سوز و گداز سناتے تو داؤد ثانی لگتے۔

وفات کے وقت ان پر بہت زیادہ بے چینی اور گھبراہٹ طاری تھی۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو

انہوں نے فرمایا: ''مجھے کتاب اللہ کی ایک آیت ﴿وَبَدَا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ﴾ (الزمر: ٤٧) ''اور ان پر اللہ کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائے گا، جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔'' کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ کہیں خدا کی طرف سے میرے سامنے بھی کوئی ایسی بات نہ آجائے، جس کا مجھے وہم وگمان تک نہ ہو۔''(694)

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ وہ عبدالرحمٰن کندی کے ساتھ بنوامیہ کے ظلم وستم کے خلاف کھڑے ہوئے اور حجاج بن یوسف ثقفی ظالم کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ چونکہ وہ ایسے ربانی انسان تھے، جنہیں آخرت کے سوا کسی چیز کا غم نہ تھا، اس لیے وہ باطل کے سامنے کبھی نہ جھکے، بلکہ اموی حکام کے سامنے جرأت کے ساتھ ڈٹے رہے اور انہیں بلاخوف وخطر نیکی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے رہے۔ وہ رات کو عبادت گزار ہوتے تو دن کو شہسوار ہوتے۔ انہوں نے قرآنِ کریم پڑھا اور حبر الامت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مقاصد الٰہیہ کی تعلیم پائی، جنہوں نے کامل ترین مرشد رسولِ خدا ﷺ کا قرآنی فہم ان کی طرف منتقل کیا۔

جب حجاج بن یوسف نے حضرت سعید بن جبیر کو حاضر کرنے کا حکم دیا تو وہ حجاج کے کارندوں کے ہمراہ چل پڑے۔ دورانِ سفر وہ جنگل میں ایک راہب کی عبادت گاہ پر جا پہنچے۔ راہب نے ان سے کہا: ''اے شہسوارو! کنیسہ کے پاس ایک شیر اور شیرنی رہتے ہیں، اس لیے شام سے پہلے پہلے کنیسہ میں داخل ہو جاؤ۔'' چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا، لیکن حضرت سعید بن جبیر نے کنیسہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر حجاج کے کارندوں نے کہا: ''ہمارے خیال میں آپ بھاگنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' حضرت سعید نے فرمایا: ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے، لیکن میں مشرک کے گھر میں ہرگز داخل نہ ہوں گا۔'' انہوں نے کہا: ''ہم آپ کو باہر نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ درندے آپ کو مار ڈالیں گے۔'' اس پر حضرت سعید نے فرمایا: ''مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔ وہ انہیں مجھ سے دور رکھے گا، بلکہ انہیں میرا پہرے دار بنا دے گا اور وہ ان شاء اللہ ہر برائی سے میری حفاظت کریں گے۔''

چنانچہ وہ حضرت سعید کو باہر چھوڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں شیرنی آگئی۔ اس نے حضرت سعید کے قریب آکر اپنا جسم ان سے ملا، انہیں چھوا اور پھر ان کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ شیر نے بھی آکر ایسے ہی کیا۔ جب راہب نے یہ معاملہ دیکھا تو صبح کے وقت وہ ان کے پاس آیا اور ان سے ان کے دین کے احکام اور ان کے رسول حضرت محمد ﷺ کی سنتوں کے بارے میں

پوچھا۔ حضرت سعید نے یہ سارے امور اس کے سامنے وضاحت سے پیش کیے، جس کے بعد راہب صدق دل سے مسلمان ہو گیا۔ حجاج کے کارندے بھی ان کے ہاتھ پاؤں چومنے، ان کی خاکِ پا اٹھانے اور ان سے معذرت کرنے لگے، نیز انہوں نے حضرت سعید کہا: ''حجاج نے ہم سے اپنی بیویوں کو طلاق دینے اور اپنے غلاموں کو آزاد کرنے کی قسم لی تھی کہ اگر ہم نے آپ کو دیکھا تو ہر صورت میں آپ کو اس کے سامنے حاضر کریں گے۔ اب آپ بتایئے ہم کیا کریں؟'' حضرت سعید نے ان سے فرمایا: ''تم اپنی ذمہ داری پوری کرو۔ میں اپنے خالق کی پناہ میں ہوں۔ اس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہیں۔''

اس پر انہوں نے مل کر کہا: ''اے روئے زمین کے بہترین انسان! کاش ہم آپ کو پہچانتے ہوتے اور نہ ہی (آپ کو گرفتار کرنے کے لیے) آپ کی طرف جاتے۔ ہم تو تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم اس آزمائش سے کیسے نکلیں؟ یوم محشر میں ہمارے خالق کے سامنے ہمارا عذر قبول کرنا، کیونکہ وہ عدل وانصاف کرنے والا سب سے بڑا قاضی ہے۔ اس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔'' جب وہ رونے دھونے اور آپس میں باتیں کرنے سے فارغ ہو چکے تو ان کے ذمہ دار نے ان سے کہا: ''اے سعید! ہم آپ جیسے انسان سے کبھی ملے اور نہ قیامت تک ملیں گے۔ ہم آپ کو خدا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ ہمارے لیے دعا فرمایئے اور ہم سے باتیں کیجیے۔'' چنانچہ حضرت سعید بن جبیر نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا۔

آخر کار وہ انہیں حجاج بن یوسف کے پاس لے گئے۔ حجاج اور ان کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا:

حجاج: تمہارا نام کیا ہے؟

سعید: سعید بن جبیر

حجاج: تم شقی بن کسیر ہو۔

سعید: میری ماں میرا نام تم سے بہتر جانتی تھی۔

حجاج: تم بھی بد بخت ہو اور تمہاری ماں بھی۔

سعید: غیب کا علم تمہارے سوا کسی اور ذات کو ہے۔

حجاج: میں تمہیں قتل کر کے جہنم رسید کر دوں گا۔

سعید: اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے تو میں تمہیں معبود بنا لیتا۔

حجاج: محمد (ﷺ) کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

سعید: وہ نبی رحمت اور ہدایت کے امام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہیں۔

حجاج: علی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟
اگر میں جنت یا جہنم میں داخل ہوتا اور ان میں رہنے والوں کو دیکھتا تو انہیں پہچان سکتا تھا۔
حجاج: خلفاء کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟
سعید: ان کے بارے میں میں جوابدہ نہیں ہوں۔
حجاج: تمہیں ان میں سے سب سے زیادہ کون پسند ہے۔
سعید: جو میرے خالق کو سب سے زیادہ راضی کرنے والا ہے۔
حجاج: ان میں سے کون خالق کو سب سے زیادہ راضی کرنے والا ہے؟
سعید: اس کا علم ان کے بھیدوں اور سرگوشیوں کو جاننے والے کو ہے۔
حجاج: (اس کا مطلب ہے) تم میری تصدیق کرنے سے انکار کر رہے ہو؟
سعید: مجھے تمہیں جھٹلانا پسند نہیں۔
حجاج: تم ہنستے کیوں نہیں؟
سعید: وہ مخلوق کیسے ہنسے جسے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور مٹی کو آگ کھاتی ہے؟
حجاج: پھر ہم کیوں ہنستے ہیں؟
سعید: سارے دل ایک جیسے نہیں ہوتے۔

اس کے بعد حجاج نے موتیوں، زمرد اور یاقوت ایسے جواہرات سعید بن مسیب کے سامنے رکھنے کا حکم دیا۔ اس پر حضرت سعید نے اس سے کہا: ''اگر تو نے اسے قیامت کی ہولنا کی سے بچاؤ کے لیے جمع کیا ہے تو یہ اچھی بات ہے ورنہ صرف ایک ہولنا کی ہر دودھ پلانے والی کو اپنے بچے سے غافل کر دے گی۔ دنیا کے لیے جمع کی گئی صرف صاف اور پاکیزہ چیزوں میں ہی بھلائی ہے۔

اس کے بعد حجاج نے ساز اور بانسری منگوائی۔ جب انہیں بجایا گیا تو حضرت سعید بن جبیر رونے لگے۔

حجاج: تم کیوں رو رہے ہو؟ یہ تو کھیل تماشا ہے۔
سعید: نہیں، یہ حزن والم ہے۔ بانسری بجانے سے مجھے وہ عظیم دن یاد آ گیا، جب صور پھونکا جائے گا، ساز کسی درخت سے ناحق کاٹی گئی لکڑی ہے اور اس کی تانتیں (strips) بکری کی وہ آنتیں ہیں، جو قیامت کے روز تمہارے ساتھ اٹھائی جائیں گی۔''

حجاج: اے سعید! تو برباد ہو۔

سعید: بربادی اس شخص کے لیے ہے جسے جنت سے دور اور جہنم میں داخل کیا گیا۔

حجاج: اے سعید! تم جس طریقے سے قتل ہونا پسند کرتے ہو اس کا انتخاب کرلو۔

سعید: اے حجاج: تو اپنے لیے انتخاب کر، اس لیے کہ بخدا جس طریقے سے تو مجھے قتل کرے گا اللہ تعالیٰ اسی طریقے سے تجھے آخرت میں قتل کرے گا۔

حجاج: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں معاف کردوں؟

سعید: معافی تو اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ تمہارے لیے کوئی چھٹکارہ ہے اور نہ کوئی عذر۔"

حجاج: اسے لے جا کر قتل کردو۔

جب حضرت سعید بن جبیر دروازے سے باہر نکلے تو ہنس پڑے۔ حجاج کو اس کی خبر کی گئی تو اس نے انہیں واپس لانے کا حکم دیا۔

حجاج: تم کیوں ہنسے ہو؟

سعید: مجھے خدا پر تمہاری جرأت اور خدا کی تم پر بردباری پر تعجب ہوا۔

حجاج نے چمڑا بچھائے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ بچھ گیا تو اس نے انہیں قتل کرنے کا کہا۔

سعید: ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفاً وَمَا أَنَاْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الأنعام: ۷۹) "میں نے سب سے یکسو ہوکر اپنے آپ کو اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔"

حجاج: اسے قبلے کے رخ سے پھیر کر باندھو۔

سعید: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجْهُ اللّهِ﴾ (البقرة: ۱۱۵) "جدھر بھی تم رخ کرو ادھر ہی اللہ کی ذات ہے۔"

حجاج: اسے منہ کے بل لٹادو۔

سعید: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى﴾ (طـٰـه: ۵۵) "اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم تمھیں لوٹائیں گے اور اسی سے ہم تمہیں دوسری دفعہ نکالیں گے۔"

حجاج: اسے ذبح کردو۔

سعید: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اس کے بعد انہیں چمڑے پر ذبح کردیا گیا۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔[695]

سنت نبویہ کے ایک چھوٹے سے مسئلے پر اپنی جانیں قربان کرنے والے ایسے بہادر فدا کاروں کے ذریعے سنت مطہرہ صاف شفاف اور بغیر گدلاہٹ کے ہم تک پہنچی۔

سعید بن جبیر، محمد بن منکدر، اویس قرنی اور مسروق ایسے ہزاروں نام گنوائے جا سکتے ہیں، لیکن چونکہ ان عظیم ہستیوں میں سے ہر ایک کے حالات زندگی کا تذکرہ اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے اس لیے ہم علم حدیث کے میدان میں شہرت پانے والے بعض تابعین عظام کے حالات زندگی انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ا: حضرت سعید بن مسیب

تابعین کے دور میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے تذکرہ کے وقت سب سے پہلے حضرت سعید بن مسیّب کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے دوران پندرہ ہجری میں پیدا ہوئے اور حضرت عثمان، علی، سعد بن ابی وقاص، ابن عباس، ابن عمر، ابوذر، ابوالدرداء، زید بن ثابت، ابوہریرہ اور ابوسعید وغیرہ ایسے کبار صحابہ سے ملے۔

وہ غور و فکر کرنے والے انسان اور قوتِ حفظ کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے امام ربانی تھے۔ جو بات ایک دفعہ سن لیتے کبھی نہ بھولتے۔ (696) ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی، لیکن عمر بھر صرف چند ایک بار ہی ہنسے ہوں گے۔ ساری زندگی خوفِ خدا کے ساتھ ایسے گزاری جیسے اپنے پروردگار و خالق کے سامنے کھڑے ہوں۔ وہ ایمان و پرہیزگاری اور معتدل مزاجی اور خاص طور پر سنت کے بارے میں وسعت علمی کی وجہ سے مشہور تھے اور سب کو اس کا اعتراف تھا۔

جس طرح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے صحابہ کرام کے دور میں بصرہ میں اپنا مدرسہ قائم کیا تھا، اسی طرح حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا مدینہ منورہ میں ظہور ہوا اور بیس سال کی عمر سے پہلے ہی افتاء کے مقام پر فائز ہو گئے۔ (697) صحابہ کرام انہیں تعجب اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ صحابہ کرام کے ہاں انہیں اس قدر قدر و منزلت حاصل تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: ''اگر رسول اللہ ﷺ اسے دیکھتے تو خوش ہوتے۔'' (698)

زندگی کے پچاس برس میں صف اول میں ان کی نماز باجماعت کبھی فوت نہ ہوئی۔ ان کا ارشاد ہے: ''پچاس برس سے میری تکبیر اولیٰ فوت ہوئی اور نہ ہی میں نے نماز میں کسی کی گدّی دیکھی ہے۔'' (699) عبادت کے بارے میں ان کی احتیاط اور شوق و اشتیاق کا یہ عالم تھا۔ اتباع سنت کا بھی وہ

اسی قدر اہتمام کرتے تھے۔ دوسرے تابعین کی طرح انہیں بھی نماز، سنتوں اور نماز با جماعت کا شدید اہتمام رسول اللہ ﷺ سے ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے اس بارے میں عمر بھر کبھی سستی کا مظاہرہ نہ کیا۔ ایک مرتبہ وہ مدینہ منورہ میں شدید بیمار پڑ گئے۔ طبیبوں نے مکمل صحت یابی کے لیے انہیں وادی عقیق میں ایک ماہ قیام کرنے کی ہدایت کی۔ اس پر انہوں نے پوچھا: ''میں عشاء اور فجر کی نمازوں کا کیا کروں گا؟'' (700) یعنی اس صورت میں میں عشاء اور فجر کی نمازوں پر کیسے پہنچوں گا۔ ہوسکتا ہے وادی عقیق میں ان کے لیے باجماعت نماز کی ادائیگی ممکن ہوتی لیکن اس سے بہرکیف روضہ انور میں نمازوں کی ادائیگی سے محرومی اور اس میں اور جنت البقیع میں مدفون پاکیزہ ہستیوں سے دوری لازم آتی۔ (701)

ولید کے عہد خلافت میں مدینہ کے گورنر ہشام بن اسماعیل نے انہیں اموی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے کہا، لیکن انہوں نے انکار کردیا، جس پر اس نے انہیں ساٹھ کوڑے مارے اور جیل میں ڈال دیا۔ حضرت مسروق اور طاؤس ایسے بڑے بڑے تابعین نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور صرف زبانی ہی بیعت کرنے کی درخواست کی، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ لوگ ہماری تقلید کرتے ہیں، بھلا ایسی صورت میں لوگوں کے سامنے ایسا اقدام کیسے کیا جاسکتا ہے۔

انہوں نے حدیث کے سرچشمے کے زیادہ قریب رہنے اور اس کا زیادہ فہم حاصل کرنے کے لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دختر سے شادی کی تھی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹے ہشام کے لیے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا، یوں کہیے موجودہ ترکی سے بیس اکیس گنا بڑی سلطنت کا طاقتور حکمران اپنے اس بیٹے کے لیے ان کی بیٹی کے رشتے کا طلب گار تھا جو مستقبل میں اس وسیع وعریض سلطنت کا حکمران بننے والا تھا، لیکن انہوں نے تمام تر دباؤ کے باوجود اس رشتے کو رد کردیا اور قبول نہ کیا اور جب ان پر دباؤ بڑھا تو انہوں نے ایک رات اپنی بیٹی کو لیا اور اسے اپنے ایک غریب طالب علم ابن ابی وداعہ جو مسجد میں سوتے تھے، کے پاس لے گئے اور اسے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے کہا۔ (702)

یہ عظیم امام اس بارے میں صدیوں بعد آنے والے ایک دوسرے عظیم امام بہاؤالدین نقشبندی کے لئے اسوہ تھے، جو اپنی بیٹی کے بالغ ہونے کے بعد ایک صبح اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی خانقاہ لے گئے اور اسے رات بھر عبادت کرنے والے واحد طالب علم علاؤالدین کے عقد زوجیت میں دے دیا۔

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے عطاء بن ابی رباح، قتادہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

پڑپوتے محمد باقر، یحییٰ بن سعید انصاری اور امام زہری ایسے بڑے بڑے ائمہ کرام نے احادیث روایت کی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ ان کی مرسل احادیث (703) کو حجت قرار دیتے تھے۔ (704) حضرت سعید بن مسیّب پر اس قدر اعتماد و اطمینان کا اظہار کیا جاتا تھا جیسے انہیں صحابہ میں شمار کیا جاتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے مبارک افعال وارشادات ان پاکیزہ ندیوں کے ذریعے ہم تک پہنچے اور سنت نبویہ ہم تک ایسے امانت دار حضرات کے ذریعے پہنچی جو ایک حدیث کی خاطر جان تک کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوتے تھے اور ان شاءاللہ یہ سنت نبویہ قیامت تک ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہے گی۔

۲- علقمہ بن قیس نخعی

بصرہ کے تذکرہ سے ذہن حضرت حسن بصری، مکہ کے تذکرہ سے عطاء بن ابی رباح، یمن کے تذکرہ سے طاؤس بن کیسان، مدینہ کے تذکرہ سے سعید بن مسیّب اور کوفہ کے تذکرہ سے علقمہ بن قیس نخعی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ جلیل القدر تابعین عظام صحابہ کرام کے بہترین اخلاف تھے۔

حضرت علقمہ رحمہ اللہ کا شمار حدیث کے بڑے ائمہ میں ہوتا ہے، انہوں نے سینکڑوں صحابہ کرام سے احادیث روایت کی ہیں، جن میں خلفائے راشدین سرفہرست ہیں۔ وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بہت قریب رہے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی اکتساب علم کیا۔

وہ جس قدر عظیم اور اپنے معاصرین سے فائق تھے اسی قدر متواضع بھی تھے۔ کوفہ کے مدرسے کی تاسیس دست قدرت نے ان کی نصیب میں لکھی تھی، اسی مدرسے سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت علقمہ سے کوفہ کے تمام تابعین نے احادیث روایت کی ہیں۔

ان میں بہت سے صحابہ کرام کی زیارت کا شرف حاصل کرنے والے تابعی حضرت عمرو بن شرحبیل سرفہرست ہیں۔ وہ اپنے احباب سے کہا کرتے تھے: ''چلو سیرت و کردار میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والی ہستی کے پاس چلیں۔'' حضرت علقمہ رحمہ اللہ سیرت و کردار میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سب سے زیادہ مشابہ تھے (705) اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سیرت و کردار اور چال ڈھال میں نبی اکرم ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ (706)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا جسم نحیف تھا، لیکن ان کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتی تھے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''قرآن چار لوگوں عبداللہ بن مسعود (ان کا نام سب سے پہلے ذکر کرتے) ابوحذیفہ کے مولی سالم، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل سے سیکھو۔''(707) اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت علقمہ سے قرآن پڑھواتے اور ان سے فرماتے: ''میرے ماں باپ تجھ پر قربان! (قرآن) پڑھ۔''(708)

عظیم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن کے زہد و تقوی کا دور دور تک شہرہ تھا، حضرت علقمہ کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ حضرت علقمہ فقہ اور حدیث میں بعض صحابہ پر فوقیت رکھتے تھے۔ یہ ہم نہیں کہہ رہے، بلکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ایسے عظیم امام کی رائے ہے، جس کی خاکِ پا تک پہنچنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے۔ فتنے و آزمائش کے دور میں کسی نے انہیں بہت غلیظ قسم کی گالیاں دیں۔ حضرت علقمہ انہیں سکون کے ساتھ سنتے رہے اور آخر میں صرف یہ آیت مبارکہ تلاوت کی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وَإِثْماً مُّبِيْناً﴾ (الأحزاب: ٥٨) ''اور جو لوگ مؤمن مردوں اور عورتوں کو ایسے کام کی تہمت سے جو انہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انہوں نے بہتان کا اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔'' ایک مرتبہ ان سے کسی نے پوچھا: ''اے ابوشبل! کیا تم مؤمن ہو۔'' تو انہوں نے جواب میں فرمایا: ''مجھے امید ہے۔''(709)

وہ اپنے دور کے ہر باطل کے سامنے سینہ سپر رہے۔ انہوں نے بنوامیہ کے ظالم حکام کی کبھی طرف داری نہ کی، بلکہ عمر بھر حدیث کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوفہ میں اسود بن یزید نخعی، ابراہیم نخعی اور امام ابوحنیفہ کے شیخ و استاد حماد بن ابی سلیمان ایسے دسیوں طلبہ تیار کرنے میں مصروف رہے۔ جس طرح انہوں نے سینکڑوں صحابہ سے علم حدیث حاصل کیا اسی طرح ان سے سینکڑوں تابعین نے احادیث روایت کیں، لہٰذا انہیں کوفہ کے اس مدرسے کا بجا طور پر بانی کہا جاسکتا ہے جس میں نخعی، ثوری اور ابوحنیفہ ایسے عظیم ائمہ اور علماء تیار ہوئے۔

۳- حضرت عروہ بن زبیر بن عوام رحمہ اللہ

حضرت عروہ رحمہ اللہ کے والد ماجد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا جن پر آپ ﷺ فخر فرمایا کرتے تھے، کے بیٹے تھے۔(710)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بڑے صحابہ اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے، حضرت عروہ رحمہ اللہ کی والدہ حضرت عائشہ رضہ اللہ عنہا کی بہن اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تھیں۔ اس سے حضرت عروہ رحمہ اللہ کی خاندانی نجابت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، چونکہ ان کی والدہ اکثر اوقات اپنی بہن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہتیں اس لیے حضرت عروہ نے اپنی خالہ جان کے حجرے میں پرورش پائی اور ان سے ہر ہر آیت اور حدیث کا مطلب سمجھا، یہاں تک کہ وہ خود ''گنجینۂ علم'' بن گئے، نیز انہوں نے اپنے سے سات آٹھ برس بڑے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے علم سے بھی استفادہ کیا۔

حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کا شمار اپنے دور کے سات فقہاء میں ہوتا ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تمام احادیث ان کے واسطے سے مروی ہیں۔ انہوں نے علی بن ابی طالب، ابن عمر، ابن عباس، ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایسے بہت سے صحابہ کرام سے بھی احادیث روایت کی ہیں، نیز قتادہ بن دعامہ، ابن شہاب زہری، یحیٰی بن سعید انصاری اور زید بن اسلم ایسے سینکڑوں تابعین نے ان سے اکتسابِ علم کیا ہے۔

دوسرے بڑے بڑے ائمہ اکرام کی طرح حضرت عروہ رحمہ اللہ بھی متقی و پرہیز گار اور مجاہدانہ زندگی کی وجہ سے مشہور تھے۔ وہ عالم ربانی کا حقیقی مصادق تھے۔ ضعیف العمری میں ان کی ایک ٹانگ کینسر کا شکار ہوگئی تو طبیبوں کے پاس ٹانگ کاٹنے کی تجویز دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ شروع میں حضرت عروہ رحمہ اللہ کو تردد ہوا، لیکن جب بیماری پھیلنے لگی تو انہیں اسے کٹوانے پر راضی ہونا پڑا۔ جب طبیبوں نے آری سے ان کی ٹانگ کاٹنی شروع کی تو انہوں نے کسی قسم کی تکلیف کا اظہار نہ کیا، بلکہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو بات ارشاد فرمائی تھی ﴿ لَقَدْ لَقِينَا مِن سَفَرِنَا هَذَا نَصَبا ﴾ (الکھف: ۶۲) ''اس سفر سے ہم کو بہت تکان ہوگئی ہے۔'' اسے دہراتے رہے پھر انہوں نے اپنے کاٹے گئے پاؤں کو منگوایا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس نے تیرے ذریعے مجھے چلایا! اللہ خوب جانتا ہے کہ تیرے ذریعے میں کسی بھی حرام یا معصیت کی طرف چل کر نہیں گیا۔''(711)

ایک دن ان کا ایک بیٹا اصطبل میں داخل ہوا۔ اسے گھوڑے نے لات ماری، جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ جب حضرت عروہ رحمہ اللہ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے فرمایا: ''اے اللہ! میرے چار اعضاء تھے ان میں سے ایک آپ نے لے لیا اور تین کو باقی رکھا، اس پر میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں، اسی

طرح میرے چار بیٹے تھے، ان میں سے ایک آپ نے لے لیا اور تین کو میرے لیے زندہ رکھا، اس پر بھی میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ بخدا! اگر آپ نے (کچھ) لیا ہے تو (بہت کچھ) چھوڑا بھی ہے اور اگر آپ نے آزمائش میں ڈالا ہے تو بہت عرصہ عافیت کے ساتھ بھی تو رکھا ہے۔"(712) حضرت عروہ رحمہ اللہ ان لوگوں کے سنہری سلسلے کی ایک کڑی تھے، جو اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی تھے۔

۴۔ محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہ اللہ

قریش کی روایت کردہ احادیث کا چوتھائی حصہ ابن شہاب زہری سے مروی ہے۔ وہ سب سے کم عمر تابعی تھے۔ ان کے والد مسلم بنوامیہ کے مخالف تھے اور حجاج کے خلاف کھڑے ہوئے۔ اسی وجہ سے بنوامیہ انہیں ناپسند کرتے تھے، لہٰذا بعض لوگوں کے دعوؤں کے علی الرغم ابن شہاب زہری بنوامیہ کے حامی نہ تھے، بلکہ بنوامیہ انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتے اور ان سے انہیں اندیشہ لگا رہتا۔

امام زہری نے سات سال سے بھی کم عمر میں صرف آٹھ دن میں پورا قرآن کریم حفظ کر لیا اور سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں افتاء و اجتہاد کے مقام پر فائز ہو گئے۔ وہ غضب کے ذہین تھے۔ کہا کرتے تھے: "میرے ذہن میں کوئی بات آنے کے بعد کبھی نہیں نکلی۔"(713) چونکہ ان کا دور ماحول اور شرائط کے لحاظ سے تعلیمی دور تھا، اس لیے وہ کوئی بات سیکھنے کے بعد کبھی نہیں بھولے۔ ابتدا میں انہوں نے آٹھ برس تک حضرت سعید بن مسیّب کے حلقہ درس میں شرکت کی۔ انہوں نے حضرت عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ کے اسباق میں بھی شرکت کی جن کا شمار اپنے دور کے سات معروف فقہاء اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تربیت کرنے والے تین حضرات میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں کہا کرتے تھے: "میں پینتالیس برس تک حجاز سے شام اور شام سے حجاز آتا جاتا رہا۔ میں کسی بھی حدیث کے بارے میں سنتا تو اس سے استفادہ کرتا۔"(714)

وہ پینتالیس برس کے اس طویل عرصے میں بجا طور پر قرآن کریم کی ضخامت سے دسیوں گنا زیادہ احادیث اور علمی مسائل یاد کر سکتے تھے، لیکن حدیث کی خاطر اپنے آپ کو وقف کرنے کے باوجود ان سے مروی احادیث کی ضخامت ڈیڑھ قرآن کریم کے برابر ہے، بعض لوگوں نے ان پر بنوامیہ کی چاپلوسی کرنے کا الزام لگایا ہے، لیکن یہ الزام قطعاً غلط ہے، کیونکہ وہ خود خوشامدی تھے اور نہ ان کے والد ایسے انسان تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے سپرد کر رکھا تھا۔ ان کے والد حضرت عبداللہ بن زبیر کے ساتھ مل کر بنوامیہ کے خلاف لڑتے رہے، یہی وجہ تھی کہ جب امام زہری کی خلیفہ عبدالملک بن مروان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تو اس نے ان کے والد کے موقف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناراضگی کا اظہار کیا۔

یہ درست ہے کہ امام زہری ہشام کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی غرض سے کچھ عرصہ تک بنوامیہ کے محلات میں ٹھہرے، لیکن یہ کوئی غلط اقدام نہ تھا، بلکہ مستقبل میں سلطنت کی زمام اقتدار سنبھالنے والے ان بچوں کی سیدھے راستے اور سنت نبویہ کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے یہ ایک زبردست لائحہ عمل تھا۔ یہ امام زہری کی زبردست خدمت تھی، جس کے ذریعے وہ بعد میں آنے والوں کے لیے ایک نمونہ بن گئے۔

بنوامیہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر طعن وتشنیع کرتے تھے اور واقعہ افک کے موقع پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت میں نازل ہونے والی آیت ﴿ان إِنَّ الَّذِينَ جَاؤُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (النور: ۱۱) ''جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا ہے وہ تم ہی میں سے ایک جماعت ہے۔ اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ ان میں سے جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لیے اتنا وبال ہے اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہوگا۔'' کی تفسیر کرتے ہوئے ﴿وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ﴾ کا مصداق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے تھے، لیکن امام زہری نے اس تفسیر کی مخالفت کی اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر لگائے جانے والے اس بہتان کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ آیئے اس واقعے کو امام زہری کی زبانی سنتے ہیں:

میں ولید بن عبدالملک کے پاس تھا کہ اس نے آیت مبارکہ ﴿وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ تلاوت کی اور کہا کہ یہ آیت علی بن ابی طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی درستگی فرمائے! مجھے حضرت عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تفسیر ایسے نہیں بتائی۔'' اس نے پوچھا: ''عروہ نے تمہیں کیا بتایا ہے؟'' میں نے کہا: ''عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے مجھے بتایا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول منافق کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [715] جب میں نے دیکھا کہ امیر المومنین کو میری بات پر غصہ آیا ہے اور وہ میری طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھنے لگا ہے تو میں نے اس سے کہا: ''تیرا باپ مرے! بخدا! اگر کوئی آسمان سے پکار کر کہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنا جائز قرار دے دیا ہے، تب بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا۔'' [716] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ مراد نہیں، بلکہ عبداللہ بن ابی سلول منافق مراد ہے۔

امام زہری بنوامیہ کے خوشامدی ہرگز نہ تھے، بلکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ بنوامیہ کے محلات میں آل بیت کی محبت متعارف کرانے کا سہرا ان کے سر ہے۔ جس طرح ایک شیعہ عالم ابوجعفر اسکافی نے سب سے پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر دروغ گوئی کا الزام لگایا، اسی طرح ایک شیعہ مؤرخ یعقوبی نے سب سے پہلے امام زہری پر وضع حدیث کا بہتان لگایا۔ اس کے مطابق عبدالملک بن مروان نے مسلمانوں کو کعبہ کے گرد طواف کرنے سے روکنے کے لیے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی اور اس مقصد کے لیے زہری سے احادیث گھڑنے کی فرمائش کی، جس کی تعمیل میں زہری نے صحیح بخاری، مسلم اور مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ ایسی کتبِ صحاح میں مروی حدیث ''تین مسجدوں یعنی مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کے سوا کسی مسجد کی طرف رخت سفر نہ باندھا جائے۔''(717) گھڑی۔

یہ بالکل غیر سنجیدہ قسم کا دعویٰ ہے، کیونکہ نہ تو یہود و نصاریٰ کی تاریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ مسجد حرام کی طرح مسجد اقصیٰ کے گرد طواف کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس بارے میں کوئی نص موجود ہے، نیز مسجد اقصیٰ کو مسلمانوں کے ہاں ابتدا سے ہی تقدس حاصل ہے۔ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق مسجد اقصیٰ اور اس کا گرد و نواح بابرکت مقام ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی تعمیر صرف عبدالملک نے ہی نہیں کی، بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی وغیرہ نے اس کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا ہے، نیز جس وقت امام زہری نے یہ حدیث روایت کی تھی، اس وقت تک ان کی خلیفہ عبدالملک سے ملاقات اور سامنا ہی نہیں ہوا تھا، کیونکہ اس وقت ان کے والد حضرت عبداللہ بن زبیر کے ہمراہ عبدالملک سے برسرِ پیکار تھے، لہٰذا اس بات میں کوئی معقولیت پائی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ امام زہری اپنے والد کا ساتھ چھوڑ کر عبدالملک سے جا ملے ہوں، مزید برآں اس بہتان کا یعقوبی کی کتاب کے سوا کہیں ذکر نہیں ملتا جو نہایت قابل توجہ امر ہے، کیونکہ تابعین کے اس دور میں یہ واقعہ راز نہیں رہ سکتا تھا، جس میں ہزاروں افراد سنت نبویہ کے معمولی سے مسئلے پر بھی اپنی جانیں فدا کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عبدالملک اتنا سادہ لوح انسان نہ تھا کہ ایسی عجیب و غریب تجویز پیش کرتا۔ خلافت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے اس کا شمار مکہ کے محدثین میں ہوتا تھا اور تابعین میں سے ائمہ حدیث سے واقف تھا۔ کسی حرام کے ارتکاب کا اس کے دل میں خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا، تاہم منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد وہ اپنی اس حساس مزاجی کو برقرار نہ رکھ سکا، لیکن اس دور میں امام زہری ابھی اپنی والدہ کی گود میں تھے۔

نہ صرف گولڈزیہر (Goldziher) مستشرق نے یعقوبی کے اس بہتان کو لے کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے، بلکہ یہ تہمت احمد امین، علی حسن عبدالقادر اور ابوریہ ایسے مغرب زدہ مسلمان مصنفین کی کتابوں میں بھی در آئی۔ گولڈزیہر ایسے مستشرقین نے حدیث اور علم حدیث کا بنیادی ماخذ اور سرچشمہ سمجھی جانے والی کتابوں کو نظرانداز کر کے ''العقد الفرید'' اور ''الاغانی'' ایسی فحش ادبی کتابوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، حالانکہ ایسی کتابوں کے ناموں سے ہی ان کی حیثیت کا علم ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ اور ابن شہاب زہری ایسے حدیث کے اساطین اور علمبرداروں کی کردارکشی سے مستشرقین کا مقصد اسلام کے اہم ترین رکن سنت نبویہ کو منہدم کرنا تھا، لہٰذا ماضی وحال میں مستشرقین کے نقش قدم پر چلنے والے لوگوں کو ہم دانستہ یا نادانستہ طور پر اسی ہدف کی تکمیل کرنے والے افراد سمجھتے ہیں۔ امام زہری کے بعد آنے والے المدینی، ابن حبان، ابن ابی حاتم، حافظ زبیر اور ابن حجر ایسے تمام بڑے بڑے علمائے حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ زہری حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اس عظیم امام کی وفات کے بعد نظام ایسے علمائے معتزلہ جن کے عقیدہ توحید کی بعض مادی فلسفوں سے آمیزش ہو چکی تھی، نے اپنے سامنے میدان خالی پا کر اپنی فکر کے گھوڑے دوڑائے اور گمراہی پھیلائی درحقیقت گولڈزیہر اور اس جیسے دیگر مستشرقین نے نظّام کے افکار اور اس کے شاگرد جاحظ کی ''کتاب الحیوان'' ایسی کتابوں پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھ کر سنجیدہ اور ٹھوس علمی تحقیق کے طریق کار سے نابلد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ نے دسیوں صحابہ کرام سے علم حدیث حاصل کیا اور ان سے سینکڑوں تابعین اور تبع تابعین نے احادیث روایت کیں، نیز انہوں نے حضرت نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے کہنے پر سرکاری طور پر پہلی دفعہ حدیث کی تدوین بھی کی۔ یہ تمام اعزازات انہیں آخرت کی طرف کوچ کرنے سے پہلے حاصل ہو چکے تھے۔

میں یہیں پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ اگرچہ بہت سے بڑے بڑے تابعین کے بارے میں گفتگو ہو سکتی ہے، ان میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں: سلسلہ نقشبندیہ کے بانی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی کے پوتے قاسم بن محمد جو فقہائے سبعہ میں شمار ہوتے ہیں۔ امام مالک کے استاد حضرت نافع جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مرجانہ نامی باندی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے آیت بارکہ ﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (آل عمران: ۹۲) ''(مومنو!) جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں اللہ کی

راہ میں خرچ نہ کرو گے، کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے۔" سنی تو میں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کے بارے میں سوچا۔ مجھے اپنی رومی باندی مرجانہ سے بڑھ کر کوئی چیز پسند نہ آئی، چنانچہ میں نے اسے آزاد کر کے اس کی شادی کرا دی۔[718] طاؤس بن کیسان جنہوں نے چالیس سال تک عشاء کی نماز کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی،[719] حضرت اسود بن یزید نخعی اور حضرت امام ابوحنیفہ جن کے بارے کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بعض صحابہ سے ملاقات کی ہے۔[720] ان تمام شخصیات کے حالاتِ زندگی بیان کیے جا سکتے تھے، لیکن ہماری رائے میں جس قدر لکھا جا چکا ہے وہ اپنے موضوع کی مناسبت سے کافی ہے۔

خاتمہ

قرآن کریم اور سنت نبویہ اسلام کے دو بنیادی ارکان ہیں۔ سنت اور حدیث کے بغیر اسلام کا تصور ممکن نہیں۔ سنت جو کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث، افعال اور تقریرات سے عبارت ہے، رسول اللہ ﷺ کے دور سے اس کی حفاظت کی گئی، دلوں اور ذہنوں پر اسے نقش کیا گیا اور پھر اس کی تدوین عمل میں آئی۔ صحابہ کرام نے سنت نبویہ کی روشنی میں اپنی زندگی کو ڈھالا اور پھر بغیر کسی کمی بیشی کے اسے تابعین تک پہنچایا۔ چونکہ تابعین کا دور بڑا پرفتن تھا اس لیے انہوں نے اپنی زندگی میں زہد وتقویٰ کو بنیادی اہمیت دی۔ ہزاروں جلیل القدر تابعین نے اسلام کے دونوں ستونوں قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور پھر بغیر آمیزش کے اسے اگلی نسلوں تک پہنچایا۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک کے مطابق ان تینوں زمانوں یعنی صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار کے لوگ سب سے بہتر لوگ تھے۔(721)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں: ''بہترین بات اللہ کی کتاب ہے۔ بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ بدترین بات (دین میں) نئے ایجاد کردہ امور ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''(722) ذیل میں اس موضوع سے متعلق چند نورانی ارشادات پیش کیے جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری ساری امت جنت میں جائے گی سوائے انکار کرنے والے کے۔'' صحابہ نے پوچھا: ''یارسول اللہ! انکار کرنے والے کون لوگ ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو میری اطاعت کرے گا جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا اس نے انکار کیا۔''(723) آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''میری اور میری امت کی مثال اس شخص جیسی ہے، جس نے آگ روشن کی، لیکن جانور اور پتنگے اڑ اڑ کر اس میں گرنے لگے۔ میں تمہیں تمہاری کمروں سے پکڑے ہوئے ہوں، لیکن تم ہو کہ اس میں گھسے جاتے ہو۔''(724)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں تم میں سے کسی کو اپنی مسہری پر ٹیک لگائے ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ اس کے پاس میرے اوامر یا نواہی میں سے کوئی حکم پہنچے اور وہ کہے: 'ہم نہیں جانتے، جو کچھ ہم کتاب اللہ میں پاتے ہیں ہم اس کی پیروی کرتے ہیں۔''(725) ابوداؤد کی روایت میں اس حدیث کا اختتام یوں ہوتا ہے: ''سنو! مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس کی مثل دی گئی ہے۔'' یعنی مجھے سنت بھی دی گئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے: ''تم میں سے جو میرے بعد جیئے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی لازم ہے۔ اسے انتہائی مضبوطی سے تھامے رکھنا اور نئے نئے امور سے بچتے رہنا، کیونکہ (دین میں) ہر نئی ایجاد کردہ بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''(726)

امام مالک کی موطا جسے بعض اہل علم نے سنن ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں شمار کیا ہے، میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے: ''میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جب تک تم انہیں تھامے رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے، وہ دو چیزیں اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت ہیں۔''(727)

اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے ہاں سنت کا یہ مقام ہے۔ جب یہ حقیقت ہے اور سنت نبویہ چودہ سو سال سے مسلمانوں کی راہنمائی کرنے، ان کے لئے مشعلِ راہ اور رضائے خداوندی کے حصول کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور قرآن کریم کی طرح تقریر و تحریر کی صورت میں نسل در نسل ہم تک پہنچی ہے تو ہم صحیح اور کافی علم سے بے بہرہ مستشرقین کے ان پیروکاروں سے جو سنت پر الزام اور اسے داغدار کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں سے قرآنِ کریم کے الفاظ میں پوچھتے ہیں: ﴿فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ﴾ (التکویر: ۲٦) ''پھر تم کدھر جا رہے ہو؟''

تمت بالخیر

حواشی وحوالہ جات

(1) اس سے ۱۹۸۹ء میں بلغاریہ میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے افسوسناک واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

(2) أبو داؤد، الجهاد، ۸۲؛ المسند، الامام أحمد، ۱/ ۳۰۰.

(3) اس سے ''روح الجهاد و حقيقته في الاسلام'' نامی کتاب مراد ہے، جس کا اردو ترجمہ ''روحِ جہاد اور اس کی حقیقت'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

(4) السيرة النبوية، ابن هشام، ۱/ ۳٤۲؛ مجمع الزوائد، الهيثمي، ۹/ ۲۹۳.

(5) السيرة النبوية، ابن هشام، ۲/ ۱۱۸؛ السنن الكبرى، البيهقي، ۹/ ۱۳؛ مجمع الزوائد، الهيثمي، ٦/ ٦۱.

(6) السيرة النبوية، ابن هشام، ۲/ ۱۱٤-۱۱٥.

(7) البخاري، الجهاد، ۱۸۰؛ مسلم، الحج، ٤۳۹؛ أبو داؤد، الفرائض، ۱۰؛ فتح الباري، ابن حجر، ۳/ ٥۲۸.

(8) اس موضوع پر مزید تفصیل سیرتِ نبوی میں موجود حکمتوں کے عنوان کے تحت آئے گی۔

(9) محمد عاکف ارسوی (۱۸۷۳ء-۱۹۳۶ء) ایک ترکی شاعر ہیں۔ ترکی کا قومی ترانہ انہی کی تخلیق ہے۔

(10) الشفاء، القاضي، ۱/ ۲۳٤.

(11) الشفاء، القاضي، ۱/ ۲۳٥.

(12) العجلوني، كشف الخفا ۱/۱۴۰

(13) أبو داؤد، الملاحم، ٥؛ المسند، الامام أحمد، ٥/ ۲۷۸.

(14) عمر بن خطاب: جوانبه المختلفة وادارته للدولة، شبلي النعماني، ۲/ ۱٤٤.

(15) الشفاء، القاضي عياض، ۱/ ۲۳٤-۲۳٥.

(16) البخاري، الأحكام، ۳۳؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٦۳؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٦/ ۳۳٦.

(17) البداية والنهاية، ابن كثير، ٦/ ۳۳٦؛ كنز العمال، الهندي، ۱۰/ ٥۷۹.

(18) البخاري، الأحكام، ٤؛ مسلم، الامارة، ۳۹؛ ابن ماجة، الجهاد، ٤۰.

(19) غزوہ بدر کی تفصیلات کے لیے دیکھئے: السيرة النبوية، ابن هشام، ۲/ ۲٦٤؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ۳/ ۳۱۸-۳۳۱.

(20) البخاري، المغازي، ۳؛ مسلم، التوبة، ٥۳.

(21) البخاری،صلاة الخوف،١-٣؛ مسلم، صلاة المسافرین،٣٠٥-٣١٢؛ابو داؤد،السفر،١٢.

(22) البخاری،المغازی،٤٨؛السیرة النبویة،ابن هشام،٤/٢٣٩.

(23) البخاری،الجهاد والسیر، ١٤١؛ مسلم، فضائل الصحابة،١٦١؛أبو داؤد،الجهاد،٩٨.

(24) السیرة النبویة،ابن هشام،٤/٣٩-٤٢؛البدایة والنهایة،ابن کثیر،٤/٣٣٢-٣٣٥.

(25) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٧٠-٧٥؛البدایة و النهایة،ابن کثیر، ٣/١٨٢-١٨٣.

(26) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٧١-٨٥؛البدایة و النهایة،ابن کثیر،٣/١٩٢-١٩٧.

(27) الاصابة،ابن حجر،٤/٤١٨؛أسد الغابة،ابن الأثیر،١/٤٤٣.

(28) دیکھئے:أبو داؤد، الأدب، ٨٥؛الترمذی،الفتن،٣-٥؛مجمع الزوائد،الهیثمی،٦/٢٥٣-٢٥٤.

(29) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٢٤٥؛ البدایة و النهایة،ابن کثیر،٣/٢٨٦.

(30) المستدرك،الحاکم،٣/١٨٨؛ المغازی، الواقدی،١/٦٩-٦٨؛البدایة والنهایة،ابن کثیر٣/٣٣٤.

(31) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٢٤١؛المغازی،الواقدی،١/١٠.

(32) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٢٤١؛المغازی،الواقدی،١/١٢.

(33) ''بواط''''جہینہ'' کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے، جو''ینبع'' کے قریب واقع ہے۔ یہ مدینے سے چار بُرد کے فاصلے پر واقع ہے اور شام کے رستے پر واقع ''ذوخشب'' سے قریب ہے۔

(34) السیرة النبویة،ابن هشام، ٢/٢٤٨؛البدایة والنهایة،ابن کثیر،٣/٣٠١.

(35) السیرة النبویة، ابن هشام،٢/٢٤٨-٢٤٩؛البدایة والنهایة،ابن کثیر،٣/٣٠٢.

(36) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٢٤٨-٢٤٩؛ البدایة والنهایة،ابن کثیر،٣/٣٠٤-٣٠٥.

(37) أسد الغابة،ابن الأثیر،٣/١٩٥؛ الاصابة، ابن حجر،٢/٢٨٦؛مجمع الزوائد،الهیثمی،٩/٣٠١.

(38) السیرة النبویة،ابن هشام،٢/٢٥٢،البدایة والنهایة،ابن کثیر، ٣/٣٠٦.

(39) مؤلف نے یہ بات ١٩٨٩ء میں کہی تھی، جب سوویت یونین میں حوادث پیش آنا شروع ہوئے تھے۔

(40) السیرة النبویة،ابن هشام، ٢/٢٧٠؛ البدایة والنهایة،ابن کثیر،٣/٣٢٤.

(41) البخاری،المغازی،٦١؛مسلم،الزکاة،١٤٤.

(42) کشف الخفاء،العجلونی،٢/١٦٤.

(43) البخاری،المناقب،٢٥؛المسند،الامام أحمد، ٤/٢٥٧، ٢٧٨.

(44) السيرة النبوية، ابن هشام، ٣٦٤/٢؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٢٨/٣.

(45) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٨٧/٢؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٣٥/٣.

(46) یہ بلغاریہ اور یونان کے شہروں کے نام ہیں۔(46) یہ بلغاریہ اور یونان کے شہروں کے نام ہیں۔

(47) البخاری، المغازی، ١٧؛ مسلم، الامارة، ١٤٥.

(48) السيرة، النبوية، ابن هشام، ٢٦٤/٢؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٣١٨/٣.

(49) حدیث مبارک میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی نسل کو اس کی پشت میں رکھا، لیکن میری نسل کو علی بن ابی طالب کی پشت میں رکھا۔'' (مجمع الزوائد، الهيثمی، ١٧٢/٩؛ فيض القدير، المناوی، ٢٢٣/٢؛ تاريخ بغداد، البغدادی، ٣١٧/١).

(50) المسند، الامام أحمد، ١٥٩/١.

(51) السيرة النبوية، ابن هشام، ١٢٧/٢؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٢١٦/٣.

(52) البخاری، المغازی، ٣٠؛ مسلم؛ الجهاد، ٦٥؛ الترمذی، السير، ٢٩.

(53) البخاری، مناقب الأنصار، ١٢؛ مسلم، فضائل الصحابة، ١٢٣؛ الترمذی، المناقب، ٥٠.

(54) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٦٣/٢؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣١٨/٣.

(55) الطبقات الكبری، ابن سعد، ١٢٠/٣.

(56) مسلم، الجهاد، ٨٦؛ المسند، الامام أحمد، ٥٣٨/٢.

(57) المسند، الامام أحمد، ٤١١/١، ٤١٨، ٤٢٢، ٤٢٤.

(58) نظامی گنجوی (۱۱۴۰-۱۲۰۳) کا شمار ایران کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور تالیفات میں ''مخزن الاسرار''، ''خسرو و شیریں'' اور ''لیلیٰ و مجنوں'' ہیں۔

(59) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٧٢/٢؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٢٦/٣- ٣٢٧.

(60) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٧٧/٢؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٣٣٣/٣.

(61) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٧٠/٢؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٢٤/٣.

(62) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٨٧/٢؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٥٠/٣-٣٥٣.

(63) البخاری، الجهاد، ٣٧؛ الرقاق، ٧؛ مسلم، الزكاة، ١٢١-١٢٣؛ ابن ماجة، فتن، ١٨.

(64) السيرة النبوية، ابن هشام، ٢٤٥/٢؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٢٨٦/٣.

(65) المسند، الامام أحمد، ٨٦/١.

(66) ویانا (Vienna) شہر مراد ہے۔

(67) شاید مصنف درج ذیل حدیث کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں: ''عنقریب اقوام عالم تمہارے خلاف ایک دوسرے کو ایسے بلائیں گی، جیسے کھانا کھانے والی جماعت ایک دوسرے کو پیالے کی طرف بلاتی ہے۔'' پوچھنے والے نے پوچھا: ''کیا اس وقت ایسا ہماری قلت کی وجہ سے ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی، لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے خس و خاشاک جیسی ہوگی، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب نکال دیں گے اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' ڈال دیں گے۔'' پوچھنے والے نے پوچھا: ''یارسول اللہ! ''وہن'' کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔'' (أبو داؤد، الملاحم، ٥؛ المسند، الامام أحمد، ٢٧٨/٥) (عربی مترجم)۔

(68) أبو داؤد، الجهاد، ٩٦؛ الترمذی، الجهاد، ٣٧؛ المسند، الامام أحمد، ٢ / ٧٠، ٨٦.

(69) البخاری، الزكاة، ٥٤؛ مسلم، فضائل، ١١.

(70) دیکھئے: البخاری، المغازی، ٥١-١٦؛ مسلم، الجهاد، ١١٩؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ٥٨/٣.

(71) السيرة النبوية، ابن هشام، ٥٠/٣-٥٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٤/٤.

(72) السيرة النبوية، ابن هشام، ٤٧/٣-٤٨؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٤١٥٤-٤١٦.

(73) السيرة النبوية، ابن هشام، ٦٧/٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٣/٤.

(74) السيرة النبوية، ابن هشام، ٦٦/٣-٦٧.

(75) البخاری، الجهاد، ١٢؛ مسلم، الامارة، ١٤٨؛ المسند، الامام أحمد، ١٩٤/٣.

(76) السيرة النبوية، ابن هشام، ٦٧/٣-٦٨؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٤/٤-١٥.

(77) البخاری، الاعتصام، ٢٨؛ الدارمی، الرؤيا، ١٣؛ المسند، الامام أحمد، ٣٥١/٣.

(78) السيرة النبوية، ابن هشام، ٦٨/٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٦/٤.

(79) السيرة النبوية، ابن هشام، ٧٠/٣؛ البداية و النهاية، ١٨/٤.

(80) البخاری، الجهاد، ١٦٤؛ أبو داؤد الجهاد، ١٠٦؛ المسند، الامام أحمد، ٢٩٣/٤؛ السيرة النبوية ابن هشام، ٧٠/٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٧/٤.

(81) مسلم، فضائل الصحابة، ١٢٨؛ المسند، الامام أحمد، ١٢٣/٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٧/٤-١٨.

(82) البخاری، الجهاد، ١٢٤؛ أبو داؤد، الجهاد، ١٠٦؛ المسند، الامام أحمد، ٢٩٣/٤؛ السيرة النبوية، ابن هشام ٧٠/٣؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ١٧/٤.

(83) مجمع الزوائد، الهيثمی، ١٠٩/٦.

(84) ارشاد خداوندی ہے: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ()لَّوْلاَ كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾(الأنفال:٦٧-٦٨) ''پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں، جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہادے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور خدا آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔ اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے لیا ہے، اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب (نازل) ہوتا۔''

(85) مسلم، الجهاد، ٥٨؛ المسند، الامام أحمد، ٣١/١-٣٢.

(86) السيرة النبوية، ابن هشام، ٨٧-٨٩/٣؛ الاصابة، ابن حجر، ٤٧٩/٤.

(87) الاصابه، ابن حجر، ٤٧٩/٤.

(88) السيرة النبوية، ابن هشام، ٨٨/٣؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٩/٤.

(89) البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٦/٤؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١١٠/٣-١٠١.

(90) البخاری، المغازی، ٢٤؛ مسلم، الجهاد، ١٠١.

(91) السيرة النبوية، ابن هشام، ٨٨/٣-٨٩؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٩/٤.

(92) السيرة النبوية، ابن هشام، ١١٠/٣؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٥٨/٤.

(93) البداية والنهاية، ابن كثير، ٥٧/٤؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١٠٧/٣.

(94) السيرة النبوية، إبن هشام، ١٠٧/٣، البداية والنهاية، ابن كثير، ٥٦/٤ ومابعد.

(95) البداية والنهاية، ابن كثير، ٥٦/٤؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١٠٧/٣.

(96) البداية والنهاية، ابن كثير، ٥٨/٤-٥٩؛ السيرة النبوية، ابن هشام، ١٠٨/٣.

(97) السيرة النبوية، ابن هشام، ٧١/٣، البداية والنهاية، ابن كثير، ١٧/٤-١٨.

(98) البخاری، الوضوء، ٧٢، الجهاد، ٨٠.

(99) اللمعات، بديع الزمان سعيد النورسی، *ساتواں لمحہ*، ص ٤١.

(100) السيرة النبوية، ابن هشام، ٨٨/٣، البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٥/٤-٣٦؛ البخاری، الجهاد، ١٢.

(101) ''میلوش'' ایک سرب کمانڈر تھا، جو اس معرکے میں معمولی زخمی ہوا تھا۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ میں سلطان کے سامنے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنے کپڑوں میں خنجر چھپا رکھا تھا، جسے اس نے سلطان کے قریب پہنچ کر ان کے سینے میں گھونپ دیا۔ (عربی مترجم)

(102) السيرة النبوية، ابن هشام، ١٠٠/٣ ومابعد؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ٤٣/٤.

(103) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام، ۲۱۳/۳؛البدایۃ النہایۃ،ابن کثیر،۹۵/٤-۹٦؛الکامل فی التاریخ،ابن الاثیر، ۱۹۲/۲.

(104) المریسیع: یہ بنوخزاعہ کا چشمہ ہے۔اس کے اور فرع کے درمیان ایک دن کی مسافت ہے۔

(105) کتاب المغازی،الوقدی،٤۱۰/۱.

(106) السیرۃ النبویۃ،۳۰۲/۳؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۷۸/٤-۱۸۲.

(107) السیرۃ النبویۃ،۳۰۹/۳-۳۲۱؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر، ۱۸۲/٤-۱۸۵.

(108) مسلم، الصلاۃ،۹.

(109) البخاری،الصلاۃ،۱۲،الأذان،٦؛مسلم الجہاد، ۱۲۰؛الموطأ،الجہاد،٤۸.

(110) البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۸۰/٤؛السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام، ۳۰۲/۳-۳۰۵.

(111) البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۸۰/٤.

(112) البخاری، مناقب الأنصار،۹،المغازی، ۲۹؛مسلم، الجہاد،۱۲۳-۱۲۵، ۱۳۰؛ البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۰٦/٤-۱۱٤؛السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲۲٦/۳-۲۳۰.

(113) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲۳۱/۳.

(114) کتاب المغازی،الواقدی،٤٦۰/۲.

(115) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲۳٥/۳؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر، ۱۲۰/٤-۱۲۱؛الکامل فی التاریخ،ابن الأثیر،۱۸۱/۲.

(116) البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر، ۱۲۰/٤؛السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲۳٥/۳؛کتاب المغازی، الواقدی، ٤۷۰/۲-٤۷۱.

(117) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲۳٥/۳؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر، ۱۲۱/٤-۱۲۲؛الکامل فی التاریخ،ابن الأثیر،۱۸۱/۲-۱۸۲.

(118) کتاب المغازی، الواقدی، ٤۷۰/۲-٤۷۲؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۲۰/٤.

(119) کتاب المغازی،الواقدی،٤۹٦/۲؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۲۳/٤،۱۳۳.

(120) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲۳۹/۳؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۲٤/٤؛الکامل فی التاریخ،ابن الأثیر،۱۸۲/۲.

(121) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام،۲٤۳/۳؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۲۹/٤-۱۳۲؛الکامل فی التاریخ،ابن الأثیر،۱۸٤/۲.

(122) السیرۃ النبویۃ،ابن ہشام، ۲۳۰/۳؛البدایۃ و النہایۃ،ابن کثیر،۱۱٦/٤؛تاریخ الأمم و الملوک،

الطبری، ۱۶۷/۳-۱۶۸؛الکامل فی التاریخ،ابن الاثیر،۱۷۹/۲.

(123) السیرۃ النبویۃ،ابن ھشام،۲۴۰/۳-۲۴۲؛البدایۃو النھایۃ،ابن کثیر،۱۲۸/٤-۱۳۰؛کتاب المغازی،الوقدی،۴۸۰/۲-۴۸۷.

(124) البدایۃو النھایۃ،ابن کثیر،۱۳۲/٤؛السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۲۴۲/۳-۲۴۳.

(125) السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۲٦٤/۳؛کتاب المغازی،الواقدی،۴۹۲/۲.

(126) البخاری،المغازی،۲۹؛ المسند، الامام أحمد،۲٦۲/٤.

(127) البخاری المغازی ۱۳۰، مسلم الجھاد ٦٥-٦٨

(128) البدایۃو النھایۃ،ابن کثیر،۳۲۲/۳؛دلائل النبویۃ،البیھقی،۱۰۷/۳.

(129) البخاری، المغازی، ۳۰؛الترمذی،السیر،۲۹.

(130) البخاری، الجھاد،۱۸؛المغازی، ۳۰؛مسلم،الجھاد،٦٥.

(131) البخاری، المغازی، ۳۰؛السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۲٤٥/۳؛البدایۃو النھایۃ،ابن کثیر،۱۳٤/۳.

(132) البخاری، الاستیذان،۲٦؛المغازی، ۳۰؛السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۲٤۹/۳-۲٥۱.

(133) تاریخی مآخذ میں رسول اللہﷺ کے غزوات کی تعداد کے بارے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ہم نے ان میں سے صحیح تر کو اختیار کیا ہے۔

(134) دوسری روایات میں اس موقع پر صحابہ کرام کی تعداد کے بارے میں اس سے مختلف اعداد و شمار بھی ملتے ہیں۔

(135) البخاری،مناقب الأنصار،٤٦؛الموطأ،المدینۃ،۱٤؛المسند ،الامام أحمد، ٦٥/٦،۸۳،۲۲۲.

(136) ارشادِ خداوندی ہے:﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ (الأنفال: ۳٥) ''اوران لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی تو تم جو کفر کرتے تھے اب اس کے بدلے عذاب (کا مزہ) چکھو۔''

(137) مسلم،تفسیر،۲٥؛النسائی،المناسك،۱٦۱.

(138) ارشادِ خداوندی ہے:﴿وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾(التوبۃ:۳) ''اور حج اکبر کے دن خدا اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دستبردار ہے) پس اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر نہ مانو (اور خدا سے مقابلہ کرو) تو جان رکھو کہ تم خدا کو ہرا نہیں سکو گے اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو۔''

(139) البـدايةو النهاية،ابن كثير، ١٩٢/٤-١٩٣؛كتاب المغازى،الوقدى،٥٧١/٢-٦٣٢؛الكامل فى التاريخ،ابن الاثير،٢٢٠/٢-٢٠٦.

(140) السيرة النبوية،ابن هشام،٣٢٥/٣-٣٢٨؛البدايةو النهاية،ابن كثير،١٨٩/٤-١٩١.

(141) السيرةالنبوية،ابن هشام،٣٤٢/٣-٣٤٤؛ البداية و النهاية،ابن كثير،٢٠٦/٤-٢٠٨.

(142) البخارى،الصلاة،١٢؛الأذان،٦؛ مسلم، الجهاد، ١٢٠.

(143) الاصابة،ابن حجر،٥٠٨/٢-٥٠٩.

(144) البخارى،المغازى،٣٨؛مسلم فضائل الصحابة،٤؛ الترمذى، المناقب، ٢٠.

(145) الاصابة،ابن حجر،٣٤٧/٤؛السيرةالنبوية،ابن هشام،٣٤٤/٣ ٣٤٥.

(146) البخارى،فضائل أصحاب النبى،٢٥؛ المغازى،٤٤؛المسند،الامام أحمد،٤/١، ٨.

(147) البداية و النهاية،ابن كثير،٢٩٨/٤، ٣١١؛تاريخ الأمم و الملوك،الطبرى، ٢٣٧/٣-٢٥٠.

(148) مـجـمـع الـزوائـد،الهيثـمى،١٥٦/٦-١٥٧؛السيرةالنبوية،ابن هشام، ١٥/٤، ٢١؛ البداية و النهاية، ابن كثير،٢٩١/٤.

(149) البخارى،المغازى،٤٤.

(150) البخارى،المغازى،٤٤؛المسند،الامام أحمد،١١٣/٣.

(153) مجمع الزوائد،الهيثمى، ١٦٠/٦؛المصنف،عبدالرزاق بن همام الصنعانى،٢٦٦/٥.

(152) السيرةالنبوية،ابن هشام، ٣٠/٤؛البدايةو النهاية،ابن كثير،٣٩٥/٤.

(153) البخارى،بدء الوحى،٣.

(154) السيرة النبوية،ابن هشام،٣١/٤ومابعد.

(155) السيرةالنبوية،ابن هشام،٣٩/٤.

(156) السيرةالنبوية،ابن هشام،٤١/٤.

(157) السيرة النبوية، ابن هشام،٤١/٤-٤٥.

(158) السيرة النبوية،ابن هشام،٤٩/٤-٥٠.

(159) البداية و النهاية،ابن كثير،٣٣١/٤-٣٣٢؛السيرةالنبوية،ابن هشام،٤٧/٤.

(160) كشف الخفاء، العجلونى،١٤٧/١.

(161) البدايةو النهاية،ابن كثير،٣٦٨-٣٧٢.

(162) البدايةو النهاية،ابن كثير،٣٧٣/٤ومابعد.

(163) البخاری،الجهاد،٥٢؛مسلم،الجهاد،٧٦-٧٧؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ٣٧٣/٤.

(164) البخاری،الجهاد،٥٢.

(165) البدايةو النهاية،ابن كثير،١٣/٥ومابعد.

(166) المسند،الامام أحمد،٨٦/١.

(167) البخاری،الجهاد،٧٤؛المغازی،٣١؛مسلم، كتاب صلاة المسافرين،٥٧.

(168) البخاری،الأدب،٣٩؛ابن ماجة،الجهاد،٩.

(169) البخاری،فضائل أصحاب النبی،٢؛المسند،الامام أحمد،٢/١.

(170) البداية و النهاية،ابن كثير،١٦٨/٣.

(171) ابن ماجة، الزهد،١٩؛الترمذی،الزهد،٩.

(172) البخاری، التوحيد، ٣٢؛مسلم،الايمان،٣٢٦.

(173) مسلم،الفتن،٢٢-٢٥؛المسند،الامام أحمد،٤/١.

(174) اس کے لئے کتب حدیث میں فتن وملاحم کے مباحث دیکھئے۔

(175) مجمع الزوائد،الهيثمی،٢١/٩.

(176) ابن ماجة،الأطعمة،٣٠؛مجمع الزوائد،الهيثمی،٢٠/٩.

(177) مجمع الزوائد، الهيثمی،١٩/٩-٢٠.

(178) السيرةالنبوية،ابن هشام،٤٧/٤-٤٨.

(179) البخاری،الاستئذان،٢٦؛الاصابة،ابن حجر،٣٨/٢.

(180) أبو داؤد،الأدب،١٥٢؛المسند،الامام أحمد،٢٥٣/٥.

(181) البدايةو النهاية ،ابن كثير،١٣٦/٣؛جامع البيان، الطبری،٣/١٥.

(182) مسلم،الفضائل،١٥٩-١٦٠.

(183) مسلم،الفضائل، ١٦٦-١٦٧.

(184) البخاری،المغازی،١٢، النكاح، ٤٨.

(185) الترمذی،النكاح،٦؛ابن ماجة،النكاح،٢١.

(186) المسند،الامام أحمد،٢٠١/١-٢٠٢.

(187) السيرةالنبوية،ابن هشام،٧٦/٢.

(188) السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۱۲۶/۲-۱۲۷.

(189) مسلم،فضائل الصحابۃ،۱۲۸.

(190) السیرۃ النبویۃ،ابن ھشام،۲۴۰/۳.

(191) البخاری، المناقب،۲۰.

(192) الاصابۃ،ابن حجر،۲۸/۱-۲۹.

(193) الاصابۃ،ابن حجر،۲۸/۱-۲۹.

(194) البخاری، المغازی،۸۳؛مسلم،الصلاۃ،۹۸؛مجمع الزوائد،الھیثمی،۲۴/۹-۲۵.]

(195) البخاری، فضائل الصحابۃ،۵؛مسلم،فضائل الصحابۃ،۲۲۱-۲۲۲.

(196) کشف الخفاء،العجلونی،۱۳۳/۱.

(197) البخاری،الایمان،۸؛مسلم،الایمان،۶۹.

(198) البدایۃوالنھایۃ، ابن کثیر،۷۶/۴.

(199) البدایۃ والنھایۃ، ابن کثیر،۴۴/۴.

(200) السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام،۱۰۵/۳.

(201) الاصابۃ،ابن حجر،۴۱۸/۴.

(202) البدایۃوالنھایۃ،ابن کثیر،۴۱۸/۴.

(203) البخاری، الجنائز، ۳۲؛مسلم،الجنائز،۱۰.

(204) الترمذی، السیر،۴۸.

(205) البخاری، الأحکام، ۳۵؛الترمذی،السیر،۴۸؛النسائی،القضاۃ،۱۷.

(206) مسلم،الایمان،۱۵۸؛ أبوداؤد، الجھاد، ۹۵.

(207) السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام،۲۶۹/۲.

(208) البخاری، کتاب الصلاۃ،۱۲؛مسلم، الجھاد،۱۲۰؛السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۴۲/۳ ومابعد.

(209) السیرۃالنبویۃ،ابن ھشام،۴۲/۴.

(210) السیرۃ النبویۃ،ابن ھشام،۲۷۱/۲_۲۷۲.

(211) البدایۃ والنھایۃ،ابن کثیر،۱۱۷/۴.

(212) مسلم،الامارۃ، ۱۶۷؛ أبوداؤد،الجھاد،۲۳؛ابن ماجۃ،الجھاد،۱۹.

(213) البخاری، الجهاد، ٨٦؛ المناقب، ٤؛ الترمذی، فضائل الجهاد، ١١؛ أبو داؤد، الجهاد، ٢٣.

(214) البخاری، الجهاد، ٨٠؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٤١.

(215) البخاری، الصلاة، ٤١؛ الجهاد، ٥٧؛ مسلم، الامارة، ٩٥؛ النسائی، الخیل، ١٦؛ أبو داؤد، الأدب، ٨.

(216) البخاری، الصلاة، ٤١؛ الجهاد، ٥٧؛ مسلم، الامارة، ٩٥؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ٣/ ٧٠.

(217) المستدرك، الحاکم، ٣/ ٤٧٥.

(218) الاصابة، ابن حجر، ٢/ ٢٥٢_٢٥٣.

(219) الاصابة، ابن حجر، ٢/ ٢٥٢_ ٢٥٣.

(220) المستدرك، الحاکم، ٣/ ٤٧٥.

(221) مجمع الزوائد، الهیثمی، ٩/ ٣١٨؛ البدایة و النهایة، ابن کثیر، ٤/ ١٧٩_ ١٨١؛ السیرة النبویة، ابن هشام، ٣/ ٣٠٤_٣٠٥.

(222) البخاری، المناقب، ٨؛ مسلم، البر، ٦٣، صفات المؤمنین، ١.

(223) مسلم، فضائل الصحابة، ١٢٨؛ المسند، الامام أحمد، ٣/ ١٢٣؛ مجمع الزوائد، الهیثمی، ٦/ ١٠٩.

(224) المسند، الامام أحمد، ١/ ١٠٢؛ البدایة و النهایة، ابن کثیر ٧/ ٣٥٨_٣٥٩.

(225) البخاری، الصلاة، ٦٣؛ مسلم، فتن، ٧٠؛ الترمذی، المناقب، ٣٤؛ کنز العمال، الهندی، ١٣/ ٥٣٦_٥٣٧.

(226) الکامل فی التاریخ، ابن الأثیر، ٤/ ١٠٦.

(227) کنز العمال، الهندی، ١٦/ ٤٤٣٤؛ کشف الخفاء، العجلونی، ٢/ ٦٨.

(228) مسلم، الامارة، ١٦٩؛ أبو داؤد، الجهاد، ٢٣.

(229) ہم ان تین جملوں پر بعد میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

(230) مسلم، الایمان، ٣٢٦.

(231) البخاری، الأنبیاء، ٤٨؛ مسلم، الفضائل، ١٤٤؛ أبو داؤد، السنة، ١٣.

(232) البخاری، الأنبیاء، ٤٤؛ مسلم، فضائل، ١٤٧؛ المسند، الامام أحمد، ٢/ ٢٨٨.

(233) البدایة و النهایة، ابن کثیر، ٢/ ٣٥٠_ ٣٥١.

(234) البخاری، الحج، ٤٢؛ مسلم، الحیض، ٧٦؛ البدایة و النهایة، ابن کثیر، ٢/ ٣٥٠.

(235) الترمذی،القیامة،٤٩؛ابن ماجة،الزهد،٢٠.

(236) البخاری،الرقاق،٣٨؛المسند،الامام أحمد،٢٥٦/٦.

(237) مختصرتاریخ دمشق لابن عساکر،ابن منظور،١٩٠/١٩-١٩١.

(238) البخاری،الایمان،٨،الأدب ٤٢؛الترمذی،الایمان،١٠.

(239) حلیةالأولیاء أبونعیم،٧٤/١٠-٧٥؛طبقات الأولیاء،ابن الملقن،١٧٦.

(240) (یوحنا:٣١:١٤)

(241) دلائل النبوة، البیهقی،١٧٣/١-١٧٥؛البدایةوالنهایة،ابن کثیر،٣١٣/٢-٣١٤؛الخصائص الکبرٰی، السیوطی،٩٢/١-٩٤.

(242) البخاری، الأنبیاء،٤٨؛مسلم،الفضائل،١٤٤.

(243) الهدایة، المرغینانی،٥٦/١.

(244) ارشادربانی ہے:﴿یَا أَهْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوا فِی دِینِکُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَی اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِیحُ عِیسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَکَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَی مَرْیَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انتَهُوا خَیْرًا لَّکُمْ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَن یَکُونَ لَهُ وَلَدٌ لَّهُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ وَکَفَی بِاللَّهِ وَکِیلًا﴾(النساء:١٧١)''اے اہل کتاب اپنے دین کی بات میں حد سے نہ بڑھواور اللہ کے بارے میں حق کیسوا کچھ نہ کہو۔مسیح یعنی مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہی تھے اوراس کا خاص حکم تھے، جواس نے مریم کی طرف بھیجا تھااوراس کی طرف سے ایک روح تھےتو اللہ تعالیٰ اوراس کے رسولوں پرایمان لاؤاور یہ نہ کہوکہ خدا تین ہیں۔اس اعتقاد سے باز آؤ کہ ایسا کرنا تمہارے حق میں بہتر ہے۔اللہ ہی معبودواحد ہےاوراس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو۔جو کچھ آسمانوں میں سے اور جو کچھ زمین میں ہے،سب اسی کا ہےاوراللہ ہی کارساز کافی ہے۔

(245) ارشادباری تعالیٰ ہے:﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِینًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِیمَ حَنِیفًا وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِیمَ خَلِیلًا﴾(النساء: ١٢٥)''اوراس شخص سے اچھا کس کا دین ہوسکتا ہے ،جس نے اللہ کے آگے سرجھکادیااوروہ نیکوکار بھی اورابراہیم کے دین کا پیرو ہے، جویکسویعنی ایک اللہ کے ہورہے تھےاوراللہ نے ابراہیم کواپنادوست بنایا تھا۔'']

(246) ارشادِخداوندی ہے﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَیْکَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْکَ وَکَلَّمَ اللَّهُ مُوسَیٰ تَکْلِیمًا﴾(النسا:١٦٤)''اور بہت سے پیغمبر ہیں کہ جن کے حالات ہم تم سے پیشتر بیان کر چکے ہیں اور بہت سے پیغمبر ہیں،جن کے حالات ہم نے تم سے بیان نہیں کیے اورموسیٰ سے تو اللہ تعالیٰ نے خود کلام فرمایا۔''

(247) دیکھیے:صموئیل دوم:١١.

(248) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کاارشاد ہے:﴿اصْبِرْ عَلَیٰ مَا یَقُولُونَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَیْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾

(ص:۱۷) ''اے پیغمبر ﷺ یہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔ بیشک وہ رجوع کرنے والے تھے۔''

(249) البخاری، التہجد، ۷، الصوم، ۵۹؛ مسلم، الصیام، ۱۸۲؛ الترمذی، الصوم، ۵۷.

(250) البخاری، التوحید، ۳۱؛ مسلم، صفات المنافقین، ۵۷-۵۹؛ الترمذی، الأدب، ۷۹.

(251) الترمذی، تفسیر سورۃ، (۷)، ۳.

(252) فیض القدیر، المناوی، ۳۴/۴؛ اس حدیث کی دیگر روایات کے لیے دیکھئے: البخاری، الحدود، ۲۲، الطلاق، ۱۱؛ أبو داؤد، الحدود، ۱۷؛ الترمذی، الحدود، ۱؛ ابن ماجہ، الطلاق، ۱۰-۱۶.

(253) ارشادِ خداوندی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (الحج:۲۵) ''جو لوگ کافر ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے اور مسجد حرام سے، جسے ہم نے لوگوں کے لیے یکساں عبادت گاہ بنایا ہے، روکتے ہیں، خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہو یا باہر سے آنے والے اور جو اس میں شرارت سے کج روی وکفر کرنا چاہے تو اس کو ہم درد دینے والا عذاب کا مزا چکھائیں گے۔'']

(254) ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا﴾ (الأحزاب: ۳۰) ''اے پیغمبر کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی ناشائستہ حرکت کرے گی اس کو دونی سزا دی جائے گی اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔''

(255) البخاری، تفسیر سورۃ (۲۰) ۱، ۳؛ القدر، ۱۱؛ مسلم، القدر، ۱۳-۱۵؛ الترمذی، القدر، ۲.

(256) مسلم، الفضائل، ۱۷؛ دوسری روایات اور مختلف الفاظ کے لیے دیکھئے: البخاری، الأنبیاء، ۴۰؛ الترمذی، الأدب، ۸۲.

(257) البخاری، تفسیر سورۃ (۹) ۱۲-۱۳؛ مسلم، فضائل الصحابة، ۲۵؛ الترمذی، تفسیر سورۃ (۹) ۱۲-۱۳.

(258) مسلم، الایمان، ۲۷۱؛ الترمذی، المناقب، ۱۲؛ المسند، الامام أحمد، ۳۳۴/۳.

(259) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ستارہ پرست تھی اور ہر ستارے کا زمین پر ایک نمائندہ صنم تھا۔

(260) الجامع لأحكام القرآن، القرطبی، ۱۹/۷؛ روح المعانی، الآلوسی، ۱۹۹/۷.

(261) فی ظلال القرآن، سید قطب، ۳۰۱/۱ - ۳۰۲.

(262) نفحات الأنس، ملا جامی، ۵۲۱، مترجم لامعی جلبی.

(263) البخاری، الأنبیاء، ۱۱؛ مسلم، الایمان، ۲۳۸.

(264) البخاری، الأنبیاء، ۱۱؛ مسلم، الایمان، ۲۳۸.

(265) البخاری،الأنبیاء،۸؛ النکاح، ۱۲؛ مسلم، فضائل، ۱۵٤؛ أبو داؤد،الطلاق،۱٦.

(266) الشمائل،الترمذی،۲٤۱.

(267) البخاری،تفسیر،سورة(۱۷)٥؛مسلم،الایمان، ۳۲٦-۳۲۷.

(268) البخاری،الأنبیاء،۸، مسلم، فضائل، ۱۵٤.

(269) المسند،الامام أحمد،٦/٤٥٤؛ کنز العمال، الهندی،۳/٦۳۲ -٦۳۳ . ارشادِ نبوی ہے:"تین مواقع کے سوا کسی موقع پر جھوٹ بولنا درست نہیں: (۱) وہ آدمی جو اپنی بیوی کے اخلاق درست کرنے کے لیے جھوٹ بولے۔(۲) وہ آدمی جو دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولے۔(۳) اور وہ آدمی جو جنگی حکمت عملی کے تحت جھوٹ بولے، کیونکہ جنگ تو نام ہی چال کا ہے۔

(270) البخاری، الجنائز،۸۱،مناقب الأنصار،٤٠؛مسلم، الایمان،۳۹؛ النسائی،الجنائز،۱۰۲.

(271) ارشادِ خداوندی ہے:﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾(الاسراء:۲۳)"اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کہنا۔

(272) مفاتیح الغیب،فخر الدین الرازی،۱۳/۳۷-٤٠؛روح المعانی، الآلوسی، ۱٦/۹٦.

(273) مفاتیح الغیب،فخر الدین الرازی،۱۳/۳۷-٤٠؛تفسیر البیضاوی،۱/۳۰۷-۳۰۸؛البدایة والنهایة،ابن کثیر، ۱۰/۱٦۳-۱٦٤.

(274) ارشادِ خداوندی ہے:﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ () فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ()وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ()قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ()إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ()وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ()وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ()سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ()كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ()إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الصافات:۱۰۲-۱۱۱)"جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا تو ابراہیم نے کہا کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجئے۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پایئے گا۔ جب دونوں نے حکم مان لیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا تو ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا اور پیچھے آنے والوں میں ابراہیم کا (ذکر خیر باقی) چھوڑ دیا کہ ابراہیم پر سلام ہو۔ نیکو کاروں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے۔

(275) درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمایئے: ﴿رَبَّنَا إِنِّیٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ الصَّلَاةَ فَاجۡعَلۡ أَفۡئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ﴾ (ابراهيم:٣٧) ''اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں، تیرے عزت (وادب) والے گھر کے پاس بسائی ہے۔اے پروردگار! تاکہ یہ نماز پڑھیں۔ تولوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں اوران کو میووں سے روزی دے، تاکہ (تیرا) شکرادا کریں۔''

(276) ﴿قُلۡنَا يَا نَارُ كُونِي بَرۡداً وَسَلَاماً عَلَى إِبۡرَاهِيمَ﴾ (انبياء:٤٩) ''ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہوجا اورابراہیم پر (موجب) سلامتی (بن جا)۔'' الجامع الاحكام القرآن لقرطبی

(277) البخاری،الأنبیاء،٨

(278) البخاری،الایمان،٣٧؛مسلم،الایمان،١٠٥؛ الترمذی، الایمان، ٤.

(279) الابریز من کلام سیّدی عبدالعزیز الدباغ، سید أحمدبن المبارک،ص٢٦٢.

(280) البخاری، الأنبیاء،١٩،المناقب،١٣؛المسند،الامام أحمد،٩٦/٢-٣٣١.

(281) البخاری،التیمم،١؛مسلم،المساجد،٣.

(282) مشرکین کی طرف سے آپ ﷺ کے لیے استعمال کیے جانے والے اوصاف کی تفصیل کے لیے دیکھئے: السیرة النبویة،ابن هشام،٢٨٩/١-٢٩٠؛البدایة و النهایة،ابن کثیر،٧٨/٣.

(283) البخاری، التعبیر،٣-٤؛مسلم،الرؤیا،٦-٩؛أبو داؤد،الأدب،٨٨؛الترمذی،الرؤیا،١.

(284) مسلم،صلاۃالمسافرین،١٣٩؛أبو داؤد،التطوع،٢٦.

(285) السیرة النبویة،ابن هشام،٥٥/٤؛البدایةو النهایة،ابن کثیر،٣٤٤/٤.

(286) مسلم،الجهاد،٥٨؛المسند،الامام أحمد، ٣١/١-٣٢.

(287) جامع البیان،الطبری،٤٣/١٠؛الجامع لأحکام القرآن،القرطبی،٣١/٨؛المسند، الامام أحمد،٣٨٣/١.

(288) البخاری،تفسیر(٥)١٥.

(289) المسند، الامام أحمد،٣٨٣/١.

(290) مسلم،الجهاد،٥٨؛المسند،الامام أحمد،٣١/١-٣٣.

(291) البخاری،التیمم،١، الصلاة، ٥٦؛مسلم،المساجد،٣.

(292) المسند،الامام أحمد،١٩٧/٤.

(293) البخاری،الایمان،٢٣؛مسلم،الایمان،١٠٧؛الترمذی،الایمان،١٤.

(294) الکشاف،الزمخشری،۲/۱۹۲.

(295) مفاتیح الغیب،فخرالدین الرازی،۱۶/۷۳-۷۴.

(296) البخاری، الجنائز،۲۳،اللباس،۸؛مسلم،فضائل الصحابة،۲۵؛المسند،الامام أحمد،۲/۱۸.

(297) البخاری،الکفارات،۹؛مسلم،العتق،۵.

(298) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعاً فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَداً إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِندَ اللَّهِ عَظِيماً ﴾(الأحزاب:۵۳)''مومنو! پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو، مگر اس صورت میں کہ تم کو کھانے کے لیے اجازت دی جائے اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے، لیکن جب تمہاری دعوت کی جائے تو جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو اور باتوں میں جی لگا کر نہ بیٹھ رہو۔ یہ بات پیغمبر کو ایذا دیتی تھی اور وہ تم سے شرم کرتے تھے اور (کہتے نہیں تھے)، لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا اور جب پیغمبر کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دونوں کے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ پیغمبر خدا کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو۔ بے شک یہ خدا کے نزدیک بڑا (گناہ کا کام) ہے۔'' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يا أيها الذين آمنوا ليستأذنكم الذين ملكت أيمانكم و الذين لم يبلغوا الحلم منكم ثلاث مرات من قبل صلاة الفجر و حين تضعون ثيابكم من الظهيرة و من بعد صلاة العشاء ثلاث عورات لكم ليس عليكم ولا عليهم جناح بعدهن طوّافون عليكم بعضكم على بعض كذلك يبيّن الله لكم الآيات والله عليم حكيم﴾(النور:۵۸)''مؤمنو! تمہارے غلام لونڈیاں اور جو بچے تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، تین دفعہ (یعنی تین اوقات میں) تم سے اجازت لیا کریں، (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے گرمی کی) دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیتے ہو اور (تیسرے) عشاء کی نماز کے بعد (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے (کے) ہیں۔ ان کے (آگے) پیچھے (یعنی دوسرے وقتوں میں) نہ تم پر کچھ گناہ ہے اور نہ ان پر کہ (کام کاج کے لیے) ایک دوسرے کے پاس آتے رہتے ہو۔ اس طرح خدا اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور خدا بڑا علم والا (اور) بڑا حکمت والا ہے۔''

(299) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (2) إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَى لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴾ (الحجرات: ۲-۳)''اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ پیغمبر خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے

ہیں، خدا نے ان کے دل تقوے کے لیے آزما لیے ہیں۔ ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔"

(300) كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، الجزيرى، ٢٧٢/١-٢٧٣.

(301) البخارى، الصلاة، ١٠١؛ مسلم، الصلاة، ٢٦١؛ أبو داود، الصلاة، ١٠٨.

(302) الاصابة، ابن حجر، ٥٢٣/٢-٥٢٤.

(303) سورة البقرة: ٢٠٥، طه: ٤٨؛ النجم: ٣٣؛ المعارج: ١٧؛ الغاشية: ٢٣؛ الليل: ١٦؛ العلق: ١٣.

(304) تفسير القرآن العظيم، ابن كثير، ٢٣٤/٧.

(305) البخارى، الجهاد، ٣٧؛ أبو داؤد، الطب، ١؛ النسائى، الجنائز، ٨١؛ ابن ماجة، الجنائز، ٣٧.

(306) السيرة النبوية، ابن هشام، ١٨٤/٤؛ الطبقات الكبرى، ابن سعد، ٣١٢/١-٣١٣؛ الدر المنثور، السيوطى، ٣١٩/٥.

(307) البخارى، الاعتصام، ٢؛ مسلم، الايمان، ٣٢؛ أبو داؤد، الزكاة، ١.

(308) المسند، الامام أحمد، ٤٢٠/١؛ تفسير القرآن العظيم، ابن كثير، ٢٥٤/٣-٢٥٥.

(309) ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (الحجرات: ١٣) "لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ (اور) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔"

(310) مجمع الزوائد، الايمان، ٢٢؛ مسلم، الايمان، ٤٠.

(311) البخارى، الايمان، ٢٢؛ مسلم، الايمان، ٤٠.

(312) الترمذى، الزهد، ٣٧؛ ابن ماجة، الزهد، ٧.

(313) الترمذى، المناقب، ١٧؛ المسند، الامام أحمد، ٩٥/٢.

(314) المسند، الامام أحمد، ٤٥٦/١؛ مجمع الزوائد، الهيثمى، ٦٧/٩.

(315) اس قسم کی بہت سے آیات ہیں مثلاً: ﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (الزمر: ٦٥) "اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔" ﴿وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ﴾ (الشورى: ١٥) "اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور کہہ دو کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے، میں اس پر ایمان رکھتا ہوں۔" ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ﴾ (القلم: ٨) "تو تم جھٹلانے والوں کا کہنا نہ ماننا۔" ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ () وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (الضحى: ٩-١٠) "تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔"

(316) البخاری، النکاح،٩٨؛مسلم،الرضاع،٤٧ .

(317) الاصابة،ابن حجر،٤/٤٩٢ .

(318) البخاری،التوحید،٢٢؛مسلم،الایمان،٢٨٨ .

(319) البخاری، تفسیر سورة (٦٦)٢؛ مسلم،الطلاق، ٣١ .

(320) الترمذی،الزهد، ٤٤؛ابن ماجة، الزهد، ٣؛المسند،الامام أحمد،١/٣٠١ .

(321) المسند،الامام أحمد، ٢/١٩٣ .

(322) الترمذی،تفسیرالقرآن،(٥٦)٦ .

(323) کنزالعمال،الهندی،٧/٢٠٦ .

(324) البخاری، تفسیرسورة(٤)٩؛مسلم،صلاةالمسافرین،٢٤٧-٢٤٨ .

(325) تفسیرالقرآن العظیم،ابن کثیر،٢/١٦٤؛الجامع لاحکام القرآن، القرطبی، ٤/١٩٧ .

(326) البخاری، الأذان، ١٥٨؛النسائی،السهو،١٠٤ .

(327) دیکھئے:المسند،الامام أحمد،٢/٢٣١؛ حلیة الأولیاء،أبونعیم،١/٣٠-٣١ .

(328) البخاری،الرقاق،١٧؛ مسلم،الزهد، ٢٩-٣٦؛ الترمذی، الزهد،٣٨ .

(329) حلیةالأولیاء،أبونعیم،٧/١٠٩؛کنزالعمال،الهندی،٧/١٩٩ .

(330) مسلم،الاشربة، ١٤٠؛الترمذی،الزهد،٣٩ .

(331) یہ کھجور کی سب سے گھٹیا قسم ہے۔

(332) مسلم،الزهد،٣٦؛ابن ماجة،الزهد،١٠؛المسند،الامام أحمد، ١/٢٤ - ٥٠ .

(333) البخاری،بدء الوحی،٥؛الصوم،٧؛مسلم،الفضائل،٥٠ .

(334) الترمذی،صفةالقیامة،٨؛المسند،الامام أحمد،١/٣٢٦-٧/٣ .

(335) لمعاتِ بدیع الزماں

(336) مجمع الزوائد، الهیثمی، ١٠/٣٢٥؛ کنز العمال،الهندی،٣/١١٣ .

(337) البخاری،الایمان،٢٩؛مسلم،صفات المنافقین،٧٨ .

(338) البخاری،الایمان، ٢٩؛النسائی،الایمان،٢٨ .

(339) البخاری،الرقاق،١٨؛المرضی،١٩؛مسلم،صفات المنافقین، ٧١،٧٣، ٧٥، ٧٦ .

(340) أبوداؤد، السنة،٢١؛الترمذی،القیامة،١١؛ المسند، الامام أحمد،٣/٢١٣ .

(341) البخاری،الوصایا، ١١؛تفسیر سورة(٢٦) ٢؛ مسلم،الایمان،٣٥١-٣٥٢.

(342) البخاری،الجهاد، ٤٠-٤١؛مسلم،فضائل الصحابة،٤٨.

(343) الاصابة،ابن حجر،٣٠٩/٢-٣١١؛أسد الغابة،ابن الأثیر، ٢٤٤/٣.

(344) البخاری،الوصایا،١١، تفسیر سورة(٢٦)٢؛ مسلم،الایمان، ٣٥٠-٣٥١.

(345) البخاری،فضائل أصحاب النبی،١٢،١٦؛مسلم ،فضائل الصحابة،٩٣-٩٤.

(346) البخاری،فضائل أصحاب النبی،٢٩؛الترمذی،المناقب،٣٠.

(347) النسائی، السهو، ١٨؛أبو داؤد،الصلاة،١٥٧؛المسند،الامام أحمد،٢٥/٤-٢٦.

(348) النسائی،عشرة النساء،١؛المسند،الامام أحمد،١٢٩/٣-١٩٩،٢٨٥.

(349) البخاری،النکاح، ١؛ مسلم،النکاح،٥؛المسند الامام أحمد،٢٨٥/٣.

(350) مجمع الزوائد،الهیثمی،٢٧١/٢؛ کنز العمال، الهندی، ٧٨٥/٧.

(351) مسلم،الصلاة،٢٢٢؛ أبو داؤد،الصلاة،١١٨،الوتر،٥.

(352) مسلم،الصلاة،١٢٢؛النسائی،عشرة النساء،٤.

(353) مسلم،الایمان،٣٤٦؛ابن ماجة، اقامة الصلاة،١٧٩؛المسند،الامام أحمد،١٤٩/٥.

(354) البخاری،فضائل أصحاب النبی،٢٧؛مسلم،فضائل الصحابة، ١١٠-١١١.

(355) البخاری، فضائل أصحاب النبی،٢٧؛مسلم،فضائل الصحابة،١١٦-١١٧؛المسند، الامام أحمد، ١٦٣/٢.

(356) الطبقات الکبری، ابن سعد، ١٥٧/٣.

(357) المسند، الامام أحمد، ١١٤/١؛ أسد الغابة، ٣٨٨/٣-٣٨٩؛ حلیة الأولیاء، أبو نعیم، ١٢٤-١٢٩.

(358) البخاری، التهجد، ٩؛ مسلم، صلاة المسافرین، ٢٠٤؛ المسند، الامام أحمد، ٣٨٥/١-٣٩٦.

(359) الطبقات الکبری،ابن سعد،١٥٧/٣.

(360) مسلم،الایمان، ٣٤٦؛ المسند،الامام أحمد،١٤٩/٥.

(361) مسلم،الجنة،٨٣؛المسند الامام أحمد،٣٣١/٣،٣٣٦.

(362) البخاری،الأذان،١٥؛ مسلم،الصلاة، ٩٠-٩٧.

(363) الفقه علی المذاهب الأربعة،الجزیری،٤٠٥/١.

(364) الفقه على المذاهب الأربعة،الجزيرى،١/١٦١-١٦٢.

(365) الفقه على المذاهب الأربعة،الجزيرى،١/٥٥.

(366) الهداية،المرغينانى،١/٤٥٧

(367) شرح فتح القدير،كمال الدين محمد عبدالواحد،١/٣٠٠.

(368) البخارى،التهجد،١٦؛مسلم،صلاةالمسافرين،١٢٥.

(369) البخارى،الصوم،٥٣؛مسلم،الصيام،١٧٨؛ أبو داؤد،الصوم،٥٦.

(370) البخارى،الصوم،٤٩؛مسلم،الصيام،٥٩.

(371) البخارى،ليلةالقدر،٥؛مسلم، الاعتكاف،٧.

(372) البخارى ، الصوم، ٣٥؛ مسلم، الصيام،١٠٨-١٠٩.

(373) البخارى،الصوم،٢،التوحيد،٣٥؛مسلم،الصيام،١٦٢-١٦٣.

(374) الترمذى،تفسيرالقرآن(٣)١٦، ٤٠؛ابن ماجة، الدعا،١؛المسند،الامام أحمد، ٤/٢٦٧، ٢٧١-٢٧٢.

(375) دیکھئے:الترمذى،الدعا،١؛كنزالعمال،الهندى،٢/٦٢.

(376) الترمذى، الدعا،١؛أبو داؤد، الصلاة، ٢٣؛ الفردوس،الديلمى،٢/٢٢٤.

(377) یہ مصنف کی تالیف ہے۔(عربی مترجم)

(378) دیکھئے:مجمع الزوائد،الهيثمى،١٠/١٥ ٤؛حلية الأولياء، أبونعيم ٧/٩٠.

(379) الدارمى،فضائل القرآن،١٤.

(380) الترمذى، فضائل القرآن، ٢؛الدارمى،فضائل القرآن،١٤.

(381) مجمع الزوائد، الهيثمى، ٧/٩٧؛ المطالب العالية،ابن حجر،٣/٣٦١.

(382) الترمذى،فضائل القرآن، ٨؛المطالب العالية،ابن حجر،٣/٣٥٨.

(383) الترمذى،فضائل القرآن، ٩؛الدعوات،٢٢.

(384) أبو داؤد،الأدب،٩٨؛الترمذى،الدعوات، ٢١-٢٢.

(385) البخارى، الدعوات،١٢؛الترمذى،الدعوات،٢١-٢٢؛أبو داؤد،الأدب،٩٧-٩٨؛ ابن ماجة، الدعا،١٥.

(386) البخارى،الدعوات،١١؛ مسلم، الذكر،٨٠.

(387) البخارى،الدعوات،٦-٧؛ مسلم، الذكر،٥٦-٥٧؛ الترمذى، الدعوات، ١٦.

(388) مسلم،الذکر،٥٩؛ أبو داؤد، الأدب، ٩٧-٩٨؛ المسند، الامام أحمد،١/٤٠٠-٤١٤.

(389) أبو داؤد، الأدب،٩٧-٩٨؛ابن ماجة،الدعا،١٥؛المسند،الامام أحمد،١/٤٠٠-٤١٤.

(390) البخاری، التهجد،١؛التوحید،٨،٣٥؛ مسلم،صلاة المسافرین،١٩٩؛المسند،الامام أحمد، ١/٣٥٨.

(391) البخاری، التهجد،١؛ التوحید، ٨،٣٥؛مسلم،صلاة، المسافرین، ١٩٩؛ المسند، الامام أحمد،١/٣٥٨.

(392) البخاری، التهجد،١٦؛مسلم،صلاة،المسافرین،١٢٥،٢٠٣-٢٠٤.

(393) البخاری، الدعوات،١٨؛مسلم،الصلاة،٩٤؛ الترمذی، الصلاة،١٠٨.

(394) البخاری،الأذان،٨٩،الدعوات،٣٩؛مسلم، المساجد،١٤٧.

(395) أبو داؤد،الأدب،١٠١؛ الترمذی،الدعوات، ٧٨.

(396) البخاری،الاستسقاء،٣؛فضائل أصحاب النبی،١١.

(397) حزب أنوارحقائق النوریة،بدیع الزمان سعید نورسی،ص٢٦٦.

(398) الترمذی،الدعوات،٩٤؛أبو داؤد، الأدب، ١٠١؛ المسندالامام أحمد،١/٤١٢.

(399) أبو داؤد،الأدب،١٠١؛ الدارمی، الاستئذان،٥٤.

(400) مسلم،صلاة المسافرین،٢٠١؛ الترمذی، الدعوت، ٣٢.

(401) مسلم،صلاةالمسافرین، ٢٠١؛أبو داؤ د،الصلاة،١١٩؛ الترمذی، الدعوت،٣٢.

(402) مسلم، الصلاة، ٢٠٢-٢٠٣؛صلاةالمسافرین،٢٠١؛الترمذی،الدعوات،٣٢.

(403) مسلم، الصلاة،٢١٦؛صلاةالمسافرین،٢٠١؛الترمذی،الدعوات، ٣٢؛ أبو داؤد، الصلاة، ١١٩.

(404) البخاری،التوحید، ٣٦؛ مسلم،الایمان،٣٢٦.

(405) الکلمات،بدیع الزمان سعید نورسی،ص٢٥٥-٢٥٦.

حضرت نوری نے یہ مضمون اپنی کتاب ''المثنوی العربی النوری ''میں عربی میں لکھا تھا پھر اس کا ترکی زبان میں ترجمہ کرکے اسے ''انیسواں کلمہ'' کا نام دیا۔جب استاذ احسان قاسم صالحی نے ''الکلمات'' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تو انہوں نے ترکی عبارت کی روشنی میں تقدیم وتاخیر اور حذف واضافے کی ضرورت کے باوجود مؤلف کی اصل عربی عبارت کو برقرار رکھا۔(عربی مترجم)

(406) مسلم، الزکاة،٦٩؛ النسائی، الزکاة،٦٣؛ابن ماجة،المقدمة،٢٠٣.

(407) شرح شرح نخبة الفکر، علی القاری، ص١٥٤.

(408) ابن ماجة، المقدمة،٧.

(409) الترمذی،الوصایا،٥؛النسائی،الوصایا،٥؛ابن ماجة،الوصایا،٦.

(410) ابن ماجة، الأحکام،١٧؛المسند،الامام أحمد،٣١٣/١.

(411) البخاری،الزکاة،٥٥؛مسلم،الزکاة،٧؛ الترمذی،الزکاة،١٤.

(412) أبوداؤد،الطهارة،١٤؛الترمذی،الطهارة،٢٥؛النسائی،الطهارة،٤٧؛ابن ماجة، الطهارة،٣/١.

(413) البخاری،الأذان،١٨؛المسند،الامام أحمد،٥٣/٥.

(414) البخاری، الصلاة،٧٠؛مسلم،النکاح،٥.

(415) البخاری، الحدود،١٠؛مسلم،فضائل،٧٧-٧٨؛أبوداؤد،الأداب،٤.

(416) أبوداؤد، الطهارة،١٢٦؛الدارمی،الطهارة،٦٥.

(417) البخاری،المغازی،٣٠، الخوف،٥؛ مسلم، الجهاد، ٦٩.

(418) أبوداؤد،السنة،٥.

(419) البخاری،البیوع،٢٥؛مسلم،اللباس،١٢٠؛الترمذی،اللباس،٢٥.

(420) البخاری،الأحکام،١؛مسلم،الامارة،٣٢-٣٣؛ابن ماجة،المقدسة،١.

(421) البخاری، الاعتصام، ٢؛ المسند، الامام أحمد،٣٦١/٢.

(422) أبوداؤد، السنة،٥؛الترمذی،العلم،١٦؛ابن ماجة،المقدمة،٦.

(423) مجمع الزوائد، الهیثمی، ١٧٢/١؛حلیة الأولیاء،أبونعیم،٢٠٠/٨؛الفردوس،الدیلمی، ١٩٨/٤.

(424) الترمذی، تفسیرالقرآن، (١)٢؛جامع البیان،الطبری،٦١/١،٦٤.

(425) البخاری، تفسیر سورة،(٦)٣؛مسلم،الایمان،١٢٤.

(426) مسلم،المساجد،٢٠٧؛الترمذی،تفسیرالقرآن، (٢)٢٩؛أبوداؤد،الصلاة،٥.

(427) البخاری، الأذان، ١٨؛ المسند، الامام أحمد،٥٣/٥.

(428) أبوداؤد، الصلاة،٢؛ الترمذی، المواقیت،١.

(429) مسلم، الحجاج، ٣١٠؛ أبوداؤد، المناسك،٧٧؛النسائی،المناسك،٢٢٠؛المسند،الامام أحمد، ٣٦٦/٣.

(430) البخاری، الاعتصام،٥؛الخمس،١٠؛مسلم،الجهاد،١٥١؛المسند،الامام أحمد، ٤٦٣/٢.

(431) الترمذی، الفرائض، ١٧؛ابن ماجة،الدیات،١٤.

(432) ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَينِ وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُواْ وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاء أَحَدٌ مَّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاء فَتَيَمَّمُواْ صَعِيداً طَيِّباً فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ مَا يُرِيدُ اللّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَـكِن يُرِيدُ لِيُطَهَّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾(المائدہ:٦) ''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لیا کرو اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو اور بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلا سے ہو کر آیا ہو یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو پھر تمہیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح یعنی تیمّم کر لو۔ اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تا کہ تم شکر کرو۔''

(433) البخاری، البیوع، ٨٢؛ مسلم، البیوع، ٥١.

(434) البخاری، تفسیر سورۃ (٢) ١؛ مسلم، الایمان، ٣٢٢.

(435) الترمذی، تفسیر العلم، ٧؛ أبو داؤد، العلیم، ١٠؛ ابن ماجۃ، المقدمۃ، ١٨.

(436) البخاری، الایمان، ٤٠؛ مسلم، الایمان، ٢٤.

(437) البخاری، العلم، ٩؛ مسلم، القسامۃ، ٢٩؛ المسند، الامام أحمد، ٤١/٥.

(438) الترمذی، العلم، ٣؛ أبو داؤد، العلم، ٩؛ ان ماجۃ، المقدمۃ، ٢٤.

(439) مسلم، الصلاۃ، ١٦١؛ أبو داؤد، الصلاۃ، ١٧٨.

(440) البخاری، التوحید، ٢٥؛ أبو داؤد، الوتر، ١٣؛ الترمذی، الوتر، ١٨.

(441) البخاری، المناقب، ٢٣؛ مسلم، فضائل الصحابۃ، ١٦٠.

(442) البخاری، المناقب، ٢٣؛ مسلم، فضائل الصحابۃ، ١٦٠.

(443) مسلم، الذکر، ٣٨؛ الترمذی، القراءات، ١٠؛ ابن ماجۃ، المقدمۃ، ١٧؛ المسند، الامام أحمد، ٣٢/٣.

(444) مجمع الزوائد، الهیثمی، ١٦١/١؛ الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع، الخطیب البغدادی، ٣٦٣/١-٤

(445) ابن ماجۃ، المقدمۃ، ١٧؛ المسند، الامام أحمد، ٣٥٠/٢-٤١٨.

(446) البخاری، العمل، ٣٦، الجنائز، ٦؛ مسلم، البر و الصلۃ، ١٥٢؛ المسند، الامام أحمد، ٣٤/٣.

(447) البخاری، الشهادات، ٣٠؛ المسند، الامام أحمد، ٢٣٥/١-٢٣٧.

(448) البخاری، القدر، ٥؛ مسلم، الایمان، ١٧٨.

(449) مسلم،الایمان،١٨٢؛الترمذی،السیر،٢١؛ الدارمی، السیر، ٤٨؛ المسند،الامام أحمد،٣٠/١.

(450) البخاری،العلم، ٦؛أبوداؤد، الصلاة،٢٣؛ابن ماجة،الاقامة،١٩٤؛المسند،الامام أحمد، ٢٦٤/١.

(451) البخاری،تفسیر سورة(٩٨) ١ -٣؛مسلم،فضائل الصحابة، ١٢٢.

(452) الترمذی، تفسیر، السورة(٤) ١٩؛ أبوداؤد، الجهاد،٢٢.

(453) مسلم،الحج،١٣٧؛أبوداؤد،المناسك،٥٦؛ابن ماجة، المناسك، ٨٤؛المسند،الامام أحمد، ٧٣/٥.

(454) الطبقات الکبری،ابن سعد، ١٩٠/٢؛ السیرة النبویة،ابن هشام،٢٥٣/٤؛فتح الباری،ابن حجر، ٧٥٩/٧.

(455) الطبقات الکبری،ابن سعد، ١٩١/٢؛ السیرة النبویة،ابن هشام،٣٠١/٤.

(456) البدایة و النهایة ، ابن کثیر،٣٣٥/٦؛ مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر،ابن منظور،٢٥١/٤.

(457-A) البدایة و النهایة،ابن کثیر،٣٣٥/٦؛کنزالعمال، الهندی، ٥٧٩/١٠.

(457-B) البخاری، الفرائض، ٣؛ مسلم،الجهاد،٥٢؛المسند،الامام أحمد،٤/١.

(458) البخاری،الخمس،١،المغازی،١٤؛مسلم،الجهاد،٥٢؛المسند،الامام أحمد،٤/١.

(459) البخاری،الایمان،١٧؛ مسلم، الایمان،٣٦.

(460) البخاری،الزکاة،١؛مسلم، الایمان،٣٢؛ الترمذی،١؛المسند،الامام أحمد،١٩/١.

(461) البخاری،الاعتصام،٢؛تفسیر سورة(٧) ٥.

(462) کنزالعمال، الهندی، ٥٣٧/١٦-٥٣/١.

(463) الترمذی، الدیات،٤؛ أبوداؤد، الدیات، ١٨؛تحفةالأحوذی،المبارکپوری، ٦٤٩/٤؛ کنزالعمال، الهندی، ١١٨/١٥.

(464) البخاری، الأحکام،١٧؛مسلم،الزکاة،١١١.

(465) مجمع الزوائد،الهیثمی،٢٣/٢؛فتح الباری،ابن حجر، ٧٨/٢.

(466) البخاری،المواقیت، ٣٣؛ السهو ،٨؛مسلم،المسافرین،٢٩٧. النسائی،المواقیت،٣٦.

(467) البخاری،الأحکام، ٥١؛مسلم،الامارة،١١؛أبوداؤد،الامارة،٨؛الترمذی،الفتن،٤٨.

(468) الطبقات الکبری، ابن سعد،٣٤٢/٣؛البدایةو النهایة،ابن کثیر،١٥٥/٧.

(469) البخاری، الحج، ۵۰؛ مسلم، الحج، ۲۴۸-۲۵۱.

(470) البخاری، الأشربة، ۱۶؛ أبو داؤد، الأشربة، ۱۳؛ المسند، الامام أحمد، ۱۳٤/۱.

(471) أبو داؤد، الطهارة، ٦۳؛ الدارمی، الوضوء، ٤۳؛ السنن الکبری، البهيقی، ۲۹۲/۱.

(472) أبو داؤد، الفرائض، ۱۸؛ الترمذی، الفرائض، ۱۸؛ ابن ماجة، الديات، ۱۲.

(473) المسند، الامام أحمد، ۱۸/۱؛ المستدرك، الحاکم، ۲٦۸/۳.

(474) مختصر تاريخ دمشق لابن عساكر، ابن منظور، ۲۷۲/۱۱؛ سير أعلام النبلاء، الذهبی، ۱۷/۱.

(475) البخاری، الطب، ۳۰؛ مسلم، السلام، ۹۸.

(476) البخاری، العلم، ۳۸؛ مسلم، الزهد، ۷۲؛ أبو داؤد، العلم، ٤؛ الترمذی، الفتن، ۷۰.

(477) البخاری، الاستتابة المرتدين، ٦؛ مسلم، الزكاة، ۱۵٤؛ أبو داؤد، السنة، ۲۸.

(478) مسلم، المقدمة، ۱؛ الترمذی، العلم، ۹؛ ابن ماجة، المقدمة، ۵.

(479) الطبقات الکبری، ابن سعد، ۱۵۷/۳. مجمع الزوائد، الهيثمی، ۲۹۱/۹.

(480) ابن ماجة، المقدمة، ۳؛ المسند، الامام أحمد، ٤۵۲/۱.

(481) البخاری، العلم، ۳۸؛ أبو داؤد، العلم، ٤؛ ابن ماجة، المقدمة، ٤.

(482) مسلم، المقدمة، ۲؛ الدارمی، المقدمة، ۲۵.

(483) الطبقات الکبری، ابن سعد، ۱۱۰/٦؛ سير أعلام النبلاء، الذهبی، ۲٦٤/٤.

(484) ابن ماجة، المقدمة، ۳؛ المسند، الامام أحمد، ۳۷۰/٤.

(485) مسلم، صفات المنافقين، ۱۷؛ النسائی، الايمان و شرائعه، ۳۱؛ المسند، الامام أحمد، ٦۸/۲؛ المسند، الطيالسی، ۲٤۸.

(486) الکفاية، البغدادی، ۱۷۸.

(487) البخاری، الدعوات، ٦؛ مسلم، الذکر، ۵٦.

(488) الدارمی، المقدمة، ۵۱.

(489) الدارمی، المقدمة، ۵۱.

(490) أبو داؤد، العلم، ۱؛ الترمذی، العلم، ۱۹؛ النسائی، الطهارة، ۱۱۳؛ ابن ماجة، المقدمة، ۱۷.

(491) الترمذی، الفرائض، ۱۰؛ ابن ماجة، الفرائض، ٤؛ الموطأ، الفرائض، ۸.

(492) البداية و النهاية، ابن کثير، ۱۰۰/۸؛ الأسرار المرفوعة، علی القاری، ۱۱٦؛ کشف الخفاء،

العجلونی، ۳۷٤/۱؛الفوائد المجموعة، الشوکانی، ۳۹۹؛ الفردوس، الدیلمی، ۱٦٥/۲.

(493) البخاری، العلم، ۳٥؛مسلم،الجنة،۷۹.

(494) البخاری، الخصومات، ٤؛ صلاة المسافرين، ۲۷۰؛أبو داؤد،الوتر، ۲۲؛ النسائی، الافتتاح،۳۷؛ الموطأ،القرآن،٤.

(495) البخاری، الاستئذان،۱۳؛مسلم،الأدب،۳۳-۳٤،۳۷؛أبو داؤد،الأدب،۱۲۸.

(496) البخاری، المغازی،۳؛ مسلم، البرو الصلة، ٥۸؛ أبو داؤد، الأدب، ۳۸؛ الترمذی،الحدود،۳.

(497) الرحلة فی طلب الحديث، البغدادی، ۱۱۸؛ جامع بيان العلم،ابن عبدالبر، ۳۹۲/۱؛ الكناية، الخطيب، البغدادی، ٤۰۲.

(498) المسند،الامام أحمد،٤۹٥/۳؛مجمع الزوائد، الهيثمی، ۳٤٥/۱۰-۳٤٦؛ أسدالغابة،ابن الأثير،۱۷۸/۳؛الأدب المفرد، البخاری، ۳۳۷؛ جامع بيان العلم،ابن عبدالبر،۳۸۹/۱-۳۹۰.

(499) تذكرةالحفاظ،الذهبی،٥٥/۱؛الرحلةفی طلب الحديث، البغدادی، ۱۲۷؛الكفاية،الخطيب البغدادی، ٤۰۲؛جامع بيان العلم ،ابن عبدالبر، ۳۹٥/۱.

(500) جامع بيان العلم،ابن عبدالبر،۳۹٦/۱؛الرحلة فی طلب الحديث، البغدادی،۱۲۷.

(501) الترمذی،العلم،۱۹؛ابن ماجة،المقدمة،۱۷؛الرحلةفی طلب الحديث،البغدادی،۷۸.

(502) الكفاية،البغدادی،۱۷۸.

(503) الكفاية،الخطيب البغدادی، ٤۰۲-٤۰۳.

(504) مسلم،المقدمة،٥.

(505) مسلم، المقدمة،٤.

(506) المحدث الفاصل،الرامهرمزی،۲۰۸؛ السنة قبل التدوين، محمد عجاج الخطيب، ۲۲۲-۲۲۳.

(507) المحدث الفاضل، الرامهرمزی،۳۹٥؛السنة قبل التدوين، محمد عجاج الخطيب،۲۲۹.

(508) تهذيب التهذيب، ابن حجر عسقلانی، ٦٤/۱.

(509) الجامع لأخلاق الراوی و آداب السامع، البغدادی،۲۸۳/۲؛السنة قبل التدروين،محمدعجاج الخطيب، ۲۲۹.

(510) كنزالعمال، الهندی،٥۳٦/۱٦-٥۳۸.

(511) مسلم،المقدمة، ٥.

(512) السنة قبل التدوين،محمد عجاج الخطيب،٢٣٣.

(513) ديوان الامام الشافعي،الامام الشافعي،٦٩.

(514) السنة قبل التدوين،محمدعجاج الخطيب، ٢٣٣.

(515) السنة قبل التدوين، محمدعجاج الخطيب،٢٣٤.

(516) مسلم،المقدمة،٥.

(517) علوم الحديث،ابن الصلاح،٣٨٩.

(518) كشف الخفاء، العجلونى، ١٣٢/٢؛ الأسرار المرفوعة،على القارى،١٧٩؛النوافح العطرة، الصعيدى، ٩،٢٦٤.

(519) تهذيب التهذيب،ابن حجر،٤٩/٩؛فتح البارى، ابن حجر، المقدمة،٥١٣.

(520) اللآلىء المصنوعة، السيوطى،٢/١.

(521) كنز العمال، الهندى، ١٣٨/١٠؛ فيض القدير،المناوى،٥٤٢/١؛كشف الخفاء، العجلونى، ١٣٨/١؛ الفردوس، الديلمى،٧٨٣١.

(522) كنز العمال،الهندى،١٢٨/٦؛كشف الخفاء، العجلونى،٣٩٣/١.

(523) كشف الخفاء، العجلونى، ٣٣/١؛الأسرار المرفوعة، على القارى،٤٧.

(524) كشف الخفاء، العجلونى، ٣٦/١.

(525) كشف الخفاء، العجلونى، ٤٣/١؛الأسرار المرفوعة،على القارى،٥٠.

(526) كشف الخفاء، العجلونى،٣٤٠/٢؛الأسرار المرفوعة،على القارى،٢٥٩.

(527) الأسرار المرفوعة،على القارى،٩١.

(528) مسلم،الطهارة،١؛الترمذى،الدعوات،٨٦.

(529) كنز العمال، الهندى، ٦٦٣/٦؛كشف الخفاء،العجلونى،٢٩٩/١-٣٠١؛كتاب الموضوعات، ابن الجوزى،٥٧/٣.

(530) كنز العمال، الهندى، ٦٦٣/٦-٦٦٤؛كشف الخفاء،العجلونى،٢٩٩/١؛

(531) كشف الخفاء، العجلونى،١٣٨/١؛الفردوس،الديلمى،٧٨/١؛ الأسرار المرفوعة، على القارى، ٢٥٢.

(532) أبو داؤد، العلم، الترمذى، العلم، ١٩؛ابن ماجة،١٧.

(533) البخارى، تفسير سورة(٤٨)٣؛البيوع، ٥٠؛ الدارمى، المقدمة،٢.

(534) صيقل الاسلام أو آثار سعيد القديم،بديع الزمان سعيد النورسى،٣٤.

(535) البخارى، الاستسقاء٣؛ فضائل أصحاب النبى،١١.

(536) البخارى،الاستسقاء، ١٤؛ أبو داؤد، الاستسقاء،٢؛ابن ماجة، الاقامة، ١٥٤؛ المسند، الاما[م] أحمد، ٢٥٣/٤-٢٥٦.

(537) دیکھئے:البخارى،الاجارة، ١٢؛ مسلم، الذكر، ١٠٠.

(538) ابن ماجة، اقامة الصلاة،١٨٩؛الترمذى،الدعوات،١١٨.

(539) البخارى،الوضوء،٣٣؛مسلم،الطهارة،١٩١؛أبوداؤد،الطهارة،٣٧؛الترمذى[،] الطهارة،٦٨؛النسائى،الطهارة،٥٠؛المسند،الامام أحمد،٢٤٥/٢-٢٥٣.

(540) البخارى،الوضوء،٣٣؛ مسلم، الطهارة، ٩٠.

(541) الهداية،المرغينانى،٢٣/١.

(542) البخارى،الطب،٥٨؛بدوالخلق،١٧؛ أبو داؤد، الأطعمة، ٤٨؛ النسائى،الفرج،١١؛ابن ماجة،الطب،٣١؛الدارمى،الأطعمة،١٢؛المسند،الامام أحمد،٢٢٩/٢،٢٤٦.

(543) البخارى، الصلاةفى مسجدمكة،١؛مسلم،الحج،٥١١؛الترمذى،الصلاة،١٢٦؛ النسائى[،] المساجد،١؛ابن ماجة،اقامةالصلاة،١٩٦؛المسند،الامام أحمد،٢٣٤/٣

(544) البخارى،الصلاة فى مسجد مكة، ١؛ مسلم،الحج، ٥١٠؛ الترمذى،المواقيت،١٢٦[؛] النسائى، المناسك، ١٢٤.

(545) البخارى،الاعتصام،١٠؛ التوحيد،٢٩؛مسلم،الامارة، ١٧٠؛ أبو داؤد، الفتن،١؛ الترمذى[،] الفتن، ٥١؛ ابن ماجة، المقدمة،١

(546) البخارى،التوحيد،٢٩.

(547) البخارى،الوضوء،٢٦؛مسلم ،الطهارة، ٨٧-٨٨؛ أبو داؤد، الطهارة، ٥٠؛المسند،الاما[م] أحمد، ٢٤١/٢،٢٥٢،٢٦٥.

(548) البخارى،الصلاة،١؛ مسلم، الايمان، ٢٦٣؛ النسائى، الصلاة،١؛ابن ماجة،اقامةالصلاة،١٩٤؛المسند،الامام أحمد، ٢٠٨/٩.

(549) البخارى، الخصومات، ١؛ الانبياء،٢٥؛ابن ماجة،الزهد،٣٣؛المسند،الامام أحمد،٣٣/٢.

(550) البخارى،البيوع،١٠٢،الانبياء،٤٩؛مسلم،الايمان،٢٤٢-٢٤٧؛أبو داؤد،الملاحم،١٤[؛] الترمذى، الفتن،٢١-٥٤؛ابن ماجة،الفتن،٣٣؛المسند، الامامأحمد،٢٤٠/٢،٣٩٤،٥٣٨،٦٧/٤.

(551) مسلم،الفتن،٢٥؛المسند،الامام أحمد،٣٤١/٥.

(552) الترمذی،العلم؛ أبوداود، السنة،٥؛ابن ماجة،المقدمة،٦؛ الدارمی،المقدمة، ١٦.

(553) البخاری الأذان ،١٨.المسند،الامام أحمد،٥٣/٥.

(554) مسلم، الحج، ٣١٠؛ أبوداؤد، المناسك، ٧٧؛النسائی،المناسك ٢٢٠؛ المسند، الامام أحمد، ٣٦٦/٣.

(555) الحمدللہ یہ معمول آج بھی جاری ہے۔(عربی ترجم)

(556) المسند،الامام أحمد، ٢١٠/١.

(557) أبوداود، العلم،١؛ الترمذی، العلم، ١٩؛النسائی،الطهارة،١١٣؛ابن ماجة، المقدمة، ١٧؛ المسند،الامام أحمد، ٢٤١/٤.

(558) العلماء العذّاب الذين آثروالعلم على الزواج،عبدالفتاح أبوغدة، ١٤٦.

(559) الدارمی،المقدمة،٥١.

(560) الدارمی،المقدمة،٥١.

(561) الأعلام،الزركلی ،٣١٥/٥.

(562) أصول السرخسی ، السرخسی، ٥/١.

(563) المحدث الفاصل،الرامهرمزی،٤٠٨، ٥٦٠؛السنةقبل التدوين، محمدعجاج الخطيب، ٢٥٠-١٥١.

(564) السنة قبل التدوين،محمدعجاج الخطيب،١٥١.

(565) وفيات الأعيان،ابن خلكان،٦٤/١.

(566) هدى الساری،ابن حجر،٤٨٧.

(567) تذكرة الحفاظ،الذهبی،٥٥٦/٢.

(568) تهذيب التهذيب،ابن حجر،٥٢/٩؛هدى الساری،ابن حجر،٤٩٤.

(569) أسدالغابة،ابن الأثير،٩٠/٧؛أعلام النساء،عمررضا كحالة، ٣٧٠/١.

(570) البخاری، صلاة،٦٨؛ مسلم، فضائل الصحابة،١٥١؛النسائی، المساجد،٢٤؛ المسند، الامام أحمد،٢٢٢/٥.

(571) البخاری،العلم،٤٢؛البيوع،١؛مسلم،فضائل الصحابة،٥٩، ١٦٠.

(572) الترمذی، الاستئذان،٢٢؛أبوداؤد، العلم،٢؛ المسند، الامام أحمد، ١٨٦/٥؛ أسد الغابة، ابن

أثير،۲۸۹/۲؛الاصابة، ابن حجر، ۵٦۱/۱.

(573) حلية الأولياء، أبو نعيم،۳٦۱/۳.

(574) البخاری، فضائل القرآن،۵؛ مسلم، كتاب المسافرين، ۲۷۰؛ أبو داؤد، الوتر، ۲۲.

(575) السنة قبل التدوين،محمدعجاج الخطيب،۲۹۸.

(576) الطبقات الكبری،ابن سعد،۲۲/۲.

(577) الترمذی،العلم،۱۱؛تقييدالعلم،البغدادی، ۲۰۲-۳۳.

(578) مسلم،الزهد،۷۲؛المسند،الامام أحمد، ۱۲/۳؛الدارمی،المقدمة،٤۲.

(579) تقييد العلم، البغدادی، ۳٤.

(580) البخاری، العلم،۳۹؛الترمذی،العلم،۱۲؛المناقب،٤٦.المسندالامام أحمد،۲٤۹/۲.

(581) اس حدیث کے راوی نے ان لوگوں کے نام احتراماً اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے ذکر نہیں کیے۔(عربی مترجم)

(582) أبو داؤد، العلم،۳؛ المسند،الامام أحمد،۱٦۲/۲؛الدارمی،المقدمة،٤۳.

(583) الترمذی،العلم،۱۲.

(584) مجمع الزوائد،الهيثمی، ۱۵۱/۱؛ كنز العمال، الهندی، ۲۳۲/۱۰؛اس سلسلے کی دیگر روایات کے لیے دیکھئے: المسند،الامام أحمد، ۲۱۵/۲.

(585) النسائی، القسامة، ٤٦؛ الدارمی، الديات،۱،۳،۱۱،۱۲.

(586) الاصابة،ابن حجر، ٦۲۸/۳؛السنة قبل التدوين، عجاج الخطيب،۳٤۷؛ الطبقات الكبری،ابن سعد، ۲۸۷/۱.

(587) الدارمی،المقدمة،٤۳؛ المستدرك، الحاكم، ۱۰٦/۱؛ كنزالعمال،الهندی،۲٤۹/۱۰.

(588) البخاری،العلم،۳۹؛ اللقطة،۷؛أبو داؤد، العلم،۳؛ الترمذی، العلم، ۱۲.

(589) البخاری،العلم،۳۹؛ مسلم، الوصية، ۲۲؛ المسند، الامام أحمد، ۳۲۵/۱.

(590) عمربن الخطاب، جوانبه المختلفة وادارته الدولة، شبلی النعمانی،۳۵۳/۲.

(591) البخاری، العلم، ٤۲.

(592) البخاری، العلم، ۳۹؛الترمذی،الديات،۱٦؛المسند،الامام أحمد،۱۰۰/۱.

(593) الترمذی، الزكاة، ٤٤؛ أبوداؤد،الزكاة،۵؛ابن ماجة، الزكاة،۹؛ الكفاية، البغدادی، ۳۳۰-۳۵٤.

(594) الطبقات الكبرى،ابن سعد،٢٩٣/٥.

(595) السيرة النبوية، ابن هشام،٨/٢ - ٩،١٤٧.

(596) النسائی، القامة،٦٤-٤٧؛الدارمی،الديات،١٢.

(597) الكفاية، البغدادی، ٣٣٠.

(598) الطبقات الكبرى، ابن سعد،٣٧٣/٢؛ أسد الغابة،ابن الأثير،٣٥٠/٣.

(599) الكفاية،البغدادی،٣٥٤؛ تقدمة الجرح، ابن أبی حاتم،٤٦.

(600) تهذيب التهذيب،ابن حجر، ٥٩/١١.

(601) کاربنی تجزیہ (Carbonic Analysis)قدیم آثار کی عمروں کا اندازہ لگانے کا سائنسی طریقہ ہے۔(عربی مترجم)

(602) الباعث الحثيث،أحمدمحمدشاكر،١٣٢-١٣٩.

(603) مسلم، الايمان، ٢٣٢؛ الترمذی،الايمان،١٣؛المسند،الامام أحمد،٧٣/٤.

(604) البخاری،العلم،٣٤.

(605) تاريخ بغداد،البغدادی،٨٥/١٤؛ تذكرة الحفاظ، الذهبی، ٢٢٩/١.

(606) درج ذیل آیات دیکھیے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً﴾(الفتح:١٨)''اے پیغمبر جب مؤمن تم سے اس درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جوصدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسکین نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔'' ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالَّذِينَ آوَواْ وَّنَصَرُواْ أُوْلَـئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُواْ وَلَمْ يُهَاجِرُواْ مَا لَكُم مِّن وَلاَيَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّى يُهَاجِرُواْ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾(الأنفال: ٧٢)''جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑے،وہ اور جنہوں نے ہجرت کرنے والوں کوجگہ دی اوران کی مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جولوگ ایمان تو لے آئے ،لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کوان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں اور اگر وہ تم سے دین کے معاملات میں مددطلب کریں تو تم کو مدد کرنی لازم ہے،مگر ان لوگوں کے مقابلے میں کہ تم میں اوران میں صلح کا عہد ہو مدد نہیں کرنی چاہیے اور اللہ تمہارے سارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔'' ﴿لِلْفُقَرَاء الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ()وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ()

وَالَّذِينَ جَاؤُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾(الحشر:۸-۱۰)''اوران ضرورت مند مہاجروں کے لیے بھی جومہاجرین سے پہلے اس گھر یعنی مدینے میں مقیم ہیں اور ایمان میں مضبوط ہیں اور جولوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش اور خلش نہیں پاتے اوران کو اپنی جانوں پر مقدم رکھتے ہیں خواہ وہ خود بھی فاقے سے ہوں اور جو شخص خود غرضی سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ بامراد ہیں اوران کے لیے بھی جوان مہاجرین کے بعد آتے اور دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مؤمنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ وحسد نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے۔''

(607) یہ آیت دیکھیے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً﴾(الفتح: ۲۹)''محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں اور جولوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل، (اے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے کہ اللہ کے آگے جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ کثرت سجود کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف تورات میں ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں، جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تا کہ کافروں کا جی جلائے۔ جولوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے اللہ نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔''

(608) الاصابة، ابن حجر، ۷/۱.

(609) المسند، الامام أحمد، ۸۹/٤-۹۰؛ أسد الغابة، ابن الأثير، ۱۳۲/٤.

(610) البخاری، تفسير سورة(۷)۳؛ السنن الكبرى، البيهقي، ۲۳٦/۱۰.

(611) معرفة علوم الحديث، الحاكم، ۲۲-۲٤؛ الباعث الحثيث، أحمد محمد شاكر، ۱۳۷.

(612) شرح كتاب الفقه الأكبر، على القاری، ۲۰٦؛ شرح العقيدة الطحاوية، ابن العز، ٦٨٩/٣؛ علوم الحديث، ابن صلاح، ۲۹٤؛ الكفاية، الخطيب البغدادی، ٤٦.

(613) المكتوبات، الامام الربانی، ۷۰/۱ (مکتوب نمبر ۵۸)

(614) البخاری، تفسير سورة(۹۸) ۱-۳؛ مسلم، فضائل الصحابة، ۱۲۱-۱۲۲؛ الترمذی، المناقب، ۳۲۰؛ المسند، الامام أحمد، ۳-۱۳۰، ۱۳۷، ۱۸۵.

(615) محاضرة الأبرار ومسافرة الأخيار، ابن عربی، ۱۷۹/۲.

(616) كنز العمال، الهندى، ٣٥٣/١٣؛ مجمع الزوائد، الهيثمى، ٥٧/١.

(617) البخارى، الرقاق، ٣٨

(618) الاصابة، ابن حجر، ١٠/١؛ الفصل فى الملل و الأهواء والنحل، ابن حزم، ١١٩/٣.

(619) دیکھئے: البخارى، التوحيد، ٣٥؛ مسلم، الايمان، ٣١٢؛ الترمذى، الجنة، ١٥؛ ابن ماجة، الزهد، ٣٩؛ الدارمى، الرقائق، ٩٨، ١٠٥؛ المسند، الامام أحمد، ٣١٣/٢، ٣٧٠.

(620) البخارى، الرقاق، ٥١؛ الترمذى، تفسير سورة (٢٣) ٣.

(621) البخارى، النكاح، ٧؛ البيوع، ١، ٤٩؛ الترمذى، البر، ٢٢.

(622) البداية و النهاية، ابن كثير، ١١٨/٨ - ١٢٠؛ سير أعلام النبلاء، الذهبى، ٦٠٩/٢.

(623) صفة الصفوية، الجوزى، ٢٩٢/١ - ٢٩٣؛ حلية الأولياء، أبو نعيم، ٣٧٨/١.

(624) البخارى، تفسير سورة (٥٩) ٦؛ مسلم، الأشربة، ١٧٢ - ١٧٤.

(625) البخارى، فضائل أصحاب النبى، ٥؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٢٢١؛ الترمذى، المناقب، ٥٨.

(626) الترمذى، المناقب، ٥٨؛ المسند، الامام أحمد، ٥٧/٥.

(627) مسلم، فضائل الصحابة، ٢٠٧؛ المسند، الامام أحمد، ٣٩٩/٤.

(628) البخارى، فضائل أصحاب النبى ١؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٢١٢.

(629) أسد الغابة، ابن الاثير، ٣٨٨/٣؛ مجمع الزوائد، الهيثمى، ٢٩١/٩.

(630) المسند، الامام أحمد، ٣٧٩/١؛ حلية الأولياء، أبو نعيم، ٣٧٥/١.

(631) حلية الأولياء، أبو نعيم، ٣٠٥/١.

(632) حلية الأولياء، أبو نعيم، ١٣٦/١.

(633) الطبقات الكبرى، ابن سعد، ٣٢٨/٤؛ الاصابة، ابن حجر، ٢٠٢/٤ - ٢١٠؛ سير أعلام النبلاء، الذهبى، ٣٤٥/١ - ٣٤٦.

(634) الطبقات الكبرى، ابن سعد، ٢٠٢/٤ - ٢١٠.

(635) مسلم، فضائل الصحابة، ١٥٨؛ المسند، الامام أحمد، ٣٢٠/٢؛ الطبقات الكبرى، ابن سعد، ٣٢٨/٤.

(636) المستدرك، الحاكم، ٥٠٨/٣.

(637) البخارى العلم، ٤٢؛ مسلم، فضائل الصحابة، ١٦٠؛ الطبقات الكبرى، ابن سعد،

.٣٣٠-٣٢٩/٤

(638) البخاری العلم،٢ ٤؛مسلم،فضائل الصحابة، ١٦٠؛ الطبقات الكبرى،ابن سعد،٣٣٠/٤.

(639) حلیةالأولیاء ، أبو نعیم،٣٧٨/١؛البدایةالنهایة،ابن كثیر،١١٨/٨.

(640) البخاری، الاعتصام، ١٦؛الترمذی،الزهد،٣٩.

(641) البخاری، الأطعمة، ٣٢؛ فضائل أصحاب النبی،١٠.

(642) البخاری،العلم،٢ ٤؛مسلم،فضائل الصحابة،١٦٠.

(643) *کیونکہ اس جلیل القدر صحابی کی قبر استنبول میں ہے۔(عربی مترجم)*

(644) المستدرك، الحاكم،٥١٢/٣؛ البدایةو النهایة، ابن كثیر،١١٧/٨.

(645) الاصابة،ابن حجر،٢٠٥/٤؛تهذیب التهذیب،ابن حجر، ٢٨٩/١٢-٢٩٠.

(646) الطبقات الكبرى،ابن سعد، ٣٣٥/٤-٣٣٦؛ أسدالغابة، ابن الأثیر، ٣٣١/٦؛ الاصابة، ابن حجر، ٢١٠/٤.

(647) البخاری،الأذان،٩٥؛ مسلم، الصلاة،١٥٨-١٦٠، الزهد، ١٢.

(648) البخاری، فضائل الصحابة،١٥؛ الرقاق، ١٧؛ مسلم، الزهد، ١٢؛ أسدالغایة،ابن الأثیر، ٣٦٦/٢.

(649) رجال حول الرسول، خالدمحمدخالد،١٢٨.

(650) تاویل مختلف الحدیث ،ابن قتیبة،٤٣-٤٤.

(651) البخاری،الفتن،٩؛مسلم ،الفتن،١٠.

(652) البدایة و النهایة، ابن كثیر،١١٦/٨.

(653) البخاری، الفتن، ٣؛ مسلم، الفتن، ٧٤؛ المسند،الامام أحمد،٢٨٨/٢.

(654) البدایة و النهایة، ابن كثیر،١٢٢/٨.

(655) البخاری،المناقب،٢٣؛مسلم،فضائل الصحابة،١٦٠.

(656) المستدرك، الحاكم، ٥٠٩/٣-٥١٠.

(657) البخاری،الوضوء، ١٠؛ مسلم، فضائل الصحابة،المسند،الامام أحمد،٢٦٦/١.

(658) دیکھئے:المستدرك، الحاكم، ٥٣٧/٣؛ أسد الغابة، ابن الاثیر، ٢٩١/٣.

(659) سیر أعلام النبلاء،الذهبی،٣٣٣/٣-٣٣٦،٣٥١؛ البدایة و النهایة، ابن كثیر،٣٣٢/٨-٣٣٣.

(660) شرح الكامل، المرصفى، ١٦٥/٧-١٦٦.

(661) البخارى، تفسيرسورة(١١٠)٣؛الترمذى،تفسيرسورة(١١٠)١.

(662) الاصابة،ابن حجر،٣٣٢/٢.

(663) المستدرك الحاكم،٥٤٣/٣،٥٤٤؛مجمع الزوائد،الهيثمى،٢٨٥/٩.

(664) المسند احمد بن حنبل١٣١/٢

(665) البخارى،الأشربة،٢٦؛ مسلم،الأشربة،١٢٢-١٢٣

(666) السيرة النبوية،ابن هشام،٣٧٣/١-٣٧٤؛ البداية والنهاية، ابن كثير، ١٠٢/٣-١٠٣.

(667) البخارى،المغازى،٦؛الطبقات الكبرى،ابن سعد، ١٤٣/٤.

(668) وفيات الأعيان، ابن خلكان،٣٠/٣.

(669) أسد الغابة،ابن الاثير،٣٤٤/٣؛الطبقات الكبرى،ابن سعد،١٥٩/٤.

(670) أسد الغابة،ابن الاثير،٣٤٤/٣؛الطبقات الكبرى،ابن سعد،١٨٧/٤.

(671) أسد الغابة،ابن الاثير،٣٨٥/٣؛الطبقات الكبرى،ابن سعد،١٥٠/٣.

(672) البخارى،المناقب،٢٧؛مسلم،فضائل الصحابة،١١٠؛الترمذى،المناقب،٣٧.

(673) البخارى،فضائل الصحابة،٢٧؛الطبقات الكبرى، ابن سعد،١٥٣٣٣.

(674) ابن ماجة، المقدمة،١١؛ المسند،الامام أحمد،٧/١؛ المستدرك، الحاكم،٣١٨/٣.

(675) البخارى، تفسيرسورة(٤)٩؛ مسلم،صلاة المسافرين، ٢٤٧؛ الترمذى، تفسير سورة (٤)١١.

(676) الطبقات الكبرى، ابن سعد،١٥٥/٣.

(677) الطبقات الكبرى، ابن سعد،١٥٧/٣.

(678) عقود الجواهر المنيفة، الزبيدى،١٠٢/١.

(679) البدايةوالنهاية،ابن كثير،١٨٣/٨

(680) البداية و النهاية، ابن كثير، ١٠٠/٨؛الأسرارالمرفوعة، على القارى،١١٦؛كشف الخفاء، العجلونى، ٣٧٤/١؛ الفوائد المجموعة، الشوكانى،٣٩٩؛ الفردوس،الديلمى،١٦٥/٢.

(681) أسدالغابة، ابن الأثير،٣٦٥/١؛ الاصابة، ابن حجر، ٣٥/٢.

(682) الترمذى، تفسيرسورة(٣)١٨؛ ابن ماجة، المقدمة،١٣، الجهاد، ١٦.

(683) البداية و النهاية، ابن كثير، ٦٥/٣.

(684) أسد الغابة، ابن الأثير،١/٣٠٢.

(685) الاصابة،ابن حجر،١/٢١٣.

(686) البخاری، الأدب،٣٩؛ مسلم، الفضائل،١٥١؛ الاصابة،ابن حجر، ١/٧١؛ أسدالغابة، ابن الاثیر، ١/١٥٢.

(687) المسند،الامام أحمد، ٣/٧١، ٥/٢٤٨،٢٥٧؛ مجمع الزوائد، الهيثمی،١٠/٢٠؛ المطالب العالية، ابن حجر، ٤/١٥٦؛ المستدرك، الحاكم،٤/٨٦.

(688) البخاری، تفسيرسورة(٣١)٢؛ مسلم، الايمان، ٥-٧؛ أبوداؤد، السنة، ١٦.

(689) حلية الأولياء،أبونعيم،٢/٩٥؛صفةالصفوة،ابن الجوزی،٢/١٤.

(690) صفةالصفوة،ابن الجوزی،٢/١٤.

(691) البخاری، تفسيرسورة (٤٨)٢؛ مسلم، صفات المنافقين،٧٩-٨١.

(692) مسلم، فضائل الصحابة،٢٢٣-٢٢٤؛ المسند، الامام أحمد،١/٣٨، ٣٩.

(693) مسلم،فضائل الصحابة،٢٢٥.

(694) حليةالأولياء، أبونعيم،٣/١٤٦.

(695) حلية الأولياء، أبونعيم،٤/٢٩١-٢٩٥؛البداية والنهاية،ابن كثير،٩/١١٦-١١٧.

(696) الطبقات الكبرى،ابن سعد ، ٥/١٢١.

(697) سيرأعلام النبلاء، الذهبی ، ٤/٢٢٢-٢٢٤؛الطبقات الكبرى،ابن سعد،٥/١٢١.

(698) وفيات الأعيان،ابن خلكان،٢/٣٧٥؛ السنة قبل التدوين ، محمد عجاج الخطيب،٤٨٥.

(699) حلية الأولياء، أبونعيم،٢/١٦٣.

(700) الطبقات الكبرى، ابن سعد،٥/١٣٢؛حلية الأولياء، أبونعيم،٢/١٦٢.

(701) حليةالأولياء،أبونعيم، ٢/١٧٢.٣؛ طبقات الكبرى،ابن سعد،٥/١٢٦.

(702) الطبقات الكبرى،ابن سعد،٥/١٣٨؛ سير أعلام النبلاء، الذهبی،٤/٢٣٤.

(703) *یعنی وہ احادیث جن میں انہیں روایت کرنے والے صحابی کا نام ذکر نہیں کیا جاتا۔*

(704) دیکھئے:المراسيل، أبوداؤد، ٣٠؛علوم الحديث،ابن الصلاح،٥٣-٥٤.

(705) الطبقات الكبرى،ابن سعد،٦/٨٦؛حليةالأولياء،ابونعيم،٢/٩٨.

(706) الطبقات الكبرى،ابن سعد٦/٨٦.

(707) البخاری،فضائل أصحاب النبی،،٢٧؛ مسلم، فضائل الصحابة،١١٨.

(708) الطبقات الكبرى، ابن سعد،٩٠/٦؛حلية الأولياء،أبو نعيم،٩٩/٢.

(709) الطبقات الكبرى،ابن سعد، ٨٦/٦؛ حلية الأولياء،أبو نعيم،١٠٠/٢.

(710) البخارى،فضائل أصحاب النبى،١٣.

(711) حلية الأولياء، أبو نعيم،١٧٨/٢.

(712) حلية الأولياء، أبو نعيم،١٧٩/٢.

(713) حلية الأولياء، أبو نعيم،٣٦٤/٣؛تذكرة الحفاظ ،الذهبى،١٠٩/١.

(714) البداية والنهاية، ابن كثير، ٣٧٥/٩.

(715) حلية الأولياء، أبو نعيم، ٢٦٩/٣؛ مختصر تاريخ دمشق لابن عساكر، ابن منظور،٢٤٠/٢٣.

(716) مختصر تاريخ دمشق لابن عساكر،ابن منظور،٢٤٠/٢٣.

(717) البخارى،الصوم،٦٧؛مسلم،الحج،٥١١.

(718) مجمع الزوائد، الهيثمى، ٣٢٦/٦.

(719) یعنی وہ چالیس سال تک عشاء کی نماز سے لے کر صبح کی نماز تک عبادت کرتے رہے۔(عربی مترجم)
دیکھئے:سير أعلام النبلاء،الذهبى،٤٢/٥.

(720) سير أعلام النبلاء،الذهبى،٣٩١/٦؛وفيات الأعيان،ابن خلكان،٤٠٦/٥.

(721) البخارى،فضائل أصحاب النبى، ١؛ مسلم، فضائل الصحابة، ٢١٠-٢١٢.

(722) مسلم،الجمعة،٤٣؛النسائى،العيدين، ٢٢؛ ان ماجة، المقدمة،٧؛أبو داؤد،السنة٥.

(723) البخارى،الاعتصام،٢؛مسلم،الامارة،٣٢.

(724) البخارى،الرقاق،٢٦؛مسلم،الفضائل،١٧-١٨.

(725) أبو داؤد، السنة، ٥؛ ابن ماجة،المقدمة،٢؛الترمذى،العلم،١٠.

(726) الترمذى،العلم،١٦؛ابن ماجة، المقدمة، ٦؛ أبو داؤد،السنة،٥.

(727) الموطأ،القدر،٣.

کتابیات

القرآن الکریم

أسد الغابة (۱-۷)، ابن الاثیر مجدالدین المبارك بن محمد الجزری، کتاب الشعب، قاهرة، ۱۹۸۰م.

أصول السرخی، (۱-۲)، أبو بطرمحمد بن أحمد بن أبی سهل السرخسی، دار المعرفة، بیروت، ۱۹۸۳م.

أعلام النساء (۱-۵)، عمررضا الکحالة، مؤسسة الرسالة، بیروت.

الأدب المفرد، أبو عبدالله محمد بن اسماعیل البخاری، دارالبشائرالاسلامیة، بیروت، ۱۹۸۹م.

الأسرارالمرفوعة فی الأخبارالموضوعة، علی القاری، المکتبةالسلامیة، بیروت، ۱۹۸۱م.

الأعلام قاموس تراجم، (۱-۸) خیرالدین الزرکلی، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸٦م.

الابریزمن کلام سیدی عبدالعزیزالدباغ، أحمد بن المبارك، دارالفکر.

الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، (۱-۱۸) تألیف:أبوحاتم محمد بن حبان البُستی، ترتیب: الأمیرعلاء الدین علی بن بلبانی الفارسی، تحقیق وتخریج وتعلیق: شعیب الأرنؤط ،مؤسسة الرسالة، بیروت، ۱۹۸۸م.

الاصابة، (۱-٤) ابن حجر العسقلانی، دارصادر، بیروت، ۱۳۲۸ھ.

الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث، أحمدمحمدشاکر، مؤسسة الکتب الثقافیة، بیروت،۱٤۰۸م.

البدایة والنهایة (۱-۱٤)، أبو الفداء اسماعیل بن کثیر، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۸۸م.

تأویل مختلف الحدیث، أبو محمدعبدالله بن مسلم بن قتیبة، دارالکتب العلمیة، بیروت ۱۹۸۵م.

تاریخ الأمم والملوك (۱-۱۳)، الطبری، دارالفکر، بیروت، ۱۹۸۷م.

تاريخ بغداد أومدينة السلام (١-١٩)، أبو بكرأحمد بن ثابت الخطيب البغدادى، دارالكتب العلمية، بيروت.

تحفةالأحوذى بشرح جامع الترمذى (١-١٠)، عبدالرحمٰن بن عبدالرحيم المباركفوردى، دارالكتب العلمية، بيروت ١٩٩٠م.

الترغيب والترتيب (١-٥) المنذرى، داراحياء التراث العربى، بيروت ١٩٦٨م.

تفسيرالقرآن العظيم (١-٨) أبو الفداء اسماعيل بن كثير، دارقهرمان للنشر والتوزيع، استانبول، ١٩٨٤م.

تفسيرالنسفى (١-١٤)، أبو البركات عبدالله بن أحمد بن محمود النسفى، دارقهرمان للنشروالتوزيع،استانبول ١٩٨٤م.

تهذيب التهذيب (١-١٤) أحمد بن على بن حجر العسقلانى، دارالفكر، بيروت، ١٩٨٤م.

جامع البيان فى تفسيرالقرآن (١-٣٠)أبو جعفر محمدبن جرير الطبرى، شركة مكتبة، بيروت، ١٩٦٨م.

جامع كرامات الأولياء (١-٢)، يوسف بن اسماعيل النبهانى، شركة مكتبة، مصر١٩٨٤م.

الجامع لأحكام القرآن (١-٢٠) القرطبى، دارالكتب العلمية، بيروت، ١٩٨٨م.

حجة الله على العالمين فى معجزات سيدالمرسلين، يوسف بن اسماعيل النبهانى، دارالفكر، بيروت.

حليةالأولياء وطبقات الأصفياء، (١-١٠) أبو نعيم أحمد بن عبدالله الاصبهانى، دارالكتاب العربى، بيروت، ١٩٦٧م.

حياةالصحابة (١-٤)، محمديوسف الكاندهلوى، دارالقلم، بيروت ١٩٨٣م.

الخصائص الكبرى، (١-٣) السيوطى، دارالكتب الحديثة، مصر، ١٩٦٧م.

الدرالمنثور (١-٨) جلال الدين السيوطى، دارالفكر، بيروت، ١٩٨٣م.

الدولةالأموية، محمد الخضارى، دارالقلم، بيروت، ١٩٨٦م.

الرحلة فى طلب الحديث، أبو بكرأحمدبن ثابت الخطيب البغدادى، تحقيق وتعليق:

نورالدين عتر، دارالكتب العلمية، بيروت ١٩٧٥م.

رجال حول الرسول، خالدمحمدخالد، دارالفكر، دمشق، ١٩٩٤م.

روح المعاني في تفسيرالقرآن العظيم والمثاني (١-٣٠)، أبو الفضل شهاب الدين السيدمحمود الآلوسي، داراحياء التراثي العربي، بيروت، ١٩٨٥م.

زاد المعاد في هدى خيرالعباد، (١-٥) ابن قيم الجوزية، مؤسسة الرسالة، بيروت، ١٩٩٠م.

سنن ابن ماجة (١-٢)، ابن ماجة، داراحياكتب العربية، مصر١٩٥٢م.

سنن أبي داود (١-٤) أبو داودسليمان بن أشعب السجستاني، المكتبة الاسلامية، استانبول.

سنن الترمذي (١-٥)أبو عيسى محمدبن عيسى الترمذي،داراحياء التراث العربي،بيروت.

سنن الدارمي (١-٢)، عبدالله بن عبدالرحمٰن الدارمي،داركتاب العربي، بيروت ١٩٨٧م.

السنن الكبرى (١-١٠) أبو بكرأحمدبن الحسيني البيهقي، مطبعةدائرةالمعارف، حيدرآباد، ١٣٥٥م.

سنن النسائي (١-٨) النسائي، دارالمعرفة، بيروت، ١٩٩٢م.

السنة قبل التدوين، محمدعجاج الخطيب،دارالفكر،دمشق ١٩٨١م.

سيرأعلام النبلا، (١-٢٥)محمدبن عبدالله بن عثمان الذهبي،مؤسةالرسالة،بيروت، ١٩٩٢م.

السيرةالنبوية (١-٤) ابن هشام، دارالقلم، بيروت.

شرح فتح القديرللعاجز الفقير (١-٩) كمال الدين محمد بن عبدالواحد، داراحياء التراث العربي، بيروت.

شرح معاني الآثار، (١-٤)أبو جعفرأحمدبن محمدبن سلامة بن عبدالملك ابن سلمةالأزدي الحجري الطحاوي، دارالكتب العلمية، بيروت، ١٩٨٧م.

الشفاء بتعرف حقوق المصطفى، (١-٢)أبو الفضل القاضي عياض، دارالفكر،

بیروت ۱۹۸۸م.

الشمائل المحمدیةوالخصائل المصطفویة، أبو عیسی محمدعیسی بن سورة الترمذی، مؤسسةالکتب الثقافیة، بیروت، ۱۹۹۲م.

الصحیح، (۱-٤)ابن خزیمة، تحقیق وتعلیق وتخریج: مصطفی الأعظمی، المکتبةالاسلامی، بیروت ۱۳۱۲ھ/۱۹۹۲م.

صحیح البخاری (۱-۸)، أبو عبدالله محمد بن اسماعیل البخاری، المکتبةالاسلامیة، استانبول، ۱۹۷۹م.

صحیح مسلم (۱-٥) أبو الحسین مسلم بن الحجاج النیسابوری، المکتبةالاسلامیة، استانبول.

صفةالصفوة (۱-۲) أبو الفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی، دار ابن خلدون، قاهرة، ۱۹۹٤م.

صیقل الاسلام أو آثار سعیدالقدیم، بدیع الزمان سعید النورسی، دارسوزلر، استانبول ۱۹۹٥م.

الطبقات الکبری (۱-۸) ابن سعد، دارصادر، بیروت، ۱۹٦۰م.

علوم الحدیث، ابن الصلاح، تحقیق وشرح: نورالدین عتر، دارالفکر، دمشق ۱۹۸٦م.

عمدةالقاری شرح صحیح البخاری (۱-۲۹)، بدرالدین أبو محمد محمود بن أحمد العینی، شرکةمکتبة، مصر ۱۹۷۲م.

فتح الباری شرح صحیح البخاری (۱-۱۳) أحمدبن علی بن حجر العسقلانی، دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۸۹م.

الفتح الکبیرفی ضم زیادةالی الجامع الصغیر (۱-۳) جلال الدین السیوطی، دارالکتاب العربی، بیروت ۱۹۳۲م.

فی ظلال القرآن (۱-٦) محمدسیدقطب، دارالشروق، بیروت، ۱۹۸٦م.

فیض القدیرشرح جامع الصغیر (۱-٦) محمد المدعو بعبد الرؤوف المناوی، دارالمعرفة، بیروت ۱۳٥۷م.

الفوائد لمجموعة فی الأحادیث الموضوعة، محمدبن علی الشوکانی، المکتب

لاسلامی، بیروت، ١٣٩٢ھ.

الکامل فی التاریخ (١-١٢)، ابن الأثیر مجدد الدین المبارک بن محمد الجزری، دارصادر، بیروت ١٩٦٧م.

کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة، (١-٥) عبدالرحمٰن الجزیریی، دارالدعوة، استانبول ١٩٨٧م.

کتاب المغازی (١-٣) محمدبن عمربن عمربن واقد السهمیی الواقدیی، عالم الکتب، بیروت، ١٩٨٤.

کتاب فضائل الصحابة (١-٤) أبو القاسم جارمحمودبن عمرالزمخشری الخوارزمی، شرکة مکتبه، مصر ١٩٧٢م.

الکشاف (١-٤) أبو القاسم جارمحمودبن عمرالزمخشری الخوارزمیی، شرکة مکتبة، مصر ١٩٧٢م.

کشف الخفاء ومزیل الالباس (١-٢)، اسماعیل بن محمد العجلونی، دارالکتب العلمیة، بیروت، ١٤٠٨ھ/١٩٨٨م.

الکفایة فی علم الروایة، أبو بکرأحمد بن ثابت الخطیب البغدادی، دارالکتب العلمیة، ١٩٨٨م.

الکلمات، بدیع الزمان سعید النورسی، دارسوزلر، استانبول، ١٩٩٢م.

کنزالعمال (١-١٨)، علاء الدین علی بن حسام الدین المتقی الهندی، مؤسسة الرسالة، بیروت، ١٩٨٦.

اللمعات، بدیع الزمان سعید النورسی، دارسوزلر، استانبول، ١٩٩٣م.

مجمع الزوائدومنبع الفوائد، (١-١٠)، نورالدین علی بن أبی بکر الهیثمی، دارالکتاب العربی، بیروت، ١٩٦٧م.

مختصرتفسیربن کثیر، (١-٣)، محمدعلی الصابونی، دارالقرآن العظیم، بیروت، ١٩٨١م.

المستدرک، (١-٥)، أبو عبدالله الحاکم النیسابوری، دارالمعرفة، بیروت، ١٩٨٦م.

مسند الفردوس، (١-٥)، أبو شجعة شراویة بن شهردار الدیلمیی، دارالکتب العلمیة،

بيروت، ١٩٨٦م.

المسند، (١-٨)، الامام أحمدبن حنبل، المكتب الاسلامى، بيزوت، ١٩٩٣م.

المسند، أبو داود الطيالسى، دارالمعرفة، حيدرآباد، ١٣٣١م.

المصنف فى الأحاديث والآثار، (١-٨)، عبدالله بن محمدبن أبى شيبة، تحقيق: سعيدمحمد اللحام، دارالفكر، ١٤٠٥ه/١٩٨٩م.

المطالب العالية، (١-٤)، ابن حجر العسقلانى، دارالمعرفة، بيروت.

معرفة علوم الحديث، الحاكم النيسابورى، دارالكتب العلمية، بيروت ١٣٩٧ه/١٩٧٧م.

مفاتيح الغيب، (١-٣٢)، فخرالدين الرازى، داراحياء التراث العربى، بيروت.

المكتوبات، (١-٢)، الامام الربانى أحمد الفاروقى السرهندى، نشريات الفضيلة، استانبول.

المكتوبات، بديع الزمان سعيد النورسى، دارسوزلر، استانبول، ١٩٩٢م.

منهل الواردين شرح رياض الصالحين (١-٢)، صبحى صالح، دارالعلم للملايين، بيروت، ١٩٧٠م.

ميزان الاعتدال، محمد بن أحمد بن عثمان الذهبى، داراحياء التراث العربى، بيروت، ١٩٦٣م.

الموطأ، (١-٢)، الامام مالك بن أنس، داراحياء التراث العربى، بيروت، ١٩٨٥م.

نفحات الأنس، عبدالرحمٰن ملاجامع، مترجم وشارح: لامعيى جلبى، نشريات المعرفة، استانبول، ١٩٩٥م.

الهداية، (١-٤) المرغينانى، دارقهرمان للنشر والتوزيع، استانبول، ١٩٨٦م.

هدى السارى، أحمدبن على بن حجرالعسقلانى، دارالكتب العلمية، بيروت، ١٩٨٩م.

وفيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان، (١-٨) محمد بن أبى بكربن خلكان، دارصادر، بيروت، ١٩٧٧م.
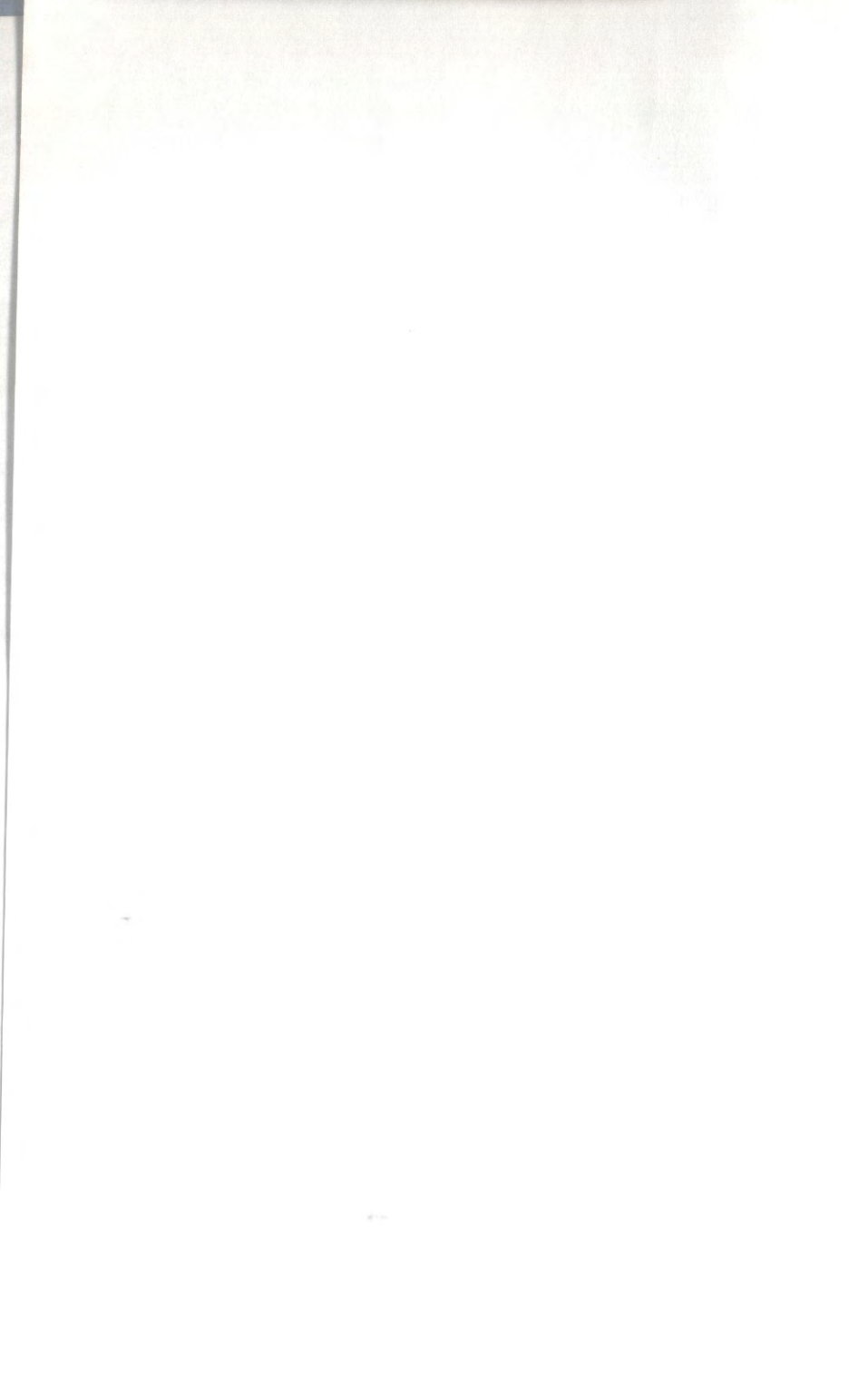
نورِ سرمدی

جولوگ سالہا سال تک اپنے افکار ونظریات بار ہا تبدیل اور ایک نظریہ چھوڑ کر دوسرا نظریہ اختیار کرتے رہے ہیں وہ یہ دیکھ اور آزما چکے ہیں کہ ان کی جدو جہد اور کوششوں کو کس طرح ناکامی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر انہوں نے مان لیا کہ واحد مکتب فکر جس کے قریب سے بھی رسوائی اور ناکامی کا گزر نہیں ہوا آپ ﷺ کا مکتب فکر ہے اور آپ ہی کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، چنانچہ انہوں نے اسے قبول کرلیا۔

کیا ہم دورِ حاضر کے انسان کے دل کو سید المرسلین ﷺ کی محبت سے لبریز اور آپ کی عظمت سے معمور کر سکے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔

اگر انسانیت آپ ﷺ کو کما حقہ پہچان اور سمجھ لیتی تو عشق ومحبت میں اپنے حواس کھو بیٹھتی اور اگر آپ ﷺ کی خوبصورت یادیں روحوں پر چھا جاتیں تو ان کے شوق کے جذبات بھڑک اٹھتے، آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے، آپ ﷺ کی پاکیزہ نبوت کے عالم کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے بدن کانپ اٹھتے اور روحیں اپنے آپ کو ہوا کے سامنے ڈال دیتیں تاکہ آپ ﷺ کی آتشِ عشق میں جلنے والے دلوں کی چنگاری خاک ہوجانے کے بعد پھر سے بھڑک اٹھے اور وہ ہوا اسے اڑا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے جائے

ہماری عقلیں اس حقیقت کو سمجھیں اور اس کا احاطہ کریں یا نہ کریں، ہمارے دل ہمیشہ اسی شمع کے گرد اڑتے اور اسی آفتاب کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور عنقریب آپ ﷺ کی طرف رجوع نہ کرنے اور آپ کے بارے میں لاپرواہی برتنے والے ندامت کے آنسو بہائیں گے اور رنج والم کے کڑوے گھونٹ پیئیں گے۔ جس نے آپ کی پیروی نہ کی اور بھاگا اور موسم سرما کی مکھی کی طرح علیحدہ اور تنہا رہا، وہ عنقریب تکلیف سے کراہتے اور پشیمانی وحسرت سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہوئے کہے گا: ''میں کیوں نہ آپ کی طرف متوجہ ہوا اور پروانوں کی طرح آپ کے گرد گھوما''، لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے وقت نکل چکا ہوگا۔

ISBN 978-969-9110-21-4
9789699110214